قرآن وحدیث کی روشنی میں تحقیقی فتاویٰ کا مجموعہ

فتاویٰ عبادُ الرحمٰن

جلد پنجم

مفتی عبدالرحمٰن ملاخیل صاحب دامت برکاتہم
رئیس دارالافتاء والتحقیق خطیب ابوبکر صدیق مسجد ڈیفنس

دارالافتاء والتحقیق
ابوبکر صدیق مسجد فیز ۲ ڈی ایچ اے کراچی

قرآن و حدیث کی روشنی میں تحقیقی فتاویٰ کا مجموعہ

فتاویٰ عباد الرحمن

جلد پنجم

مفتی عبد الرحمن ملاخیل صاحب دامت برکاتہم
رئیس دار الافتاء والتحقیق خطیب ابوبکر صدیق مسجد ڈیفنس

دار الافتاء والتحقیق
ابوبکر صدیق مسجد۔ فیز ۲ ڈی ایچ اے، کراچی

ناشر: مفتی عبدالرحمٰن ملاخیل صاحب رئیس دارالافتاء والتحقیق ابوبکر صدیق مسجد فیز ۲ ڈی ایچ اے

مطبع: ایجوکیشنل پریس پاکستان چوک کراچی فون نمبر: 32630051

مسائل معلوم کرنے کے لئے مفتی صاحب سے مندرجہ ذیل نمبروں پر رابطہ کر سکتے ہیں براہ کرم نماز اور آرام کے اوقات کا خیال رکھیں۔

برائے رابطہ فون نمبر: 02135804388

موبائل: 03132775126 0333-2251145

☆ ملنے کے پتے ☆

ناشر: مفتی عبدالرحمٰن ملاخیل (مندرجہ بالا تینوں نمبرز)

ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی فون نمبر: 32638114

دارالاشاعت اردو بازار کراچی فون نمبر: 32631861

اسلامی کتب خانہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

قرآن محل اردو بازار ڈیرہ اسماعیل خان

مولوی سیف الرحمٰن عبدل خیل ڈیرہ اسماعیل خان فون نمبر: 03139341266

مکتبہ جاوید میانوالی شہر

مکتبہ رشیدیہ ۳ شیش محل روڈ لاہور فون نمبر: 04237364516

مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ فون نمبر: 0812662263

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
1	﴿طلاق صریح اور کنایہ کا بیان﴾	32

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
172	﴿بیوی کی رہائش اور نان ونفقے کا حکم﴾	205
173	﴿عدت طلاق میں عورت کے نان نفقہ کا مسئلہ﴾	206
174	﴿متوفیٰ عنہا زوجہا کے نفقہ کا شرعی حکم﴾	206
175	﴿زوجہ کی تجہیز وتکفین کا خرچہ شوہر پر ہے﴾	207
176	﴿عورت شوہر کی اجازت کے بغیر میکے چلی جائے تو اس کے نفقے کا حکم﴾	207
177	﴿شوہر کا مال اس کی اجازت کے بغیر کسی پر خرچ کرنا جائز نہیں ہے﴾	208
178	﴿بیوی کے پاس خرچہ میں سے بچ جائے تو کیا حکم ہے؟﴾	210
179	﴿بدکردار بیوی کے مہر اور نان ونفقہ کا مسئلہ﴾	211
180	﴿نابالغ اولاد کے مال میں والدین ولی کی حیثیت سے تصرف کر سکتے ہیں﴾	213
181	﴿کتاب الأیمان والنذور﴾	215
182	﴿غیر اللہ کی قسم کھانا جائز نہیں﴾	215
183	﴿قسم معلق کی ایک صورت اور اس کا کفارہ﴾	216
184	﴿یمین غموس کا حکم﴾	216
185	﴿منت، قسم اور اس کے کفارہ کا حکم﴾	217
186	﴿لا ینعقد القسم بغیر اسماء اللہ تعالی وصفاتہ﴾	217
187	﴿غیر ارادی طور پر قسم کھانے کا حکم﴾	218
188	﴿قسم اٹھوانے والے کے سامنے "ہاں میں ہاں" ملانا﴾	218
189	﴿مستحلف کو نعم سے جواب دیا جائے تو کیا حکم ہے؟﴾	219
190	﴿دوسرے کی صفائی کیلئے قسم کھانا﴾	220

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
209	﴿کتاب النذر﴾	236
209	﴿منت ماننے کے مسائل﴾	236
210	﴿نذر میں دارومدار الفاظ پر ہوتا ہے﴾	236
211	﴿وجود شرط سے پہلے نذر ادا کرنا﴾	237
212	﴿نذر کا مسئلہ﴾	238
213	﴿نذر ماننے کا حکم﴾	238
214	﴿نذر کے روزوں میں تسلسل کا حکم﴾	239
215	﴿مسجد کے لئے نذر ماننے کا حکم﴾	240
216	﴿کسی بزرگ کی قبر کی زیارت کی نذر ماننا﴾	241
217	﴿نذر کے روزوں میں تسلسل کا حکم﴾	242
218	﴿نذر کا مصرف﴾	242
219	﴿نذر شدہ چیز واجب التصدق ہے﴾	243
220	﴿نذر کی ایک صورت﴾	244
221	﴿ظالمانہ ٹیکس سے نجات کیلئے نذر ماننا﴾	244
222	﴿عرفاً نذر کیلئے مستعمل صیغوں سے بھی نذر منعقد ہو جاتی ہے﴾	246
223	﴿نذر معلق کی ایک صورت﴾	247
224	﴿منت کے روزے نہیں رکھ سکتا تو کیا کرے؟﴾	247
225	﴿لزوم کے صیغوں کے بغیر بھی نذر معلق منعقد ہو جاتی ہے﴾	248
226	﴿نذر معلق کی ایک صورت کا حکم﴾	249

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
396	﴿اکاؤنٹ میں کسی کی رقم غلطی سے آجائے تو مالک کو لوٹانا ضروری ہے﴾......	412
397	﴿موبائل میں نامعلوم بیلنس پہنچنے کا حکم﴾..............................	413
398	﴿ایسے سامان کا حکم جس کا مالک معلوم نہ ہو﴾..............................	414
399	﴿لقطہ پر خرچ کرنے سے مطالبہ کا حق حاصل ہے﴾..............................	415
400	﴿کافر کے لقطہ کا حکم﴾..............................	416
401	﴿کتاب البیوع﴾	418
402	﴿اندازے سے لینا دینا جائز ہے بشرطیکہ وزن کا عقد میں ذکر نہ ہو﴾..........	418
403	﴿ادھار پر عام قیمت سے زیادہ پر بیچنا جائز ہے﴾..............................	418
404	﴿خریدار کے قبضے میں اگر مبیع کا نقصان ہوجائے تو خود ذمہ دار ہے﴾.........	420
405	﴿زمین کی بیع میں درخت تبعاً داخل ہوتے ہیں﴾..............................	421
406	﴿منقولہ چیز قبضے سے قبل فروخت کرنا جائز نہیں ہے﴾..............................	422
407	﴿ادائیگی رقم کے بعد بیچی ہوئی چیز کو کم قیمت پر خریدنا جائز ہے﴾..............	422
408	﴿جو چیز اپنے پاس موجود نہ ہو اس کو فروخت کرنے کا حکم﴾..............................	423
409	﴿جواز التصرف فی المبیع قبل القبض﴾..............................	424
409	﴿قبضہ سے پہلے مبیع میں تصرف کرنا جائز ہے﴾..............................	424
410	﴿کانے کی بیع کی ایک صورت کا حکم﴾..............................	424
411	﴿درخت کے پتوں کو بمع شاخوں فروخت کرنا﴾..............................	425
412	﴿بیع مرابحہ میں خیانت ظاہر ہوجائے تو واپس لوٹانے کا اختیار ہے﴾..........	427
413	﴿ثمن اول معلوم نہ ہو تو بیع مرابحہ درست نہیں﴾..............................	428

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
471	﴿دو مہینوں کے اندر واپسی کی شرط پر قرضہ وصول کرکے زیورات رکھوانا﴾	482
472	﴿عام ریٹ سے مہنگا بیچنا، دوکاندار سے کمیشن لینا﴾	484
473	﴿عیب ظاہر ہونے کیصورت میں خریدار مبیع کو لوٹا سکتا ہے﴾	484
474	﴿مردہ جانور کے دودھ کی بیع کا حکم﴾	486
475	﴿بیعانہ کا شرعی حکم﴾	487
476	﴿مبیعہ کا قبضہ میں آنے نیز ادھار کی صورت میں قیمت بڑھانے کا مسئلہ﴾	487
477	﴿سامان پہنچنے سے پہلے ریٹ مقرر کرنے نیز اپنے حق سے زیادہ لینے کی شرعی تحقیق﴾	488
478	﴿ٹیلیفون پر بیع کی صورت میں اگر مال راستے ہی میں ضائع ہوگیا تو نقصان کس پر آئیگا؟﴾	490
479	﴿سمندری جہاز کا مال پہنچنے سے پہلے بیع کا حکم﴾	491
480	﴿قیمت مقرر کرنے سے پہلے بیچنا﴾	492
481	﴿خریدار پر عقد کے وقت طے شدہ قیمت ہی لازم ہے﴾	493
482	﴿والد اپنے بیٹے کو اپنی جائیداد فروخت کرسکتا ہے﴾	494
483	﴿روٹیوں کے ٹکڑے فروخت کرنا جائز ہے﴾	494
484	﴿مملوکہ حوض میں بارش کے جمع شدہ پانی کے بیچنے کا حکم﴾	495
485	﴿زندہ مرغیوں کو وزن کرکے بیچنے کا حکم﴾	496
486	﴿مکان کے اطراف میں موجود درخت بدون ذکر کے بھی بیع میں داخل ہونگے﴾	497
487	﴿سڑک کے کنارے بیٹھ کر خرید و فروخت کرنے کا حکم﴾	497
488	﴿پرندوں کو فروخت کرنا جائز ہے﴾	498
489	﴿شیئرز (Shares) کی بیع قبل القبض کا حکم﴾	499

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

﴿طلاق صریح اور کنایہ کا بیان﴾

﴿تین طلاقوں کے متعلق ایک مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مفتیان عظام مسئلہ ذیل کے بابت:

مسئلہ: زید اور عائشہ دونوں میاں بیوی ہیں، عائشہ کی گھر میں ساس سے کسی مسئلہ پر الجھن ہوئی تو میکے چلے گئی زید کو پتہ چلا تو اسکے گھر چلا گیا اور کہا "مجھے آپ نے بہت تنگ کرلیا اس لئے میں تمہیں طلاق دیدونگا اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ" تو اسکے بھائی نے زید سے کہا کہ تم طلاق دے رہے ہو، زید نے ہاں کہا، پھر زید سے عائشہ کے بھائی نے کہا کہ کیا طلاق ہے؟ تو زید نے کہا، طلاق ہے، طلاق ہے، طلاق ہے۔ پشتو میں عائشہ کے بھائی نے کہا "طلاق دہ؟ تو زید نے کہا "طلاق دہ، طلاق دہ، طلاق دہ"۔ از راہ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں تینوں طلاقیں واقع ہوگئی ہیں، اب کوئی رجوع نہیں ہوسکتا اور حلالہ شرعیہ کے بغیر دوبارہ نکاح بھی نہیں ہوسکتا۔ عورت عدت پوری گذار کر چاہے تو دوسری جگہ شادی کرسکتی ہے۔

لما فی الدر المختار :(۲۹۳/۳ طبع سعید)

کرر لفظ الطلاق وقع الکل وان نوی التاکید دین

ولما فی فتاوی قاضیخان :(۲۹۵/۱ طبع قدیمی)

رجل قال لغیره أطلقت امراتک؟ فقال نعم بالهجاء او قال بلی بالهجاء ولم یتکلم به یقع الطلاق.

ولما فی العالمگیریه :(۲۹۰/۱ طبع قدیمی)

متی کرر لفظ الطلاق بحرف الواو او بغیر حرف الواو یتعدد الطلاق ـــــ رجل قال لغیره: أطلقت امراتک؟ فقال نعم بالهجاء او قال بلی ـــ یقع الطلاق الخ

ولما فی خلاصة الفتاوی :(۸۱/۲ طبع رشیدیه)

رجل قال لاخر هل طلقت امراتک فقال بالهجاء، ن ـ ع ـ م بمعنی نعم او قال لها ابتدا انت طا ـ ل ـ ق، بمعنی طالق یقع بخلاف ما لو قرا ایة السجدة بالهجا، حیث لا یلزمه السجدة لانه لیس بقرأن، اما الطلاق یتعلق بلفظ یدل علیه.

واللہ اعلم بالصواب: ریحان اللہ　　　　الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتوی نمبر ۳۷۷۸　　　　۵ جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ

﴿ایک دو تین بولنے سے طلاق نہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی نے اپنی بیوی سے کہا تجھے طلاق ہے پھر تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کہا ایک دو تین اب پوچھنا یہ ہے کہ مذکورہ صورت میں ایک طلاق واقع ہوگی یا تین طلاقیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں دونوں جملوں کے درمیان خاموش رہنا محض سانس توڑنے کی غرض سے معمولی سا اگر تھا تو یہ کل ایک ہی بات شمار ہوگی اور تینوں طلاقیں واقع شمار ہوں گی اب رجوع نہیں ہوسکتا اور حلالہ شرعیہ کے بغیر دوبارہ نکاح بھی نہیں ہوسکتا البتہ اگر سانس توڑنے کی غرض سے خاموش نہیں ہوا بلکہ ویسے ہی ایک طلاق دینے کے بعد کچھ خاموش رہنے کے بعد پھر ایک دو تین بولا ہے تو اس صورت میں صرف ایک ہی طلاق واقع ہوگئی ہے دوران عدت وہ رجوع کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔

لما فی ردالمحتار جلد۳/۲٦۷ طبع ایچ ایم سعید

وفی الخانیہ قال لزوجته انت طالق وسکت ثم قال ثلاثا ان کان سکوته لانقطاع النفس تطلق ثلاثا والا تقع واحدةً

ولما فی الفتاوی العالمگیریه جلد۱/۸٦ طبع مکتبة رشیدیه

رجل قال لامراته انت طالق وسکت ثم قال ثلاثا ان کان السکوت لانقطاع النفس یقع الثلاث وان کان لا لانقطاع النفس لا یقع الثلاث

ولما فی خلاصة الفتاوی جلد۱/۸٦ طبع مکتبہ رشیدیہ

وفی الفتاوی رجل قال لامراته انت طالق وسکت ثم قال ثلاثا ان کان السکوت لانقطاع النفس یقع الثلاث وان کان لا لانقطاع النفس لا یقع الثلاث.

واللہ اعلم بالصواب: شفقت اللہ الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۳۸۷۰ ۲۴ ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ

﴿بیوی کو تین طلاقیں دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے گھریلو لڑائی جھگڑے کے دوران اپنی بیوی کو تین مرتبہ کہہ دیا جا تجھے طلاق طلاق طلاق اب وہ شخص کہتا ہے کہ میں نے یہ الفاظ چونکہ نہایت غصے کی حالت میں کہے ہیں لہٰذا طلاق نہیں ہوئی پوچھنا یہ ہے کہ

اس طرح الفاظ کہنے کا شرعاً کیا حکم ہے اور غصے سے کہنے کی وجہ سے حکم پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں تینوں طلاقیں واقع ہوگئی ہیں اب رجوع نہیں ہوسکتا اور حلالہ شرعیہ کے بغیر نکاح نہیں ہوسکتا اور شوہر کا کہنا کہ "میں نے غصے کی حالت میں طلاق دی ہے اس لیے طلاق نہیں ہوئی" غلط ہے طلاق عموماً غصے کی حالت میں ہی دی جاتی ہے ہوش وحواس ہوتے ہوئے اگرچہ سخت غصے کی حالت میں ہو تب بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے لہٰذا عورت عدت گزار کر دوسری جگہ چاہے تو شادی کر سکتی ہے اس شوہر کا اب کوئی حق زوجیت باقی نہیں رہا۔

لما فی قوله تعالیٰ سورة البقرة پاره ۲)

الطلاق مرتان فامساك بمعروف أو تسريح باحسان......الیٰ قوله تعالیٰ فان طلقها فلا تحل له حتیٰ تنكح زوجاً غيره....الخ

ولما فی سنن ابی داؤد:(۱/۳۲۲، مكتبه: رحمانيه)

عن سهل بن سعدؓ فی هذا الخبر قال فطلقها ثلث تطليقات عند رسول الله صلی الله عليه وسلم فانفذه رسول الله صلی الله عليه وسلم.

ولما فی الهداية:(۲/۳۵۳،طبع:رحمانيه)

وطلاق البدعة ان يطلقها ثلاثاً بكلمة واحدة او ثلاثاً فی طهر واحد فاذافعل ذالک وقع الطلاق وكان عاصياً

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ	واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق المکی
۳ محرم الحرام ۱۴۳۲ھ	فتویٰ نمبر: ۳۱۲۴

﴿طلاق رجعی کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ "تمہیں طلاق طلاق" تو اس صورت میں عورت کو کونسی اور کتنی طلاق واقع ہوئی؟ کیا شوہر بغیر نکاح رجوع کر سکتا ہے یا نہیں؟ مستفتی: شاجہان ڈیروی

﴿جواب﴾ صورت مذکورہ میں عورت مدخول بہا ہے تو دو طلاق رجعی واقع ہوئی شوہر کو دوران عدت رجوع کا حق حاصل ہے لیکن یاد رہے آئندہ کیلئے صرف ایک طلاق کا حق باقی رہیگا، کسی بھی موقع پر مزید ایک طلاق دیدی تو رجوع نہ ہو سکے گا لہٰذا احتیاط سے رہے اور دوران عدت شوہر نے اگر رجوع نہیں کیا تو عدت گزرنے کے بعد عورت آزاد ہو جائیگی دوسری جگہ چاہے تو شادی کر سکے گی۔

لما فی قوله تعالیٰ:(پاره ۲ آیت نمبر ۲۲۸/سورۃ بقره)

(وبعولتهن احق بردهن فی ذالک)

ولما فی روح المعانی (۲/۲۹۳)مکتبه رشیدیه

(احق بردهن)الی النکاح والرجعة الیهن وهذ اذاکا ن الطلاق رجعیا للاية بعدها

ولما فی الدر المختار :(۳/۲۹۳طبع:سعید)

کر ر لفظ الطلاق وقع الکل وان نوی التاکید دین

وفی الشامية قوله (وان نوی التاکید دین)بان قال للمد خول بها انت طالق انت طالق الخ قوله (وان نوی التاکید)ای وقع الکل قضاء وکذااذا اطلق اشباه ای بان لم ینوی استینا فا ولاتاکید لان الاصل عد م التاکید

ولما فی الفتاوی الهندیه :(۱/۳۵۵طبع: رشیدیه)

ولو قال لها انت طالق طالق او انت طالق انت طالق۔۔تقع ثنتان اذاکانت المرئة مدخولا بها

ولما فی الفتاوی الولوالجیة :(۲/۱۳ مکتبه: فاروقیه پشاور)

رجل قال لأ مرئته بعد الد خول بها انت طالق یقع ثنتان

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سمیع الرحمٰن دیروی

۱۷محرم الحرام ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر:

﴿بغیر ارادہ لفظ "طلاق" کہنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید جو کہ اپنی بیوی ہندہ سے محو گفتگو تھا، دوران گفتگو بے ساختہ اسکی زبان سے یہ کلمات نکلے: طلاق، طلاق، طلاق دونوں میاں بیوی کا کہنا ہے کہ ہمارے درمیان معمول کی بات چیت ہو رہی تھی کوئی جھگڑا بھی نہیں ہوا اور نہ ہی زید غصہ میں تھا، کیا ایسی صورت میں زید کا ہندہ سے نکاح برقرار ہے؟ واضح رہے کہ زید کا یہ کہنا ہے کہ نا میرا ارادۂ طلاق تھا اور نا ہی نیتِ طلاق۔ مستفتی: محمد شعیب ایبٹ آباد

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ مفتی غیب نہیں جانتا، سوال کے مطابق جواب دیتا ہے، سوال میں غلط بیانی سے کوئی کام لے تو وبال سوال کرنے والے پر ہوگا، لہذا زید کی زبان سے بے ساختہ طلاق، طلاق، طلاق کے محض یہی الفاظ نکلے ہیں اور ان الفاظ سے واقعی کوئی طلاق دینا مقصود نہ تھا اور نہ ہی کوئی نسبت جملہ میں موجود تھی تو ایسی صورت میں کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی۔

لما فی الشامی:(۳/۲۴۸طبع سعید)

(قوله لتركه الاضافة)ای المعنوية فانها الشرط والخطاب من الاضافة المعنوية وكذا

الاشارة نحو هذه طالق وكذا نحو امرأتي طالق ...

أقول: ما ذكره الشارح من التعليل أصله لصاحب البحر أخذا من قول البزازية في الأيمان قال لها لا تخرجي من الدار إلا بإذني فإني حلفت بالطلاق فخرجت لا يقع لعدم ذكر حلفه بطلاقها ويحتمل الحلف بطلاق غيرها فالقول له اهـ ومثله في الخانية وفي هذا الأخذ نظر فإن مفهوم كلام البزازية أنه لو أراد الحلف بطلاقها يقع لأنه جعل القول له في صرفه إلى طلاق غيرها والمفهوم من تعليل الشارح تبعا للبحر عدم الوقوع أصلا لفقد شرط الإضافة مع أنه لو أراد طلاقها تكون الإضافة موجودة ويكون المعنى فإني حلفت بالطلاق منك أو بطلاقك ولا يلزم كون الإضافة صريحة في كلامه لما في البحر لو قال: طالق فقيل له من عنيت؟ فقال امرأتي طلقت امرأته اهـ ... ويؤيده ما في البحر لو قال: امرأة طالق أو قال طلقت امرأة ثلاثا وقال لم أعن امرأتي يصدق.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: نعمان اقبال عفا اللہ عنہ

صفر الخیر ۱۴۳۶ھ — فتویٰ نمبر: ۲۰۳۳

﴿دورانِ گفتگو غلطی سے لفظ طلاق زبان سے نکلے تو۔۔۔؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ زید اپنی بیوی کو کچھ اور کہنا چاہ رہا تھا لیکن غلطی سے لفظ طلاق نکل گیا، زید اس پر بہت نادم ہے اور اس کا ارادہ بھی نہیں تھا، کیا مذکورہ صورت میں طلاق واقع ہوگی؟

مستفتی: محمد عدنان

﴿جواب﴾ زید کی بیوی پر قضاءً تو ایک طلاق رجعی واقع ہوگئی ہے، البتہ دیانۃً طلاق واقع نہیں ہوئی، بیوی طلاق کے معاملہ میں چونکہ قاضی کے حکم میں ہے اس لئے وہ طلاق شمار کرے۔

لما في التنوير مع الدر (۲/۲۲۸، طبع امدادیہ)

(أو مخطئا) بأن أراد التكلم بغير الطلاق فجرى على لسانه الطلاق.

وفي الشامية: بأن أراد أن يقول سبحان الله فجرى على لسانه أنت طالق تطلق، لأنه صريح لا يحتاج إلى النية لكن في القضاء كطلاق الهازل واللاعب.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی

۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ — فتویٰ نمبر: ۲۷۹

﴿"میں نے تجھے طلاق دیدی" کئی مرتبہ بیوی سے کہنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ میری دو بیویاں ہیں بڑی بیوی اکثر مجھ سے تنگ

کلامی کرتی رہتی ہے، زیادہ تنگ آ کر میں نے اپنی بیوی کے بھائیوں کے سامنے جا کر کہا کہ میں نے اس کو طلاق دی اور پھر اپنی بیوی سے بھی آ کر کئی مرتبہ یہ لفظ کہا کہ میں نے تجھے طلاق دی دی، اب اس عورت کے بھائی دوبارہ میرے ساتھ اسکو بسانا چاہتے ہیں، اسکی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں تین طلاقیں واقع ہونے کی وجہ سے آپ کی بیوی آپ پر حرام ہو چکی ہے اور حلالہ شرعیہ کے بغیر دوبارہ بسانے کی کوئی صورت نہیں رہی، حلالہ شرعیہ کا مطلب یہ ہے کہ عدت کے بعد یہ عورت خود دوسری جگہ نکاح کرلے اور دوسرا شوہر با قاعدہ اس سے صحبت بھی کرلے پھر وہاں بھی اسے طلاق ہو جائے تو عدت گزارنے کے بعد دوبارہ نئے حق مہر کے ساتھ باہمی رضامندی سے نکاح ہو سکے گا۔

لمافی قولہ تعالیٰ:(سورۃ البقرۃ،آیت ۲۲۹)

الطلاق مرتان فامساك بمعروف او تسريح باحسان — فان طلقها فلاتحل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره — الأية.

ولمافی احکام القرآن للجصاص:(۱/۵۲۲،طبع قدیمی)

(حتى تنكح زوجا غيره) غاية التحريم الموقع بالثلاث فاذا وطئها الزوج الثانى ارتفع ذلك التحريم الموقع وبقى التحريم من جهة انها تحت زوج كسائر النساء الاجنبيات فمتى فارقها الثانى وانقضت عدتها حلت للاول.

ولمافی مشکاۃ المصابیح:(۲/۲۸۴،باب المطلقة ثلاثا،طبع سعید)

عن عائشة قالت جاءت امراة رفاعة القرظى الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقالت انى كنت عند رفاعة فطلقنى فبت طلاقى فتزوجت بعده عبد الرحمن بن الزبير وما معه الامثل هدبة الثوب فقال اتريدين ان ترجعى الى رفاعة قالت نعم قال لا حتى تذوقى عسيلته ويذوق عسيلتك. متفق عليه.

ولمافی التنویر مع الدر:(۳/۴۰۹-۴۱۰،طبع سعید)

(لا) ينكح (مطلقة) من نكاح صحيح نافذ — (بها) اى بالثلاث — (حتى يطأها غيره)

ولمافی الھندیۃ:(۱/۴۷۳،طبع رشیدیہ)

وان كان الطلاق ثلاثا فى الحرة وثنتين فى الامة لم تحل له حتى تنكح زوجا غيره نكاحا صحيحا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالوہاب لقمانی عفا اللہ عنہ

۸ جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۷۰۸

﴿ایک، دو، تین تو مجھ سے آزاد ہے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے غصہ کی حالت میں اپنی بیوی سے پشتو میں کہا ''یو، دوہ، درے پہ ما خلاصہ ئے'' اسکی تعبیر یہ ہے ایک، دو، تین مجھ سے خلاصہ ہو (مجھ سے چھوٹی ہوئی ہو، مجھ سے آزاد ہو) یہ جملہ استعمال کیا۔ اور پہ ما خلاصہ ئے یہ متصل بولا ہے درمیان میں کوئی رکا نہیں۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ اس آدمی کی کتنی طلاق واقع ہوئیں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں تسلی بخش جواب دیکر ثواب دارین حاصل کریں۔

﴿جواب﴾ مذکورہ الفاظ ''ایک دو تین'' دراصل گنتی کیلئے موضوع ہیں طلاق کیلئے موضوع نہیں ہیں لیکن اس سے طلاق کی گنتی بھی مراد لی جاسکتی ہے، اور قرینہ مقام کے لحاظ سے بسا اوقات معدود کا ذکر کئے بغیر صرف عدد پر کفایت کیجاتی ہے، اور مخاطب باسانی سمجھ جاتا ہے، مذکورہ صورت میں خاوند نے بیوی کو یہ کہا ہے کہ ''یو، دوہ، درئے پہ ما خلاصہ ئے'' ایک دو تین مجھ سے خلاصہ ہو (مجھ سے آزاد ہو یا مجھ سے چھوٹی ہوئی ہو) یہ الفاظ خاوند نے غصہ کی حالت میں بول دیئے اور ''خلاصہ'' لفظ پشتو زبان میں طلاق کیلئے عام بولا جاتا ہے، لہذا اسکا کوئی اور مطلب نہیں ہے سوا اسکے کہ شوہر ایک دو تین سے طلاق ہی مراد لے رہا ہے، اس لئے تینوں طلاقیں واقع ہوگئی ہیں اب رجوع نہیں ہوسکتا اور حلالہ شرعیہ کے بغیر تجدید نکاح بھی نہیں ہوسکتا عورت عدت پوری کرنے کے بعد چاہے تو دوسری جگہ شادی کرسکتی ہے۔

لمافی الهندیه (۱/۵۷ رشیدیه)

ولو قال لامراته انت منی ثلاثا ان نوی الطلاق طلقت وان قال لم انو الطلاق لم یصدق ان کان فی حال مذاکرة الطلاق.

لمافی الشامی (۲/۲۷۵ سعید)

ورایت بخط السائحانی: مقتضی مافی الخانیه من قوله ولو قال لامراته انت بثلاث قال ابن الفضل: اذا نوی یقع هنا اذا نوی وفیها ایضا اذا قال طالق فقیل من عنت فقال امراتی طلقت ولو قال انت منی ثلاثا طلقت ان نوی او کان فی مذکراة الطلاق والا فالا ـــ والظاهران قوله هکذا مثل قوله بثلاث ـــ والاسم المبهم مذکور فی مسالتنا: فهذا العلم بعدد الطلاق المقدر الذی نواه المتکلم، کما ان قوله بثلاث دل علی عدد الطلاق مقدر نواه المتکلم ولا فرق بینهما الا من جهة ان العدد فی احدهما صریح وفی الاخری غیر صریح وهذا الفرق غیر موثر بدلیل انه لا فرق بین قوله انت طلاق

ھکذامشیرالی الاصابع الثالث وبین قولہ انت طلاق بثلاث،ھذاماظھرلی فافھم

لمافی التاتارخانیہ(۲/۲۰۲قدیمی کراچی)

واذقال لامراتہ :تویکی متوسہ اوقال ترایکی ،تراسہ ــــ قال الصدر الشھید المختار عندی انہ نوی یقع الطلاق وفی الحجۃ،تراسہ المختارتقع الثلاث اذانوی ــــ وقال غیرابی القاسم:ینبغی ان یکون الجواب علی التفصیل :ان کان فی حال مذاکرۃ الطلاق اوفی حال الغضب یقع،والافلایقع الابالنسبۃوفی الغانیہ ولوقال لامراتہ" انت بثلاث"قال الشیخ الامام ابوبکر محمدبن الفضل اذانوی یقع وفی"الحجۃ"انت منی بثلاث تقع ثلاث ولایصدق علی عدم النیۃ، خصوصا عند مذاکرۃ الطلاق، (وایضاًوفی "الذخیرہ سالت المراۃ زوجہاان یطلقہاواحدۃ فقال الزوج دارم یکی دو سہ فقالت طہ یکی چہ دو چہ سہ ؟ فلم یجبہابشیء، فقد قیل اناتطلق ثلاثاً۔۲/۲۰۲)

ولمافی الشامی :(۴/۲۹۹طبع رشیدیہ)

ولاشیئ من الکنایات یقع بہ الطلاق بلانیۃ ودلالۃ الحال کما صرح بہ البدائع ویدل علی ذلک ماذکرہ البزازی عقب قولہ فی الجواب الماران المتعارف بہ ایقاع البائن لاالرجعی حیث قال مانصہ بخلاف فارسیۃ قولہ سرحتک وھو "رھاکردم"لانہ صار صریحا فی العرف الخ

الجواب صحیح :مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب :صفی اللہ غفرلہ ولوالدیہ

۱۳صفرالخیر۱۴۳۵ھ فتوی نمبر:۳۸۹۵

﴿"تو آزاد ہے" سے طلاق کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان شرع اس مسئلہ کے بارے میں کہ شوہر نے بیوی کوکہاتم میری طرف سے آزاد ہومیں نے تمہیں آزادی دی جہاں جاناچاہتی ہوتمہیں کوئی نہیں روکے گاتو کیااس سے طلاق واقع ہوگی یانہیں؟وضاحت فرمائیں۔

تنقیح:شوہر نے جہاں جاناچاہتی ہوجاسکتی ہوتمہیں کوئی نہیں روکے گابولتے ہوئے کیاارادہ کیاتھا،ان الفاظ سے الگ طلاق کاارادہ کیاتھایاتم میری طرف سے آزادہو،میں نے تجھے آزادی دی،اس جملہ کااثرونتیجہ واضح کرنامقصودتھا،اس کی وضاحت شوہرخودکرے تاکہ جواب دے سکے۔

جواب تنقیح:ان الفاظ سے نئی طلاق کاارادہ نہیں بلکہ پہلے جوکہاکہ میں نے تجھے آزادی دی اس کی وضاحت مقصود ہے۔

﴿جواب﴾ شوہرکے یہ بولنے سے کہ تم میری طرف سے آزادہومیں نے تجھے آزادی دی

سے دو رجعی طلاقیں واقع ہوگئی ہیں جن کا حکم یہ ہے کہ شوہر کیلئے رجوع کا حق باقی ہے وہ چاہے تو عدت کے اندر رجوع کرسکتا ہے عدت گذرنے کے بعد رجوع نہیں ہوسکتا، البتہ باہمی رضامندی سے نئے حق مہر کے ساتھ دوبارہ نکاح ہوسکے گا۔

واضح رہے کہ رجوع کی صورت میں شوہر کے پاس صرف ایک طلاق کا اختیار رہے گا، زندگی میں کسی بھی وقت ایک طلاق مزید دیدی تو پھر حلالہ شرعیہ کے بغیر نکاح نہ ہوسکے گا۔

لمافی البحر الرائق:(۲/۳۰۱،طبع سعید)

ومشائخ خوارزم من المتقدمین ومن المتأخرین کانوا یفتون بان لفظ التسریح بمنزلة الصریح یقع به طلاق رجعی کذافی المجتبی(۲/۱۸۹ طبع رشیدیه)

ولمافی البزازیة علی هامش الهندیة:(۱/۱۸۹ طبع رشیدیه کوئٹه)

قوله سرحتک وهو بهایله کردم لانه صار صریحا علی ماصرح به نجم الزاهدی الخوارزمی فی شرح القدوری.

ولمافی الشامی:(۲/۲۹۹طبع سعید)

فاذاقال لها رها کردم ای سرحتک یقع به الرجعی مع ان اصله کنایة وماذاك الالانه غلب فی عرف الناس استعماله فی الطلاق وقد مران الصریح مایستعمل الافی الطلاق من ای لغة کانت.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: بلال احمد غفرہ الاحد

۲۱محرم الحرام ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر:۶۳۶

«"تجھے آزاد کرتا ہوں، تجھے طلاق دی" دو طلاق رجعی ہیں»

«سوال» کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی سے کہا "میں تجھے ازاد کرتا ہوں، میں نے تجھے طلاق دی" اور کہتا ہے کہ میری طلاق کی نیت نہیں تھی بلکہ ڈرانا مقصود تھا، اس صورت میں کتنی طلاقیں واقع ہوں گی؟

«جواب» لفظ "طلاق" تو اصالۃً صریح طلاق ہے بغیر نیت کے بھی اس سے طلاق واقع ہوجاتی ہے، اور اردو زبان میں بیوی سے یہ کہنا کہ "تجھے ازاد کرتا ہوں" بھی عرفاً صریح طلاق ہے اسلئے کہ اسطرح کہنے سے طلاق دینا ہی مراد ہوتا ہے، لہذا مذکورہ صورت میں دو طلاق رجعی واقع ہوگئی ہیں، اس سے پہلے شوہر نے اگر کوئی طلاق نہیں دی ہے تو دوران عدت شوہر اگر چاہے

تو رجوع کرسکتا ہے پھر آئندہ کیلئے شوہر کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا، زندگی میں کسی بھی وقت ایک طلاق مزید اگر دی تو طلاق مغلظہ واقع ہوگی اور پھر بغیر حلالہ شرعیہ کے دوبارہ نکاح سے بھی عورت حلال نہ ہوگی، لہذا احتیاط رہے۔

لمافی التنویر ج ۳ /۲۴۷ تا ۲۵۰ طبع سعید کراچی

صریحہ مالم یستعمل الا فیہ کطلقتک وانت طالق ومطلقۃ ویقع بھا واحدۃ رجعیۃ وان نوی خلافھا اولم ینو شیئا

ولمافی البدائع :ج ۳/ ۲۲۰، ۲۲۱ طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت

اما الصریح فھو اللفظ الذی لا یستعمل الا فی حل قید النکاح وھو لفظ الطلاق او التطلیق مثل قولہ :انت طالق او انت الطلاق او طلقتک ۔ وھذہ الالفاظ ظاھرۃ المراد لانھا لاتستعمل الا فی الطلاق عن قید النکاح فلایحتاج الی النیۃ لوقوع الطلاق.

ولمافی الشامی :ج ۳/ ۲۹۹ (طبع سعید)

فان سرحتک کنایۃ لکنہ فی عرف الفرس غلب استعمالہ فی الصریح فاذاقال: "رھا کردم" ای سرحتک یقع بہ الرجعی مع ان اصلہ کنایۃ ایضا وماذاك الا لانہ غلب فی عرف الفرس استعمالہ فی الطلاق وقدمران الصریح مالم یستعمل الا فی الطلاق من ای لغۃ کان.

ولمافی التنویر مع الدر :ج ۳/ ۴۰۹، ۴۱۰ (طبع سعید)

(لا) ینکح (مطلقۃ) من نکاح صحیح نافذ کما سنحققہ (بھا) ای بالثلاث (لوحرۃ اوثنتین ولو) قبل الدخول حتی لا یطئھا غیرہ ... بنکاح

ولمافی البخاری :ج ۲/ ۳۱۱ طبع رحمانیۃ

عن عائشۃؓ ان رفاعۃ القرظی تزوج امرئۃ ثم طلقھا فتزوجت آخر فاتت النبی ﷺ فذکرت انہ لا یأتیھا وانہ لیس معہ الامثل ھدبۃ :فقال لا حتی تذوقی عسیلتہ ویذوق عسیلتک.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: عاقل شاہ

۷ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ　　فتویٰ نمبر: ۳۰۲۹

﴿تیرا میرا رشتہ نہیں، تو مجھ سے آزاد ہے، سے کونسی طلاق واقع ہوگی؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی آدمی نے غصے کے دوران لڑائی جھگڑے کی حالت میں اپنی بیوی سے یہ کہدیا۔ ''تیرا میرا رشتہ نہیں، تو مجھ سے آزاد ہے'' تو اس صورت میں کتنی طلاق واقع ہونگی؟　　مستفتی: ایک سائل

﴿جواب﴾ تیرا میرا رشتہ نہیں' طلاق دینے کی غرض سے شوہر بول دے تو ایک طلاق بائن

واقع ہو جاتی ہے' اسی طرح "تو مجھ سے آزاد ہے" بھی اصالۃً طلاق کنائی کے الفاظ ہیں. البتہ جہاں یہ الفاظ طلاق دینے کی غرض سے عام بولے جاتے ہوں اور عرف میں طلاق ہی کیلئے استعمال ہوتے ہوں تو وہاں ان سے ایک طلاق صریح واقع ہوتی ہے، شوہر کا تعلق ایسے علاقہ سے اگر ہے تو اس سے بلانیت بھی ایک طلاق واقع ہوگئی ہے. اور شوہر کے علاقہ میں یہ الفاظ طلاق کیلئے اگر عام نہیں بولے جاتے تو بغیر نیت کے اس سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔ طلاق کے ارادہ سے بول دیئے ہوں تو طلاق بائن واقع ہوئی ہے، لیکن طلاق بائن کنائی کے الفاظ متعدد ہوں اور ہر ایک سے مستقل طلاق دینے کا ارادہ ہو تب بھی ایک طلاق واقع ہوتی ہے، لہذا اس علاقہ میں آزاد لفظ کا استعمال طلاق کیلئے اگر عام رائج نہیں ہے اور دونوں جملے بولتے وقت طلاق کا ارادہ تھا تو ایک ہی طلاق بائن واقع ہوگئی ہے رجوع نہیں ہوسکتا. البتہ باہمی رضامندی سے نئے حق مہر کیساتھ دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے تجدید نکاح کی صورت میں آئندہ کیلئے صرف دو طلاقیں باقی ہونگی۔

اور یہ لفظ آپ کے عرف میں اگر طلاق ہی کیلئے استعمال ہوتا ہے اور پہلا جملہ طلاق کے ارادہ سے بول دیا ہے تو ایک طلاق بائن اور ایک رجعی واقع ہوگئی ہے تجدید نکاح کی صورت میں صرف ایک طلاق کا حق باقی رہیگا۔ اور دونوں جملے طلاق دینے کی غرض سے نہ بولے ہوں اور آزاد لفظ عرف میں بھی طلاق نہ ہو تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی لہذا اس تفصیل کی روشنی میں شوہر خود ہی یا علاقہ کے علماء کرام سے رہنمائی حاصل کرکے اپنے ان الفاظ کا حکم معلوم کرے.

لما فی الشامی:(۲۹۹/۳ ،طبع سعید)

بخلاف فارسية قوله سرحتك وهو رهاكردم "لأنه صار صريحا في العرف على ما صرح به نجم الزاهدي الخوارزمي في شرح القدوري اھ.

ولما في الشامي:(۲۲۸/۳ طبع سعيد)

قال في الشرنبلالية وقع السؤال عن التطليق بلغة الترك هل هو رجعي باعتبار القصد او بائن باعتبار مدلول "سن بوش" أو "بوش اول" لأن معناه خالية فلينظر اھ. قلت: وأفتى الرحيمي تلميذ الخير الرملي بانه رجعي وقال كما أفتى به شيخ الاسلام أبوسعود ونقل مثله شيخ مشائخنا التركماني عن فتاوى علي أفندي مفتي دار السلطنة وعن الحامدية.

ولما في التنوير :(۳۰۶/۳ ،۳۰۷، ۳۰۸ طبع سعيد)

(الصريح يلحق الصريح والبائن' والبائن يلحق الصريح لا البائن)

ولما فی الھندیۃ:(۳۷۶/۱ طبع رشیدیہ)

ولو قال لم یبق بینی وبینک شئی ونوی بہ الطلاق لا یقع وفی الفتاوی لم یبق بینی وبینک عمل ونوی یقع کذا فی العتابیۃ'

أیضا فی الھندیۃ:(۳۷۵/۱ طبع رشیدیہ)

ولو قال لھا لانکاح بینی وبینک أو قال لم یبق بینی وبینک نکاح یقع الطلاق اذا نوی

ولما فی فتاوی قاضی خان:(۲۱۲/۱ طبع قدیمی)

ولو قال لھا لا نکاح بینی وبینک أو قال لم یبق بینی وبینک أو قال فسخت نکاحک یقع الطلاق اذا نوی

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عمران الحق سواتی

۱۲ صفر الخیر ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر: ۳۹۱۰

﴿ایک طلاق میں تین کی نیت کا اعتبار کب ہے؟﴾

﴿سوال﴾ (۱) اگر کوئی اپنی بیوی کو صریح طلاق دے ان الفاظ کیساتھ "انت طالق" کہ تجھے طلاق ہے اور تین طلاق کی نیت کرے تو کیا تین طلاقیں واقع ہونگی یا ایک طلاق واقع ہوگی؟

(۲) اسی طرح اگر کوئی مرد اپنی بیوی کو طلاق بائن دے ان الفاظ کیساتھ "انت بائن" کہ تو مجھ سے جدا ہے اور تین طلاق کی نیت کرے تو اس صورت میں کتنی طلاقیں واقع ہونگی؟

﴿جواب﴾ طلاق صریح الفاظ کیساتھ کسی طرح قید یا صفت کے بغیر اگر دیدے تو اسکا حکم الفاظ پر منحصر ہے، لفظ ایک بولا ہے تو ایک طلاق ہوگی، زیادہ بولے ہیں تو زیادہ واقع ہونگی، ایک طلاق بول کر تین مراد لینے سے بھی صرف ایک ہی رجعی واقع ہوگی۔

لما فی الھدایۃ:(۳۸۷/۲ طبع رحمانیہ)

فالصریح قولہ انت طالق ومطلقۃ وطلقتک فھذا یقع بہ الطلاق الرجعی ولا یفتقر الی النیۃ ولا یقع بہ الا واحدۃ وان نوی أکثر من ذلک.

ولما فی التنویر مع الدر:(۲۴۷/۳ تا ۲۵۰ طبع سعید)

(صریحہ مالم یستعمل الا فیہ کطلقتک وأنت طالق ومطلقۃ ویقع بھا واحدۃ رجعیۃ وان نوی خلافھا) من البائن أو أکثر.

(۲) البتہ طلاق کنائی میں نیت کا اعتبار کیا جاتا ہے، چنانچہ اگر مرد یہ الفاظ "انت بائن" "تو مجھ سے جدا ہے" کہے اور تین طلاق کی نیت ہو تو تین طلاق واقع ہوں گی۔

لما فی الهدایة:(۲/۳۲۶-۳۲۷،طبع رحمانیه)

قال وبقية الكنايات اذانوى بها الطلاق كانت واحدة بائنة وان نوى ثلاثا كانت ثلاثا وان نوى ثنتين كانت واحدة بائنة — ولاتصح نية الثنتين عند ناخلافالزفر لانه عدد.

ولما فی الدر المختار:(۳/۲۷۶-۲۷۷،طبع)

(و) يقع (ب) قوله (أنت طالق بائن أو البتة).... (أو أفحش الطلاق — واحدة بائنة) في الكل (إن لم ينو ثلاثا) في الحرة وثنتين في الأمة فيصح لما مر.

ولما فی الشامی:(۳/۲۷۷-۲۷۸،طبع سعید)

(قوله فيصح لما مر) أي في أول هذا الباب من أنه مصدر يحتمل الفرد الاعتباري، وهو الثلاثة في الحرة والثنتان في الأمة فتصح نيته--أي فإن نوى ماذكر صح أفاده.....ونظيره قولهم لو نوى الثلاث بأنت بائن أوحرام فهي ثلاث.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:عبداللہ عفا اللہ عنہ

۲۳ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر:۱۰۲۵

﴿طلاق صریح کے بعد طلاق بائن کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ زوجین کے درمیان ناچاقی کی وجہ سے زوج نے اپنی زوجہ کو ایک طلاق صریح دیدی، اس کے بعد اپنی زوجہ سے کہا کہ اگر تو میری بچی اپنی بہن کے پاس لے گئی تو تیرے ساتھ میرا نکاح ختم ہوجائے گا، چنانچہ اسکے بعد زوجہ بچی کو اپنی بہن کے پاس لیکر بھی گئی اور اس کے بعد کئی مرتبہ وہ اپنی زوجہ سے کہہ چکا ہے کہ تیرے ساتھ میرا نکاح ختم ہوگیا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ مذکورہ صورت میں یہ عورت اسکی بیوی رہتی ہے یا نہیں؟ اور کتنی طلاقیں واقع ہوئی ہیں؟ تفصیل سے وضاحت فرمائیں۔ مستفتی:عالم زیب کراسنگ

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں ایک طلاق صریح دینے کے بعد شوہر کو رجوع کرنے کا حق حاصل تھا، ہوسکتا ہے رجوع کیا ہوگا لیکن اس کے بعد شوہر کا یہ جملہ "اگر تو میری بچی کو اپنی بہن کے پاس لے گئی تو تیرے ساتھ میرا نکاح ختم ہوجائے گا" یہ طلاق بائن معلق ہے، اس کے بعد وہ خاتون اگر بچی کو واقعی بہن کے پاس لے گئی ہے تو اس سے ایک طلاق بائن واقع ہوگئی ہے، اس کے بعد شوہر کے اس جملہ سے " تیرے ساتھ میرا نکاح ختم ہوگیا ہے" مزید کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، لہٰذا کل دو طلاقیں واقع ہوگئی ہیں اور نکاح ختم ہوگیا ہے، دونوں کے لئے آپس میں میاں بیوی والا تعلق قائم رکھنا حرام ہوگیا ہے، مطلقہ چاہے تو عدت گزارنے کے بعد دوسری جگہ

نکاح کر سکتی ہے شوہر اب رجوع نہیں کر سکتا، البتہ نئے حق مہر کے ساتھ باہمی رضامندی سے نیا نکاح ہو سکتا ہے جس کے بعد شوہر کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا۔

لما فی التنویر مع الدر:(۳۰۶/۲ تا ۳۰۸، طبع سعید)

والبائن يلحق الصريح لا يلحق البائن البائن.

وفی الشامية:وان كان الطلاق رجعيا يلحقها الكنايات، لان ملك النكاح باق، فتقييده بالرجعى دليل على أن الصريح البائن لا يلحقه الكنايات

ولما فی الهداية:(۴۰۵/۲، باب الرجعة، طبع رحمانيه)

واذا طلق الرجل امرأته تطليقة رجعية أو تطليقتين فله أن يراجعها فی عدتها رضيت بذلك أو لم ترض لقوله تعالى فامسكوهن بمعروف من غير فصل.

ولما فی الهندية:(۴۷۲/۱، طبع رشيديه كوئٹه)

اذا كان الطلاق بائنا دون الثلاث فله ان يتزوجها فی العدة وبعد انقضائها.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد اسلم چترالی غفرلہ

یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۳۶۹

﴿ "تجھے بالکل طلاق ہے تو مجھ پر میری بہن کی طرح ہے" الفاظ کا حکم ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو غصہ کی حالت میں کہا "تجھے بالکل طلاق ہے تو مجھ پر میری بہن کی طرح ہے" ان الفاظ کے ساتھ کتنی طلاقیں واقع ہوئی ہیں اور کونسی اور انکا حکم کیا ہے؟ مستفتی: بتوسط قاری محمد دین

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں شوہر نے اپنی بیوی کو مذاکرۂ طلاق اور غصہ کی حالت میں جن الفاظ کے ساتھ طلاق دی ہے، اس سے عورت کو ایک طلاقِ بائنہ واقع ہوئی ہے جسکا حکم یہ ہے کہ شوہر اور بیوی اپنی باہمی رضامندی سے نئے حق مہر کیساتھ اور گواہان کی موجودگی میں دوبارہ نکاح کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، لہٰذا اس نکاح کے بعد یہ عورت اپنے شوہر کیلئے حلال ہوگی اور نکاح چاہے عدت میں ہو یا عدت کے گزرنے کے بعد۔

(نوٹ) یہاں پہلا جملہ "تجھے بالکل طلاق ہے" طلاقِ صریح بائن ہے اور دوسرا جملہ "تو مجھ پر میری بہن کی طرح ہے" طلاقِ بائن کنایہ ہے، یہ بظاہر اگرچہ دو طلاقیں ہیں لیکن حسب ضابطہ دوسری طلاق اگر بائن کنائی ہو تو پہلی طلاق صریح بائن کیساتھ اس کا الحاق نہ ہوگا یعنی مستقل

طلاق شمار نہ ہوگی، اسی طرح کا مسئلہ فتاوی عثمانی ۲/۳۷۸ میں بھی ہے۔

لما في الهداية:(۲/۳۸٦،طبع رحمانيه)

واذا وصف الطلاق بضرب من الزيادة أو الشدة كان بائنا مثل أن يقول أنت طالق بائن أو البتة.

ولما في التنوير مع الدر:(۳/۴۷۰،طبع سعيد)

(وان نوى بأنت على مثل أمي) أو كأمي وكذا لو حذف "على" خانية (برًّا أو ظهارا أو طلاقا صحت نيته) ووقع مانواه لأنه كناية.

وفي الشامية:(قوله لأنه كناية) أي من كنايات الظهار والطلاق، قال في البحر: واذا نوى به الطلاق كان بائنا.

ولما فيه ايضا:(۳/۳۰۸-۳۱۰،طبع سعيد)

(لا) يلحق البائن(البائن)اذا أمكن جعله اخبارا عن الأول كأنت بائن بائن أو أبنتك بتطليقة فلا يقع لأنه اخبار فلا ضرورة في جعله انشاء، بخلاف أبنتك بأخرى أو أنت طالق بائن ـــ لتعذر حمله عن الاخبار فيجعله انشاء.

وفي الشامية:(قوله لا يلحق البائن البائن)المراد بالبائن الذى لا يلحق هو ما كان بلفظ الكناية لأنه هو الذى ليس ظاهرا في انشاء الطلاق كذا في الفتح، وقيد بقوله الذى لا يلحق اشارة الى أن البائن الموقع أولا أعم من كونه بلفظ الكناية أو بلفظ الصريح المفيد للبينونة ــ منها ما أطبقوا عليه من تعليلهم عدم لحوق البائن البائن بامكان جعل الثاني خبرا عن الأول ولا يخفى أن ذلك شامل لما اذا كان البائن الأول بلفظ الكناية أو بلفظ الصريح ـــ (أو أبنتك بتطليقة) عطف على بائن الثانية أي أنت بائن أبنتك بتطليقة اه وأشار الي أنه لا يشترط اتحاد اللفظين فشمل ما اذا كان الأول بلفظ الكناية البائنة أو الطلاق الصريح اذا كان على مال أو موصوفا بما ينبئ عن البينونة كما علم مما قدمناه بعد كون الثاني بلفظ الكناية البائنة كالخلع.... (قوله فلا يقع) أي وان نوى لما في البحر عن الحاوى.

الجواب صحیح: عبد الرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: علی خان

۳ رجب المرجب ۱۴۳۶ھ — فتوی نمبر: ۲٦۹۸

﴿بیوی سے کہا"میں نے تجھے طلاق دی اور میں نے تجھے چھوڑ دیا" کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دیتے وقت یہ الفاظ کہے"میں نے تجھے طلاق دی اور میں نے تجھے چھوڑ دیا" ان الفاظ سے کتنی طلاقیں واقع ہوئی ہیں اور کونسی اور انکا کیا حکم ہے؟ مستفتی: بتوسط امام صاحب نبوی مسجد

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں اس شخص نے جن الفاظ کیساتھ طلاق دی ہے ان سے دو

طلاقیں رجعی واقع ہوئی ہیں جنکا حکم یہ ہے کہ شوہر چاہے تو عدت کے دوران یعنی تین ماہواری گزرنے سے پہلے اگر رجوع کرلے تو نکاح بدستور قائم رہے گا، بہتر یہ ہے کہ گواہوں کے سامنے رجوع کا اقرار کریں تا کہ ضرورت پیش آنے کی صورت میں گواہوں کی مدد سے رجوع ثابت کرسکیں اور اگر عدت گزر چکی ہو تو رجوع نہیں ہوسکتا لیکن باہمی رضامندی سے نئے حق مہر کیساتھ بغیر حلالہ کے دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے۔

لما فی الھندیۃ:(۳۵۴/۱ طبع رشیدیہ)

(الفصل الأول فی الطلاق الصریح)وھو کأنت طالق ومطلقۃ وطلقتک وتقع واحدۃ رجعیۃ وان نوی الأکثر أو الابانۃ أولم ینو شیئا کذا فی الکنز.

ولما فی الشامی:(۲۹۹/۳ طبع سعید)

بخلاف فارسیۃ قولہ سرحتک وھو"رھا کردم"لأنہ صار صریحا فی العرف علی ما صرّح بہ نجم الزاھدی الخوارزمی فی شرح القدوری.وقد صرح البزازی ــــ فان سرحتک کنایۃ فی عرف الفرس غلب استعمالہ فی الصریح فاذا قال:"رھا کردم"أی سرحتک یقع بہ الرجعی مع أن اصلہ کنایۃ أیضا وماذاک الا لأنہ غلب لکنہ فی عرف الفرس استعمالہ فی الطلاق وقدمر أن الصریح مالم یستعمل الا فی الطلاق من أیّ لغۃ کانت..... وأما اذا تعورف استعمالہ فی مجرد الطلاق لا بقید کونہ بائنا یتعین وقوع الرجعی بہ کما فی فارسیۃ سرحتک.

ولما فی التنویر مع الدر:(۴۰۱/۳ طبع سعید)

(وندب اعلامھا بھا)لئلا تنکح غیرہ بعد العدۃ فان نکحت فرق بینھما وان دخل شمنی(وندب الأشھاد)بعدلین ولو بعد الرجعۃ بالفعل.

ولما فی التنویر مع الدر:(۳۰۶/۳ طبع سعید)

(الصریح یلحق الصریح و)یلحق(البائن)بشرط العدۃ(والبائن یلحق الصریح) الصریح مالا یحتاج الی نیۃ بائنا کان الواقع بہ أو رجعیا فتح.

ولما فی ردالمحتار:(۳۹۸/۳ طبع سعید)

(قولہ مع الکراھۃ)..... ویؤیدہ أیضا قولہ فی الفتح:والمستحب أن یراجعھا بالقول فافھم.

ولما فی الھدایۃ:(۴۰۱/۲ طبع رحمانیہ)

وان کان الطلاق بائنا دون الثلث فلہ أن یتزوجھا فی العدۃ وبعد انقضائھا لأن حل المحلیۃ باق لأن زوالہ معلق بالطلقۃ الثالثۃ.

واللہ اعلم بالصواب: علی خان　　　　الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۲۷۱۷　　　　۱۰ جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ

﴿خلوت صحیحہ سے پہلے تین طلاقوں کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان عظام درج ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ جو آدمی اپنی منکوحہ کو خلوت صحیحہ سے پہلے پہلے تین طلاقیں دیدے تو عدت گذرنے کے بعد بغیر حلالہ شرعیہ کے دوبارہ اس سے نکاح کرسکتا ہے یا نہیں؟ دلائل شرعیہ سے وضاحت مطلوب ہے۔

﴿جواب﴾ اپنی منکوحہ سے شوہر نے اگر صحبت نہیں کی ہے اور خلوت صحیحہ کی بھی نوبت نہیں آئی تو طلاق ہونے کی صورت میں اس پر کوئی عدت نہیں ہے عدت کے بغیر وہ دوسری جگہ شادی کرسکتی ہے اور طلاق اگر ایک واقع ہوگئی ہے تو اپنے اسی شوہر کے ساتھ بھی دوبارہ نیا حق مہر مقرر کرکے نکاح ہوسکتا ہے اور ایسی عورت چونکہ ایک ہی طلاق سے بائن ہوجاتی ہے نکاح ختم ہو جاتا ہے اس لئے دوسری، تیسری طلاق واقع نہیں ہوتی اس لئے کوئی الگ الگ الفاظ بول کر اگر طلاق دیدے مثلاً طلاق، طلاق، طلاق تو ایسی صورت میں صرف ایک ہی طلاق ہوجاتی ہے باقی لغو اور بے کار ہیں البتہ ایک ہی جملہ کے ذریعہ تینوں طلاق ایک ساتھ کوئی دیدے مثلاً یوں کہے کہ تجھے تین طلاق تو ایسی صورت میں تینوں طلاق واقع ہوجاتی ہیں عدت اس صورت میں بھی نہیں ہوتی لیکن اسی شوہر سے بغیر حلالہ شرعیہ کے دوبارہ نکاح نہیں ہوسکتا۔

(لما فی تنویر: ۲/۲۸۴-۲۸۶ طبع ایچ ایم سعید)

قال لزوجته غیر المدخول بها انت طالق ثلثا قبل الدخول بها وقعن وان فرق بانت بالاولی ولم تقع الثانیة والثالثة وکذا انت طالق ثلثا متفرقات فواحدة

(ولما فی الهدایة: ۲/۴۰۹ طبع رحمانیة)

وان کان الطلاق بائنا دون الثلث فله ان یتزوجها فی العدة وبعد انقضائها لان حل المحلیة باق لان زواله معلق بالطلقة الثالثة فینعدم قبله ومنع الغیر فی العدة لاشتباه النسب ولا اشتباه فی اطلاقه وان کان الطلاق فی الحرة ثلاثا او ثنتین فی الامة لم تحل له حتی تنکح زوجا غیره نکاحا صحیحا ویدخل بها ثم یطلقها او یموت عنها والاصل فیه قوله تعالی "فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجا غیره".

(ولما فی الهدایة: ۲/۳۸۸ طبع رحمانیة)

واذا طلق الرجل امرأته ثلاثا قبل الدخول بها وقعن علیها لان الواقع مصدر محذوف لان معناه طلاقا ثلاثا علی ما بینا. فلم یکن قوله انت طالق ایقاعا علی حدة فیقعن جملة. فان فرق الطلاق بانت ولم تقع الثانیة والثالثة وذلک مثل ان یقول انت طالق، طالق، طالق. لان کل واحد ایقاع علی حدة اذلم یذکر فی آخر کلامه ما یغیر صدره

حتی یتوقف علیه فتقع الاولی فی الحال لانصادفها الثانیة وهی مبانة

ولما فی فتح القدیر : ۳/۳۱ طبع رشیدیة

واذا طلق الرجل امرأته قبل الدخول بها وقعن علیها لان الواقع مصدر محذوف لان معناه طلاقا ثلاثا علی ما بیناه فلم یکن قوله انت طالق ایقاعا علی حدة فیقعن جملة فان فرق الطلاق بانت بالاولی ولم تقع الثانیة والثالثة وذلک مثل ان یقول انت طالق ، طالق ، طالق لان کل واحدة ایقاع علی حدة اذلم یذکر فی آخر کلامه مایغیر صدره حتی یتوقف علیه فتقع الاولی فی الحال فتصادفها الثانیة وهی مبانة .

(ولما فی فتح القدیر : ۳/۱۵۷ طبع رشیدیة)

واذا کان الطلاق بائنا دون الثلاث فله ان یتزوجها فی العدة وبعدانقضائها لان حل المحلیة باق لان زواله معلق بالطلقة الثالثة فینعدم قبله .ومنع الغیر فی العدة لاشتباه النسب ولااشتباه فی اطلاقه وان کان الطلاق ثلثا فی الحرة او ثنتین فی الامة لم تحل له حتی تنکح زوجا غیره نکاحا صحیحا ویدخل بها ثم یطلقها اویموت عنها

(ولما فی فتح القدیر :۳/۲۶۱ طبع رشیدیه)

لکنه اعتبر فیه الاطلاق المجازی ،اعنی اطلاق العدة علی نفس المدة ثم لایخفی ان سبب العدة ماخوذ منه تاکده بالدخول او مایقوم مقامه کما ذکرنا وانما ترکه المصنف لتیسر ان الطلاق قبل الدخول لاتجب فیه العدة قال الله تعالی (اذانکحتم المؤمنات ثم طلقتموهن من قبل ان تمسوهن فمالکم علیهن من عدة تعتدونها)

(ولما فی البحر الرائق:۳/۲۹۱.۲۹۲طبع ایچ ایم سعید)

قوله طلق غیر المدخول بها ثلثا وقعن سواء قال اوقعت علیک ثلث تطلیقات او انت طالق ثلثا ولا خلاف فی الاول کما فی فتح القدیر وفی الثانی خلاف قیل یقع واحدة والجمهور علی خلافه وقد صرح به محمد بن الحسن وقال بلغنا ذلک عن رسول الله صلی الله علیه وسلم وعن علی وابن مسعود وابن عباس رضی الله عنهم قوله وان فرق بانت بواحدة ای وان فرق الطلاق بغیر حرف العطف ویمکن جمعه بعبارة واحدة فانها تبین بالاولی لاالی عدة فلایقع مابعده اذ لیس فی آخر کلامه ما یغیر اوله لیتوقف علیه نحو انت طالق،طالق،طالق او انت طالق انت طالق انت طالق

(ولما فی البحر الرائق:۳/۵۶ طبع ایچ .ایم .سعید)

قوله وینکح مبانته فی العدة وبعدها ای المبانة بما دون الثلث لان المحلیة باقیة لان زوالها معلق بالطلقة الثالثة فینعدم قبله ومنع الغیر لاشتباه النسب ولااشتباه فی الاطلاق له لقوله لاالمبانة بالثلث لو حرة وبالثنتین لو امة حتی یطأها غیره ولو مراهقا بنکاح صحیح وتمضی عدته لایملک یمین ای لاینکح مبانته بالبینونة الغلیظة اطلقه فشمل ما اذاکان قبل الدخول او بعده کما صرح به فی الاصل

(ولما فی البحر الرائق: ۱۲۸/۴ طبع ایچ ایم سعید)

واما سبب وجوبها فلكل نوع منها سبب فعدة الاقراء لوجوبها اسباب منها الفرقة فی النكاح الصحيح سواء كانت بطلاق او بغير طلاق بعد وطء او خلوة

(ولما فی المحيط البرهانی: ۶۰۱/۴ مطبع ادارة القرآن المجلس العلمی)

اذا قال لها قبل الدخول بها انت طالق ثلثا يقع الثلث وكذلك اذا قال لها انت طالق ثنتين يقع ثنتان والوجه فی ذلك ان فی هذه الصورة اول الكلام يتوقف علی الآخر لان فی آخر كلامه مايغير حكم اوله لان قوله :انت طالق لايحتمل العدد عندنا وبهذا لايصح نية العدد فيه واذا توقف اول الكلام علی آخره كان الوقوع عند آخره فيصادفها آخر الكلام وهی منكوحة بخلاف ما اذا كرر لفظ الطلاق بحرف العطف او بغير حرف العطف فقال لها انت طالق وطالق اوقال فطالق اوقال ثم طالق اوقال انت طالق طالق حيث يقع واحدة لان هناك ليس فی آخر كلامه مايغير حكم اوله فلم يتوقف اوله علی آخره فطلقت باول الكلام وبانت لا الی عدة فيصادفها الكلام الثانی وهی مبانة فلغی

(ولما فی القرآن المجيد پاره ۲۲، سورة الاحزاب: ۴۹)

يايها الذين امنوا اذا نكحتم المومنات ثم طلقتموهن من قبل ان تمسوهن فما لكم عليهن من عدة تعتدونها فمتعوهن وسرحوهن سراحا جميلا.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد سلمان غفرلہ ولوالدیہ

۲۸ صفر الخیر ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر: ۳۸۹۸

﴿رخصتی سے پہلے طلاق صریح دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری منگنی ہوئی ہے اور منگنی میں باقاعدہ ایجاب وقبول کے ساتھ نکاح ہوا تھا لیکن ابھی تک رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ تو میرے نکاح سے آزاد ہے تو کیا ان الفاظ سے طلاق واقع ہوتی ہے یا نہیں؟ اگر ہوتی ہے تو کونسی طلاق واقع ہوتی ہے؟ اور دوبارہ نکاح کرنے کی کیا صورت ہوگی؟

﴿جواب﴾ ان الفاظ سے ''کہ تو میرے نکاح سے آزاد ہے'' ویسے تو طلاق رجعی واقع ہوتی ہے لیکن مذکورہ صورت میں چونکہ رخصتی سے پہلے یہ الفاظ بولے ہیں، اس لئے ان الفاظ سے ایک طلاق بائن واقع ہوگئی ہے اور نکاح ختم ہوگیا ہے، البتہ باہمی رضامندی سے نئے حق مہر کیساتھ دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے۔

(یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ یہ حکم تب ہے کہ شوہر اور بیوی کے درمیان خلوت صحیحہ نہ ہوئی ہو

ورنہ طلاق رجعی ہے) اور یہ بھی یاد رہے کہ نئے نکاح کی صورت میں شوہر کے پاس صرف دو طلاقوں کا حق باقی رہے گا یعنی زندگی میں کسی بھی وقت اگر مزید دو طلاق دے گا تو طلاق مغلظہ واقع ہوگی اور پھر حلالہ شرعیہ کے بغیر نکاح بھی نہیں ہو سکے گا۔

لمافی ردالمحتار:(۲/۲۹۹،طبع سعید)

وأما اذا تعورف استعماله فی مجرد الطلاق لا بقید کونه بائنا یتعین وقوع الرجعی به کما فی فارسیة سرحتک.

ولمافی فتح القدیر:(۴/۴۹،طبع رشیدیه)

فصل فی الطلاق قبل الدخول ..... فان فرق الطلاق بانت بالاولی.

ولمافی التنویر مع الدر:(۳/۲۸۲،طبع سعید)

(قال لزوجته غیر المدخول بها أنت طالق)......(وان فرق)......(بانت بالأولی) لاالی عدة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عبداللہ عفا اللہ عنہ

۱۸ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ فتویٰ نمبر: ۱۰۲۲

﴿الفاظ کنایہ سے طلاق کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے بیوی کو کہا کہ تو میری منکوحہ نہیں، کیا ایسی صورت میں زید کی بیوی پر طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ مستفتی: محمد اکرم

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اگر زید نے یہ الفاظ طلاق کی نیت سے کہے ہوں تو ایک طلاق رجعی واقع ہو جائے گی ورنہ نہیں۔

لمافی الدرالمختار:(۳/۵۰۷،طبع امدادیه)

لست لک بزوج أو لست لی بامرأة أو قالت له لست لی بزوج فقال صدقت طلاق ان نواه خلافا لهما.

وفی الشامیة: قوله:(طلاق ان نواه) لان الجملة تصلح لانشاء الطلاق کما تصلح لانکاره فیتعین الاول بالنیة، وقید بالنیة لانه لا یقع بدونها اتفاقا لکونه من الکنایات، وأشار الی انه لا یقوم مقامها دلالة الحال، لأن ذلک فیما یصلح جوابا فقط وهو ألفاظ لیس هذا منها، وأشار بقوله طلاق الی ان الواقع بهذه الکنایة رجعی، کذافی البحر من باب الکنایات.

ولمافی الهندیة:(۱/۳۷۵،طبع رشیدیه)

ولو قال لامرأته لست لی بامرأة أو قال لها ما أنا بزوجک أو سئل فقیل له هل لک امرأة فقال لا فان قال أردت به الکذب یصدق فی الرضا والغضب جمیعا ولا یقع الطلاق وان

قال نویت الطلاق یقع الطلاق فی قول أبی حنیفة رحمه الله تعالیٰ.

ولمافی الهندیة:(۲۱۱/۱،طبع رشیدیه)

ولـو قال ماأنت لی بامرأة اولست لک بزوج ونوی الطلاق یقع عندابی حنیفة رحمه الله تعالی وعندهما لایقع ولوقال لها:لانکاح بینی وبینک أوقال لم یبق بینی وبینک نکاح یقع الطلاق اذانوی ولوقالت المرأة لزوجهالست لی بزوج فقال الزوج صدقت ونوی به الطلاق یقع فی قول أبی حنیفة رحمه الله تعالی کذافی فتاوی قاضیخان ومثله فی البحرالرائق:(۲۰۵/۳،طبع سعید)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم:صلاح الدین ڈیروی

۱۴جمادی الاولی ۱۴۲۷ھ　　　　فتوی نمبر:۳۰۹

﴿اپنی بیوی سے کہے چادراوڑھ لواور چلی جاؤ﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماءکرام اس مسئلہ کے بارے میں کوئی آدمی اپنی بیوی سے کہے کہ چادراوڑھواوراپنے والدین کے گھر چلی جاو،تمہارے پیچھے کاغذات پہنچ جائیں گے توکیا اس صورت میں طلاق واقع ہوگی یانہیں؟اگرطلاق واقع ہوئی ہوتوکون سی طلاق ہوئی؟

﴿جواب﴾ شوہر نے مذکورہ جوالفاظ استعمال کیے ہیں یہ کنایہ کے الفاظ ہیں اورکنایہ الفاظ میں طلاق کی نیت کااعتبارہوتاہے،اس لئے اگریہ الفاظ استعمال کرتے وقت شوہرکی نیت طلاق کی تھی توایک طلاق بائن واقع ہوگئی ہے،دوبارہ رجوع کے لئے نئے مہرکے ساتھ تجدیدنکاح ضروری ہوگااوراگرطلاق کی نیت نہیں تھی توطلاق واقع نہیں ہوئی۔

لمافی قاضیخان:(۲۱۱/۱،طبع قدیمی)

وعن ابی یوسف رحمه الله فی الاملاء،انه الحق بهذه الخمسة،اربعة اخری لاملک لی علیک لاسبیل لی علیک خلیت سبیلک،الحقی باهلک لوقال فی حال مذاکرة الطلاق اوفی الغضب وقال لم انوبه الطلاق یصدق قضاء فی قول ابی حنیفة رحمه الله تعالی وقال ابویوسف :لایصدق..... استتری قومی اخرجی اذهبی انتقلی......لا یقع الطلاق الابالنیة واذاقال لم انوالطلاق مصدقا.

ولمافی الهندیة:(۳۷۰/۱،طبع قدیمی)

وانتقلی وانطلقی،کالحقی وفی البزازیة وفی الحقی برفقتک لایقع الطلاق الابالنیة کذا فی فتاوی قاضیخان.

ولمافی شرح الوقایة:(۸۱/۲،طبع قدیمی)

وکنایة مالم یوضع له واحتمله وغیره لاتطلق الابالنیةاودلالة الحال ومنهااعتدی

واستبرئی،الحقی باھلک،اخرجی اذھبی قومی ابتغی الازواج تقع واحدۃ بائنۃ ان نواھا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: شاہد محمود عفا اللہ عنہ

۲۶ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ   فتویٰ نمبر: ۱۵۷۷

﴿''جاؤ دفع ہو تجھے دس میل لمبی طلاق ہے'' کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے اپنی بیوی کو کہا ''جاؤ دفع ہو تجھے دس میل لمبی طلاق ہے جس سے چاہے شادی کرو میں تم کو نہیں رکھوں گا'' اسے کونسی اور کتنی طلاقیں واقع ہو گئیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ بالا صورت میں زید کی بیوی کو دو طلاق بائن واقع ہو گئیں ہیں اب رجوع نہیں ہو سکتا، البتہ عدت کے اندر یا عدت کے بعد زوجین باہمی رضامندی سے نئے حق مہر کے ساتھ نکاح کرنا چاہیں تو ہو سکتا ہے اور عدت کے بعد عورت اگر دوسری جگہ شادی کرنا چاہے تو کر سکتی ہے۔

واضح رہے کہ دوبارہ نکاح کی صورت میں خاوند کو صرف ایک طلاق کا اختیار ہوگا، زندگی میں کسی وقت بھی ایک طلاق دیدی تو پھر بغیر حلالہ کے دوبارہ نکاح نہیں ہو سکے گا۔

لما فی الجوھرۃ النیرۃ: (۲/۲۲،طبع میر محمد کراچی)

وقولہ ابتغی الأزواج یحتمل لانی طلقتک ویحتمل ابعادھا منہ ومن الکنایات ایضا اخرجی اذھبی وقومی......فان ارادبہ الطلاق کان طلاقا.

ولما فی الھندیۃ: (۱/۳۷۲،طبع رشیدیہ کوئٹہ)

ولوقال انت طالق طولہ وعرضہ کذافھی واحدۃ بائنۃ وان نوی الثلاث لایقع.

ولما فی التنویر مع الدر: (۲/۵۴۰،طبع امدادیہ ملتان)

(الصریح یلحق الصریح) ویلحق (البائن) بشرط العدۃ (والبائن یلحق الصریح) الصریح مالایحتاج الی نیۃ بائنا کان الواقع بہ او رجعیا،فتح.فمنہ الطلاق الثلاث فیلحقتھا،وکذاالطلاق علی مال فیلحق الرجعی ویجب المال والبائن لایلزم المال کما فی الخلاصۃ،فالمعتبر فیہ اللفظ لاالمعنی المشھور (لا) یلحق البائن (البائن)

وفی الشامیۃ: قولہ: (لایلحق البائن البائن) المرادبالبائن الذی لایلحق ھو ماکان بلفظ الکنایۃ لانہ ھوالذی لیس ظاھرافی انشاء الطلاق،کذافی الفتح.وقیدبقولہ ''الذی لایلحق'' اشارۃ الی ان البائن الموقع اولاًاعم من کونہ بلفظ الکنایۃ اوبلفظ الصریح المفید للبینونۃ کالطلاق علی مال،وحینئذفیکون المراد بالصریح فی الجملۃ الثانیۃ: اعنی قولھم: ''والبائن یلحق الصریح لاالبائن'' ھوالصریح الرجعی فقط دون الصریح

للبائن وبه ظهران مانقله الشارح اولا عن الفتح من الصريح مالا يحتاج الى نية بانناكان الواقع به اورجعيا خاص فى الجملة الاولى.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: بلال احمد غفرہ الاحد

۱۱ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ

فتویٰ نمبر: ۹۷۵

﴿مذاکرہ طلاق میں بیوی کو "باپ کے گھر جاؤ" کہنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام ذیل کے مسئلہ میں کہ میاں بیوی کے درمیان تذکرۂ طلاق چل رہا تھا، کہ شوہر نے اس کو یہ الفاظ کہدیئے (اپنے باپ کے گھر جاؤ) پوچھنا یہ ہے کہ بیوی کے اولیاء اس کو طلاق سمجھتے ہیں جبکہ شوہر کا کہنا ہے کہ اس سے میرا مقصد طلاق دینا نہیں تھا، شرعاً کس کی بات معتبر ہے؟

سائل: عازم

﴿جواب﴾ یہ لفظ عربی لفظ "اِلْحَقِیْ بِاَھْلِکِ" کے مشابہ ہے، شوہر کی نیت واقعی طلاق دینے کی اگر نہ تھی تو طلاق واقع نہیں ہوئی یعنی شوہر کی بات معتبر ہے۔

لمافى الخانية: (۲۱۱/۱، طبع قديمي)

وعن ابى يوسفؒ فى الاملاانه الحق بهذه الخمسة اربعة اخرى الحقى باهلک لو قال ذلک فى حالة مُذاكرة الطلاق اوفى الغضب وقال لم انوبه الطلاق يصدق قضاء فى قول ابى حنيفةؒ وقال ابى يوسفؒ لا يصدق.

ولمافى الهداية: (۳۴۰/۲، طبع رحمانيه)

وفى حالة مُذاكرة الطلاق لم يصدق فيمايصلح جوابا ولايصلح ردافى القضاء... ويُصدّق فيمايصلح جوابا وردا مثل قوله اذهبى اخرجى قومى تقنعى تخمرى وما يجرى هذا المجرى لانه يحتمل الرد وهوالادنى فحمل عليه.

ولمافى البدائع: (۱۰۵/۲، طبع سعيد)

وقوله الحقى باهلک يحتمل الطلاق لان المرأة تلحق باهلها اذاصارت مطلقة ويحتمل الطرد والابعاد عن نفسه مع بقاء النكاح واذا احتملت هذه الالفاظ الطلاق وغيرالطلاق فقد استترالمراد فافتقرت الى النية.

ولمافيه ايضا: (۱۰۷/۲، طبع سعيد)

واماالقسم الثالث فبقية الالفاظ التى ذكرناهالان تلک الالفاظ لاتصلح للشتم و تصلح للتبعيدوالطلاق لان الانسان قديُبعد الزوجة عن نفسه حال الغضب من غيرطلاق وكذلحال سؤال الطلاق فالحال لايدل على ارادة احدهمافاذاقال ماأردت به

الطلاق فقد نوی مایحتملہ لفظہ والظاھر لایخالفہ فیصدق فی القضاء۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ
واللہ اعلم بالصواب: عبیداللہ عابد غفرلہ ولوالدیہ

۲۵ صفرالخیر ۱۴۳۰ھ
فتویٰ نمبر: ۱۹۳۱

﴿''تم اپنے والدین کے پاس چلی جاؤ الخ'' کہنے سے طلاق کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ میری شادی اپنے سگے تایا کے گھر بمطابق ۲۴ اپریل ۲۰۰۹ کو ہوئی شادی کے بعد سے ہی میرے سسرال والوں کا رویہ میرے ساتھ اچھا نہیں رہا، میں ۳ نومبر ۲۰۰۹ سے اپنے والدین کے گھر ہوں کیونکہ میرا حمل نارمل نہیں تھا، پانچواں مہینہ مکمل ہونے پر میرا حمل ضائع ہوگیا، میرے شوہر کا رویہ بھی میرے ساتھ مناسب نہیں، اس لئے ہمارے درمیان حالات کشیدہ ہونا شروع ہوگئے۔

چنانچہ میرے شوہر چند مواقع پر شدید غصہ اور فیصلہ کن انداز میں بولے ہیں، ایک مرتبہ بمطابق ۶ ستمبر ۲۰۰۹ کو انہوں نے کہا'' تم اپنے والدین کے پاس چلی جاؤ شاید ہمارا گزارا نہیں الخ، شریعت کی روشنی میں بتائیں کہ مجھے طلاق ہوچکی ہے؟ یا باقاعدہ خلع کرنا ہوگا، نیز طلاق کی صورت میں عدت کی بھی وضاحت فرمادیں۔ مستفتیہ: بنت اعجاز

(نوٹ) مستفتیہ نے کافی تفصیلی تحریر ارسال کی تھی، غیر متعلقہ ہونے کی وجہ سے پوری تحریر نہیں لکھی گئی۔

﴿جواب﴾ آپکی تفصیلی تحریر کو ہم نے بغور پڑھا جس کا بڑا اثر بھی ہوا لیکن میاں بیوی کے معاملہ کی صحیح صورت حال تو تب واضح ہوتی ہے جب دونوں کا بیان سامنے ہو اس لئے زیادتی یا حق تلفی کے بارے میں ایک کا بیان سن کر مفتی کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا، البتہ تحریر میں اصل مسئلہ کے بارے میں آپ نے جو لکھا ہے کہ مختلف مواقع پر آپ کے شوہر نے مختلف جملے استعمال کئے ہیں ان کا کیا حکم ہے؟ اس کے بارے میں عرض ہے کہ آپکی پوری تحریر سے ہم نے یہ نتیجہ لیا ہے کہ آپ کے اور آپکے شوہر کے درمیان ہونے والی گفتگو اور معاملہ کسی حتمی نتیجہ پر نہیں پہنچا، البتہ ۶ ستمبر ۲۰۰۹ کو بحالت غصہ اگر واقعۃً آپکے شوہر نے یہ الفاظ کہے ہیں'' تم اپنے والدین کے پاس چلی جاؤ کیونکہ شاید ہمارا گذارا نہیں، بہتر یہ ہے کہ'' تم فارغ ہوجاؤ'' اگر طلاق کی نیت سے

بولے گئے تھے (اور نیت کا علم صرف شوہر ہی کو ہے) تو ان الفاظ سے ایک طلاق بائن واقع ہو چکی ہے، آپ کا حمل اگر شوہر کے ان الفاظ کے بعد ساقط ہوا ہے اور ساقط شدہ حمل میں بچے کی خلقت کسی حد تک ظاہر ہو چکی تھی تو آپ کی عدت بچے کے ساقط ہونے کے ساتھ ہی مکمل ہو چکی ہے اور اگر شوہر نے یہ الفاظ حمل کے ضائع ہونے کے بعد استعمال کئے ہیں تو ایسی صورت میں تین ماہواریاں آپ کی عدت ہوگی۔

اگر شوہر کی ان الفاظ سے طلاق کی کوئی نیت نہیں تھی بلکہ یہ الفاظ بھی انہوں نے بطور مشورہ استعمال کئے ہوں تو ایسی صورت میں طلاق واقع نہیں ہوئی اور آپ بدستور ان کی منکوحہ ہیں۔

لہٰذا اگر ثالث یا منصفین کے ذریعہ مصالحت ممکن ہو تو اس کی کوشش کرلیں بصورت دیگر آپ اپنے شوہر سے اپنے حق مہر کے عوض یا جس پر باہمی رضامندی ہو جائے با قاعدہ خلع کرلیں خلع کے بعد تین ماہواریاں آپ کی عدت شمار ہوگی۔

لمافی شرح الوقایۃ:(۸۶/۲-۸۷،طبع امدادیہ)

وکنایته مالم یوضع له واحتمله غیره فلاتطلق الابنیته اودلالة الحال وفیه الحقی باهلک الخ تقع واحدة بائنة ان نواهاملخصا.

ولمافی الخانیۃ علیٰ هامش الهندیۃ:(۴۲۷/۱،طبع رشیدیہ)

وعن ابی یوسف فی الاملاء انه الحق بهذه الخمسة اربعة اخری لاملک لی علیک الخ الحقی باهلک وفی التنویر مع الدر:(۲۴۹/۳،طبع سعید)وفی الشامی: (۳/۲۴۳،سعید)

ولمافی الهندیۃ:(۴۸۸/۱،طبع رشیدیہ)

الخلع ازالة ملک النکاح ببدل بلفظ الخلع کذا فی فتح القدیر.....اذاتشاقاالزوجان وخافاان لایقیما حدوداللہ فلاباس ان تفتدی نفسهابمال یخلعهابه فاذافعلاذالک وقعت تطلیقة بائنة ولزمهاالمال کذافی الهدایة.

ولمافیه ایضا:(۵۲۶/۱،الباب الثالث عشرفی العدة،طبع رشیدیہ)

هی انتظار مدة معلومة یلزم المراة بعدزوال النکاح حقیقة اوشبهة المتاکدبالدخول وفیه ایضا:اذا طلق الرجل امراته طلاقابائناا ورجعیا اوثلاثا اووقعت الفرقة بینهمابغیر طلاق فعدتهاثلاثة اقراء.

ولمافی البحرالرائق:(۱۳۵/۴،طبع سعید)

واذااسقطت سقطااستبان بعض خلقه انقضت به العدة لانه ولدوان لم یستبن بعض خلقه لم تنقض لان الحمل اسم لنطفة متغیرة بدلیل ان الساقط اذاکان علقة اومضغة

لم تنتقض به العدة لانها لم تتغير فلا يعرف كونها متغيرة بيقين الا باستبانة بعض الخلق كذا في المحيط.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالوہاب لقمانی عفااللہ عنہ

۳ جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ — فتوی نمبر: ۲۷۵۸

﴿"میں تجھے چھوڑتا ہوں" ان الفاظ سے طلاق واقع ہو جاتی ہے﴾

﴿سوال﴾ ایک آدمی نے غصے میں اپنی بیوی کو کہا کہ "میں تجھے چھوڑتا ہوں" کیا اس جملے سے طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ اگر خاوند اس جملے سے ماضی کا معنی مراد لے تو پھر کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ ان الفاظ کا تعلق زمانہ حال سے ہے اور اردو میں صریح طلاق کیلئے استعمال ہوتے ہیں، لہٰذا یہ الفاظ اگر تین مرتبہ کہے ہوں تو بغیر حلالہ شرعیہ کے خاوند کیلئے جائز نہیں کہ اسکو اپنی بیوی بنا کر رکھے خاوند اس جملے سے ماضی کا معنی مراد لے تب بھی یہی حکم ہے اگر ایک یا دو مرتبہ یہی جملہ بولدیا ہے تو طلاق رجعی واقع ہوگئی ہے، عدت کے اندر اندر خاوند کو رجوع کرنے کا حق حاصل ہے اور عدت گزارنے کے بعد باہمی رضامندی سے نئے حق مہر کے ساتھ بغیر حلالہ شرعیہ کے دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے لیکن آئندہ کیلئے شوہر کے پاس صرف باقی ماندہ طلاقوں کا حق باقی رہے گا۔

لمافی تنقیح الحامدیة:(۳۸/۱ طبع حقانیه)

صيغة المضارع لا يقع بها الطلاق الا اذا غلب في الحال كما صرح به الكمال بن همام.

ولمافی فتح القدیر:(۷/۴ طبع رشیدیه)

ولا يقع باطلقك الا اذا غلب في الحال ولو قالت انت طالق فقال نعم طلقت.

ولمافی البحر الرائق:(۲۵۲/۳ طبع سعید)

وليس منه اطلقك بصيغة المضارع الا اذا غلب استعماله في الحال كما في فتح القدير وفي الصيرفية سئل الفقيه ابوليث عمن قال لجماعة كل من كان له امرأة مطلقة فليصلق بيديه فصفقوا الا رجل وقيل لا وفيها قالت له طلقني فقال اطلقك وقع عند مشايخ سمرقند.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: اسلام بادشاہ کمیٹی

۵ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ — فتوی نمبر: ۲۰۴۰

﴿طلاق بائن کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج سے دس ماہ پہلے

میرے بھائی کا اپنی بیوی سے کسی بات پر تکرار ہوا اور غصہ میں کہہ دیا کہ تو نے ایسی بات کہی ،لہٰذا میں نے تجھے چھوڑ دیا، جا میرے گھر سے نکل، میں نے تمہیں طلاق دی، پھر عرصہ چھ مہینے تک کوئی رجوع نہیں کیا اور نہ کوئی نکاح کیا اور ایک بار پھر بول دیا کہ میں نے تمہیں طلاق دی ہے تو گھر سے نکلتی کیوں نہیں؟ اور اب بھی تقریباً ایک ماہ ہو گیا یہی کہہ دیا ہے کہ تو گھر سے نکلتی کیوں نہیں؟ جب کہ میں نے تجھے طلاق دی ہے، اس صورت میں کتنی طلاقیں واقع ہوگئی ہے اور شرعاً کیا حکم ہے، آپس میں رہ سکتے ہیں یا نہیں؟ مستفتی: محمد کلیم خان، آزاد کشمیر

﴿جواب﴾ آپ کے بھائی نے اپنی بیوی کو واقعی یہی الفاظ اگر بول دیے ہیں ''میں نے تجھے چھوڑ دیا ہے جا میرے گھر سے نکل میں نے تمہیں طلاق دی'' تو یہ جملہ تین طرح طلاق کے الفاظ پر مشتمل ہے، چنانچہ آخری الفاظ ''میں نے تمہیں طلاق دی'' یہ تو صریح طلاق ہے، اس سے بغیر نیت کے بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے اور ''میں نے تجھے چھوڑ دیا'' اصالۃً یہ لفظ اگرچہ کنائی ہے، لیکن عرف میں طلاق ہی کے لئے رائج ہے، اس لئے عرفاً صریح طلاق ہے اور ''جا میرے گھر سے نکل'' یہ خاص کنائی طلاق ہے، طلاق کے ارادے سے کوئی بول دے تو اس سے طلاق بائن واقع ہو جاتی ہے۔

لیکن ایک ہی جملہ میں بلا فصل یہ تینوں الفاظ بول دیے ہیں اور اصالۃً یہ کنائی ہے صریح کے ساتھ ملحق ہو کر مستقل طلاق شمار ہوتی ہے لیکن یہاں ''چھوڑ دیا ہے'' کے لئے بظاہر تفریع واقع ہے، لہٰذا مستقل طلاق کی غرض سے آپ کے بھائی نے یہ الفاظ اگر بول دیے ہیں تو پھر تین طلاقیں واقع ہوگئی ہے اور حلالہ شرعیہ کے بغیر دوبارہ نکاح نہیں ہو سکتا۔

اور اگر مستقل طلاق کی غرض سے نہ بولے ہوں بلکہ ''چھوڑ دیا ہے'' کہنے کا نتیجہ اور اثر بتانا مقصود تھا اور بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے تو ایسی صورت میں دو طلاقیں واقع ہوگئی ہیں، عدت چونکہ گزر چکی ہے، آپس میں میاں بیوی بن کر رہنا اگر چاہتے ہیں تو دونوں باہمی رضامندی سے نئے حق مہر کے ساتھ دوبارہ نکاح کر لیں، حلالہ کی ضرورت نہیں ہے، تاہم آئندہ کے لئے صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا، زندگی میں کسی بھی وقت آپ کے بھائی نے نکاح کے بعد اگر ایک طلاق دیدی تو طلاق مغلظہ واقع ہوگی اور پھر حلالہ شرعیہ کے بغیر نکاح نہ ہو سکے گا، لہٰذا محتاط رہے۔

لمافی ردالمحتار،(۲۹۹/۳،طبع:سعید)

"قوله :سرحتک وهو رها کردم لان صار صریحافی العرف علی ماصرح به نجم الزاهدی الخوارزمی فی شرح القدوری"

ولمافی ردالمحتار،(۳۰۱/۳)

والحاصل ان الاول (فوهی واخرجی واذهبی)یتوقف علی نیة فی حالة الرضا والغضب والمذاکرة"

ولمافی التنویر مع الدر،(۳۰۶/۳)

(الصریح یلحق الصریح و)یلحق (البائن)بشرط العدة (والبائن یلحق الصریح)"

ولمافی قول اللہ تبارک وتعالیٰ سورة البقرة ،آیت : ۲۳۰

فان طلقها فلاتحل من بعدحتی تنکح زوجا غیره".

ولمافی العالمگیریة ،(۴۷۰/۱، ۴۷۱،طبع: رشیدیه)

واذاطلق الرجل امراة تطلیقة اوتطلیقتین فله ان یراجعهافی عدتها ـــوتنقطع الرجعة ان حکم بخروجهامن الحیضة الثالثة ان کانت حرة"

ولمافی العالمگیریة ،(۴۷۳/۱)

"اذاکان الطلاق بائنادون الثلث فله ان یتزوجهافی العدة وبعدانقضائهاوان کان الطلاق ثلاثافی الحرة وثنتین فی الامة

لم تحل له من بعدحتی تنکح زوجا غیره نکاحاصحیحاویدخل بهاثم یطلق اویموت عنهاکذافی الهدایة ".

مزید تفصیل کے لئے دیکھیے: فتاویٰ محمودیہ،۲۸۹/۱۸، ۲۸۳،کتاب الطلاق،طبع:دارالاشاعت کراچی)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: تکمیل الدین

۵صفرالخیر۱۴۳۴ھ　　　　فتویٰ نمبر:۳۵۲۸

﴿لفظ حرام سے بلانیت طلاق بھی طلاق بائن واقع ہوجاتی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے شادی کو عرصہ اڑھائی سال ہوا،اہلیہ اور میرا آپس میں بنتا نہیں،ایک دو ماہ سے وہ میکے میں ہے،ہمارے بڑوں نے ہمیں آپس میں بٹھایا کہ معاملہ سدھر جائے تو کسی بات پر میں نے کہا یہ اب میرے اوپر حرام ہوگئی، میں اس کو اب کیسے بساؤں؟اس جملہ سے کیا طلاق واقع ہوگئی ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ "یہ میرے اوپر حرام ہوگئی ہے" یہ لفظ اگرچہ اپنے لفظ کے اعتبار سے کنایہ ہے

مگر دلالت عرف کی بناء پر اس سے بلانیت طلاق بائنہ واقع ہو جاتی ہے، اس لئے صورت مسئولہ میں ایک طلاق بائن واقع ہو چکی ہے، اب رجوع نہیں ہو سکتا، عدت پوری گزار کر عورت دوسری جگہ چاہے تو شادی کر سکتی ہے، اور باہمی رضامندی سے دونوں آپس میں بغیر حلالہ کے تجدید نکاح بھی کر سکتے ہیں، جس کے لئے حق مہر نیا مقرر کرنا ہوگا اور آئندہ کے لئے اس شوہر کے پاس صرف دو طلاقوں کا حق باقی رہے گا، تجدید نکاح کی صورت میں کسی بھی وقت اس شوہر نے مزید اگر دو طلاقیں دیدیں تو پھر حلالہ شرعیہ کے بغیر نکاح نہ ہو سکے گا۔

لمافی الشامی (۲۹۹/۳ طبع سعید)

"وان کان الحرام فی الاصل کنایة یقع بها البائن، لانه لما غلب استعماله فی الطلاق لم یبق کنایة، ولذا لم یتوقف علی النیة او دلالة الحال"

ولما فی الشامی: (۳۰۶/۳ طبع سعید)

"وقال ح: ولا یرد انت علی المفتی به من عدم توقفه علی النیة مع انه لایلحق البائن ولا یلحق البائن لکونه بائنا لما ان عدم توقفه علی النیة امر عرض له لا بحسب اصل وضعه"

ولما فی الهدایة (۴۰۵/۲ طبع رحمانیه)

"واذا کان الطلاق بائنا دون الثلث فله ان یتزوجها فی العدة وبعد انقضائها"

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: کمیل الدین کلکتی

۲۳ محرم الحرام ۱۴۳۴ھ — فتوی نمبر: ۳۳۹۲

﴿طلاق رجعی کے بعد کنائی مستقل طلاق شمار ہوتی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا اپنی بیوی سے جھگڑا ہوا مجھے بہت زیادہ غصہ آ گیا میں نے اپنی بیوی کو ڈانٹنا شروع کر دیا میری بیوی نے مجھے کہا آپ مجھے روز ڈانٹتے رہتے ہیں اس سے بہتر ہے آپ مجھے چھوڑ دیں تو میں نے بہت زیادہ غصہ میں آ کر کہا "تجھے طلاق ہے، تجھے طلاق ہے" میں یہ کہہ کر چل پڑا جب میں گھر کے دروازہ پر پہنچا تو میں نے کہا بس اب تو اپنے "گھر چلی جا" مجھے فارغ کا لفظ یاد نہیں ہے۔ اس مسئلہ میں بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ دو طلاقیں پہلے ہوئی، تیسری طلاق بائن ہو کر حرمت مغلظہ ثابت ہو گئی اور بعض علماء کرام کی رائے یہ ہے کہ دو طلاقیں ہوئیں اور اس کا یہ کہنا کہ "تو چلی جا" اپنی پہلی بات کی تصدیق اور بات کو پکا کرنا ہے آپ اس کے بارے میں حتمی رائے قائم کر کے فتوی جاری فرمائیں۔

وضاحت: مستفتی سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ "تو چلی جا، تو فارغ ہے" اس سے مستقل طلاق کی نیت نہیں تھی۔ مستفتی: عنایت اللہ

﴿جواب﴾ آپ کے اس جملہ سے "تجھے طلاق ہے، تجھے طلاق ہے" دو طلاقیں رجعی واقع ہو گئی ہیں مزید یہ کہنے سے "بس اب تو اپنے گھر چلی جا" یہ طلاق کنائی کے الفاظ ہیں اگر طلاق دینے کے ارادہ سے بول دیئے ہیں تو ان سے تیسری طلاق بھی واقع ہو گئی ہے اور طلاق دینے کے ارادے سے نہیں بولے بلکہ طلاق صریح کا نتیجہ اور اثر واضح کرنے کے ارادہ سے بول دیئے ہیں تو تیسری طلاق واقع نہیں ہوئی۔ لہذا یہ فیصلہ آپ خود ہی کر سکتے ہیں کہ دو طلاقیں واقع ہو گئی ہیں یا تین، دو طلاقیں واقع ہونے کی صورت میں آپ کو عدت گزرنے سے پہلے پہلے رجوع کا حق حاصل ہے۔ دوران عدت اگر رجوع نہیں کیا تو بعد میں بغیر حلالہ کے باہمی رضامندی سے نئے حق مہر کیساتھ نکاح ہو سکے گا اور رجوع ہو یا تجدید نکاح ہر دونوں صورتوں میں اب ایک ہی طلاق باقی ہے۔ احتیاط کریں کسی بھی موقع پر ایک مزید طلاق دینے سے حرمت مغلظہ ثابت ہو گی پھر حلالہ شرعیہ کے بغیر یہ بیوی کبھی حلال نہ ہو گی۔ اور اگر تینوں طلاقیں واقع ہو گئیں ہیں تو اس صورت میں حرمت مغلظہ ثابت ہو گئی ہے۔ بغیر حلالہ کے تجدید نکاح بھی نہیں ہو سکتا عدت گزارنے کے بعد یہ عورت چاہے تو دوسری جگہ شادی کر سکتی ہے۔

لما فی العالمگیریہ: (۱/۴۷۰، طبع رشیدیہ)

واذا طلق الرجل امراته تطليقة او تطليقتين فله ان يراجعها في عدتها رضيت بذلك او لم ترض كذا في الهداية.

ولما فی الهدایة: (۲/۳۱۹، طبع سعید)

الكنايات لايقع بها الطلاق الابالنيته او بدلالة الحال لانها غير موضوعة للطلاق بل تحتمله و غيره فلا بد من التعين او دلالته.

ولما فی شرح الوقایة: (۲/۸۶، طبع امدادیه)

و كنايته مالم يوضع له و احتمله و غيره فلا تطلق الابنيته او دلالة الحال.

و لما فی تحفة الفقهاء: (ص ۳۰۵، مکتبة المعروفية)

اذا ذكر لفظا يصلح للطلاق في غير حال مذاكرة الطلاق و حال الغضب، كما كان فاذا نوى به الطلاق يقع وان لم يكن له نية لا يقع لانه كما يصلح للفرقة لامر آخر فان قوله "بائن" يحتمل بينونة الطلاق و يحتمل البينونة عن الخير او عن الشر و كذلك

قوله "اذهبی" "اغربی" "الحقی باهلک" فانه کما یصلح للطلاق یصلح للابعاد عن نفسه و التغریب من غیر طلاق محتمل و المحتمل لا یقع بدون النیۃ.

ولمافی تنویر الابصار مع درالمختار: (۲۹۶/۳، ۲۹۷، طبع سعید)

(و کنایته) عند الفقهاء (ما لم یوضع له) ای الطلاق (واحتمله) و غیره (و) الکنایات (لا تطلق بها) قضاء (الا بنیۃ او دلالۃ الحال) و هی حالۃ المذاکرۃ الطلاق او الغضب فالحالات ثلاث رضا و غضب و مذاکرۃ و الکنایات ثلاث ما یحتمل الرد او ما یصلح للسب او لا و لا فنحو اخرجی و اذهبی و قومی)......... (یحتمل ردا)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد حامد یاسین، بھکر

۱۰ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر: ۳۶۸۱

﴿الفاظ کنایات کہہ دینے سے بغیر نیت کے طلاق واقع نہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ شوہر نے غصہ کی حالت میں اپنی بیوی سے یہ الفاظ کہہ دیے کہ "تم نے میری زندگی خراب کردی ہے اپنے والدین سے کہو کہ آکر تمہیں لے جائیں" مذکورہ جملے طلاق کی نیت سے ہرگز نہیں کہے گئے تھے تو کیا شوہر کے اس طرح کہہ دینے سے طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ — مستفتی: رانا صلاح الدین کورنگی

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں شوہر نے واقعی صرف یہی الفاظ "تم نے میری زندگی خراب کردی ہے اپنے والدین سے کہو کہ آکر تمہیں لیجائیں" بولے ہوں اسکے علاوہ کچھ اور نہ بولا ہو تو یہ طلاق کنایہ کے الفاظ ہیں جنکا حکم یہ ہے کہ طلاق کی نیت ہو تو ان الفاظ سے طلاق واقع ہوجاتی ہے، نیت نہ ہو تو واقع نہیں ہوتی، شوہر کا کہنا ہے کہ طلاق کی نیت نہیں تھی، اس بارے میں شوہر اپنی بیوی کو مطمئن کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی قسم کھالے کہ ان الفاظ سے میری طلاق کی کوئی نیت نہیں تھی تو اس صورت میں کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی، بیوی اپنے شوہر کے نکاح میں بدستور رہے گی۔

لمافی الشامی: (۲۹۸/۳، طبع سعید)

والکنایات ثلاث ما یحتمل الرد او ما یصلح للسب او لا و لا (فنحو اخرجی واذهبی وقومی)
وفی الشامیۃ: (قوله فنحو اخرجی واذهبی وقومی) ای من هذا المکان لینقطع الشر فیکون ردا او لانه طلقها فیکون جوابا رحمتی.

ولمافی التنویر مع الدر: (۳۰۰/۳-۳۰۱، طبع سعید)

(ففی حالۃ الرضا) ای غیر الغضب والمذاکرۃ (تتوقف الاقسام) الثلاثۃ تاثیرا (علی نیۃ)

لاحتمال والقول له بيمينه في عدم النية يكفي تحليفها له في منزله فان ابى رفعته للحاكم فان نكل فرق بينهما مجتبى.(وفي الغضب)توقف الاولان ان نوى وقع والا لا.

وفي الشامية:(قوله بيمينه)فاليمين لازمة له سواء ادعت الطلاق ام لا حقالله تعالى ط عن البحر(قوله توقف الاولان)اى مايصلح رداوجواباً ومايصلح سباوجواباولايتوقف مايتعين للجواب،بيان ذلك ان حالة الغضب تصلح للرد والتبعيد وللسب والشتم كماتصلح للطلاق والالفاظ الاولين يحتملان ذلك ايضا فصار الحال في نفسه محتملاً للطلاق وغيره،فاذاعنى به غيره فقدنوى مايحتمله كلامه ولايكذبه الظاهر فيصدق في القضاء.

ولمافي الهندية:(۱/۳۷۴،طبع رشيديه)

(ومايصلح جواباوردالاغير)اخرجي اذهبي اغربي قومي تقنعي استتري تخمري وفي حالة الغضب يصدق في جميع ذلك لاحتمال الرد والسب الامافيمايصلح لطلاق ولايصلح للرد والشتم كقوله اعتدى واختاري وامرك بيدك فانه لايصدق فيها كذافي الهداية.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: نعیم اقبال عفا اللہ عنہ

۲۴ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۶۴۰

﴿"جاؤ تو میری بیوی نہیں" ان الفاظ سے طلاق واقع ہو جاتی ہے﴾

﴿سوال﴾ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو بدفعلی کے شبہ کی وجہ سے کہا کہ "جاؤ تو میری بیوی نہیں" ہے اور گھر سے نکال دیا، کیا ان الفاظ سے طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ اگر واقع ہوگی تو کونسی طلاق واقع ہوگی؟　　　　مستفتی: حاجی نور الرحمٰن

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں شوہر کی نیت کا اعتبار ہوگا شوہر نے اگر یہ الفاظ طلاق دینے کی غرض سے بولے ہیں تو ایک طلاق بائن واقع ہوگی، اب رجوع نہیں ہوسکتا، البتہ باہمی رضامندی سے نئے حق مہر کے ساتھ دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے، نکاح کی صورت میں آئندہ کیلئے شوہر کے پاس دو(۲) طلاقوں کا حق باقی رہے گا اور عورت چاہے تو عدت گذارنے کے بعد دوسری جگہ شادی کرسکتی ہے اور شوہر کہے کہ طلاق کی نیت نہیں تھی تو بیوی کو باور کرانے کے لئے قسم کھالے تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی۔

لمافي الهداية:(۲/۳۹۰،طبع رحمانيه)

واخرجي واذهبي وقومي وابتغي الازواج لانهاتحتمل الطلاق وغيره فلابدمن النية.

ولمافي الهندية:(۱/۳۷۵،طبع رشيديه)

وفي حالة مذاكرة الطلاق يقع الطلاق في سائر الاقسام قضاء الافيمايصلح

جوابا ور دافانه لایجعل طلاقا.

ولما فی الشامی:(۲/۲۱۸،طبع سعید)

(قوله فنحو اخرجی واذهبی وقومی)ای من کان هذا المکان لینقطع الشر فیکون ردا او لانه طلقها فیکون جوابا.

ولما فی التنویر مع الدر:(۲/۳۰۰،طبع سعید)

(وتتوقف الأقسام)الثلاثة تاثیر(علی النیة)للاحتمال والقول له بیمینه فی عدم النیة.

وفی الشامیة:(قوله بیمینه)فالیمین لازمة له سواء ادعت الطلاق أم لا حتالله تعالی.

ولما فی فتاوی قاضی خان:(۱/۲۱۱،طبع قدیمی)

قومی اخرجی اذهبی انتقلی انطلقی تزوجی اعزبی لانکاح لی علیک......لایقع الطلاق الا بالنیة.واذاقال لم انو الطلاق کان مصدقا.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:اسلام بادشاہ بھیٹنی

۲۴صفرالخیر ۱۴۳۰ھ — فتوی نمبر:۱۹۹۴

﴿ کیا یہ اپنے آپ کو مجھ پر حرام سمجھتی ہے الفاظ کا حکم ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام شوہر کی بیوی سے لڑائی ہوئی تو شوہر اپنی ساس سے باتیں کر رہا تھا،شوہر نے اپنی ساس سے کہا" کیا یہ اپنے آپ کو مجھ پر حرام سمجھتی ہے حرام سمجھتی ہے حرام سمجھتی ہے"اب ساس کا کہنا ہے کہ شوہر نے میری بچی کو طلاق دی ہے جبکہ شوہر منکر ہے کہ میں نے طلاق نہیں دی ہے،قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔ مستفتی:صفدر عرفات ٹاؤن

﴿جواب﴾ بیان کردہ صورت میں مذکورہ الفاظ سے اگر آپکی ساس وقوع طلاق مراد لے رہی ہے تو یہ درست نہیں،اسلئے کہ ان الفاظ سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔

لما فی الدر مع الرد:(۲/۲۳۰،طبع سعید)ورکنه لفظ مخصوص.

وفی الشامیة:(قوله ورکنه لفظ مخصوص)هو ماجعل دلالة علی معنی الطلاق من صریح او کنایة فخرج الفسوخ علی مامر،واراد اللفظ ولو حکما الخ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:محمد طیب حسن زکی

۲۸جمادی الاولی ۱۴۳۰ھ — فتوی نمبر:۲۱۹۳

﴿بیوی سے کہنا کہ" آج کے بعد تو میرے اوپر حرام ہے"ایک طلاق بائن ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی

سے کہا" آج کے بعد بلکہ ابھی سے تم میرے اوپر بالکل حرام ہو" اسکے بعد کہا" اسکے بعد اگر میں نے تجھے ہاتھ بھی لگایا تو مجھ پر خدا تعالیٰ کی مار" واضح رہے کہ یہ الفاظ اس نے کئی بار بولے ہیں، اب وضاحت طلب امر یہ ہے اس سے کتنی طلاقیں واقع ہوں گی؟ برائے کرم وضاحت فرمائیں۔

﴿جواب﴾ "تو مجھ پر حرام ہے" اگرچہ اپنی اصل وضع کے اعتبار سے الفاظ کنایہ ہیں لیکن چونکہ آجکل اسکا استعمال طلاق کیلئے عام ہے اسلئے صریح کے حکم میں ہے، لہذا بغیر نیت طلاق کے بھی اس سے طلاق واقع ہو جاتی ہے، پھر لفظ کے اندر چونکہ حرمت والا معنی پایا جاتا ہے اسلئے اس سے واقع ہونے والی طلاق بائن ہوگی، لہذا صورت مسئولہ میں ایک طلاق بائن واقع ہوگئی ہے ،الفاظ اگرچہ کئی بار بولدئے ہوں لیکن طلاق بائن مکرر دینے سے بھی ایک ہی شمار ہوتی ہے اسلئے ایک ہی طلاق واقع ہوگئی ہے، عورت عدت گزارنے کے بعد دوسری جگہ شادی کرسکتی ہے۔

لما في الدر مع الرد: ج۳/۳۲۲،۳۲۵ (طبع سعيد)

(وتطليقة بائنة)(اى قوله لامرأته انت على حرام)ان نوى الطلاق وثلاث ان نواها يفتى بانه طلاق بائن وان لم ينوه لغلبة العرف (قوله لغلبة العرف)اشارة الى مافى البحر حيث قال :فان قلت اذاوقع الطلاق بلانية فينبغى ان يكون كالصريح فيكون الواقع به رجعيا قلت :المتعارف به ايقاع البائن ،اقول وفى هذالجواب نظرفانه يقتضى انه نولم يتعارف به ايقاع البائن يقع به الرجعى كما فى زماننافان المتعارف الآن استعمال الحرام فى الطلاق ولا يميزون بين الرجعى والبائن فضلاعن ان يكون عرفهم فيه البائن واماكونه بائنافلانه مقتضى لفظ الحرام لان الرجعى لايحرم الزوجة مادامت فى العدة وانما يصح وصفها بالحرام بالبائن.

ولما فى البحر:ج۳/۲۱ (طبع سعيد)

وفى الفتاوى اذاقال لامرأته انت على حرام والحرام عنده طلاق ولكن لم ينو طلاقا وقع الطلاق يعنى قضاء لماظهر من العرف.

ولما فى الشامى:ج۳/۳۰۶ (طبع سعيد)

ولا يرد انت على حرام على المفتى به من عدم توقفه مع انه لايلحق البائن ولايلحقه البائن لكونه بائنا وايضا قال نقلا عن الكافى للحاكم الشهيد رح:واذاطلقهاتطليقة بائنة ثم قال لها فى عدتها انت على حرام أوخلية أوبرية وهو يريد به الطلاق لم يقع عليهاشئى لانه صادق فى قوله هى على حرام وهى منى بائن لانه يمكن جعل الثانى خبراعن الاول.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: عاقل شاہ

۲۴ ربیع الثانی ۱۴۳۵ | فتویٰ نمبر: ۳۰۹۹

﴿خاوند کہے کہ تو مجھ پر حرام ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ:

(۱) اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کو گھریلو ناچاقی کی وجہ سے کہے کہ "تو مجھ پر حرام ہے" تجھے میری طرف سے پکی چھٹی ہے، تجھے میری طرف سے پکا ریسٹ ہے، یہ الفاظ بار بار کہے کیا مذکورہ شخص کا نکاح باقی ہے یا اس کی بیوی کو طلاق واقع ہوگئی ہے؟ اگر طلاق واقع ہوئی ہو تو کون سی طلاق واقع ہوئی ہے؟ اور کیا دوبارہ نکاح کی کوئی صورت نکل سکتی ہے یا نہیں؟

(۲) اگر یہی شخص مذکور اپنی بیوی سے اپنی دو بچیوں کے بارے میں کہے کہ یہ میری نہیں ہیں، میں ثابت کروں گا، یہ الفاظ بار بار کہے تو شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

(۳) اگر مذکورہ جملوں کی وجہ سے طلاق واقع ہوگئی ہے تو اس عورت کو بصورت مہر زیور دے کر بعد میں فروخت کر دیا گیا ہے، کیا اب خاوند کے ذمہ اس مہر کی ادائیگی ضروری ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ (۱) مذکورہ صورت میں جب شوہر نے پہلی مرتبہ اپنی بیوی کو کہا کہ "تو مجھ پر حرام ہے" تو اس سے بیوی پر ایک طلاق بائن واقع ہوگئی ہے اور دونوں کے درمیان زوجیت کا تعلق اسی ایک جملے سے ختم ہوگیا ہے، اسکے بعد مذکورہ الفاظ کا بار بار تکرار لغو ہے۔

لہٰذا عورت چاہے تو عدت گزار کر دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے، البتہ فریقین میں اگر صلح کی کوئی صورت بن جائے تو دونوں کی رضامندی سے نئے مہر کے ساتھ صرف تجدید نکاح ضروری ہے، حلالہ ضروری نہیں ہے اور آئندہ کے لئے شوہر کے پاس صرف دو طلاقوں کا حق باقی رہے گا۔

(۲) بغیر کسی شرعی ثبوت کے اپنی بچیوں کے نسب کی نفی کرنا بیوی پر بہتان ہے جو گناہ کبیرہ ہے، قرآن پاک میں ایسا کرنے والوں پر سخت وعید آئی ہے، لہٰذا توبہ و استغفار کے علاوہ شوہر کو چاہیے کہ عورت سے معافی بھی مانگ لے اور آئندہ ایسا جملہ بولنے سے اجتناب کرے۔

(۳) مہر عورت کا حق ہے جس کی ادائیگی شرعاً شوہر پر لازم ہے، مہر ادا نہ کرنے پر حدیث میں سخت وعید آئی ہے، لہٰذا طلاق کے بعد عورت کو مہر کے مطالبہ کا حق ہے، عدم ادائیگی کی صورت میں عورت مہر وصول کرنے کے لئے عدالت سے بھی رجوع کر سکتی ہے۔

ولما فی قوله تعالیٰ:(سورۃ النور،آیت ۲۳)

﴿ان الذین یرمون المحصنت الغفلت المؤمنات لعنوا فی الدنیا والآخرۃ ولہم عذاب عظیم.....الآیۃ﴾

لما فی الدرمع الرد:(۳/۲۲۴-۲۲۵،طبع سعید)

(ولو قال لامرأته انت علی حرام).....ویفتی بانه طلاق بائن وان لم ینوه،لغلبة العرف.

وفی الشامیة:وعلی هذا التعلیل بغلبة العرف لوقوع الطلاق به بلانیة وأما کونه بائنا فلانه مقتضی لفظ الحرام لان الرجعی لا یحرم الزوجة ما دامت فی العدۃ وانما یصح وصفها بالحرام بالبائن.

ولما فی الهندیة:(۱/۳۷۷،طبع رشیدیه)

ولا یلحق البائن البائن بان قال لها انت بائن ثم قال لها انت بائن لا یقع الا طلقة واحدۃ بائنة.

ولما فی التاتارخانیة:(۳/۲۲۲،طبع قدیمی)

رجل قال لامرأته"انت علی حرام علی"والحرام عنده طلاق لکن لم ینو طلاقا وقع الطلاق.

ولما فی التنویر مع الدر:(۳/۱۰۲،طبع سعید)ویتاکد(عند وطی اوخلوۃ صحت)من الزوج.

وفی الشامیة:وافاد ان المهر وجب بنفس العقد لکن مع احتمال سقوطه بردتها او تقبیلها ابنه او تنصفه بطلاقها قبل الدخول وانما یتاکد لزوم تمامه بالوطی ونحوه.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب:عبدالحکیم کشمیری عفااللہ عنہ

۹ رجب ۱۴۲۹ھ　　　فتویٰ نمبر:۱۶۷۰

﴿طلاق کے جھوٹے اقرار کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے صرف ایک پتھر اپنی بیوی کیطرف پھینکا حالت غصہ میں طلاق کا کوئی لفظ نہیں بولا پھر کچھ دیر بعد اس کا بھائی گھر آیا اور چھوٹے بھائی سے پوچھا،کیا تو نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی؟ تو اس نے کہا"ہاں" وضاحت کرنے پر بتا رہا ہے کہ طلاق کا کوئی ارادہ نہیں تھا،بھائی کیساتھ ناچاقی ہے،اسلئے زیادہ بات کرنا نہیں چاہا،اس کے علاوہ بھائی کے سوال کا مطلب بھی صرف پتھر پھینکنے کیوجہ سے وقوع طلاق تھا،اس لئے کہ اس علاقہ میں پتھر پھینکنا طلاق شمار ہوتا ہے؟　　　مستفتی:ضیاء الدین ٹانک

﴿جواب﴾ زبان سے کچھ کہے بغیر صرف پتھر پھینکنے سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوتی لیکن جس وقت بھائی نے پوچھا کہ تو نے طلاق دی؟ اس کے جواب میں آپ نے"ہاں" یعنی جھوٹا اقرار کرلیا اور جھوٹے اقرار سے طلاق قضاءً واقع ہوجاتی ہے یعنی معاملہ اگر کسی حاکم یا عدالت

تک پہنچا تو وقوع طلاق کا فیصلہ کیا جائیگا اسلئے کہ قاضی ظاہر پر فیصلہ کرنے کا پابند ہے، البتہ دیانۃً (عنداللہ) طلاق واقع نہ ہوگی، اللہ تعالیٰ دلوں کے بھیدوں سے باخبر ہے، لہٰذا عورت کو اپنے شوہر پر اگر اعتماد ہے کہ بھائی کو "ہاں" کہنے سے کوئی نئی طلاق دینا مقصود نہیں تھا تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی اور اعتماد نہیں ہے تو شوہر سے قسم لینا ضروری ہے۔

لمافی الشامی:(۲۳۶/۳،طبع سعید)

ولو اقر بالطلاق کاذبا اوهازلاً وقع قضاء لا دیانة.

ولمافیه ایضاً:(۲۳۸/۳،طبع سعید)

(قوله أو هازلا)۔۔۔ثم نقل عن البزازية والقنية لو اراد به الخبر عن الماضی کذبا لا یقع دیانةً وان اشهد قبل ذلک لا یقع قضاء ایضاًاه.

ولمافی الدر المختار:(۲۹۲/۳،طبع سعید)

قال:انت طالق او انت حر وعنی الاخبار کذبا وقع قضاءً الااذا اشهد علی ذلک.

ولمافی الدر المختار:(۱۲۶/۵،طبع سعید)

اقر بشیء ثم ادعی الخطأ لم یقبل الا اذا اقر بالطلاق بناءً علی افتاء المفتی ثم تبین عدم الوقوع لم یقع یعنی دیانة قنية.

ولمافی الشامی:(۲۳۰/۳،طبع سعید)

(قوله ورکنه لفظ مخصوص)هو ما جعل دلالة علی معنی الطلاق من صریح او کنایة۔۔۔وبه ظهر ان من تشاجر مع زوجته فاعطاها ثلاثة احجار ینوی الطلاق ولم یذکر لفظا لا صریحا ولا کنایة لا یقع علیه کما افتی به الخیر الرملی وغیره.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۳ر رجب المرجب ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۷۲۹

﴿طلاق پر شہادت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے شراب کے نشے کی حالت میں اپنے گھر میں داخل ہوکر بچوں اور بیوی کو مارنا شروع کردیا اور اول فول بکنے لگا شور کی آواز سن کر پڑوس کے کچھ لوگ جمع ہوئے اور معاملے کو رفع دفع کیا، نشہ اترنے کے بعد لوگوں نے بتایا کہ تم نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے، مذکورہ شخص منکر ہے اور بیوی بچے بھی کہتے ہیں، آپ نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ شریعت کی رو سے بتائیں کہ اس شخص کی بیوی ان لوگوں

کے کہنے سے اس پر حرام ہوگی؟ یا زوجیت کا تعلق برقرار رہے گا؟ مستفتی: عزیز احمد مختار

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں جو لوگ طلاق کے دعویدار ہیں وہ قاضی کے پاس یا پنچائیت کے روبرو اگر یہ گواہی دیں کہ اس شخص نے ہماری موجودگی میں اپنی بیوی کو طلاق دی ہے اور لفظ ''طلاق'' سننا بیان کریں تو طلاق واقع ہو جائے گی۔

لما فی الهندیة:(۲/۲۵۱،طبع رشیدیه)

ومنها الشهادة بغير الحدود والقصاص ومايطلع عليه الرجال وشرط فيها شهادة رجلين أورجل وامرأتين سواء كان الحق مالا أوغيرمال كالنكاح والطلاق والعتاق والوكالة والوصاية ونحوذلك ممالیس بمال.

تاہم قاضی اگر اُن شہود میں عدالت کے اوصاف کو مفقود پائے یا شہود علیہ کے ساتھ اُن کی عداوت ثابت ہو جائے تو اُن کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی اور میاں بیوی کے درمیان رشتہ زوجیت برقرار رہے گا۔

لما فی البحر الرائق:(۷/۵۶،طبع سعید)

ومن الشرائط:أن لايكون بينه وبين المشهودله قرابة الولادولازوجية وأن لايدفع عن نفسه مغرما وان لايجلب لنفسه مغنما وأن لايكون بينه وبين المشهودعليه عداوة دنيوية.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی

۱۹ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۵۶۳

﴿محض ارادہ کرنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مرد سے اس کی بیوی بار بار طلاق کا مطالبہ کرتی رہی، ایک دن بیوی نے کہا کہ مجھے طلاق دو طلاق دو، مجھے چھوڑتے کیوں نہیں؟ شوہر نے کہا کہ چلو کاغذات بھیج دو، میں سائن (دستخط) کرونگا۔

عرض یہ ہے کہ اس گفتگو سے طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ مستفتی: قاری نصیر صاحب

﴿جواب﴾ شوہر کا یہ کہنا کہ ''چلو کاغذات بھیج دو، میں دستخط کرونگا'' ارادہ طلاق ہے یا زیادہ سے زیادہ وعدہ طلاق ہے سو ارادۂ طلاق یا وعدۂ طلاق سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوتی، لہٰذا مذکورہ صورت میں کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی۔

لما فی البحر:(۳/۲۵۱،طبع سعید)

ولو قال اردت طلاقك لايقع.

ولما فی تنقیح الحامدیة:(۳۸/۲،طبع حقانیه)

المضارع لایقع بهاالطلاق الااذاغلب فی الحال کماصرح به الکمال ابن الهمام.

ولما فی الشامی:(۲۴۸/۳،طبع سعید)

(قوله ومابمعناهامن الصریح)......وکذاالمضارع اذاغلب فی الحال مثل أطلقک.

الجواب صحیح عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: عبداللہ غفرلہ ولوالدیہ

۱۰ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۷۵۰

﴿طلاق منجز کی ایک مخصوص صورت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا "اس وقت تک تجھے طلاق ہے جب تک میری والدہ کو راضی نہ کرلے" اس کلام کے بعد عورت شوہر کے پاس گئی تو شوہر نے دوبارہ یہی الفاظ دہرائے، کئی دفعہ ایسا ہوا لیکن شوہر برابر پہلے والے الفاظ دہراتا رہا، اب شوہر کہتا ہے کہ میں نے دوبارہ جوالفاظ دہرائے ہیں میرا مقصد اس سے پہلی بات کی یاددہانی تھی نہ کہ دوسری طلاق، نیز اسکی بیوی بھی قرینہ سے یہی سمجھی ہے تو کیا تین طلاق واقع ہوئی یا ایک؟　　　　مستفتی: محمد حلیم عبدل خیل

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں بظاہر یہ شخص اپنی بیوی کو دھمکی دے رہا تھا کہ اگر آپ نے میری والدہ کو راضی نہ کیا تو آپ کو طلاق دونگا لیکن الفاظ ایسے استعمال کئے کہ جن سے فی الحال طلاق واقع ہوگئی، البتہ دوسری تیسری دفعہ الفاظ طلاق دہرانے سے دیانۃً طلاق نہیں ہوگی قضاءً دوسری اور تیسری طلاق واقع ہوگی، عورت کیلئے شوہر کیساتھ بحیثیت بیوی کے رہنا دیانۃً جائز ہے، چنانچہ تنقیح الحامدیہ کی عبارت میں "المرأۃ کالقاضی" کی تفصیل میں فرماتے ہیں کہ عورت قاضی کیطرح ظاہر پر عمل کرے گی کیونکہ وہ قاضی کیطرح ظاہر ہی کو جانتی ہے جبکہ مذکورہ صورت میں عورت قرائن خارجیہ کیوجہ سے شوہر کی نیت کو غالب گمان کے درجہ میں جانتی ہے کہ دوسری اور تیسری مرتبہ الفاظ طلاق دہرانے سے مقصود پہلے والے الفاظ یاددلانا تھا۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲۶۹/۳،طبع سعید)

(انت طالق مالم اطلقک اومتی لم اطلقک اومتی مالم اطلقک وسکت طلقت) للحال بسکوته

ولمافی الهندیة:(۳۶۹/۱،طبع رشیدیه)

ولوقال انت طالق مالم اطلقک اومتی لم اطلقک اومتی مالم اطلقک وسکت

طلقت باتفاق العلماء.

ولما فی الشامی:(۲۹۳/۳،طبع سعید)

(قوله کرر لفظ الطلاق)بان قال للمدخولة:انت طالق انت طالق اوقدطلقتک قد طلقتک أوانت طالق قدطلقتک اوانت طالق وانت طالق،واذاقال:أنت طالق ثم قیل لہ ماقلت؟فقال:قدطلقتهااوقلت هی طالق فهی طالق واحدة لانه جواب،کذافی کافی الحاکم(قوله وان نوی التاکیددین)ای وقع الکل قضاء.

ولما فی الهندیة:(۳۵۴/۱،طبع رشیدیه)

ولوقال لهاانت طالق ونوی به الطلاق عن وثاق لم یصدق قضاء ویدین فیمابینه وبین الله تعالی والمرأة کالقاضی لایحل لهاان تمکنه اذاسمعت منه ذلک اوشهدبه شاهدعدل عندها.

ولما فی تنقیح الحامدیة:(۳۷/۱،طبع حقانیه)

وقال فی الخانیة لوقال انت طالق انت طالق انت طالق وقال اردت به التکرار صدق دیانةوفی القضاء طلقت ثلاثاومثله فی الاشباه والحدادی وزادالزیلعی ان المرأة کالقاضی فلایحل لهاان تمکنه اذاسمعت منه ذلک اوعلمت به لانهالاتعلم الا الظاهر.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب:سلمان احمد

۱۳ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ　　　فتوی نمبر:۲۰۱۳

﴿ایک طلاق رجعی کے بعد دوطلاقوں کا اختیار ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ہاتھ میں تین پتھر لیکر اپنی حاملہ بیوی سے کہا کہ تجھے طلاق ہے،اب اس کا حمل (جوکہ تقریباً پانچ مہینہ کا تھا) ساقط ہوگیا تو کیا میری بیوی پر طلاق واقع ہوگئی؟اوراب میں دوبارہ اسکو بیوی بنا کر رکھ سکتا ہوں یا نہیں؟

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ طلاق کا معاملہ بڑا نازک ہے،مفتی صرف سوال کے مطابق جواب دینے کا پابند ہے،اس لئے کہ وہ غیب نہیں جانتا،لہٰذا شوہر نے واقعی صرف ایک ہی بار "تجھے طلاق ہے" کہا ہے تو صرف ایک طلاق رجعی واقع ہوگئی ہے اوراب چونکہ وضع حمل کی وجہ سے عدت بھی گذر گئی ہے۔

لہٰذا شوہر کا حق رجوع باقی نہ رہا،عورت چاہے تو دوسری جگہ شادی کرسکتی ہے اوراسی شوہر کیساتھ بھی چاہے تو باہمی رضامندی سے نئے حق مہر کیساتھ دوبارہ نکاح کرسکتی ہے،حلالہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے،اسی شوہر کیساتھ دوبارہ نکاح کرنے کی صورت میں صرف دوطلاقوں کا حق شوہر کے پاس رہیگا،کسی بھی موقع پر مزید دوطلاقیں اگر دیں تو پھر حلالہ شرعیہ کے بغیر نکاح نہ

ہو سکے گا، لہٰذا احتیاط رہے۔

لما فی الھندیۃ:(۱/۴۷۰،طبع رشیدیہ)

واذا طلق الرجل امرأتہ تطلیقۃ رجعیۃ اوتطلیقتین فلہ ان یراجعہا فی عدتہا رضیت بذلک اولم ترض وایضاً فی ص/۳۵۵ وان قال انت الطلاق اوانت طالق الطلاق اوانت طالق طلاقا فان لم تکن لہ نیۃ اونوی واحدۃ او ثنتین فہی واحدۃ رجعیۃ وان نوی ثلاثا فثلاث وایضاً فی ص/۳۵۷ ولو قالت لزوجہا طلقنی فاشار بثلاث اصابع واراد بذلک ثلاث تطلیقات لایقع مالم یقل بلسانہ.

ولما فی ردالمحتار:(۳/۵۱۱،طبع سعید)

(قولہ وضع حملہا)ای بلاتقدیر بمدۃ سواء ولدت بعدالطلاق اوالموت بیوم اواقل جوہرہ،والمراد بہ الحمل الذی استبان بعض خلقہ اوکلہ،فان لم یستبن بعضہ لم تنقض العدۃ،لان الحمل اسم لنطفۃ متغیرۃ،فاذاکان مضغۃ اوعلقۃ لم تتغیر فلایعرف کونہامتغیرۃ بیقین الاباستبانۃ بعض الخلق بحرعن المحیط.

ولما فی الہدایۃ:(۶/۲۳،طبع حقانیہ)

(ولانہ)ای ایقاع الواحدۃ(ابعدمن الندامۃ)حیث ابقی بنفسہ التدارک بان یراجعہا فی العدۃ وبعدہابتجدیدالنکاح من غیرتزوج اٰخر.

ولما فی البحر:(۳/۲۳۵،طبع سعید)

وان کان رجعیا وقف علی انقضاء العدۃ ای لم یزل الملک الابعد انقضائہا.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:سلمان احمد

۱۰رجب ۱۴۳۰ھ　　　　فتویٰ نمبر:۲۳۶۰

﴿طلاق معلق کا بیان﴾

﴿طلاق معلق میں خلاف ظاہر کی نیت کرے تو کیا حکم ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ایک شخص نے دوسرے کو باور کرانے کیلئے کہا کہ اگر بیس مارچ تک میں نے فلاں کام نہیں کیا تو میری بیوی کو طلاق جبکہ دل میں اس نے بیس مارچ سے مستقبل بعید کے بیس مارچ کی نیت کی مثلاً 2090 وغیرہ کی، پوچھنا یہ ہے کہ اگر اس شخص نے اسی سال کے 20 مارچ تک وہ کام نہیں کیا تو اسکی بیوی کو اسی وقت طلاق ہوگی یا اس کی نیت کے مطابق مستقبل بعید کے 20 مارچ میں طلاق واقع ہوگی؟　　　　قاری سجاد بعداللہ

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں اگر اس شخص نے اسی رواں سال کے 20 مارچ تک وہ

کام نہیں کیا تو اسکی بیوی پر ایک طلاق واقع ہوگی، باقی رہا اسکا مستقبل بعید کے کسی سال کے 20 مارچ کی نیت کرنا تو اسکا اعتبار عند اللہ تو ہوسکتا ہے کہ اپنی نیت کے مطابق بیوی کو طلاق کے بارے میں بتائے بغیر اسکو نکاح قدیم کیساتھ برقرار رکھے لیکن معاملہ اگر اسلامی عدالت میں جائے تو اسلامی جج (قاضی) الفاظ کے ظاہر کو دیکھ کر فیصلہ کرے گا اور الفاظ کا ظاہر یہی ہے کہ اسی سال کے 20 مارچ مراد ہو۔

لما فی المبسوط للسرخسی:(۱۱٦/٦،طبع دار المعرفة)

"وان قال انت طالق فی رمضان فهو علی اول رمضان یجئی هو الظاهر المعلوم بالعادة من کلامه ،کما لو ذکر الأجل فی الیمین الی رمضان أو اجر داره الی رمضان، فان قال عنیت الثانی لم یصدق فی القضاء لأنه خلاف الظاهر ولانه فی معنی تخصیص العموم لأن موجب کلامه أن تکون موصوفة بالطلاق فی کل رمضان یجیء بعد یمینه فاذا عین البعض دون البعض کان هذا تخصیصاً للعموم وتخصیص العموم بالنیة صحیح فیما بینه وبین الله تعالی دون القضاء".

ولما فی تبیین الحقائق :(۲/۲۱،طبع سعید)

"ولو قال لها انت طالق ونوی به الطلاق عن وثاق لم یصدق قضاء فیما بینه وبین الله تعالی لأنه خلاف الظاهر والمرأة کالقاضی لا یحل لها أن تمکنه اذا سمعت منه ذلک أو شهد به شاهد عدل عندها".

ولما فی الهندیة:(۱/۴۲۰،طبع رشیدیه) "واذا أضافه الی الشرط وقع عقیب الشرط اتفاقاً".

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبد الباری چشتی

۱۳ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ — فتوی نمبر:

﴿طلاق ثلاثہ کو کسی چیز پر معلق کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ زید نے دوران جھگڑا اپنی بیوی سے کہا کہ تو اگر گھر سے باہر نکلی تو تجھے تین طلاق اور اگر تمہارے فلاں رشتہ دار آئے تو تجھے تین طلاق پھر اسی مجلس میں اس کی بیوی جانے لگی تو زید نے پیچھے سے آواز دی کہ "چل ٹھیک ہے تمہاری مرضی" یعنی جانے اور نہ جانے کا اختیار ہے پھر فلاں رشتہ دار جس کے بارے میں زید نے کہا تھا وہ بھی نمودار ہو گیا، کیا شریعت کی رو سے زید کی بیوی پر طلاقیں واقع ہوئیں؟ اگر ہوئیں تو کتنی؟

﴿جواب﴾ صورت مذکورہ میں جن دو شرطوں کے ساتھ طلاق کو معلق کیا گیا تھا چونکہ وہ پائی

گئیں، لہٰذا اس سے طلاق مغلظہ بائنہ واقع ہوگئی ہے اور بیوی زید پر حرام ہو چکی ہے، عدت گزرنے کے بعد عورت دوسری جگہ شادی کر سکتی ہے۔

لما فی خلاصة الفتاوی:(۱۲۹/۲ ،طبع رشیدیه)

رجل حلف وقال لامراته ان خرجت من بیتی فانت طالق فخرجت من البیت الی الدار یحنث ولو حلف لایخرج لایحنث الابالخروج الی السکة. قال الامام النسفی فی شرح الشافی هذافی عرفهم امافی الفارسیة لایحنث مالم یخرج الی السکة فی الوجهین وعلیه الفتوی.

ولمافی التنویرمع الدر:(۲/۲۰۵،طبع امدادیه)

(تنحل)ای تبطل(الیمین)ببطلان التعلیق(اذاوجدالشرط مرة الافی کلمافانه ینحل بعد الثلاث)

وفی الشامیة:(ای تبطل الیمین)ای تنتهی وتتم،واذاتمت حنث فلایتصور الحنث ثانیاًالابیمین اخری لانهاغیرمقتضیة للعموم والتکرار.

زید کا اپنی بیوی کو پیچھے سے آواز دینا کہ ''ٹھیک ہے تمہاری مرضی ہے'' اس سے زید کی نیت اگر تعلیق کو ختم کرنے کی بھی ہو یعنی رجوع عن التعلیق کی بھی ہو تب بھی اس کا اعتبار نہیں کیونکہ تعلیق رجوع سے ختم نہیں ہوا کرتی، اس طرح اس کے نکلنے سے تین طلاقیں واقع ہوگئیں اور مذکورہ میاں بیوی کا باہمی تعلق ختم ہو چکا۔

لمافی الدرالمختار:(۲/۱۸۳ ،طبع سعید)

(دبرعبده ثم ذهب عقله فالتدبیرعلی حاله)لمامرأنه تعلیق وهولایبطل بجنون ولارجوع.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی

۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ　　فتویٰ نمبر: ۲۷۲

﴿دوران نکاح طلاق معلق کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ غلام نامی شخص نے نکاح کے وقت یہ کہا تھا کہ اگر میں اپنی بیوی کو ماروں یا برا بھلا کہوں یا نفقہ میں تنگی کروں تو اس کو طلاق ہے اور اس نے اس بات کی اضافت نکاح کی طرف نہیں کی مطلق کہہ دیا، بعد میں ان امور میں سے کوئی امر اس سے سرزد ہوا تو کیا اس کی زوجہ کو طلاق ہوگی؟　　مستفتی: اکرام الدین

﴿جواب﴾ صورت مذکورہ میں اگر اس شخص نے نکاح سے پہلے شرط لگائی ہو اور اس کی

اضافت بھی نکاح کی طرف نہ کی ہوتو اس صورت میں وہ شروط لغو ہیں، بعد نکاح ان کا کوئی اثر نہ ہوگا، نکاح کے بعد اگر شرط لگائی ہو یا اس کی اضافت نکاح کی طرف کی ہوتو اس صورت میں یہ شروط معتبر ہوں گی۔

لما فی التنویر مع الدر:(۲/۵۹۳،طبع امدادیہ):وشرط(الملک)حقیقة أو حکماً(أو الاضافة الیه)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم:محمد عزیز چترالی

۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ   فتویٰ نمبر:۲۷۷

﴿طلاق معلق کی ایک صورت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر تو نے میرے اور اپنے بھائیوں کے علاوہ کسی اور شخص سے سلام کے جواب کے علاوہ مزید بات کی یا کسی کی بات کے جواب میں ہاں یا ناں سے زیادہ کوئی بات کہی تو تجھے طلاق ہے، پوچھنا یہ ہے کہ اگر اس شخص کی بیوی نے اپنے اور شوہر کے بھائیوں کے علاوہ کسی کو سلام کے جواب سے زیادہ بات کی یا پھر کسی کی بات کے جواب میں ہاں یا ناں سے زیادہ کوئی بات کہی تو طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ اگر ہوگی تو کونسی؟   مستفتی: قاری محمد دین گزری

﴿جواب﴾ بیوی نے شوہر کی طرف سے عائد پابندی کے خلاف اگر کیا یعنی اپنے اور اپنے شوہر کے بھائیوں کے علاوہ کسی سے سلام، جواب سے زیادہ بات کی، یا سوال کے جواب میں فقط ہاں یا ناں پر اکتفاء نہیں کیا اور کچھ مزید بات کہی تو طلاق رجعی واقع ہو جائیگی۔

جسکا حکم یہ ہے کہ شوہر کو دوران عدت رجوع کرنے کا حق حاصل ہوگا، دوران عدت اگر رجوع نہیں کیا تو عورت دوسری جگہ شادی کر سکے گی اور باہمی رضامندی سے اسی شوہر سے بھی بغیر حلالہ کے نئے حق مہر کے ساتھ نکاح ہو سکے گا لیکن یہ یاد رہے کہ طلاق واقع ہونے کی صورت میں آئندہ کے لئے صرف دو طلاقیں باقی رہینگی، کسی بھی وقت دو طلاقیں مزید اگر واقع ہو گئیں تو حرمت مغلظہ ثابت ہو جائیگی اور پھر حلالہ کے بغیر نکاح بھی نہ ہو سکے گا۔

لما فی الھندیة:(۱/۴۲۰،طبع رشیدیه)

واذا اضافه الی شرط وقع عقیب الشرط اتفاقا مثل ان یقول لامرأته ان دخلت الدار فانت طالق — الخ

ولما فی الشامی:(۵۲/۴ طبع سعید)

(قوله ای تبطل الیمین)ای تنتهی وتتم،واذاتمت حنث فلا یتصور الحنث ثانیاالا بیمین اخری لانها غیر مقتضیة للعموم والتکرار لغةنهر.

ولما فی البحر الرائق:(۸/۴ طبع ایچ ایم سعید)

وکذلک لو قال ان کلمت فلانا فانت طالق،وان کلمت انسانا فانت طالق تطلق تطلیقتین بحکم الیمین ـــ الخ.

ولما فی البحر الرائق:(۱۴/۴ طبع سعید)

(قوله ففیها ان وجدالشرط انتهت الیمین)ای فی الفاظ الشرط ان وجدالمعلق انحلت الیمین وحنث وانتهت لانها غیر مقتضیة للعموم والتکرار لغة فبوجود الفعل مرة یتم الشرط ولایتم بقاء الیمین بدونه واذاتم وقع الحنث فلا یتصور الحنث مرة اخری الا بیمین اخری اوبعموم لتلک الیمین.....الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: نعیم اقبال عفا اللہ عنہ

۱۲ جمادی الثانی ۱۴۳۶ھ | فتویٰ نمبر: ۲۲/۱۶

﴿طلاق کو بات نہ کرنے کے ساتھ معلق کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام دریں مسئلہ کہ مجلس میں بیٹھے آدمی نے کہا کہ اس کے بعد کسی نے بات کی تو اسکی بیوی کو طلاق، اس کے بعد کسی نے مجلس میں بات کی تو کیا اسکی بیوی کو طلاق پڑ جائیگی؟

مستفتی: عنایت الرحمٰن اورگی

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں متکلم "کہنے والے" نے اگر بات کر لی تو اسکی بیوی کو طلاق ہو جائے گی طلاق بائن کے ساتھ، اس لئے کہ اس نے طلاق کو عدم تکلم کے ساتھ معلق کیا ہے۔

مجلس کے باقی لوگوں کے بات کرنے سے کسی کی بیوی کو طلاق واقع نہ ہوگی کیونکہ متکلم کی تعلیق کا حکم دوسروں کی طرف تعدی نہیں کرتا، البتہ دوسروں نے بھی اسکی تعلیق کی تائید کر لی مثلاً کہا "صحیح" ہے تو اسکی بات سے بھی انکی بیویوں کو طلاق واقع ہوگی۔

لما فی الدر مع الرد:(۲۹۵/۴ طبع ایچ ایم سعید)

جماعة یتحدثون فی مجلس فقال رجل منهم: من تکلم بعدهذافامرأته طالق ثم تکلم الحالف طلقت امرأته لأن کلمة من للتعمیم.

وفی الشامیة:(قوله ثم تکلم الحالف)سکت عما اذاتکلم غیره والظاهرانه لایقع لأن

تعلیق المتکلم لایسری حکمه الی غیره الا اذا قال الغیر واذا کذالک مثلاً.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ
واللہ اعلم بالصواب: ظہور احمد شمس

۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ
فتویٰ نمبر: ۱۴۵۸

﴿''اللہ کی قسم اگر دوبارہ میں نے چرس پی لی تو میری بیوی کو طلاق'' الفاظ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیانِ شرعِ متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص چرس کا عادی ہے، اس نے یہ قسم کھائی کہ ''اللہ کی قسم اگر دوبارہ میں نے چرس پی لی تو میری بیوی کو طلاق ہوگی'' اسطرح قسم کھانے کے بعد حسبِ عادت دوبارہ چرس پی لی، اب پوچھنا یہ ہے کہ اس کی بیوی پر طلاق پڑ گئی یا نہیں؟ نیز اس شخص پر اپنی قسم میں حانث ہونے کی بناء پر کفارہ بھی لازم ہے یا نہیں؟ از راہ کرم تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں۔ مستفتی محمد منظور کشمیری

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں بیوی پر ایک طلاق رجعی واقع ہوگئی ہے، جس کا حکم یہ ہے کہ شوہر کے لئے دوبارہ رجوع کرنے کی گنجائش ہے بشرطیکہ طلاق کے بعد اب تک عدت نہ گزری ہو، عدت اگر گزر گئی تو میاں بیوی دونوں کی باہمی رضامندی سے نئے حق مہر کے ساتھ دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے۔

واضح رہے کہ رجوع کی صورت میں اسی طرح تجدید نکاح کی صورت میں بھی شوہر کے پاس اب صرف دو طلاقوں کا حق باقی رہیگا یعنی کسی بھی موقع پر اگر مزید دو طلاقیں دیں تو طلاق مغلظہ واقع ہوگی اور بدون حلالہ شرعیہ کے حلال ہونے کی کوئی صورت نہ ہوگی، لہٰذا محتاط رہے، نیز چونکہ یہ الفاظ قسم کے بھی ہیں اسلیئے حانث ہونے کی بناء پر شوہر کے ذمہ کفارہ ادا کرنا بھی ضروری ہے یعنی دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا ان کو کپڑا پہنانا یا غلام آزاد کرنا اور عدم استطاعت کی صورت میں تین دن مسلسل روزے رکھنا ضروری ہے۔

لمافی التاتارخانیة:(۲/۲۸۹-۲۹۰ طبع قدیمی)

ورکن الیمین باللہ تعالی ذکر اسم اللہ تعالی ـــ وفی الاجناس اذا قال واللہ ان دخلت الدار کان یمینا.

ولمافی الهندیة:(۲/۹۲ طبع رشیدیه)

حلف بطلاق امرأته ان لایشرب المسکر فصب فی حلقه ودخل جوفه ان دخل جوفه بغیر صنعه لایحنث ولو امسکه فی فیه ثم شربه بعد ذلک یحنث.

ولما فی التنویر مع الدر:(۲/۷۲۵،طبع سعید)

(وکفارته تحریر رقبة أو اطعام عشرة مساكين او كسوتهم بما)يصلح للاوساط (وان عجز عنها وقت الاداء صام ثلاثة ايام ولاء)

وفی الشامية:حتی لو اعطی مسكينا واحدا فی عشرة ايام كل يوم نصف صاع يجوز الی قوله واذا غدی مسكينا وعشی غيره عشرة ايام لم يجزه لانه لافرق طعام العشرة علی عشرين.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم:محمد اسلم چترالی غفرلہ

۹ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۳۰۴

﴿بیوی کیطرف نسبت کیے بغیر الفاظ طلاق کہنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے گاؤں میں لکڑیاں لانے کیلئے ایک گدھا کسی سے مانگا تھا.جب اس گدھے پر لکڑیاں لادی تو ایک جگہ جاکر گدھے کا پاؤں ریت میں دھنس گیا جس کیوجہ سے وہ زمین پر گر گیا،میں نے اسپر سے لکڑیاں کم کر کے اسے کھڑا کر دیا اور دوبارہ وہ لکڑیاں اسپر لادی کچھ دور جاکر پھر وہ گر گیا میں نے پھر لکڑیاں کم کر کے اسے کھڑا کیا اور اسپر لکڑیاں ڈال کر گھر پہنچادی،اسی دوران گدھے کے مالک کا بھتیجا بھی ہمارے ساتھ تھا،اس نے جاکر گدھے کے مالک کو گدھے کے گرنے کا بتایا،سات آٹھ دن بعد جب میں مالک سے ملا تو اس نے گلہ شکوہ کرتے ہوئے کہا کہ تم نے ہمارے گدھے کو گرایا ہے، اس وقت میرے ذہن میں گدھے کے گرنے کا بالکل خیال نہیں تھا،اچانک میرے منہ سے یہ الفاظ نکلے''ثلاثا طلاق می دی چہ مانہ نہ دی گذار شوی''میری تین طلاق ہیں مجھ سے نہیں گرا، حالانکہ گدھا گر گیا تھا لیکن یہ الفاظ بولتے وقت میرے ذہن میں گدھے کے گرنے کا خیال نہیں تھا،اب کیا ان الفاظ سے میری بیوی پر طلاق واقع ہوگئی؟

تنقیح:کیا یہ الفاظ بولتے وقت آپ کے ذہن میں بیوی کا کچھ خیال تھا اور یہ جملہ بیوی کو طلاق دینے کے قصد وارادے سے بولا تھا؟

جواب تنقیح:یہ الفاظ بولتے وقت مجھے بیوی کا خیال تک نہیں تھا اور نہ بعد میں بلکہ کافی عرصہ گذرنے کے بعد خواب میں کچھ ایسا اشارہ ملا جس کی وجہ سے مذکورہ واقعہ یاد آیا اور بیوی کے بارے میں وہم ہونے لگا۔

مستفتی:معین الدین بلال کالونی

﴿جواب﴾ ''ثلاثا طلاق می دی''یعنی میری تین طلاق ہیں اس جملہ میں بیوی کی طرف

طلاق کی ظاہری کوئی نسبت موجود نہیں ہے، اور بولتے وقت اپنی بیوی کی طرف طلاق منسوب کرنے کا کوئی قصد وارادہ نہیں تھا تو معنوی نسبت بھی موجود نہیں ہے، اس لئے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی۔

آپ کی بیوی کو اگر اس بات کی خبر ہے جس کی وجہ سے وہ طلاق واقع ہونا سمجھ رہی ہے تو اعتماد دلانے کیلئے اس کے سامنے قسم کھالے کہ ان الفاظ سے میرا آپ کو طلاق دینے کا کوئی قصد وارادہ نہیں تھا پھر اُسے بھروسہ کرنا چاہئے، زیادہ وہم ووسواس میں نہ رہے۔

لما فی الشامی (ج۳/ص۲۴۸)سعید

(قوله لتركه الاضافة)أی المعنوية فانها الشرط والخطاب من الاضافة المعنوية وكذاالاشارة نحوهذه طلاق ،اقول ما ذكره الشارح من التعليل اصله لصاحب البحر اخذاً من قول البزازية فی الايمان قال لها :لا تخرجی من الدار الا باذنی فانی حلفت بالطلاق فخرجت لا يقع لعدم ذكر حلفه بطلاقها ويحتمل الحلف بطلاق غيرها فالقول له .ه ومثله فی الخانية :وفی هذاالاخذ نظر فان مفهوم كلام البزازية انه لو اراد الحلف بطلاقها يقع لانه جعل القول له فی صرفه الی طلاق وغيرها ،والمفهوم من تعليل الشارع تبعاً للبحر عدم الوقوع اصلا لفقد شرط الاضافة مع انه لو اراد طلاقها تكون الاضافة موجودة ويكون المعنی فانی حلفت بالطلاق منك او بطلاقك ولا يلزم كون الاضافة صريحة فی كلامه ،لما فی البحر لو قال :طالق فقيل له :من عنيت ؟فقال امرتی طلقت امرأته ويؤيده ما فی البحر لوقال :امرأة طالق اوقال طلقت امرأة ثلاثا وقال لم اعن امرأتی يصدق

ولما فی الخانية (ج۱/ص۴۶۵)رشيديه

امرأة قالت لزوجها طلقنی ثلاثا فقال الزوج اينك هزار طلاق لاتطلق لانه كلام محتمل

تائید دیکھئے کفایت المفتی جلد نمبر ۶ صفحہ نمبر ۳۸ اور صفحہ ۴۲

والله اعلم بالصواب: سیف اللہ الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۳۱۸۶ ۲۰ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ

﴿تکرار طلاق سے تاکید مراد ہو تو دیانۃً معتبر ہے قضاءً نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک داماد ہے، بیوی بچوں کا کوئی خیال نہیں کرتا، اسکو اپنی ذمہ داریوں کا کوئی احساس نہیں ہے، میں خود بوڑھا ہوں کئی سالوں سے اپنی لڑکی کے علاوہ اس کے بچوں کے خرچے بھی خود برداشت کرنے پڑتے ہیں، کئی طریقے اختیار کر لئے کہ کسی طرح یہ شخص اپنے پیروں پر کھڑا ہو، ہر طرح تعاون کیا لیکن یہ احسان

فراموش بالکل لاپرواہ ہے، آخر تنگ آکر فون پر میں نے اس کو کہا کہ اس بار اگر تین ماہ کے اندر تو نے بیوی بچوں کا خرچہ نہیں بھیجا تو تیری بیوی کو طلاق ہوگی، اس نے شروع میں نہیں مانا، پھر میں نے سخت لہجہ استعمال کیا تو اس نے حامی بھر لی، اس طرح میں نے تین بار اس سے واضح لفظوں میں وعدہ لیا کہ اگر تو نے تین ماہ کے اندر اندر بیوی بچوں کا خرچہ نہیں بھیجا تو تیرے بیوی کو طلاق ہوگی اور اس نے تین بار حامی بھر لی، لیکن اب دو سال ہو گئے ہیں کہ اس کے بعد بھی نہ کوئی خرچہ بھیجا اور نہ وہ خود حاضر ہوا، اس صورت میں کیا میری لڑکی اس کے نکاح میں ہے یا طلاق ہوگئی ہے؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں آپ کے داماد نے آپ کی بات کی حامی بھرتے ہوئے ہر بار طلاق سے مستقل طلاق کا اگر ارادہ کیا تھا اور بظاہر یہی معلوم ہو رہا ہے تو ایسی صورت میں تینوں طلاقیں واقع ہوگئی ہیں، بیوی اس شوہر کے لئے حرام ہوگئی ہے، اب حلالہ شرعیہ کے بغیر نکاح بھی نہیں ہوسکتا۔

ہاں البتہ آپ کا داماد اگر یہ کہے کہ ہر مرتبہ طلاق کے لفظ سے مستقل طلاق کا ارادہ نہیں تھا، صرف تاکید اور تائید کے لئے تین بار حامی بھر دی تھی، تو اس صورت میں دیانۃً ایک طلاق واقع ہوگئی ہے، چونکہ دوران عدت اس نے کوئی رجوع نہیں کیا اور اب رجوع کی مدت گذر گئی ہے اس لئے لڑکی آزاد ہے، دوسری جگہ شادی کر سکتی ہے، اور چاہے تو دونوں کی باہمی رضامندی سے بغیر حلالہ کے نئے حق مہر کے ساتھ نکاح کے بھی ہوسکتا ہے، لیکن شوہر کے پاس تجدید نکاح کی صورت میں صرف دو طلاقیں باقی ہونگی، کسی بھی موقع پر مزید دو طلاقیں دینے سے حرمت مغلظہ ثابت ہوگی اور پھر حلالہ شرعیہ کے بغیر تجدید نکاح بھی نہ ہوسکے گا۔

لما فی الدر المختار: (۳/۲۹۳ طبع سعید) کرّر لفظ الطلاق وقع الکلّ وان نویٰ التاکید دیّن.

ولما فی الهندیة: (۱/۴۲۰ طبع: رشیدیة کوئٹه) واذا اضافه الی الشرط وقع عقیب الشرط اجماعاً.

ولما فی الشامی: (۳/۸۴۹، طبع: سعید)

قال فی الخانية: ولو قال والله لتفعلن كذا فقال الآخر نعم، فهو على خمسة اوجه احدها........ الثاني ان يريد المبتدي الاستحلاف والمجيب اليمين على نفسه فالحالف هو المجيب فقط.

ولما فی فتاوی قاضیخان: (۱/۵۲۹، طبع قدیمی)

رجل قال لغریمه: امرأتک طالق ان لم تقض حقی فقال الغریم نعم ولم یرد جوابه فقال

الطالب قل نعم فقال نعم واراد به جوابه قال محمد رحمه الله تعالی الغریم حالف، لان الکلام واحد سالم یاخذ فی کلام آخر او یطول ذالک، لا ینقطع و یکون موصولاً.

ولما فی العالمکیریه:(۱/۴۴۳،طبع رشیدیه)

رجل قال لمدیونه امرئتک طالق ان لم تقض دینی فقال المدیون نعم فقال له الرجل قل نعم فقال نعم واراد جوابه فالیمین لازمة وان دخل بینهما انقطاع کذافی خزانة المفتین.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد ابرار غفرلہ ولوالدیہ

۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر: ۳۷۳۹

﴿بیوی سے کہا ''اگر تو نے فلاں شخص سے بات کی یا ہاتھ ملایا تو تجھے تین طلاق''﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے یوں کہے کہ اگر فلاں شخص سے بات کی یا ہاتھ ملایا تو تین طلاق اور اس کے بعد سے تو میری بہن ہے تو ایسی صورت میں اگر بات کرلی یا ہاتھ ملالیا تو شریعت میں اس کا کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ اس عورت نے فلاں شخص سے اگر بات کرلی یا ہاتھ ملایا تو اس پر تینوں طلاقیں واقع ہو جائیں گی اور حرمت مغلظہ ثابت ہو جائیگی پھر حلالہ شرعیہ کے بغیر میاں بیوی کا آپس میں تجدید نکاح بھی نہ ہو سکے گا، لہٰذا اس عورت کو پوری طرح محتاط رہنا چاہیے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۳/۳۵۲،طبع سعید)

(تنحل) ای تبطل (الیمین) ببطلان التعلیق (اذا وجد الشرط مرة الا فی کلما..... الخ.

وفی الشامیة: تبطل الیمین ای تنتهی وتتم ،واذا تمت حنث.....الخ.

ولمافی الهندیة:(۱/۴۲۰،طبع رشیدیه)

واذا اضافه الی الشرط وقع عقیب الشرط اتفاقا مثل ان یقول لامرأته ان دخلت الدار فانت طالق الخ.

ولمافی البحر:(۴/۸،طبع ایچ ایم سعید)

وکذلک لو قال ان کلمت فلانا فانت طالق، وان کلمت انسانا فانت طالق تطلق تطلیقتین بحکم الیمین..... الخ.

ولمافیه ایضا:(۴/۱۲ طبع سعید)

قوله فنیها ان وجد الشرط انتهت الیمین ای فی الفاظ الشرط ان وجد المعلق انحلت الیمین وحنث

ولمافیه ایضا:(۴/۲۱ طبع سعید) فان وجد الشرط فی الملک طلقت وانحلت الیمین..... الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: انیس طالب غفراللہ لہ

۲۸ صفر ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۳۶۵

طلاق بائن معلق کی ایک صورت

سوال: جناب مفتی صاحب: السلام علیکم ورحمۃ اللہ علیہ وبرکاتہ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ میں نے اپنی بیٹی کی شادی اپنے بھانجے منور سے کرائی تھی، شاید اللہ تعالیٰ کیطرف سے اس میں کوئی بڑی حکمت ہوگی کہ وہ رشتہ کامیاب نہ ہوسکا، منور صاحب نے کچھ الفاظ بولے تھے اور اس سے متعلق دارالعلوم سے فتویٰ بھی حاصل کیا جس کی کاپی منسلک ہے اس فتوی میں وقوع طلاق کو منور صاحب کی نیت وارادہ پر موقوف کردیا ہے، منور صاحب نے تو اب شادی بھی کرلی اور ہمارے اوپر واضح کردیا ہے کہ انہوں نے ہماری لڑکی کو طلاق دی ہے، اور شاید آپ نے بھی اس سے وضاحت طلب کی تھی تو اس نے مذکورہ الفاظ کا مطلب واضح کردیا تھا کہ اس کا ارادہ مستقل چھوڑنے اور طلاق ہی کا تھا۔

ایسی صورت میں ہمیں واضح فتوی عنایت فرمادیں تاکہ ہمارے پاس بطور ثبوت رہے اور ہم اپنی لڑکی کا رشتہ کسی دوسری جگہ کرسکیں، عنایت ہوگی۔ مستفتی: محمد اقبال مدنی مسجد کورنگی نمبرا

جواب: منور صاحب نے ایک موقع پر اپنی رشتہ دار خاتون کے ذریعے اپنی بیوی کو پیغام بھیجا کہ آج کی شب وہ ہمارے گھر آجاتی ہے تو ٹھیک ورنہ پھر میری طرف سے یہ رشتہ ختم، منور صاحب سے مفتی صاحب نے بذات خود ان الفاظ کی وضاحت طلب کی تھی، منور صاحب نے واضح کردیا تھا کہ "ان الفاظ کا مطلب تو مخفی نہیں ہے کہ پھر وہ میری بیوی نہیں رہیگی یعنی طلاق ہوگی" چونکہ یہ طلاق معلق کے الفاظ ہیں اسی رات بیوی منور صاحب کے گھر چلی جاتی تو طلاق واقع نہ ہوتی لیکن وہ منور صاحب کے گھر اسی رات گئی نہیں ہے اس لئے طلاق بائن واقع ہوگئی ہے، نکاح ختم ہوگیا ہے البتہ باہمی رضامندی سے بغیر حلالہ کے نئے حق مہر کے ساتھ دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے، اور لڑکی چاہے تو دوسری جگہ بھی شادی کرسکتی ہے منور صاحب کو روکنے کا حق باقی نہیں رہا۔

لما فی الفتاوی العالمگیریہ: (۱/۲،۳۷۴..۳۷۵طبع: رشیدیہ)

(الفصل الخامس فی الکنایات) لا یقع بہ الطلاق الا بالنیۃ أو بدلالۃ الحال ـــــ ولو قال فسخت النکاح ونوی الطلاق یقع وعن ابی حنیفہ رحمہ اللہ تعالی ان نوی ثلاثا فثلاثا کذا فی معراج الدرایۃ........ ولو قال ما أنت لی بامرأۃ أو لست لک بزوج ونوی الطلاق یقع عند ابی حنیفہ رحمہ اللہ تعالی وعندھما لا یقع ولو قال انا منک بائن أو انا علیک حرام ونوی الطلاق یقع ...... ولو قال لھا لا نکاح بینی وبینک او

قال لم یبقی بینی و بینک نکاح یقع الطلاق

لما فی فتاوی التاتار خانیة :(۲/۲۲۱،طبع قدیمی)

واما مدلولات الطلاق فھو مثل قوله ....لا سبیل لی علیک ولا نکاح بینی وبینک لا ملک لی علیک "وما شاکلھا اذا نوی الطلاق بھذہ الالفاظ یقع بائنا وان نوی الثلاث یقع ثلاثا .

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سمیع الرحمن دیروی

۱۸ جمادی الثانیہ ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر:

﴿تونے فلاں سے تعلقات قائم رکھے تو میری بیوی کو ہزار طلاق﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام درج ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی آدمی نے اپنے کسی دوست سے یہ کہا کہ اگر آپ نے فلاں آدمی مثلاً زید سے دوستی اور تعلقات قائم رکھے تو میری بیوی کو ہزار طلاقیں ہوں اب اس شخص نے زید کے ساتھ دوستی بھی لگائی رکھی اور تعلقات بھی قائم رکھے تو مذکورہ صورت میں شریعت کا کیا حکم ہے یعنی طلاق مغلظہ واقع ہوگی یا نہیں شریعت کی روشنی میں وضاحت مطلوب ہے۔ مستفتی: مولوی عبدالرزاق بنوں

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ اس آدمی نے جب اپنے دوست سے کہا کہ آپ نے اگر زید سے دوستی لگائی اور تعلقات قائم رکھے تو میری بیوی کو ہزار طلاقیں ہوں اس کے بعد اس دوست نے واقعی زید کیساتھ تعلقات قائم رکھے اور دوستی لگائی رکھی تو کہنے والے شخص کی بیوی کو طلاق مغلظہ ہوگئی یعنی تینوں طلاقیں واقع ہوگئی ہیں دونوں کا آپس میں نکاح ختم ہو چکا ہے اب رجوع نہیں ہوسکتا اور حلالہ شرعیہ کے بغیر دوبارہ نکاح بھی نہیں ہوسکتا عورت عدت پوری گذارنے کے بعد چاہے تو دوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے۔

لما فی مشکوۃ المصابیح کتاب النکاح: (۲۸۴ طبع ایچ ایم سعید)

وعن مالک بلغه ان رجلا قال لعبداللہ بن عباس انی طلقت امراتی مائة تطلیقة فماذا تری علی فقال ابن عباس طلقت منک بثلث وسبع وتسعون اتخذبھا ایات اللہ ھزوا رواہ فی الموطا .

ولما فی تنویر باب التعلیق،۳۴۱ طبع ایچ ایم سعید)

ھو ربط حصول مضمون جملة بحصول مضمون جملة اخری شرطه الملک کقوله لمنکوحته ان ذھبت فانت طالق اوالاضافة الیه کان نکحتک فانت طالق

ولما في الهداية ۲/۳۹۸ طبع ایچ ایم سعید)
واذا اضافه الى شرط وقع عقيب الشرط مثل ان يقول لامراته ان دخلت الدار فانت طالق وهذا بالاتفاق لان الملك قائم في الحال والظاهر بقاء ه الى وقت وجود الشرط فيصح يمينا وايقاعا

ولما في الخانيه على الهندية:(۱/۴۷۶ طبع رشیدیه)
رجل قال لغيره زن وى ازوى بسه طلاق اگر تو مهمان من نيانى قال الفقيه ابو جعفر رحمه الله تعالى هذاتعليق صحيح كانه قال ان لم تجئني الى ضيفا فامرأتي طالق.

ولما في البدائع :۳/۲۷۰ طبع دار الكتب العلميه بيروت)
ولو قال لها انت طالق ان شاء فلان يتقيد بمجلس علم فلان ان شاء في مجلس علمه وقع الطلاق وكذلك اذا كان غائبا وبلغه الخبر يقتصر على مجلس علمه لان هذا تمليك الطلاق فيتقيد بالمجلس بخلاف ما اذا قال لها :انت طالق ان دخل فلان الدار انه يقع الطلاق اذا وجد الشرط في اى وقت وجد ولا يتقيد بالمجلس لان ذلك تعليق الطلاق بالشرط والتعليق لا يتقيد بالمجلس لان معناه ايقاع الطلاق في زمان ما بعد الشرط فيتف الوقوع على وقت وجود الشرط في اى وقت وجد يقع۔

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد سلمان غفرلہ ولوالدیہ

۵ صفر الخیر ۱۴۳۵ھ فتوی نمبر: ۳۸۸۲

﴿منکوحہ کی رخصتی سے پہلے طلاق معلق کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک علاقے کا رواج یہ ہے کہ وہاں منگنی میں نکاح پڑھایا جاتا ہے اور رخصتی کے وقت تجدید نکاح ہوتی ہے تو ایک آدمی کی بھی اس طریقے سے منگنی ہوئی ہے، اس نے دوسرے آدمی سے کہا کہ اگر میں تجھ سے سلام کروں تو میری بیوی کو طلاق کیا اس صورت میں سلام کرنے سے اسکی بیوی کو طلاق ہوگی یا نہیں؟

﴿جواب﴾ گواہوں کی موجودگی میں باقاعدہ ایجاب وقبول کیساتھ یہ منگنی اگر ہوئی ہے تو یہ منگنی نہیں بلکہ نکاح ہے اور مذکورہ تعلیق صحیح ہے، لہٰذا یہ شخص دوسرے آدمی سے اگر سلام کریگا تو طلاق واقع ہو جائیگی، ابھی تک اسکی رخصتی اگر نہیں ہوئی اور خلوت صحیحہ بھی نہیں ہوئی تو ایک طلاق واقع ہونے کی صورت میں نکاح ختم ہو جائیگا اور بغیر عدت گذارے عورت دوسری جگہ شادی کر سکے گی، البتہ اس شخص کیساتھ بھی باہمی رضامندی سے بغیر حلالہ کے نکاح ہو سکے گا پھر اس شخص کے پاس صرف دو طلاقوں کا اختیار رہے گا۔

لمافی ردالمحتار:(۲/۲۵۳،طبع ایچ ایم سعید)

وقد تعورف فی عرفنا فی الحلف الطلاق یلزمنی لاافعل کذایریدان فعلته لزم الطلاق ووقع فیجب ان یجری علیهم لانه صاربمنزلة قوله ان فعلت فانت طالق.

ولمافی الهندیة:(۱/۴۲۰،طبع رشیدیه) واذااضافه الی شرط وقع عقیب الشرط اتفاقا.

ولمافی بدائع والصنائع:(۳/۳۰،طبع سعید)

فالذاوجد رکن الایقاع مع شرائطه لابدمن الوقوع عندالشرط.

ولمافی الهدایة:(۲/۳۸۱،طبع رحمانیه) واذااضافه الی شرط وقع عقیب الشرط.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:احمد علی عفی عنہ

در بیع الاول ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر:۲۰۸۸

﴿طلاق کو فعل حرام کے ساتھ معلق کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک آدمی نے اپنی محرم سے کہا کہ اگر میں تجھ سے فعل حرام نہ کروں تو میری بیوی کو تین طلاق، کیا اس صورت میں طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ مستفتی:محمد نواز صوابی

﴿جواب﴾ حرام کام کی قسم کھانا بھی حرام ہے اور سخت گناہ ہے شریعت نے ایسی قسموں سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے، تاہم قسم منعقد ہو جاتی ہے اور خلاف کرنے کی صورت میں آدمی حانث بھی ہو جاتا ہے، غلطی سے کوئی اس طرح قسم کھائے تو اس کے خلاف کرنا واجب ہے اور ساتھ ساتھ کفارہ کا بھی حکم ہے۔

اس شخص کا یہ جملہ تعلیق طلاق ہے جو کہ غالباً قسم کے حکم میں ہے، لہٰذا اس سے توبہ واستغفار کرے تاہم طلاق معلق ہوگئی ہے جس کا اثر عمر کے آخری حصہ میں ظاہر ہوگا یعنی محرم یا خود اس شخص کی موت کے وقت طلاق واقع ہوگی اس وقت اگر بیوی زندہ ہوگی تو طلاق واقع ہو جائیگی۔

البتہ اس شخص کی موت کے واقع ہونے کی صورت میں بیوی پر اگرچہ طلاق واقع ہوگی لیکن ایسی طلاق میراث پر اثر انداز نہیں ہوتی، طلاق کے باوجود بیوی کو میراث سے حصہ ملے گا۔

لمافی ردالمحتار:(۳/۸۲۲،طبع ایچ ایم سعید)

(ولوحلف لیفعلنه برة)لان الملتزم فعل واحدغیرعین اذالمقام للاثبات فیبره بای فعل...... واذالم یفعل لایحکم بوقوع الحنث حتی یقع الیأس عن الفعل وذلک بموت الحالف قبل الفعل اوبفوت محل الفعل.

ولما فی الهداية:(۱۳۹/۲،طبع رشیدیه)

وان حلف ليفعلن كذا ابدا او بالفعل مرة فاذا لم يفعل لا يحكم بوقوع الحنث حتى يقع الياس عن الفعل وذلك بموت الحالف او بفوت محل الفعل

ولما فی رد المحتار:(۳/۲۱۱،طبع ایچ ایم سعید)

(قوله منه) اى من الفرار وهو من قسم التعليق بفعل نفسه والصاوي لكنه لانه وجد الشرط وهو عدم التطليق او عدم التزوج قبيل موته وهو وقت مرض فكان فارا وان كان التعليق فی الصحة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد علی عفی عنہ

۱۷ صفر ۱۴۲۱ھ — فتویٰ نمبر:۳۳۲۹

﴿بیوی سے کہا ”تو اگر ماں کے گھر گئی تو تجھے طلاق ہے“ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیانِ عظام دریں مسئلہ کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی سے کہا کہ ”تو اگر ماں کے گھر گئی تو تجھے طلاق ہے“، قسم میں جس گھر کا ذکر ہے، وہ ماں کی ملکیت ہے، اب اس سے بچنے کا کیا طریقہ ہوسکتا ہے؟ جبکہ اس آدمی نے اس بیوی کو اس سے پہلے بھی دو طلاقیں دی ہیں، ماں اگر اپنا مکان تبدیل کر کے مثلاً شوہر کسی مکان کا انتظام کرے پھر وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہنا شروع کرے تو بیٹی کا وہاں جانے سے طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ سائل: سید ذوالفقار علی

﴿جواب﴾ شوہر نے قسم کھاتے وقت جس گھر کا ذکر کیا ہے چونکہ وہ ماں کا مملوکہ گھر ہے اگر وہ اس گھر کو تبدیل کر کے شوہر یا کسی بیٹے کے ساتھ رہنا شروع کر دے تو ماں کے ایسے گھر میں بیٹی کے جانے سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔

لما فی الدر مع الرد:(۳/۸۲۸،طبع سعید)

لو حلف لا يدخل فی دار فلانة فدخل دارها وزوجها ساكن بها لم يحنث لان الدار انما تنسب الى الساكن وهو الزوج نهر عن الواقعات وهو لما فی الخانية: لو حلف لا يدخل دار ابنته أو امه او ابنته وهی تسكن فی بيت زوجها فدخل الحالف حنث. ويمكن الجواب: بان الدار فی مسئلة الخانية السابقة لما لم تكن للمرأة انعقدت يمينه على دار السكنى بالتبعية فحنث اما فی مسئلة الواقعات المذكورة هنا فالدار فيها ملك المرأة فانصرفت اليمين اليها ما ينسب اليها اصالة فلما سكنها زوجها نسبت اليه وانقطعت نسبتها اليها فلم يحنث الحالف بدخولها ما لم ينوها.

ولسائی لفتاوی النوازل للسمرقندی:(ص ۲۰۲، طبع حقانیه پشاور)

رجل حلف ان لا یدخل دار امرء ته فباعت الدار ثم استأجرتها فدخلها لم یحنث.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم: عبید اللہ عابد غفرلہ ولوالدیہ

۶ رجب المرجب ۱۴۳۰ھ

فتویٰ نمبر: ۲۳۵۷

﴿شرکت کے وکیل کا ہر فعل مؤکل کی طرف منسوب نہیں ہوتا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ زید (باپ) اور خالد (بیٹے) کا ایک مشترکہ ٹرک ہے، اب بکر (زید کا دوسرا بیٹا) اس میں شریک ہونا چاہتا ہے لیکن خالد نے انکار کر دیا اور قسم بھی کھالی کہ اگر میں نے تیری رقم اس ٹرک میں شریک کی تو میری بیوی کو طلاق، لیکن زید اپنے دوسرے بیٹے بکر کی رقم اس ٹرک میں لگانا چاہتا ہے۔

غرض مسئلہ یہ ہے کہ شرکت میں ہر شریک دوسرے کا وکیل بھی ہوتا ہے تو اگر زید نے بکر کی رقم ٹرک میں لگالی تو چونکہ زید کا عمل شرکت کی وجہ سے خالد کا بھی شمار ہوتا ہے، تو کیا اس سے طلاق واقع ہو جائیگی؟

مستفتی: ایک سائل فون پر

﴿جواب﴾ یہ بات صحیح ہے کہ شرکت میں ہر ایک شریک دوسرے کا وکیل بھی ہوتا ہے لیکن یہ بات کہ وکیل کا ہر عمل مؤکل کا بھی شمار ہوتا ہے صحیح نہیں ہے اس بارے میں فقہاء کرام نے ایک ضابطہ بیان فرمایا ہے کہ بعض عقود کے حقوق مباشر یعنی براہ راست کرنے والے سے متعلق ہوتے ہیں اور اسی کی طرف ان کی نسبت ہوتی ہے وہی مسئول ہوتا ہے جیسے خرید وفروخت، اجارہ، اور صلح عن مال اور بعض عقود کے حقوق کا تعلق مباشر کے ساتھ نہیں بلکہ جس کے لئے وہ عقد کیا گیا ہو حقوق بھی اسی سے متعلق ہوتے ہیں جیسے نکاح، طلاق، غلام کا آزاد کرنا وغیرہ کہ ان میں وکیل کی حیثیت سفیر محض کی ہوتی ہے، تو پہلی قسم کے عقود کی اگر کوئی قسم کھالے مثلاً کوئی کہدے کہ میں نے اگر بیع کی یا میں نے مکان کرایہ پر دیدیا، یا کرایہ پر لیا تو میری بیوی کو طلاق پھر خود اس نے نہیں بلکہ اس کے وکیل نے بیع کی یا کرایہ پر اس کا مکان دیا وغیرہ تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی اس لئے کہ عقد بیع واجارہ جس نے کیا ہے وہی مسئول ہے عقد کے تمام حقوق کا تعلق وکیل کے ساتھ ہے مؤکل بیع کرنے والا یا کرایہ پر مکان دینے والا شمار نہیں ہوتا اس لئے اس کی بیوی پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔

لہذا صورت مسئولہ میں اگر خالد خود اپنے بھائی کو شریک نہیں کرتا اس کے والد صاحب اپنے دوسرے بیٹے کو شریک کر لیتے ہیں تو خالد کی بیوی پر کوئی طلاق واقع نہ ہوگی۔

لما فی الشامی:(۸۱۲/۳،طبع:سعید کراچی)

(قوله الاصل فیه الخ)ذکر فی الفتح اصلا اظهر من هذا وهوان کل عقدترجع حقوقه الی المباشرویستغنی الوکیل فیه عن نسبة العقدالی المؤکل لایحنث الحالف علی عدم فعله بمباشرة المامورلوجوده من المامور حقیقة وحکما فلایحنث بفعل غیره لذالک وذالک کالبیع والشراء والایجاروالاستئجاروالصلح عن مال وکذاالفعل الذی یستناب فیه ویحتاج للوکیل الی نسبته للمؤکل کالمخاصمة فان الوکیل یقول ادعی لمؤکل ـــ وکل عقد لاترجع حقوقه الی المباشربل هو سفیر وناقل عبارة یحنث فیه بمباشرة المامور کما یحنث بفعله بنفسه کالتزوج ـــ الخ.

ولما فی الهندیه :(۱۱۲/۲،باب الیمین فی البیع طبع رشیدیه کوئٹه)

لو حلف لایشتری او لایبیع او لایواجر فوکل من فعل ذالک لم یحنثالا ان ینوی ان لایامر غیره فحینئذ شدد الامر علی نفسه بنیته او یکون الحالف ممن لا یباشر هذه العقود بنفسه فحینئذ بالتفویض فان کان یباشر تارة ویفوض اخری یعتبر الغالب کذافی الکافی.

ولما فی البحر الرائق :(۳۲۱/۳،طبع:سعید کراچی)

واعلم ان العقود انواع ثلاثة منها ما یترلق حقوقه بمن وقع له العقدلابالعاقد کالنکاح ومنها مایتعلق حقوقه بالعاقد لذا کان العاقداهلا لتعلق الحقوق به کالبیع والشراء ـــ فما تتعلق حقوقه بالعاقدفان کان الحالف لایحنث بماشرتوکیله لوجودالفعل من الوکیل حقیقة وحکماً.

ولما فی الهدایه اولین :(ص:۶۰۹،طبع رحمانیه لاهور)

واما شرکة العنان فتنعقدعلی الوکالة دون الکفالة ......قال وما اشتراه کل واحد منهما للشرکة طولب بثمنه دون الآخرلما بینانه یتضمن الوکالة دون الکفالة والوکیل هو الاصل فی الحقوق.

والله اعلم بالصواب: محمد اویس غفراللہ لہ ولوالدیہ — الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ

فتویٰ نمبر:۳۷۳۶ — ۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ

﴿میں نے اگر دوسری شادی نہیں کی تو تجھے طلاق ہے﴾

﴿سوال﴾ ایک شخص بار بار اپنی بیوی کے سامنے یوں کہتا رہا کہ دوسری شادی کرونگا، بیوی اسکو منع کرتی رہی، ایک دفعہ وہ غصہ میں آکر کہنے لگا کہ اگر میں نے دوسری شادی نہیں کی تو پھر تجھے طلاق ہو، حال یہ ہے کہ ابھی تک اس شخص نے دوسری شادی نہیں کی ہے جبکہ اسکے بعد تقریبا

۳،۴ سال ہو گئے، اب پوچھنا یہ ہے کہ مذکورہ صورت میں بیوی پر طلاق واقع ہو گی یا نہیں؟ اگر واقع ہو گی تو کب؟ اور کونسی؟ اور اسکا اثر کیا ہو گا؟

مستفتی محمد رحیم شانگلہ

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں شوہر نے چونکہ طلاق عدم نکاح کے ساتھ معلق کیا ہے، لہٰذا فی الحال واقع نہیں ہو گی، البتہ جب شوہر دوسری شادی کرنے سے مایوس ہو جائے اور دوسری شادی اس کیلئے ممکن نہ رہے اور یہ موت کی صورت میں ہی ہو سکتا ہے تو اس وقت اس پر طلاق رجعی واقع ہو جائیگی۔

لما فی الهداية:(۲/۳۶۸،طبع رحمانيه)

الطلاق على ضربين صريح وكناية فالصريح قوله انت طالق ومطلقة۔۔۔فهذا يقع به الطلاق الرجعي۔۔۔الخ.

ولما فيها ايضا:(۲/۴۸۰،طبع رحمانيه)

وان حلف ليفعلن كذافعله مرة واحدة بر۔۔۔وانما يحنث لوقوع الياس عنه وذلك بموته أو بفوت محل الفعل۔۔۔الخ.

ولما فيها ايضا:(۲/۴۹۸،طبع رحمانيه)

وألفاظ الشرط ان واذا واذاما۔۔۔قال:ففي هذه الالفاظ اذا وجد الشرط انحلت وانتهت اليمين.

ولما في كنز الدقائق:(ص۱۲۶،طبع قديمي)

والفاظ الشرط ان واذا۔۔۔ففيها ان وجد الشرط انتهت اليمين الخ.وهكذا في النهر الفائق:(ص۳۸۹)

اور موت کے وقت طلاق کا دنیا میں کوئی اثر ظاہر نہیں ہو سکے گا اس خاتون کو وراثت میں سے حصہ ملے گا، اس لئے کہ مطلقہ عورت کی جب تک عدت پوری نہ ہو تعلق زوجیت باقی رہتی ہے اور میراث کیلئے موت کے وقت تعلق زوجیت کا باقی ہونا کافی ہے۔

لما في الشامي:(۳/۳۸۸،طبع ايچ ايم سعيد)

(وكذا) ترث (طالبة رجعية)أوطلاق فقط(طلقت)بائنا(اوثلاثا)لان الرجعي لايزيل النكاح حتى حل وطؤها ويتوارثان في العدة مطلقا وتكفي أهليتها للارث وقت الموت، الخ قال العلامة ابن عابدينؒ تحت هذا(قوله:وكذا ترث طالبة رجعية)(قوله:أوطلاق فقط)(قوله:ويتوارثان في العدة مطلقا)أي سواء كان طلاقه لهافي صحته أومرضه برضاها أوبدونه كما في البدائع فأيهما مات وهي في العدة يرثه الآخر۔۔۔الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ	واللہ اعلم بالصواب: محمد احمد عفااللہ عنہ

۵ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ	فتویٰ نمبر: ۱۲۸۶

﴿طلاق کو بہن کے گھر میں داخل ہونے پر معلق کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء حضرات ایک آدمی نے اپنی بیوی سے کہا ''میں تمہیں طلاق دیتا ہوں'' پھر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد دوسری مرتبہ بیوی سے کہا ''اگر تم اپنی بہن کے گھر گئی تو میری تمہاری ختم'' نیت طلاق کی تھی اور پھر تیسری مرتبہ کسی موقع پر بیوی سے کہا میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، اس شخص کی دو سالیاں ہیں ایک کراچی میں رہتی ہے اور دوسری حیدرآباد میں اس شخص کا کہنا ہے کہ جب میں نے یہ الفاظ کہے تھے ''اگر تم اپنی بہن کے گھر گئی تو میری تمہاری ختم'' تو میری نیت طلاق کی تھی اور میری مراد کراچی میں رہنے والی سالی تھی۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ مذکورہ صورت میں شوہر اپنی بیوی کو اپنی اس سالی کے گھر جو کراچی میں رہتی ہے لیجانا چاہتا ہے کیونکہ اسکی سالی کو عمرہ پر جانا ہے اور طلاق والی بات شوہر اور بیوی ہی کو معلوم ہے کسی اور کو خبر تک نہیں اگر یہ بیوی کو نہیں لیجاتا تو پورے خاندان کو پتہ چل سکتا ہے اور بڑے مسائل کھڑے ہو سکتے ہیں، کیا یہ ممکن ہے کہ اس شخص کی بیوی اپنی والدہ کے گھر میں اپنی بہن سے ملاقات کرلے؟ یا یہ ممکن ہے کہ مذکورہ بیوی اپنی بہن سے اسکے سسرال کے گھر میں ملاقات کرلے؟ جبکہ اسکی بہن اور اسکا شوہر اس گھر میں اوپر والی منزل میں رہتے ہیں یا اس مسئلہ کا کوئی حل ہے؟ تو قرآن وحدیث کی روشنی میں بتائیں۔ مستفتی: عمران خواجہ ناظم آباد کراچی

﴿جواب﴾ بیان کردہ صورت میں آپکی بیوی کو دو طلاقیں واقع ہو چکی ہیں اور تیسری طلاق بہن کے گھر میں داخل ہونے کے ساتھ معلق ہے، آپ کی بیوی جب بھی بہن کے گھر میں داخل ہوگی تو تیسری طلاق واقع ہو کر حرمت مغلظہ ثابت ہو جائے گی، اسلئے اسمیں خوب احتیاط رہے، البتہ اگر آپ کی بیوی بہن کے گھر کے علاوہ کہیں اور ملاقات کرلے تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔

لما فی قوله تعالیٰ:(سورة البقرة، آیت ۲۲۹): ﴿الطلاق مرتان ---الآية﴾

ولما فی الهداية:(۲/۳۹۸، طبع رحمانیه)

واذا اضافه الی شرط وقع عقيب الشرط مثل ان يقول لامرأته ان دخلت الدار فانت طالق.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: محمد طیب حسن زکی

۱۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ | فتویٰ نمبر: ۲۱۷۵

﴿طلاق معلق کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بھتیجا چچا کی گاڑی چلا رہا تھا کسی بات پر وہ ناراض ہوگیا اور کہا پشتو میں "کہ مادترہ گاڈے پہ ٹخہ او چلولو نو حماسے تہ دری طلاقہ" یعنی اگر میں نے چچا کی گاڑی مستقل چلائی تو میری بیوی کو تین طلاق اس کے بعد اس نے چند روز یا کچھ عرصہ کے لیے گاڑی چلائی تو آیا اس کی بیوی کو تین طلاق واقع ہو جائے گی یا نہیں؟

واضح رہے کہ مذکورہ الفاظ (پہ ٹخہ) بولنے والے کے عرف میں تاحیات کسی کام کے کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

وضاحت: مذکورہ الفاظ سے آپ کی مراد کتنی مدت گاڑی چلانا تھی؟

جواب: میری مراد مستقل تاحیات گاڑی چلانے کی تھی چند مہینے یا کچھ عرصہ کی نہیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ الفاظ سے واقعی اگر حالف کے عرف میں تاحیات چلانا مراد لیا جاتا ہے اور اس کی نیت بھی تاحیات نہ چلانے کی تھی تو اس صورت میں چند روز یا کچھ عرصہ گاڑی چلانے سے طلاق واقع نہیں ہوئی، البتہ احتیاط کا تقاضا تو یہی ہے کہ یہ شخص اس کے بعد چچا کی گاڑی نہ چلائے۔

لما فی فتح القدیر:(۵/۹۱،طبع رشیدیہ)

ان الایمان مبنیّۃ علی العرف عندنا۔لان المتکلم انما یتکلم بالکلام العرفی أعنی الالفاظ التی یراد بہا معانیہا التی وضعت لہا فی العرف۔

ولما فی المحیط البرہانی :(۶/۲۲۹،طبع بیروت)

الفعل اذا اضیفت الی وقت کان ذکر الوقت لتقدیر الفعل بہ لالکونہ ظرفاً فیشترط الوجود فی جمیع المدۃ ۔

وفیہ ایضاً(ص:۲۲۵،الفصل الثالث وعشرون ،طبع بیروت)

فصل فی الحنث ما یقع علی الابد وما یقع علی الساعۃ ۔اذاقال الرجل ان صمت الابد فعبدی حرّ لایحنث فی یمینہ ما لم یصم العمر کلہ حتی یموت واذا مات ولم یفطر یوماً حنث فی یمینہ ۔ثم فی قولہ ان صمت الابد لایحکم بالحنث مادام حیاً لان شرط البرّ موہوم مادام حیاً بان یفطر یوماً فان انتہی الی آخر جزء من اجزاء حیاتہ وہو صائم وقع الیأس عن البرّ فیتحقق شرط الحنث فیحنث ویعتق العبد فی آخر جزء من اجزاء حیاتہ ۔

ولما فی الهندیه:(۱/۴۲۰،طبع رشیدیه)

واذا اضافه الی الشرط وقع عقیب الشرط اتفاقاً.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:محمد تنویر عفااللہ عنہ

یکم رجب ۱۴۳۴ھ　　　　فتویٰ نمبر:۳۸۲۲

﴿وقوع طلاق کو گھر میں داخلہ کیساتھ مشروط کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بہن سے کہا کہ اگر تو میرے گھر میں آئی تو میری بیوی کو طلاق ہے پھر اسکی بہن اس شخص کی عدم موجودگی میں اسکے گھر آئی، کیا اس صورت میں اس شخص کی بیوی پر طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ واضح رہے کہ گھر اس شخص کا اپنا ذاتی ہے، بہن یا والد وغیرہ کا حصہ نہیں ہے۔ مستفتی: قاری ساجد احمد

﴿جواب﴾ تعلیق طلاق کے بعد واقعی اس شخص کی یہی بہن بھائی کے گھر میں اگر داخل ہوگئی ہے تو اس شخص کی بیوی پر طلاق واقع ہوگئی ہے، طلاق واقع ہونے کیلئے اس شخص کا گھر میں موجود ہونا ضروری نہیں ہے، لہٰذا اس شخص نے ایسا ہی اگر بولا تھا جس طرح سوال میں ذکر ہے تو صرف ایک طلاق رجعی واقع ہوگئی ہے، عدت گذرنے سے پہلے پہلے شوہر رجوع کرسکتا ہے اور عدت گذرنے کی صورت میں باہمی رضامندی سے نئے حق مہر کے ساتھ بغیر حلالہ کے تجدید نکاح کرسکتے ہیں۔

رجوع اسی طرح تجدید نکاح کی صورت میں بھی شوہر کے پاس اب صرف دو طلاق کا حق باقی رہیگا، زندگی بھر کسی بھی وقت مزید دو طلاقیں اگر دیدی تو طلاق مغلظہ واقع ہوگی اور بغیر حلالہ شرعیہ کے تجدید نکاح بھی نہ ہوسکے گا، لہٰذا احتیاط رہے۔

لما فی الهدایة:(۲/۳۹۸،طبع رحمانیه لاهور)

واذا اضافه الی الشرط وقع عقیب الشرط مثل ان یقول لامرأته ان دخلت الدار فانت طالق وهذا بالاتفاق.

ولما فی الهندیة:(۱/۴۲۰،طبع رشیدیه)

اذا اضافه الی الشرط وقع عقیب الشرط اتفاقا مثل ان یقول لامراته ان دخلت الدار فانت طالق.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۱۰ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ　　　　فتویٰ نمبر:۲۵۱۵

﴿پردے پر طلاق معلق کیا تو اعتبار عرفی پردہ کا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر تو بغیر پردے کے گھر سے نکلی تو تجھے تین طلاق ہیں پھر وہ اس طرح چادر اوڑھ کر نکل گئی کہ اگر سامنے سے کوئی دیکھے تو اس کا چہرہ نظر آئے پوچھنا یہ ہے کہ آیا چہرہ شرعی پردے میں داخل ہے یا نہیں اگر داخل ہے تو اس کو طلاق ہوئی ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ چہرہ شرعی پردہ میں داخل ہے اور چادر اوڑھنے سے بھی ایک حد تک پردہ ہو جاتا ہے بشرطیکہ متعارف طریقہ سے چادر اوڑھ کر نکلے اگرچہ برقعہ کی طرح پردہ نہیں ہوتا آپ کے علاقے میں چادر اوڑھنا پردہ کیلئے اگر رائج ہے اور لوگ ایسے نکلنے کو باپردہ نکلنا شمار کرتے ہیں تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی اس لئے کہ ایمان اور طلاق میں عرف کا اعتبار ہوتا ہے بشرطیکہ کہنے والے نے اسکے خلاف نیت نہ کی ہو۔

اور اگر اس طرح نکلنا آپ کے علاقے میں بے پردہ شمار ہوتا ہے تو ایسی صورت میں تینوں طلاق واقع ہوگئی ہیں اب رجوع نہیں ہوسکتا اور حلالہ شرعیہ کے بغیر دوبارہ نکاح بھی نہیں ہوسکتا۔

لما فی تفسیر ابن کثیر (۲۳۱/۵ طبع رشیدیه)

وقال محمد بن سیرین سالت عبیدة السلمانی عن قول الله تعالٰی (یدنین علیهن من جلٰبیبهن) فغطی وجهه وراسه وابرز عینه الیسری.

ولما فی احکام القرآن للتانوی (۳۱۶/۳ طبع ادارة القرآن والعلوم الاسلامیه)

(الثانیه) وجوب ستر الوجه للنسآء اذا خیف الفتنه،

ولما فی الشامی (۷۹/۲ طبع امدادیه)

(تمنع المرأة الخ) أی تنهی عنه وان لم یکن عورة وقوله: (بل لخوف الفتنه) أی الفجور بها. قاموس. أو الشهوة. والمعنی تمنع من الکشف لخوف أن یری الرجال وجهها فتقع الفتنة، لانه مع الکشف قد یقع النظر الیها بشهوة.

ولما فی الدر المختار (۵۲۷/۵ طبع امدادیه)

الاصل أن الأیمان مبنیة عند الشافعیؒ علی الحقیقة، وعند مالکؒ علی الاستعمال القرآنی، وعند احمدؒ علی النیة، وعندنا علی العرف، مالم ینو مایحتمله اللفظ فلا حنث فی لا یهدم الا بالنیة.

ولما فی الشامی (۵۲۸/۵ امدادیه)

فاما الفرع المذکور فالوجه فیه: ان کان نواه فی عموم قوله بیتاً حنث، وان کان لم یخطر

له فلا لانصراف الكلام الى المتعارف عند اطلاق لفظ بيت فظهر ان مرادنا بانصراف الكلام الى العرف اذا لم تكن له نية،وان كان له نية شئى و اللفظ يحتمله انعقد اليمين باعتباره.

ولما فى بحر الرائق(۴/۲۹۸، طبع ایچ ایم سعید)

واما الفرع المذكور فالوجه فيه انه ان كان نواه فى عموم بيتاً حنث وان لم يحظر له وجب ان لا يحنث لانصراف الكلام الى المتعارف عند اطلاق لفظ بيت و ظهر ان مرادنا بانصراف الكلام الى العرف انه واذا لم يكن له نية كان موجب الكلام ما هو معنى عرفيا ، له وان كان له نية شئى واللفظ يحتمله انعقد اليمين باعتباره.

الجوب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن صاحب عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: دوست محمد دیروی

۶ صفر ۱۴۳۵ھ فتویٰ نمبر ۱۳۸۸

﴿''میری بیوی میرے باپ کی'' کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بیٹے نے کہا میں لاہور جارہا ہوں والد نے کہا آپ لاہور نہیں جاؤ گے بیٹے نے کہا اگر میں لاہور نہیں گیا تو میری بیوی آپ کی۔اب پوچھنا یہ ہے کہ مذکورہ الفاظ سے طلاق واقع ہوگئی یا نہیں؟اگر طلاق واقع ہوگئی تو کونسی طلاق واقع ہوگی؟برائے کرم وضاحت فرما کر ممنون فرمائیں۔ مستفتی:ایک سائل

﴿جواب﴾ بیٹے کا والد سے یوں کہنا کہ ''اگر آج میں لاہور نہیں گیا تو میری بیوی آپ کی'' بے ہودہ جملہ اور لغو الفاظ ہیں ان سے طلاق واقع نہیں ہوگی اگرچہ طلاق کے ارادے سے بولدئے ہوں،ہاں اسطرح بولنا گناہ ہے آئندہ کیلئے احتیاط کرے۔

دراصل طلاق دو طرح کے الفاظ سے واقع ہوتی ہے:

(۱) صریح الفاظ سے جن میں طلاق ہی کا معنی ہو یا عرف میں طلاق کیلئے استعمال ہوں اور لوگ طلاق ہی ان الفاظ سے مراد لیتے ہوں.

(۲) کنائی الفاظ سے جو کہ طلاق کیلئے خاص نہ ہوں البتہ دیگر معانی کے ساتھ انشاء طلاق یا اسکی خبر دینا بھی مراد لیا جاسکتا ہو پھر شوہر کی نیت سے جسکی وہ خود وضاحت کرے یا قرائن سے طلاق مراد لینا متعین ہو،مذکورہ الفاظ نہ صریح ہیں اور نہ کنائی،اس لئے ان الفاظ سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی البتہ ایسا کرنا غلط ہے آئندہ گریز کرے۔

لمافی التنویر مع الدر ج۳/۲۲۶،۲۲۷ طبع سعید

(هو)لغة رفع القيد لكن جعلوه في المرأة طلاقا وفي غيرها اطلاقا فلذا كان انت مطلقة بالسكون كناية ،وشرعا (رفع قيد النكاح في الحال) بالبائن (اوالمئال) بالرجعي (بلفظ مخصوص) هوما اشتمل علي الطلاق فخرج الفسخ كخيار عتق وبلوغ وردة فانه فسخ لا طلاق وبهذا علم ان عبارة الكنز والملتقى منقوضة طردا وعكسا.

ولمافی البدائع :ج ۴/۱۱۲،۱۱۵ طبع دار الكتب العلمية

واما بيان ركن الطلاق : فركن الطلاق هو اللفظ الذى جعل دلالة على معنى الطلاق لغة وهو التخلية والارسال ورفع القيد في الصريح ،وقطع الوصلة ونحوه في الكناية ، او شرعا وهو ازالة حل المحلية في النوعين اومايقوم مقام اللفظ فمثل ان يقول في الكناية انت بائن اوابنتك ،اويقول في الصريح : انت طالق اوطلقتك .

ولمافی الرد :ج۳/۲۹۶طبع سعید

لان ماذكروه في تعريف الكناية ليس على اطلاقه بل هو مقيد بلفظ يصح خطابها به ويصلح لانشاء الطلاق الذى اضمره اوللاخبار بانه اوقعه كانت حرام ـــ حتى لوقال انت يمين لانى طلقتك لايصح فليس كل مااحتمل الطلاق من كنايته بل بهذين القيدين ولابدمن ثالث هو كون اللفظ مسبباعن الطلاق وناشئا عنه كالحرمة في انت حرام

الجواب صحیح :مفتی عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب :عاقل شاہ

۲۲ صفر الخیر ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر :۳۹۲۱

﴿''اگر میں نے یہ باتیں کی ہوں تو مجھ پر طلاق'' کے الفاظ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ میں نے ایک دوست کے متعلق کچھ باتیں کی تھی، اس نے مجھ سے کہا کہ تم نے میرے خلاف باتیں کی ہیں، میں نے جواب میں کہا کہ اگر میں نے یہ باتیں کی ہوں تو مجھ پر طلاق، پشتو کے الفاظ یہ تھے ''پہ ما باندے طلاقہ شوہ'' اس کے بعد میں نے ایک مولوی صاحب سے مسئلہ دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ایک طلاق ہو چکی ہے اور ساتھ ہی فرمایا کہ آپ نے ''یو پہ درے'' تو نہیں کہا یعنی تین کے الفاظ تو نہیں کہے؟ بس ان کے بعد سے مجھے شک اور وسوسہ شروع ہوگیا کہ کہیں یہ الفاظ بولے نہ ہوں، کئی مفتیان کرام سے مسئلہ دریافت کرنے کے باوجود شک اور وسوسہ زائل نہیں ہو رہا۔

﴿جواب﴾ آپ کو کئی مفتیان کرام نے جواب دیدیا ہے، لہٰذا آپ کو اطمینان ہونا چاہیے، لگتا ہے شیطان وہم کے مرض کے ذریعہ آپ کو تنگ کر رہا ہے، شریعت کا صاف ضابطہ ہے کہ

احکام کا مدار یقین پر ہے شک پر نہیں ہے، بلاشبہ آپ کا اصل واقعہ صرف ایک طلاق کا ہے۔

چنانچہ مولوی صاحب کے پاس جانے سے پہلے آپ کو اس طرح کا کوئی وسوسہ اور شک نہیں تھا، مفتی صاحب نے اپنی ذمہ داری کو پورا کرتے ہوئے آپ سے دریافت کیا کہ آپ نے ''پے درپے'' تو نہیں بولا اس کے بعد سے آپ کو اس کا وہم شروع ہوگیا جو کہ خالص شک ہی ہے، لہٰذا اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

لمافی الهندية:(۱/۴۲۰،طبع رشيديه) وإذا أضافه إلى شرط وقع عقيبه اتفاقا ... الخ۔

ولمافی الدر المختار:(۲/۲۸۳،طبع سعيد) لو شک أطلق واحدة أو أكثر بنى على الأقل۔

ولمافی الشامی:(۲/۲۸۳،طبع سعيد)

(قوله بنى على الأقل) أي كما ذكره الاسبيجابي، إلا أن يستيقن بالأكثر أو يكون أكبر ظنه۔

ولمافی الهندية:(۱/۳۶۳،طبع رشيديه)

في نوادر ابن سماعة عن محمد إذا شک في انه طلق واحدة أو ثلاثا فهي واحدة حتى يستيقن أو يكون أكبر ظنه على خلافه۔

ولمافی الاشباه والنظائر:(ص ۶۰ طبع قديمی) القاعدة الثالثة: اليقين لا يزول بالشک۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: عبدالوہاب لقمانی عفا اللہ عنہ

یکم رجب المرجب ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۷۴۸

﴿طلاق معلق کا ایک مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں، کہ زید نے شریف کو 50,00 روپے قرض دیا، شریف نے کہا پورے نہیں دوں گا کچھ کم دوں گا، زید نے کہا پورے دوگے یا میں کچھ بھی نہیں لوں گا، ورنہ پھر میری بیوی کو تین طلاق۔ اسکے بعد زید نے 35,00 روپے لئے، اور شریف کی بیوی کہہ رہی ہے کہ مزید میں دوں گی، اب زید کہہ رہا ہے کہ میں پیسے واپس کروں یا کیا صورت اختیار کروں تاکہ میری بیوی کو طلاق نہ ہو، کیا یہ پیسے لینے سے طلاق ہوئی یا نہیں؟ برائے کرم شریعت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔ مستفتی: حبیب الوہاب

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں زید نے اپنا پورا قرض وصول نہ ہونے پر طلاق کو معلق کیا ہے، اور الفاظ میں بظاہر یکمشت یا متفرق طور پر وصولی کا کوئی ذکر نہیں ہے، اور نہ کسی خاص وقت کو وصولی کے لئے متعین کیا ہے، لہٰذا زید کو اپنا پورا حق وصول ہونا چاہئے یکمشت ہو خواہ متفرق

طور پر، جلدی ہو یا دیر سے، تو کوئی طلاق واقع نہ ہوگی۔ البتہ زید کو اپنا پورا حق اسکی موت تک وصول نہ ہوا تو موت کے وقت اسکی بیوی پر تینوں طلاق واقع ہوں گی۔ تاہم اپنے شوہر کے ترکہ میں وہ اس طلاق کی وجہ سے میراث سے محروم نہیں ہوگی۔

لما فی الهداية: ۲۹۸/۲ طبع رحمانیه

واذا اضافه الی شرط وقع عقيب الشرط مثل ان يقول لأمرء ته ان دخلت الدار فانت طالق وهذا بالاتفاق، لأن الملك قائم فی الحال والظاهر بقاء ه الی وقت وجود الشرط فيصح يميناً أو ايقاعاً.

ولما فی تنوير الأبصار: ۲۹۸/۳ طبع سعيد

الايمان مبنية على الالفاظ لا على الأغراض. وفی الشامية تحته: فصار الحاصل ان المعتبر انما هو اللفظ العرفی المسمّٰی، وأما غرض الحالف فان كان مدلول اللفظ المسمّٰی اعتبر، وان كان زائدا على اللفظ فلا يعتبر ـــــ الأولی: حلف لا يشتريه بعشرة فا شتراه بأحد عشر حنث، لأنه اشتراه بعشرة وزيادة، والزيادة على شرط الحنث لا تمنع الحنث ـــــ لو اشتری بتسعة لم يحنث لانه لم توجد العشرة بنوعيها مع انه وجد الغرض أيضاً لانه مستنقص.

ولما فی رسائل ابن عابدين ۳۰۲/۱ طبع عثمانيه

وان المراد بالغرض ما قصده المتكلم من كلامه سواء كان هو المعنی العرفی الذی استعمل فيه اللفظ او كان معنی عرفياً خارجاً عن اللفظ زائدا عليه وانه بالمعنی الاول يصلح مخصصاً، وبالمعنی الثانی لا يعتبر وهو المعنی بقولهم لا على الاغراض.

ولما فی التنوير مع الدرّ: ۷۵۷/۳ طبع سعيد

حلف ليأتينه فهو أن يأتی منزله ـــــ فلو لم يأته حتی مات أحدهما حنث فی آخر حياته وكذا كل يمين مطلقة. وفی الشامية تحته: وأصل هذا ان الحالف فی اليمين المطلقة لا يحنث ما دام الحالف والمحلوف عليه قائمين لتصور البر فاذا مات احدهما فانه يحنث.

ولما فی التنوير مع الدرّ أيضاً: ۳۹۱،۳۹۰/۳ طبع سعيد

والحال ان التعليق والشرط فی مرضه أو علّق طلاقها بفعل تفعله هما فی المرض أو الشرط فقط فيه ـــــ ورثت لفراره، وعنه ما فی البدائع: ان لم أطلقك او ان لم أتزوج عليك فانت طالق ثلاثاً فلم يفعل حتی مات ورثته، ولو مات هی لم يرثها.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۲۵ صفر ۱۴۲۰ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۳۵۵۶

﴿کلما کیساتھ قسم میں نکاح کا طریقہ کیا ہوگا؟﴾

﴿سوال﴾ من حلف كلما تزوجت امرأة فهی طالق قال الفقهاء ان اجاز نكاح

الفضولی بالفعل لایحنث ولکن ان طلقهابعد ذالک لم اراد ان ینکحهاالهل یحتاج الی الحیلة المذکورة ثانیاام لا؟ مستفتی :عبدالله التاجکستانی

﴿جواب﴾نعم یحتاج الی اجازة نکاح الفضولی بالفعل ثانیافی هذه الصورة لان کلمة کلماتقتضی عموم الافعال فاذادخلت علی التزویج لاینحل الیمین ولو کان بعدزوج آخرلدخوله علی سبب الملک وهو غیرمتناه وان کان الحالف من ابناء الفارس فقوله"هربار"یکون بمعنی کلماوفی غیرهامثلاًهر گاه هرزمان وهمیشه یکون للمرة الواحدة.

لمافی التنویرمع الدر:(۲/۲۰۵،طبع امدادیه)

(وفیها)کلها(تنحل)ای:تبطل(الیمین)ببطلان التعلیق(اذاوجدالشرط مرة الافی کلما فانه ینحل بعدالثلاث)لاقتضائهاعموم الافعال کاقتضاء کل عموم الاسماء.(فلایقع ان نکحهابعدزوج آخرالااذادخلت)کلما(علی التزویج نحوکلماتزوجت فانت کذا) لدخولهاعلی سبب الملک وهوغیرمتناه.

ولمافی الهندیة:(۱/۴۱۹،طبع رشیدیه)

ولوتزوجهامن غیران یأمراحدالاتطلق وان امربعدذلک فقال زوجنی فلانة وهی امرأته علی حالهاطلقت.

ولمافی خلاصة الفتاوی:(۲/۱۴۰،طبع رشیدیه)

ههناستة الفاظ اگروهمی وهمیشه وهرگاه وهرزمان وهربارفالاول وهوقوله اگر فارسیة ان فلایحنث الامرة وهمی ای هی وهمیشه بمنزلة متیماولایحنث فیهاالا مرة وهرگاه وهرزمان المختارانه یحنث مرة وفی قوله هرباریحنث بکل مرة.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب :معراج الدین غفراللہ لہ

۲۶ جمادی الاولی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۴۹۷

﴿تکرار طلاق سے تاکید مراد لینا دیانۃً معتبر ہے قضاءً نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے دومرتبہ اپنی بیوی سے کہا کہ اگر تو چھت پر چڑھی تو تجھے طلاق ہے اور دومرتبہ عورت کے رشتہ داروں کے سامنے کہا کہ تم سن لو اگر یہ چھت پر چڑھی تو اسے طلاق ہے پھر وہ شخص کسی کام سے باہر چلا گیا اور عورت کسی ضرورت سے چھت پر چڑھ گئی تو اس صورت میں کتنی طلاقیں واقع ہوں گی؟

﴿جواب﴾ صورتِ مسئولہ میں دوسری مرتبہ اپنی بیوی سے اور تیسری بار رشتہ داروں کے

سامنے یہ الفاظ کہنے سے اگر اس شخص کی مراد پہلے جملہ کی تاکید ہے تو دیانۃً صرف ایک طلاق واقع ہوئی ہے دورانِ عدت شوہر کو رجوع کا حق حاصل ہے اور مزید دو طلاقوں کا حق باقی رہے گا اور اگر تاکید مراد نہیں ہے بلکہ ہر بار الگ اور مستقل طلاق کا ارادہ تھا تو وقوعِ شرط کے بعد تین طلاقیں واقع ہوگئی ہیں اس صورت میں بغیر حلالہ شرعیہ کے پہلے شوہر سے تجدید نکاح بھی جائز نہیں ہے۔

لما في الدر مع الرد:۳/۲۵۲،طبع: سعيد)

(تنحل)اى تبطل (اليمين) ببطلان التعليق (اذا وجد الشرط مرة الا في كلما فانه ينحل (قوله اى تبطل اليمين)اى تنتهي وتتم واذا تمت حنث فلا يتصور الحنث ثانيا الا بيمين اخرى لانها غير مقتضية للعموم والتكرار لغة نهر.

ولما في الهندية:۱/۴۲۰،طبع رشيدية)واذا اضافه الى شرط وقع عقيبه اتفاقا۔

ولما في البحر الرائق:۴/۱۲،طبع سعيد)

(قوله ففيها ان وجد الشرط انتهت اليمين)اى في الفاظ الشرط ان وجد المعلق انحلت اليمين وحنث وانتهت لانها غير مقتضية للعموم والتكرار لغة فبوجود الفعل مرة يتم الشرط ولا يتم بقاء اليمين بدونه واذا تم وقع الحنث فلا يتصور الحنث مرة اخرى الا بيمين اخرى او بعموم تلك اليمين۔

ولما في تنقيح الحامدية:۱/۳۷،طبع حقانية)

وقال في الخانية لو قال انت طالق انت طالق انت طالق وقال اردت به التكرار صدق ديانةً وفي القضاء طلقت ثلاثا ومثله في الاشباه والحدادي وزاد الزيلعي ان المرأة كالقاضي فلا يحل لها ان تمكنه اذا سمعت منه ذلك او علمت به لانها لا تعلم الا الظاهر۔

ولما في التنوير مع الرد:۳/۷۴۳،طبع سعيد)

الأيمان مبنية على الالفاظ لا على الاغراض اى المقاصد والنيات۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: عمر فاروق لاہوری

۷ رجب المرجب ۱۴۳۲ھ | فتویٰ نمبر: ۳۸۳۹

﴿معلق طلاق مغلظہ سے بچنے کی ایک تدبیر﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے یہ الفاظ کہے کہ اگر میں فلاں شخص کے ساتھ کاروبار کروں تو میری بیوی کو تین طلاق، اب وہ شخص اس کے ساتھ کاروبار کرنا چاہتا ہے، ایک مولوی صاحب نے یہ صورت بتائی کہ ایک طلاق بائن دو، اس کے بعد عدت میں باقی طلاقیں بھی دیدو، اس سے طلاقیں ختم ہو جائے گی اور اس کے بعد آپ

اس شخص کے ساتھ کاروبار کرسکتے ہیں۔اس شخص نے پہلے ایک طلاق رجعی دی ہے، اس کے بعد رجوع بھی کرلیا ہے، ایسے شخص کے بارے میں کیا حکم ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں تین طلاقوں کو کاروبار کے ساتھ معلق کیا ہے، لہٰذا بیوی کے نکاح میں ہوتے ہوئے یہ شخص اگر کاروبار کرلیتا ہے تو تینوں طلاقیں واقع ہوکر طلاق مغلظہ واقع ہوجائے گی۔

تین طلاقوں کے وقوع سے بچنے کی یہ صورت ہوسکتی ہے کہ کام شروع کرنے سے پہلے طلاق بائن دیدے اور عورت پوری عدت گزارلے، اس کے بعد یہ شخص کاروبار کرلے، اس سے وہ شرط تو پوری ہوجائے گی، لیکن طلاقیں (جو باقی بچیں ہیں) وہ واقع نہیں ہوں گی؛ اس لئے کہ اب وہ اس کے نکاح سے نکل چکی ہے اور عدت ختم ہوجانے کی وجہ سے طلاق واقع ہونے کے لئے محل باقی نہیں رہا، اس کے بعد نئے حق مہر کے ساتھ تجدید نکاح کرے۔

باقی مولوی صاحب کا یہ کہنا کہ عدت کے اندر ہی وہ کام (کاروبار) کرلے، یہ غلط ہے؛ اس لئے کہ دوران عدت نکاح من وجہ باقی رہتا ہے، طلاق واقع ہوسکتی ہے اس لئے عدت کے بعد ہی اس شخص کے ساتھ کاروبار کرے، ورنہ طلاقیں واقع ہوجائیں گی۔

اب چونکہ وہ شخص ایک طلاق رجعی دیکر رجوع کرچکا ہے؛ اس لئے مذکورہ بالا صورت اختیار کرنے کی صورت میں صرف ایک طلاق کا مالک رہے گا، اس لئے کہ اس صورت کو اختیار کرنے سے ایک طلاق بائن واقع ہوجائے گی اور ایک وہ پہلے بھی دے چکا ہے؛ لہٰذا ایک طلاق جو باقی تھی صرف اسی کا مالک رہے گا، زندگی میں کبھی بھی اس نے ایک طلاق مزید اگر دیدی تو طلاق مغلظہ واقع جائے گی، پھر وہ رجوع نہیں کرسکے گا اور حلالہ شرعیہ کے بغیر دوبارہ نکاح بھی نہیں کرسکے گا، لہٰذا احتیاط رہے۔

لما فی الدر المختار، (باب التعلیق، ۳/۳۵۵، طبع: سعید)

"فحیلة من علق الثلاث بدخول الدار ان یطلقها واحدۃ ثم بعد العدۃ تدخلها فتنحل الیمین فینکحها".

ولما فی الدر المختار، (۳/۲۱۳، طبع: سعید)

"(وکل فرقة هی طلاق یقع) الطلاق (فی عدتها) ـــــ فروع: انما یلحق الطلاق لمعتدۃ

الطلاق". قال ابن عابدين رحمه الله : فصار الحاصل ان الطلاق يلحق في عدة فرقة عن طلاق او اباء او ردة بدون لحاق بدار الحرب".

ولما في الشامي :(۳۰۶/۳، طبع سعيد)

"(الصريح يلحق الصريح)ويلحق البائن (بشرط العدة)هذا الشرط لا بدمنه في جميع صور اللحاق فالاولیٰ تاخيره عنها".

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: کمیل الدین گلگتی

۱۹ صفر الخیر ۱۴۳۴ھ　　فتویٰ نمبر: ۳۵۲۸

﴿طلاق مکرہ کا بیان﴾

﴿زبردستی دلوائی گئی طلاق کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ایک دوست کو ان کے سسرال والوں نے ڈرا دھمکا کر اس سے زبردستی طلاق مغلظہ دلوائی، کیا اس طرح طلاق واقع ہو جاتی ہے؟　　مستفتی رئیس احمد کورنگی ا

﴿جواب﴾ ہوش و حواس میں ہوتے ہوئے زبان سے طلاق دینے کی صورت میں طلاق واقع ہو جاتی ہے خواہ اپنی مرضی و خوشی شامل نہ ہو، لہٰذا مذکورہ صورت میں اگر چہ زبردستی طلاق دلوائی ہے طلاق واقع ہوگئی ہے، اب رجوع نہیں ہو سکتا اور حلالہ شرعیہ کے بغیر دوبارہ نکاح بھی نہیں ہو سکتا، عدت گزار کر مطلقہ خاتون دوسری جگہ چاہے تو نکاح کر سکتی ہے۔

لما في سنن ابي داؤد:(۲۱۶/۱،طبع رحمانيه)

عن ابي هريرة ان رسول الله ﷺ قال ثلث جدهن جد وهزلهن جد النكاح والطلاق والرجعة.

ولما في التنوير مع الدر:(۲۳۵/۲،طبع امداديه)

(ويقع طلاق كل زوج بالغ عاقل)ولو تقديرا بدائع ،ليدخل السكران (ولو عبدا أو مكرها) فان طلاقه صحيح لا اقراره بالطلاق.

ولما في البحر:(۲۴۵/۳،طبع سعيد)

(قوله ولو مكرها)اي ولو كان الزوج مكرها علىٰ انشاء الطلاق لفظا.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: خلیل اللہ ویروی عفا اللہ عنہ

۲۹ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ　　فتویٰ نمبر: ۱۳۷۸

﴿کچھ کہے بغیر زبردستی طلاق نامہ پر انگوٹھا لگوانے سے طلاق واقع نہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ ایک آدمی کا اپنی بیوی سے معمولی نوعیت کا جھگڑا ہوا، بیوی ناراض ہوکر اپنے والدین کے گھر چلی گئی، اب لڑکی کے والدین اسے واپس اپنے شوہر کے گھر نہیں جانے دے رہے، یہ آدمی خود اسے لینے گیا تو لڑکی کے والدین نے زبردستی اس سے طلاق نامہ پر انگوٹھا لگوالیا اور دستخط وغیرہ کروالئے، پوچھنا یہ ہے کہ کیا اسطرح طلاق واقع ہوجائے گی؟ حالانکہ اس آدمی نے زبان سے طلاق کے الفاظ نہیں کہے اور نہ وہ اس پر راضی ہے۔

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اس آدمی کی بیوی پر طلاق واقع نہیں ہوئی کیونکہ اس آدمی نے زبان سے طلاق نہیں دی اور زبردستی اس سے طلاق نامہ پر دستخط وغیرہ لئے گئے ہیں اور زبردستی کی صورت میں طلاق نامہ لکھنے یا اس پر دستخط کرنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی کیونکہ تحریر ضرورت کے وقت قائم مقام عبارت کے ہوتی ہے اور یہاں کوئی ضرورت نہیں ہے شامی میں طلاق مکرہ کے بیان میں ہے:

لمافی الدر المختار:(۲/۲۳۶ طبع سعید)

وفی البحر أن المراد الاکراہ علی التلفظ بالطلاق،فلو اکرہ علی أن یکتب طلاق امرأته فکتب لاتطلق،لأن الکتابة أقیمت مقام العبارة باعتبار الحاجة ولا حاجة هنا کذا فی الخانیة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم:شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

۳۰ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتوی نمبر:۵۰۱

﴿زبردستی طلاق لینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بیٹی کا نکاح بچپن ہی میں کروادیا تھا، لڑکی کے بالغ ہونے کے بعد والد نے رخصتی سے انکار کردیا تو اس مرد نے دوسری جگہ شادی کرلی، اس وقت اس کے آٹھ بچے ہیں، اب وہ لڑکی اس مرد کے پاس جانے کے لئے تیار نہیں ہے اور طلاق لینا چاہتی ہے تو کیا شرعاً اس لڑکی کو طلاق لینے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ اور اگر مرد سے زبردستی طلاق لی جائے تو طلاق اس صورت میں واقع ہوگی یا نہیں؟

﴿جواب﴾ باپ، دادا اپنی نابالغ لڑکی کا نکاح کسی سے کردیں جس میں والد یا دادا کی ذاتی

لالچ یا سوء اختیار بھی نہ ہو تو بالغ ہونے کے بعد لڑکی اگر چہ راضی نہ ہو تو بھی یہ نکاح قائم رہتا ہے، شوہر سے طلاق یا خلع لئے بغیر ختم نہیں ہو سکتا، لڑکی کے والد نے رخصتی سے انکار کر دیا تھا جس کی وجہ سے شوہر نے دوسری جگہ شادی کر لی تو یہ زیادتی لڑکی کے والد کی طرف سے ہے، لڑکی کو چاہیے کہ رخصتی کے لئے آمادہ ہو جائے اگر چہ شوہر نے دوسری شادی کر لی ہے، البتہ شوہر کو اب اس کی طرف اگر رغبت نہیں ہے یا دونوں کا ایک ساتھ بوجھ برداشت نہیں کر سکتا یا مساوات قائم نہیں کر سکتا تو ایسی صورت میں شوہر کو چاہیے کہ اس کو فارغ کر دے یا کم از کم خلع کر لے ورنہ تو ظلم ہوگا اور ظلم کی صورت میں لڑکی عدالت سے رجوع کرے تا کہ عدالت کے ذریعے حق زوجیت حاصل کر سکے یا قید نکاح سے خلاصی حاصل کر سکے، زبردستی طلاق لینے کی دین اسلام ہرگز اجازت نہیں دیتا اگر چہ بعض صورتوں میں زبردستی لی ہوئی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

لما في التنوير:(۳/ص ۶۶ طبع سعید)

وللولي انكاح الصغير والصغيرة ولوثيباً ولزم النكاح ولو بغبن فاحش او بغير كفء ان كان الولي اباً او جداً لم يعرف منهما سوء الاختيار.

ولما في الهداية:(۲/۲۵۸ طبع رحمانيه)

فان زوجها الأب أو الجد يعني الصغير والصغيرة فلا خيار لهما بعد بلوغهما.

ولما في تكملة فتح الملهم:(۱/۱۳۲ طبع دار العلوم كراچی)

ولكنها لم تسد باب الفرقة من جهة المرأة بالكلية و اذا ابا حت لها ذلك في ظروف خاصة، فيمكن لها مثلاً ان تعقد النكاح بشرط تفويض الطلاق اليها ولو لم تشترط ذلك في العقد فلها أن تختلع من زوجها برضاه، وان لم يكن ذلك فلها أن تطلب من القاضي فسخ النكاح اذا كان زوجها عنيناً او مجنوناً او متعنتاً او مفقوداً.

ولما في قوله تعالىٰ:(سورة آل عمران، آيت ۲۲۹)

فان خفتم أن لا يقيما حدود الله فلا جناح عليهما فيما افتدت به...... الآية.

ولما في تنوير الابصار:(۳/۲۳۵ طبع سعيد)

ويقع طلاق كل زوج بالغ عاقل ولو عبداً او مكرهاً.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد کاشف عزیز

۷ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۱۲۷

مجنون، معتوہ، نابالغ اور بے ہوش کی طلاق کا بیان

بسم الله الرحمن الرحيم

ما رايكم! رحمكم الله

فى الجواب الذى كتبه الشيخ ابو بكر الجزائرى المدرس بالمسجد النبوى الشريف. عن حكم طلاق الغضبان والى حضرتكم نص تلك الفتوى برفق هذه الورقة. والشيخ استدل بالحديث المشهور. فالرجاء من تكرمكم ان تفيدونا بما هو الراجح عندكم بناءً على الادلة الشرعية من القران والحديث والاجماع مع شرح معنى الحديث الذى ذكره الشيخ فى هذه المسئلة.

ولكم منا جزيل الشكر وعظيم المنه

المستفتى: عبدالنصير عفى عنه القدير المسجد البخارى. سهراب گوٹھ كراچى ۳۸

(بسم الله الرحمن الرحيم)

الحمد لله و الصلاة والسلام على رسول الله

و بعد

ان طلاق الغضبان انما اشتد به الغضب فاصبح لا يميز بحيث لا يشعر بما قال فهذا بالاجماع ان طلاقه لايقع لقول الرسول صلى الله عليه و آله و صحبه وسلم "لا طلاق ولا عتاق فى اغلاق" والاغلاق هو الغضب الشديد. والحديث صحيح رواه غير واحد من اصحاب السنن والمسانيد.

ابو بكر جابر الجزائرى المدرس بالمسجدالنبوى الشريف

الجواب احامداً ومصلياً

ورد هذا الحديث بلفظ "لا طلاق و لا عتاق فى اغلاق "فى غير واحد من كتب الحديث واسناده صحيح، و لفظ ابى داود "فى غلاق" بدون الف و فى سنده محمد بن عبيد بن ابى صلاح قال الحافظ فى التقريب : هو ضعيف

الحديث الخ وعنى الائمة الثلاثة سوى الامام الاعظم رحمهم الله "باغلاق و غلاق" الكره فلا يقع طلاق المكره عندهم ،و قال الامام ابو داود رحمه الله "الغلاق" اظنه فى الغضب و قال الشيخ زكريا رحمه الله فى تعليقه على "بذل المجهود" ...."جزم الحافظ ان روايةابى داود بلفظ غلاق بدون الف بمعنى الغضب و حكى البيهقى انه روى على الوجهين و عند ابن ماجه بلفظ اغلاق بمعنى الكره و غلط من قال :الاغلاق الغضب :٦٨٣ ج ١٠ فالانسب فى هذالمقام للشيخ ابو بكر جابر الجزائرى ان يستشهد برواية ابى داود بلفظ غلاق ليطابق الدليل المدلول.

اما الكلام فى طلاق الغضبان ففيه تفصيل والغضب كيفية تطرء العبد ولها مراتب فيختلف حكمه باعتبار شدتهاوضعفها و المرء لا يطلق عادة الا فى الغضب فلو افتى بعدم وقوعه مطلقافى حالة الغضب لم يقع طلاق كما ياتى فى كلام ابن السيد فالحكم على عدم وقوع الطلاق فى حالة الغضب مطلقاً ليس بمدلول الحديث و لم يذهب اليه واحدمن الائمة المقتدى بهم رحهم الله تعالى.

ثم قسم اهل العلم الغضب الى ثلثة اقسام .الاول:ان يحصل له مبادى الغضب بحيث لم يتغير عقله فيعلم ما يقول و يقصد فاتفقوا على وقوع طلاقه فى هذه الصورة.والثانى:ان يبلغ النهاية فلا يعلم ما يقوله و لايريد فاتفقوا على عدم وقوع الطلاق فى هذه الصورة ،و اشكل الحكم فى الثالث اى الدائر بين المرتبتين بحيث لم يصر كالمجنون فيعلم ما يقول من الفاظ الطلاق ولكن لا يقصدبها طلاق زوجته بل جرت الفاظ الطلاق على لسانه من شدة الغضب لا عن روية و فكر كالمخطى جرى على لسانه لفظ الطلاق فهو يعلم ما يتلفظ به و لكن لم يكن اراده و الفتوى فى هذه الصورة عندالحنفية رحمهم الله انه يصدق ديانة فلايقع طلاقه فيمابينه و بين الله تعالى ولو رفع الى القاضى يحكم بوقوعه والمرأة فى حكم الطلاق كالقاضى عندنا فلو سمعت الفاظ الطلاق لم يسع لها ان تعامله معاملة الزوجة مع الزوج بل وجب عليها التجنب منه.

لمافى بذل المجهود:(٢٨٣/١٠)

قال الشيخ خليل احمدؒ فى بذل المجهود شرح للسنن للامام ابى داؤد :وقال الشوكانى

فی الذیل بقوله فی اغلاق ـــ فسره علماء الغریب بالاکراه روی ذلک فی التلخیص عن ابن قتیبة والخطابی وابن السید وغیره وقیل الجنون واستبعده المطرزی وقیل الغضب وقع ذلک فی سنن ابی داؤد وفی روایة ابن الاعرابی وکذا فسره احمد وردہ ابن السید فقال: لو کان کذلک لم یقع علی احد طلاق لان احدا لا یطلق حتی یغضب ـــ الی ان قال قال ابو داود "الغلاق اظنه فی الغضب" ولعله عند المصنف للطلاق الموقع فی حالة الغضب الذی یغلق العقل لا یقع.

لما فی الشامیه ۲/۲۲۲)

قال ابن عابدین رحمه الله تعالی: والذی یظهر لی ان کلا من المدهوش والغضبان لا یلزم فیه ان یکون بحیث لا یعلم ما یقول بل یکتفی فیه بغلبة الهذیان واختلاط الجد بالهزل کما هو المفتی به فی السکران علی مامر ـــ فالذی ینبغی التعویل علیه فی المدهوش ونحوه اناطة الحکم بغلبة الخلل فی اقواله وافعاله الخارجة عن عادته وکذا یقال فیمن اختل عقله لکبر أو لمرض أو لمصیبة فاجأته: فما دام فی حال غلبة الخلل فی الاقوال والافعال لا تعتبر اقواله وان کان یعلمها ویریدها لان هذه المعرفة والارادة غیر معتبرة لعدم حصولها عن ادراک صحیح کما لا تعتبر من الصبی العاقل

ولما فی الاشباه والنظائر ۱/۳۸)

وفی "الاشباه والنظائر" تحت "القاعدة الاولی" وفی عبارة بعض الکتب ان طلاق المخطی واقع قضاء لا دیانة، فظهر بهذا ان الصریح لا یحتاج الیها قضاء ویحتاج الیها دیانة ـــ

ولما فی فتح القدیر ۳/۳۵۲)

وقال الامام ابن الهمام رحمه الله: والذی یظهر من الشرع ان لا یقع بلا قصد لفظ الطلاق عند الله تعالی وقوله فیمن سبق لسانه واقع ای قضاء ـــ وسیذکر فی انت طالق اذا نوی به الطلاق من الوثاق یدین فیما بینه وبین الله تعالی مع انه اصرح صریح فی الباب ثم لم یعارض ذالک قوله ولا یحتاج الی النیة لان المعنی لا یحتاج الی النیة بمعنی اللفظ بعد القصد الی اللفظ، والحاصل انه اذا قصد السبب عالماً بانه سبب رتب الشرع حکمه علیه اراده او لم یرده الا ان اراده ما یحتمله واما انه اذا لم یقصده او لم یدر ماما هو فیثبت الحکم علیه شرعاً وهو غیر راض بحکم اللفظ ولا باللفظ فما ینبو عنه قواعد الشرع وقد قال تعالی: لا یؤاخذ کم الله باللغو فی ایمانکم وفسر بامرین ـــ واما ما روی عنهما نصیر من ان من اراد ان یتکلم فجری علی لسانه الطلاق یقع دیانة وقضاء فلا یعول علیه

وفیه: وکل ما لا یدینه القاضی اذا سمعته منه المرأة أو شهد به عندها عدل لا یسعها ان تدینه لانها کالقاضی لا تعرف منه الا الظاهر (۳/۳۵۳)

وفی "العقود الدریة فی تنقیح الفتاوی الحامدیه" وزاد الزیلعی ان المرأة کالقاضی

فلا یحل لها ان تمکنه اذا سمعت منه ذالک أو علمت به لانها لا تعلم الا الظاہر (تنقیح الفتاوی الحامدیہ ص ۳۸)

الجواب صحیح: بندہ محمد اسماعیل عفی عنہ

الجواب صحیح: واصف علی ربانی عفی عنہ

مفتی جامعہ قاسم العلوم ملتان دار الافتاء دار العلوم کراچی
دار الافتاء دار العلوم کراچی ۱۴

واللہ اعلم بالصواب: اعبد الرحمن ڈیروی

۲۲ رجب المرجب ۱۴۱۲ھ

۱۷ رجب المرجب ۱۴۱۲ھ

۱۸ رجب المرجب ۱۴۱۲ھ

﴿حالت جنون میں طلاق کا اعتبار نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نفسیاتی مریض ہے، باقاعدہ علاج بھی جاری ہے، بے جوڑ باتیں کرتا ہے، عام لوگوں کی طرح سوچ نہیں رکھتا اس کا کہنا ہے کہ نماز میں میری سوچ صحیح رہتی ہے، نماز سے باہر میری سوچ صحیح نہیں ہوتی، محلّہ کے لوگ بھی جانتے ہیں کہ وہ نفسیاتی مریض ہے، عقل صحیح کام نہیں کرتی، بیوی کے ساتھ کسی بات پر تکرار کرتے ہوئے اس نے دو طلاقیں دیدیں اور یہ بات اب بھی اس کو یاد ہے اور مانتا بھی ہے لیکن اس کے ایک رشتہ دار کا کہنا ہے کہ میں نے اس بارے میں جب اس سے دریافت کیا کہ آپ نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے تو بتایا کہ میں نے اسے تین طلاقیں دی ہے لیکن زید خود اس اقرار کا انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے اس طرح کی کوئی بات یاد نہیں ہے، اس صورت میں طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ اگر ہوئی تو کتنی؟

مستفتی: شہاب الدین ڈیروی

﴿جواب﴾ یہ بات اگر درست ہے کہ زید نفسیاتی مریض ہے، اسکی عقل صحیح کام نہیں کرتی اور بے جوڑ باتیں کرتا ہے، نہ ٹھیک سوچ سکتا ہے، نہ ٹھیک کام کر سکتا ہے تو ایسے شخص کی طلاق کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا بشرطیکہ طلاق دیتے وقت بھی اس طرح کی کیفیت طاری ہو چونکہ اس طرح کا مریض بعض اوقات صحیح آدمی کی کیفیت میں بھی آجاتا ہے تو عین ایسی حالت میں اگر طلاق دیدی تو اس کا اعتبار ہوگا۔

لہٰذا زید نے اگر دو طلاقیں پوری طرح صحیح کیفیت کی حالت میں دی ہیں، تو دو طلاقیں واقع ہوگئی ہیں، البتہ عدت گزرنے سے پہلے اگر رجوع کرنا چاہے تو صرف رجوع کرنے سے نکاح برقرار رہیگا لیکن آئندہ کسی موقع پر زید نے اگر ایک طلاق مزید دیدی تو طلاق مغلظہ واقع ہوگی

اور پھر بغیر حلالہ شرعیہ کے نکاح بھی نہیں ہو سکے گا، لہٰذا زید احتیاط سے رہے۔

لیکن طلاق دیتے وقت اگر بیماری کی کیفیت تھی ہوش و ہواس صحیح کام نہیں کر رہے تھے تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی اور رشتہ دار کے سامنے تین طلاقوں کا اقرار اور پھر اس سے لاعلمی کا اظہار بیماری پر محمول ہے، اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

لمافی الهندية:(۱/۳۵۲،طبع رشيديه)

ولايقع طلاق الصبي وان كان يعقل والمجنون الخ،، وكذلك المعتوه لايقع طلاقه ايضا وهذا اذاكان في حالة العته واما في حالة الافاقة فالصحيح انه واقع.هكذافي جوهرة النيرة.

ولمافي التنوير:(۲/۴۲۹-۲۵۰-۲۵۱،طبع امداديه)

ولايقع طلاق المولى على امرءة عبده والمجنون والصبي والمعتوه والمبرسم.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبیداللہ عابد

۱۸ ذیقعدہ ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۷۷۴

﴿مجنون کی طلاق کا اعتبار نہیں﴾

﴿سوال﴾ السلام علیکم! جناب عالی عرض گزارش یہ ہے کہ میں معلّمہ ہوں، میرے شوہر نے مجھے کہا میں تجھے طلاق دیتا ہوں طلاق، طلاق، طلاق کہا لیکن میرے شوہر کے بڑے بھائی کہتے ہیں، ان کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے تم انکی بات پر توجہ نہ دو جبکہ مجھے مہینہ کا حمل ہے، اس کے علاوہ وہ اکثر مجھے کہتے رہتے ہیں، طلاق دے دوں گا، طلاق، طلاق، طلاق کہتے رہتے ہیں اور اکثر رات کو بڑبڑاتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کسی سے بات کر رہے ہیں اور گالی بکتے رہتے ہیں بہت زیادہ انکی ذہنی حالت خراب ہے اور اکثر رات کو ہی ایسی باتیں کرتے ہیں اور دن کو بالکل صحیح رہتے ہیں مگر میں چاہتی ہوں کہ ہمارے حق میں کوئی بہتری ہو، لہٰذا آپ سے درخواست ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کا کوئی حل بتائیں۔ جزاک اللہ خیرا۔ فقط آپکی بیٹی

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ مفتی غیب نہیں جانتا، سوال کے مطابق جواب دیتا ہے، سو سوال میں مذکور بیان کے صحیح یا غلط ہونے کی ذمہ داری سائل پر ہے، لہٰذا سوال میں بیان کردہ واقعہ اگر حقیقت پر مبنی ہے یعنی سچ ہے تو ایسی صورت میں کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، شہناز بدستور صلاح الدین کی بیوی ہے، اس لئے کہ صلاح الدین مذکورہ بالا بیان کے مطابق مجنون ہے اور شرعا

مجنون کی طلاق کا اعتبار نہیں ہے۔

لما فی تنویر الابصار:(۳/۲۲۲-۲۲۳،طبع سعید)

(لایقع طلاق المولی علی امراۃ عبدہ والمجنون والصبی والمعتوہ والمدہوش)

ولما فی فتح القدیر:(۳/۴۶۸،طبع رشیدیہ)

(قولہ ولایقع طلاق الصبی وان کان یعقل والمجنون والنائم)والمعتوہ کالمجنون والمدہوش کذلک وھذا لقولہ ﷺ کل طلاق جائز الاطلاق الصبی والمجنون)

ولما فی الفقہ الاسلامی وادلتہ:(۷/۳۶۴،طبع دار الفکر)

طلاق المجنون والمدہوش: ولا یصح طلاق المجنون،ومثلہ المغمی علیہ لقولہ ﷺ:"لاطلاق فی اغلاق"والاغلاق:کل مایسد باب الادراک والقصد والوعی لجنون لان الطلاق تصرف یحتاج الی ادراک کامل وعقل والرو وھذا لایتوافر فی الصبی والمجنون.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:ریاض الرحمٰن عفا اللہ عنہ

۱۸/۱/۱۴۲۹ھ فتوی نمبر:۱۱۰۸

﴿مدہوشی کی حالت میں طلاق کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ایک آدمی نے خودکشی کی غرض سے کچھ گولیاں (زہریلی) کھالیں جسکی وجہ سے مذکورہ شخص بے ہوش ہوگیا،ہسپتال میں جاکر علاج وغیرہ کے بعد کچھ ہی ہوش آیا تھا (پوری طرح ہوش میں نہیں تھا) کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، پوچھنا یہ ہے کہ آیا ایسی حالت میں طلاق دینے سے طلاق واقع ہوتی ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ مفتی غیب نہیں جانتا،حقائق تک پہنچنا اس کی ذمہ داری نہیں ہے، سوال کے مطابق جواب دینے کا پابند ہے،لہٰذا صورت مسئولہ میں اس شخص کو طلاق کے الفاظ کہتے وقت اگر ہوش تھا اور اپنی بات کے نفع ونقصان کو سمجھتا تھا تو ایسی صورت میں طلاق واقع ہوچکی ہے اور اگر مدہوشی میں تھا اپنی بات کے فائدہ ونقصان کو نہیں سمجھ رہا تھا تو ایسی صورت میں کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی۔

لما فی الشامی:(۳/۲۴۴،مطلب فی طلاق المدہوش،طبع سعید)

والذی یظہر لی ان کلام المدہوش والغضبان لایلزم فیہ ان یکون بحیث لایعلم ما یقول بل یکتفی فیہ بغلبۃ الھذیان واختلاط الجد بالھزل کما ھو المفتی بہ فی السکران علی ما مر ولا ینافیہ تعریف الدھش بذھاب العقل فان الجنون فنون ولذا فسرہ فی

البحر باختلال العقل وادخل فيه العته والبرسام والاغماء والدهش.

ولما في فتح القدير:(۴۶۸/۳،طبع رشيديه)

قوله(ولا يقع طلاق الصبي)وان كان يعقل(والمجنون والنائم)والمعتوه كالمجنون . قيل هو القليل الفهم المختلط الكلام الفاسد التدبير لكن لايضرب ولايشتم بخلاف المجنون وقيل العاقل من يستقيم كلامه وافعاله الانادرا والمجنون ضده والمبرسم والمغمى عليه والمدهوش كذلك وهذا لقوله صلى الله عليه وسلم كل طلاق جائز الا طلاق الصبي والمجنون.

ولما في الهندية:(۳۵۳/۱،طبع رشيديه)

ولايقع طلاق الصبي وان كان يعقل والمجنون والنائم والمبرسم والمغمى عليه والمدهوش هكذا في فتح القدير وكذلك المعتوه لايقع طلاقه ايضا وهذا اذا كان في حالة العته اما في حالة الافاقة فالصحيح انه واقع هكذا في الجوهرة النيرة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ والله اعلم بالصواب: نعیم اقبال عفا اللہ عنہ

۳ رجب ۱۴۳۱ھ فتویٰ نمبر: ۲۷۲۹

﴿مدہوش کی طلاق کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ میرا بڑا بھائی منور خان غوری دو سال سے نفسیاتی مریض ہے، پہلے اچھے تھے گھریلو اور کاروباری حالات کیوجہ سے اس کا ذھن بالکل کام نہیں کرتا، محلے کے اکثر لوگ اور دوست جانتے ہیں، اس سے بات کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نارمل آدمی نہیں ہے، میرے دوسرے بھائی محی الدین اور میرے ماموں معلوم نہیں کس وجہ سے چاہتے ہیں کہ منور کی بیوی جو کہ باہر خاندان سے ہے کسی طرح اس سے جدا ہو جائے اسلئے طلاق کی کوشش کی، طلاق سے چندروز پہلے منور کا جھگڑا ہوا جسمیں خوب پیٹا، زخمی بھی ہوا اور ہاتھ بھی ٹوٹ گیا جس کا اسکو احساس بھی نہیں رہتا چونکہ پہلے سے نفسیاتی مریض ہے، اب تو ڈر اور خوف دل میں بیٹھ گیا، روتا رہتا ہے، اس حالت میں وثیقہ نویس کے پاس لے جاکر اس سے طلاق کہلوائی گئی اور طلاق نامہ پر دستخط بھی لئے گئے ہیں اس موقع پر موجود گواہ اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ اس وقت بھی یہ صحیح کیفیت میں نہیں تھا، مدہوشی میں تھا، دارالعلوم کراچی سے اسکا فتویٰ لیا لیکن شاید ان حضرات کو منور کی بیماری کا علم نہیں تھا یا کسی نے بتایا نہیں، بہرحال مہربانی فرما کر اس فتویٰ پر نظر ثانی فرمائیں۔ مستفتی: نادر خان غوری ڈیفنس فیز ۲

﴿جواب﴾ واضح رہے مفتی غیب نہیں جانتا، مسئلہ معلوم کرنے والا جس طرح سوال کرتا

ہے اسی کے مطابق جواب دیتا ہے، واقعہ کی صحیح صورت ظاہر کرنا سوال کرنے والے کی ذمہ داری ہے، لہٰذا منور خان کی ذہنی کیفیت طلاق دیتے وقت بھی اگر یہی تھی جس طرح سوال میں بیان ہوئی ہے تو ایسی صورت میں کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، حلیمہ بیگم بنت ارشد ندیم قریشی بدستور منور خان کے نکاح میں ہے۔

دارالعلوم کے مفتیان کرام نے سوال کے مطابق صحیح جواب دیا ہے لیکن منور خان کی ذہنی کیفیت کے بارے میں انکو پتہ نہ چل سکا نہ کسی نے ان پر واضح کیا ورنہ دارالعلوم سے بھی طلاق واقع نہ ہونے کا فتویٰ ملتا۔

لما فی التاتارخانیۃ: (۱۸۶/۳، طبع قدیمی)

طلاق صبی غیر واقع وکذالک طلاق المجنون والمعتوہ وفی شرح الطحاوی وکذلک المغمیٰ علیہ والمدھوش.

ولما فی ردالمحتار: (۲۴۴/۳، طبع سعید)

وکذا یقال فی من اختل عقلہ لکبر اولمرض اولمصیبۃ فاجأتہ: فمادام فی حال غلبۃ الخلل فی الاقوال والافعال لاتعتبر اقوالہ وان کان یعلمھا ویریدھا. لان ھذہ المعرفۃ والارادۃ غیر معتبرۃ لعدم حصولھا عن ادراک صحیح کما لاتعتبر من الصبی العاقل.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: حبیب الرحمٰن سواتی

۱۹ ذی الحجہ ۱۴۲۹ھ　　　فتویٰ نمبر: ۱۷۸۰

﴿مراہق حلالہ کرسکتا ہے لیکن طلاق نہیں دے سکتا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ کہ قریب البلوغ لڑکا جس کی عمر ۱۴ سال ہے لیکن جماع کرنے پر قادر ہے تو کیا اس لڑکے کے جماع (حلالہ) کرنے سے عورت پہلے شوہر کیلئے حلال ہوسکتی ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ حلالہ کے لیے حلالہ کرنے والے کا بالغ ہونا شرط نہیں ہے جماع پر قادر ہونا ضروری ہے اور ایسا قریب البلوغ لڑکا جو جماع پر قادر ہو بالغ کے حکم میں داخل ہے، لہٰذا مراہق حلالہ کرسکتا ہے لیکن طلاق بالغ ہونے کے بعد ہی دے سکے گا اس سے پہلے اس کی طلاق معتبر نہیں ہے بالغ ہونے کے بعد وہ طلاق دے گا تو وہ عورت شوہر اول کے لیے حلال ہوگی ورنہ نہیں۔

لما فی الهندیه:(۱/۴۷۳،باب التعلیق ،طبع رشیدیه)

وفی "الاینفع" الصبی المراهق فی التحلیل کالبالغ ـ فسر المراهق فی الجامع الصغیر فقال غلام لم یبلغ ومثله یجامع جامع امرأته وجب الغسل علیها واحلها للزوج الاول ومعنی هذاالکلام ان تتحرك آلته ویشتهی

ولما فی البدائع الصنائع:(۳/۱۸۹،طبع سعید)

سواء کان الزوج الثانی بالغا او صبیا یجامع فجامعها او مجنوناً لقوله تعالی حتی تنکح زوجا غیره من غیر فصل بین زوج وزوج ولان وطی الصبی والمجنون یتعلق به احکام النکاح من المهر والتحریم کوطء البالغ العاقل،

ولما فی تنویر الابصار مع الشامی:(۳/۴۱۰،طبع سعید)

لاینکح مطلقة بها ای بالثلاث حتی یطاها غیره ولو الغیر مراهقاً یجامع مثله وفی الشامیة(قوله ولو مراهقا) هو الدانی من البلوغ ولابد ان یطلقها بعد البلوغ لان طلاقه غیر واقع

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب :محمد تنویر عفااللہ عنہ

۷ جمادی الثانی ۱۴۳۲ھ — فتوی نمبر:۲۷۵۶

﴿اہلیت طلاق کیلئے بلوغت شرط ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اہلیت طلاق کیلئے بلوغت شرط ہے؟ بینوا توجروا۔

مستفتی :محمد امین شاہ حسن خیل ڈیرہ اسمٰعیل خان

﴿جواب﴾ جی ہاں اہلیت طلاق کیلئے بلوغت شرط ہے، نابالغ کی طلاق معتبر نہیں ہے۔

لما فی حاشیة الهدایة عن شرحها العنایة:(ص ۳۷۳،طبع رحمانیه)

قوله:کتاب الطلاق،وشرطه کون المطلق عاقلا بالغا.....الخ.

ولما فی الشامی:(۳/۲۳۱،طبع امدادیه)واهله زوج عاقل بالغ مستیقظ.....الخ.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب :محمد احمد عفااللہ عنہ

۱۸ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ — فتوی نمبر:۱۶۰۰

﴿نشے کی حالت میں دی ہوئی طلاق کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور پھر کہنے لگا کہ میں نشے کی حالت میں تھا اب لوگوں میں سخت خلفشار ہے بعض کہتے ہیں طلاق ہوگئی ہے اور بعض کہتے ہیں طلاق نہیں ہوئی آپ حضرات شریعت کی روشنی میں

مسئلہ کی وضاحت فرمائیں؟ جزاکم اللہ فی الدارین مستفتی: احمد سعید

﴿جواب﴾ شراب اور کوئی بھی نشہ آور چیز استعمال کرنا حرام اور گناہ ہے اور گناہ کر کے انسان معذور قرار نہیں پاتا اس لیے نشہ کی حالت میں دی ہوئی طلاق واقع ہو جاتی ہے البتہ کسی دوا کے کھانے سے یا بیماری کی وجہ سے ہوش وحواس قائم نہ رہیں تو یہ عذر غیر اختیاری ہے ایسی حالت میں طلاق وغیرہ واقع نہیں ہوتی.

لما فی التنویر والدر ۲/۲۳۹ طبع سعید)

(أو سكران) ولو بنبيذ أو حشيش أو افيون أو بنج زجرا به يفتى تصحيح القدورى

(ولما فی الرد المحتار ۲/۲۳۹ طبع سعید)

وبين فى التحرير حكمه انه ان كان سكره بطريق محرم لا يبطل تكليفه فتلزمه الاحكام وتصح عباراته من الطلاق والعتاق لان العقل قائم وانما عرض فهم الخطاب بمعصية فبقى فى حق الاثم ووجوب القضاء .وبعد اسطر قال فى الفتح وبقوله يفتى لان السكر من كل شراب محرم وفى البحر عن البزازية المختار فى زماننا لزوم الحد ووقوع الطلاق.

(ولما فی التاتار خانیه ۲/۱۸۷ قدیمی کتب خانه)

وطلاق السكران واقع اذا سكر من الخمر أو النبيذ وهو مذهب اصحابنا وكان الشيخ ابو الحسن الكرخیؒ يختار انه لا يقع شیء، وهو قول الطحاویؒ وأحد قول الشافعیؒ وفى التفريد والفتوى عليه

(ولما فی فتح القدیر ۲/۷۲ طبع رشیدیه)

(وطلاق السكران واقع) واختيار الكرخیؒ والطحاویؒ انه لا يقع وهو احد قولى الشافعیؒ لان صحة القصد بالعقل وهو زائل العقل فصار كزواله بالبنج والدواء ولنا انه زال (بسبب معصية فجعل باقيا حكما زجرا له) حتى لو شرب فصدع وزال عقله بالصداع نقول انه لا يقع طلاقه.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفی اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق الکی

۱۴ محرم الحرام ۱۴۳۳ھ فتوی نمبر: ۳۲۰۸

﴿مدہوشی کی حالت میں طلاق کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کا شدید ایکسیڈنٹ ہوا تھا جسکی وجہ سے تقریباً عرصہ چار سال سے مریض ہے، چار پائی پہ پڑا ہے جبکہ بسا اوقات اس کو غصہ آتا ہے اور وہ الفاظ بولتا ہے جسکے کہنے پر بعد میں وہ خود نادم ہوتا ہے اور کہنا مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ موصوف شرع محمدی کا پیروکار ہے، موصوف نے بیوی سے نماز پڑھنے کے لئے جائے نماز

مانگا، بیوی کی تاخیر سے موصوف کو غصہ آیا، زبان پہ مختلف قسم کی باتیں آئیں، اب اس موصوف (زید کی بیوی) کہتی ہے کہ زید نے مجھے غصہ میں کہا کہ تم میری ماں، بہن اور پھوپھی ہو اور طلاق ہو جبکہ زید کے والدین کہتے ہیں کہ اس نے صرف یہ کہا کہ تجھ کو طلاق ہے جبکہ شوہر پہلے انکار کر رہا تھا کہ میں نے کچھ نہیں کہا ہے، اب کہتا ہے کہ میں نے طلاق کے الفاظ کہے ہونگے لیکن مجھے پتہ نہیں ہے کہ میں نے کیا الفاظ کہے ہیں؟ اب یہ عورت مطلقہ ہوگی یا نہیں؟ سائل: محمد دین وعبدالکریم

﴿جواب﴾ بیماری کی وجہ سے کسی کا ذہن اگر صحیح کام نہ کرتا ہو اور غصہ کی کیفیت اس قدر تیز ہو جاتی ہو کہ سوچ وسمجھ متاثر ہو کر اقوال وافعال میں عام لوگوں کی طرح احتیاط کا پہلو نہ رہتا ہو تو ایسی صورت میں طلاق واقع نہیں ہوتی۔

لہٰذا موصوف کی اس وقت واقعی ایسی کیفیت تھی تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی اور ایسی کیفیت نہیں تھی بلکہ غصہ کے ساتھ ساتھ احتیاط کا پہلو بھی باقی تھا اپنی بات کے نقصان ونتیجہ کو بھی جانتا تھا تو ایسی صورت میں ''طلاق ہو'' کہنے کی وجہ سے صرف ایک طلاق رجعی واقع ہوگئی ہے، عدت کے اندر رجوع کرنے سے نکاح بحال رہے گا، البتہ آئندہ کے لئے صرف دو طلاقوں کا حق باقی رہے گا، علاوہ ازیں مذکورہ دیگر الفاظ ''تم میری ماں، بہن اور پھوپھی ہو'' سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا، بیوی کو اسطرح بولنا اگر چہ منع ہے لیکن حروف تشبیہ وغیرہ نہ ہونے کی وجہ سے طلاق یا ظہار کے الفاظ نہیں قرار دیئے جا سکتے۔

لما في الشامي:(۲۲۲/۳،طبع سعيد)

والذي يظهر لي ان كلا من المدهوش والغضبان لا يلزمه فيه ان يكون بحيث لا يعلم ما يقول بل يكتفي فيه بغلبة الهذيان واختلاط الجد بالهزل.

ولما في فتح القدير:(۴۸۸/۳،طبع رشيديه)

قوله ولا يقع طلاق الصبي وان كان يعقل والمجنون والنائم والمعتوه كالمجنون قيل هو القليل الفهم المختلط الكلام الفاسد التدبير لكن لا يضرب ولا يشتم بخلاف المجنون وقيل العاقل من يستقيم كلامه وافعاله واقواله والمبرسم والمغمى عليه والمدهوش كذلك وهذا لقوله صلى الله عليه وسلم كل طلاق جائز الا طلاق الصبي والمجنون.

ولما في الفقه الاسلامي وادلته:(۳۶۵/۷،طبع دار الفكر)

طلاق الغضبان يفهم مما ذكر ان طلاق الغضبان لا يقع اذا اشتد الغضب بان وصل الى درجة لا يدري فيها ما يقول ويفعل ولا يقصده او وصل به الغضب الى درجة يغلب فيها الى

الاضطراب فی اقواله وافعاله وهذه حالة نادرة.

ولما فی التنویر مع الدر:(۲۵۱/۳،طبع سعید)

وفی أنت الطلاق اوطلاق..... واحدة رجعیة ان لم ینوشیئا اونوی... لومدخولا بها وفی الشامی:(۲۷۰/۳،طبع سعید)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ریاض الرحمٰن کوھائی

۲صفرالمظفر ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۱۳۶

﴿معتوہ کی طلاق کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ معتوہ یعنی وہ شخص جس کی سمجھ بوجہ عام لوگوں کی طرح نہیں ہے کی طلاق کا شرعاً کوئی اعتبار ہے؟ مستفتیہ:ضلع بونیر

﴿جواب﴾ معتوہ یعنی وہ شخص جس کی سمجھ بوجہ عام لوگوں کی طرح نہیں ہے کی طلاق کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں ہے۔

لما فی فقه السنة:(۲۲۲/۲،طبع دارالکتب محله جنگی پشاور)

کما لایقع طلاق المجنون والمعتوه والمغنی علیه.

ولما فی حاشیة القدوری:(ص۱۷۲،طبع قدیمی)

ولایقع طلاق الصبی الخ الاصل فیه حدیث کل طلاق جائز الاطلاق المعتوه المغلوب علی عقله اخرجه الترمذی.

ولما فی کنزالدقائق وحاشیته:(ص۱۱۵،طبع قدیمی)

لا(یقع)طلاق الصبی والمجنون والنائم والسید علی امرأة عبده.

وفی حاشیته:والمجنون لقوله علیه السلام کل طلاق جائز الاطلاق الصبی وحکم المعتوه والمغمی علیه کالمجنون وکذالایقع طلاق النائم والمعتوه من کان قلیل الفهم مختلط الکلام فاسد التدبیر الاانه لایضرب ولایشتم.

ولما فی التنویر مع الدر:(۲۴۳/۳،طبع سعید)

(لایقع طلاق المولی علی امرأة عبده والمجنون والصبی والمعتوه)من العته وهو اختلال فی العقل.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:محمد وارث خان

۸رجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۷۴۵

﴿نابالغ کی طلاق کا کوئی اعتبار نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک نابالغ لڑکے کا

نکاح بالغ لڑکی سے ہوا، دونوں کا آپس میں شدید اختلاف ہے، لڑکا طلاق دینے پر آمادہ ہے اور اس کے والدین بھی راضی ہیں تو کیا نابالغ لڑکے کی طلاق واقع ہو جائے گی؟ واضح رہے کہ لڑکا نابالغ ہونے کے باوجود سمجھدار ہے۔ مستفتی: اکرام الحق ہزاروی

﴿جواب﴾ طلاق دینے کے لئے خاوند کا عاقل بالغ ہونا ضروری ہے، نابالغ کی طلاق کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اس لئے مذکورہ صورت میں اس نابالغ کی طلاق واقع نہیں ہوگی اگرچہ وہ سمجھدار ہے۔

لما فی الهداية:(۲/۳۷٦-۳۷۷،طبع رحمانيه)
ويقع طلاق كل زوج اذا كان عاقلا بالغا ولا يقع طلاق الصبي والمجنون والنائم.
ولما فی فتح القدير:(۳/۳٦۸،طبع رشيديه)(قوله ولا يقع طلاق الصبي) وان كان يعقل.
ولما في الشامي:(۳/۲۳۰،طبع سعيد)
(قوله واهله زوج عاقل)احترز بالزوج عن سيد العبد ووالد الصغير — وبالبالغ عن الصبي ولو مراهقا.
ولما في الهندية:(۱/۳۵۳،طبع رشيديه) ولا يقع طلاق الصبي وان كان يعقل.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد سجاد کشمیری
کیم ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۱۴۷

﴿بیوی کو طلاق کا اختیار دینے کا بیان﴾

﴿تفویض طلاق کے متفرق مسائل﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام درج ذیل سوالات کے بارے میں کہ: (۱) طلاق کا حق صرف مرد ہی کو ہوتا ہے؟ (۲) اگر مرد طلاق کا حق عورت کو دیدے تو عورت اس حق کے ذریعے سے طلاق لے سکتی ہے؟ (۳) اگر عورت اپنے حق کے ذریعے سے اپنے اوپر طلاق کا حق جاری کرلے تو اس سے وہ اپنے مرد سے ویسے ہی الگ ہو جائیگی جیسا کہ مرد کے طلاق دینے سے؟ (۴) گواہوں کے سامنے عورت طلاق کا حق نافذ کرے گی؟ (۵) طلاق کا حق استعمال کر کے عورت عدت گذارنے کے بعد دوسرا نکاح کر سکتی ہے؟ (٦) یہ حق استعمال کرنے کے بعد مرد اپنی بیوی پر کسی قسم کی روک ٹوک کر سکتا ہے یا نہیں؟ مستفتی: قاری محمد جنید صاحب

﴿جواب﴾ (۱-۲) طلاق کا حق اللہ تعالیٰ نے مرد ہی کو سپرد کیا ہے، عورت کو دراصل یہ حق

حاصل نہیں ہے، البتہ شوہر اپنی بیوی کو یہ حق تفویض کردے تو بیوی بھی خود کو طلاق دے سکتی ہے۔

(۳) شوہر نے بیوی کو طلاق کا یہ حق ایسا تفویض کردیا ہو جس طرح اسکو خود یہ حق حاصل ہے مثلاً رجعی طلاق دے یا بائن ایک دے یا ایک سے زائد جب چاہے دے یا خاص محدود وقت کے لئے یا خاص شرائط کے ساتھ یہ حق مشروط کردیا ہو، اسی نوعیت کا حق وہ استعمال کرسکتی ہے اور نتائج بھی وہی مرتب ہونگے جس نوعیت کی طلاق ہوگی۔

(۴) طلاق واقع ہونے کے لئے گواہوں کی موجودگی ضروری نہیں ہے، اکیلے میں بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے لیکن اختلاف کی صورت میں قاضی کے ہاں ثابت کرنے کے لئے گواہوں کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔

(۵) رخصتی ہوئی ہو تو عدت گذارنا ضروری ہے، طلاق شوہر دے یا اس کی طرف سے حاصل شدہ حق بیوی استعمال کرکے طلاق واقع کرے، ہر دو صورت میں عدت گذارنا ضروری ہے، عدت سے فارغ ہونے کے بعد مطلقہ چاہے تو دوسری جگہ شادی کرسکتی ہے۔

(۶) ایک بار حق طلاق کھلے طور پر تفویض کرنے کے بعد شوہر یہ حق واپس نہیں لے سکتا، نہ بیوی کو حق استعمال کرنے سے روک سکتا ہے۔

لمافی البحر الرائق:(۳۱۰/۲،طبع سعید)

لما فرغ من بیان مایوقعه الزوج بنفسه صریحاً وکنایة شرع فیمایوقعه غیره باذنه وهو ثلاثة انواع تفویض وتوکیل ورسالة الخ(ولوقال لهااختاری ینوی الطلاق فاختارت فی مجلسهابانت بواحدة)لان المخیرة لهاخیارالمجلس باجماع الصحابةؓ اجماعاً سکوتیاً عندتصریح بعضهم.

ولمافی البدائع:(۱۱۳/۲،طبع سعید)

أمابیان صفته فهوانه لازم من جانب الزوج حتیٰ لایملک الرجوع عنه ولانهی المرأة عماجعل الیهاولافسخ ذٰلک لانه ملکهاالطلاق ومن ملک غیره شیئاًفقدزالت ولایته من الملک فلایملک ابطاله بالرجوع والنهی والفسخ کسائرالتعلیقات المطلقة بخلاف البیع الخ.....(وینکح مبانته فی العدة وبعدها)ای المبانة بمادون الثلاث لان المحلیة باقیة لان زوالها معلق بالطلقة الثالثة فینعدم قبلهاومنع الغیر فی العدة لاشتباه النسب ولااشتباه فی الاطلاق له.(قوله لاالمبانة بالثلاث لو حرة وبالثنتین لوامة حتیٰ یطأهاغیره ولومراهقابنکاح صحیح وتمضیٰ عدته لا بملک یمین)ای لاینکح مبانته بالبینونة الغلیظة أطلقه فشمل ماالذاکان قبل الدخول اوبعده الخ.

ولما فی البدائع:(۱۱۷/۳،طبع سعید)

ولان قوله امرک بیدک جعل امرها بنفسها بیدها فتصیر عند اختیارها نفسها وانما تصیر مالکة نفسها بالبائن لا بالرجعی وان قرن به ذکر الطلاق بان قال امرک بیدک فی تطلیقة فاختارت نفسها فهی واحدة یملک الرجعة لانه فوض الیها الصریح حیث نص علیه.

ولما فیه ایضاً:(۱۱۹/۳،طبع سعید)

(واما)الواقع بهذه الالفاظ فان التخییر واحداً ولم یذکر الثلاث فی التخییر فلایقع الا طلاق واحد ولن نوی الثلاث فی التخییر ویکون بائناً عندنا وان کان التفویض مطلقاً عن قرینة الطلاق،وان کان التفویض مقروناً بذکر الطلاق بان قال لها اختاری الطلاق فقالت اخترت الطلاق فهی واحدة رجعیة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب:محمد کاشف عزیز

۲صفر الخیر ۱۴۳۰ھ   فتویٰ نمبر:۱۸۸۵

﴿زوجہ کو طلاق دینے کا اختیار دینا﴾

﴿سوال﴾ اگر کوئی ولی لڑکی کے نکاح میں دولہا سے یہ الفاظ کہہ کر ایجاب وقبول کرالے کہ اگر شوہر سے زوجہ کا اتفاق نہ رہا تو زوجہ مختار ہوگی کہ اپنے نفس کو طلاق دیدے اور دولہا کہے کہ میں نے اس شرط کے ساتھ مسماۃ کو اپنے نکاح میں قبول کرلیا،اب پوچھنا یہ ہے کہ اس طرح کرنا درست ہے یا نہیں؟   مستفتی:محمد یوسف بگرام

﴿جواب﴾ لڑکی خود یا اس کا وکیل ایجاب وقبول کے موقع پر یہ شرط لگائے کہ لڑکی کو اختیار ہوگا جب چاہے وہ اپنے کو طلاق دے سکے گی اور شوہر اس کو قبول کرلے تو لڑکی کا اختیار باقی رہے گا،وہ جب چاہے اپنے کو طلاق دے سکے گی،عورتیں عموماً تنگ ظرف ہوتی ہیں،جذبات کی وجہ سے عجلت میں ایسا خطرناک فیصلہ کرنے کا اس سے اندیشہ ہے،اس لئے بہتر یہ ہے کہ اس کو بھی کسی درجہ میں پابند کریں مثلاً لڑکی کو اختیار ہوگا بشرطیکہ لڑکی کی برادری کے کم از کم دو عمر رسیدہ نمازی آدمی بھی لڑکی کے ساتھ اتفاق کریں۔

لما فی الدر مع الرد:(۳/۳۱۵،طبع سعید)

ولو خافت ان لا یطلقها تقول زوجتک نفسی علی ان امری بیدی زیلعی،وتمامه فی العمادیة.

وفی الشامیة:(قوله وتمامه فی العمادیة)حیث قال:ولو قال لها تزوجتک علی ان امرک بیدک فقبلت جاز النکاح ولغا الشرط،لان الامر انما یصح فی الملک اومضافا الیه ولم یوجد احدهما بخلاف ما مر فان الامر صار بیدها مقارنا لصیرورتها منکوحة.

ولما فی العالمگیریۃ:(۱/۲۷۳،طبع رشیدیه)

رجل تزوج امرأة على انها طالق او على ان امرها في الطلاق بيدها ذكر محمد في الجامع انه يجوز النكاح والطلاق باطل ولا يكون الامر بيدها وقال الفقيه ابو الليث هذا اذا بدأ الزوج فقال تزوجتك على انك طالق وان ابتدأت المرأة فقالت زوجت نفسي منك على انى طالق او على ان يكون الامر بيدى أطلق نفسي كلما شئت فقال الزوج قبلت جاز النكاح ويقع الطلاق ويكون الامر بيده وهكذا في الخانية على هامش الهندية:(۱/۳۲۱،طبع رشيديه) وفى البحر:(۳/۳۱۸،طبع سعيد)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ والله اعلم بالصواب:ظہور احمد شمس

۹ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر:۱۳۰۳

﴿فسخ نکاح اور خلع کا بیان﴾

﴿جب تک شوہر طلاق نہ دے محض تفریق موجب طلاق نہیں﴾

﴿سوال﴾ جناب مفتی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!ایک خاتون کو اسکے شوہر نے آٹھ سال قبل گھر سے نکال دیا تھا،اسکے بعد دونوں میں کوئی تعلق باقی نہیں رہا لیکن باپ نے بچوں کی وجہ سے طلاق نہیں دی کہ بڑے ہونے پر واپس لے سکے،ایک ماہ کے بچے کو باپ نے اپنے پاس روک لیا تھا،جواب بھی اسکے پاس ہے،خاتون نے اسکے بعد شہر تبدیل کر دیا۔

پوچھنا یہ ہے کہ کیا اب بھی دونوں کے درمیان نکاح باقی ہے جبکہ آٹھ سال کا عرصہ گذر چکا ہے اور کیا خاتون بغیر طلاق اور عدت کے کسی دوسرے شخص سے نکاح کر سکتی ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اس پورے عرصہ میں اگر واقعتاً شوہر نے صراحتاً یا دلالۃً ایسے الفاظ استعمال نہیں کیے جن سے طلاق واقع ہو جاتی ہے تو مذکورہ نکاح برقرار ہے اور عورت شرعاً اسی کی منکوحہ ہے،لہٰذا جب تک عورت اپنے شوہر سے طلاق حاصل نہیں کرتی اور عدت نہیں گزارتی،کسی دوسرے شخص سے نکاح نہیں کر سکتی۔

لما فی التنویر مع الدر:(۳/۲۲۶،طبع سعید)

وشرعا(رفع قيد النكاح في الحال)بالبائن(او المآل)بالرجعى(بلفظ مخصوص)هو ما اشتمل على الطلاق.

ولما فى التاتارخانية:(۳/۱۷۸،طبع قديمى)

فى الكنز هو رفع القيد الثابت شرعا بالنكاح وفى السغنانى اما ركن الطلاق فهو هذه

الملفظة الصادرة من الزوج.

ولما فی التنویر مع الدر:(۲/۵۰۲-۵۰۳ طبع سعید)

(تربص یلزم المرأة)....(عند زوال النکاح)....(اوشبهته)....(وسبب وجوبها) عقد (النکاح المتأکد بالتسلیم وماجری مجراه)....وشرطها الفرقة ورکنها حرمات ثابتة بها کحرمة تزوج وخروج (وصحة الطلاق فیها) ای فی العدة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: عبدالحکیم کشمیری

۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ   فتویٰ نمبر: ۱۴۲۰

﴿سوء اختیار کی صورت میں قاضی فسخ نکاح کر سکتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں یہ عام رواج ہے کہ جب کوئی شخص کسی کو قتل کردے یا کسی لڑکی کیساتھ زنا کرے یا کسی کو اغواء کرے تو جرگہ والے جب ان کے درمیان صلح کراتے ہیں تو قاتل، زانی اور اغواء کرنے والے کی نابالغ لڑکی مقتول کے ورثاء یا مزنیہ کے ورثاء میں سے کسی کو نکاح میں دے دیتے ہیں اور اسی پر صلح کرتے ہیں حالانکہ قاتل، زانی یا اغواء کرنے والا مجبوری سے اپنی نابالغ لڑکی دیتا ہے تو کیا اس طرح لڑکی پر صلح کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس طرح کرنے سے نکاح منعقد ہوجاتا ہے یا نہیں؟ اور اگر منعقد ہوجاتا ہے تو لڑکی کو بلوغت کے بعد نکاح فسخ کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ آپکے گاؤں کا رواج بلاشبہ خلاف شرع ہے، علماء کو چاہیے کہ اس طرح کے فیصلوں کی مذمت کریں اور بدلنے کی کوشش کریں، لڑکی کا نکاح اس کے والد یا دادا نے اگر کرلیا ہے تو نکاح منعقد ہوگیا ہے، بلوغت کے فوراً بعد لڑکی اس نکاح کی نامنظوری کا اظہار کرے پھر خود نکاح کو فسخ نہیں کرسکتی ہے، البتہ وہ شرعی قاضی یا مسلمان حاکم مجاز کی عدالت میں دعویٰ کرکے شرائط شرعیہ کے مطابق ثبوت پیش کرے تو وہ اپنا نکاح مسلمان حاکم سے فسخ کرا سکتی ہے۔

لما فی الدر المختار:(۲/۶۶-۶۷ طبع سعید)

(أو)....(بغیر کفء إن کان الولی أباأوجدا)....(لم یعرف منهما سوء الاختیار) مجانة وفسقا(وإن عرف لا) یصح النکاح اتفاقاً.

وفی الشامیة: حتی لو عرف من الأب سوء الاختیار لسفهه أو لطمعه لایجوز عقده اجماعاً.

ولما فی فتاوی الخیریة علی هامش تنقیح الحامدیة:(۱/۳۰-۱ طبع حقانیه)

(سئل) فی الأب اذا علم منه سوء الاختیار وعدم النظر فی العواقب اذا زوج ابنته القابلة

للتخلق بالخير والشر بغير كفوء هل يصح النكاح ام لا (أجاب) قال ابن فرشته فى شرح المجمع لو عرف من الأب سوء الاختيار لسفهه او لطمعه لا يجوز عقده اتفاقاً ومثله فى الدرر والغرر وقال فى البحر لو زوج طفله غير كفوء او بغبن فاحش صح ولم يجز ذالك لغير الأب والجد اطلق فى الأب والجد وقيده الشارحون وغيرهم بان لا يكون الاب معروفاً بسوء الاختيار حتى لو كان معروفاً بذالك مجانة وفسقاً فالعقد باطل على الصحيح قال فى فتح القدير ومن زوج ابنته الصغيرة القابلة للتخلق بالخير والشر ممن يعلم انه شرير فاسق فهو ظاهر سوء اختياره ولان ترك النظر ههنا مقطوع به فلا يعارضه ظهور ارادة مصلحة تفوق ذالك نظراً الى شفقة الأبوة ثم قال وقد وقع فى اكثر الفتاوىٰ فى هذه المسئلة ان النكاح باطل فظاهره انه لم ينعقد وفى الظهيرية يفرق بينهما ولم يقل انه باطل وهو الحق ولذا قال فى الذخيرة فى قولهم فالنكاح باطل اى يبطل انتهى كلام البحر والمسئلة شهيرة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: رضوان اللہ حقانی

۱۴ جمادالاولیٰ ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۱۶۶

﴿ قادیانی ہوجانے والے شخص کا نکاح فسخ ہوجاتا ہے ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا نکاح منور کرامت احمد کے ساتھ تاریخ یکم ستمبر ۲۰۰۰ء کو مسجد ابوبکر صدیق میں ہوا تھا، اور سنّی طریقے پر مبنی تھا، منور کرامت ایک قادیانی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اور نکاح سے پہلے مسجد بنوریہ میں بیعت کر کے سنّی ہوئے، ۱۰ سال کے بعد وہ اپنے دین میں واپس چلے گئے، اور ہم ایک باہمی فیصلے کے نتیجے میں الگ رہنے لگے۔ کیونکہ میں اور میرے بچے سنّی تھے۔ تو کیا میرا یہ عمل صحیح ہے؟ اور کیا میرا نکاح منور کرامت احمد قادیانی کے ساتھ باقی رہا یا نہیں؟ برائے کرم شریعت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں نوازش ہوگی۔ مستفتیہ: حلیمہ احمد

﴿جواب﴾ عقیدۂ ختم نبوت دین اسلام میں بنیادی عقیدہ ہے، اس کا منکر دین اسلام سے خارج ہے، قادیانی لوگ ختم نبوت کے منکر ہیں، اسکے باوجود دین اسلام کا بھی دعویٰ کرتے ہیں، اس لئے یہ لوگ نہ صرف کافر بلکہ مرتد اور دنیا کے بدترین کافر شمار ہوتے ہیں۔

منور کرامت واقعی قادیانی عقیدہ اگر رکھتا ہے، جس کا وہ خود اقرار کرتا ہے یا آپکو اسکے بارے میں یہ یقین ہے، تو آپکا نکاح بغیر طلاق کے فسخ یعنی ختم ہوچکا ہے، اس کے بعد عدت بھی

اگر گذر گئی ہے، تو آپ دوسری جگہ چاہے تو شادی کر سکتی ہے۔ اسکے ساتھ کسی بھی درجہ میں تعلق قائم رکھنا بڑا گناہ ہے، لہذا اس سے خود دور رہیں، اور اپنی اولاد کو بھی اس سے دور رکھیں۔

ولما فی التنویر مع الدر (۱۹۳/۳، ۱۹۲ طبع: سعید)

(وارتداد أحدهما) ای الزوجین (فسخ) فلا ینقص عددا (عاجل) بلا قضاء." وفی الشامی تحت (قوله بلا قضاء) ای بلا توقف علی قضاء القاضی وکذا بلا توقف علی مضی مدة فی المدخول بها کما فی البحر.

ولما فی التنویر مع الدر: (۲۵۲/۳ طبع: سعید)

"أخبرت بارتداد زوجها فلها التزوج بآخر بعد العدة استحسانا".

ولما فی احکام القرآن للجصاص: (۲۲۳/۳ سورۃ ھود آیت ۱۱۳، طبع: قدیمی)

قوله تعالیٰ: "ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار" والرکون الی الشیئ هو السکون الیه بالأنس والمحبة فاقتضیٰ ذلک النهی عن مجالسة الظالمین ومؤانستهم والانصات الیهم وهو مثل قوله تعالیٰ: "فلا تقعد بعد الذکری مع القوم الظالمین".

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفر لہ ولوالدیہ

۸ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ | فتویٰ نمبر: ۳۶۶۵

﴿غیر مسلم عورت مسلمان ہو جائے تو غیر مسلم شوہر کا نکاح باقی نہیں رہتا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے امریکہ سے ایک شادی شدہ عیسائی عورت کو مسلمان کرا کے لے آیا، اس عورت نے نہ کوئی عدت گزاری ہے اور نہ اس کے عیسائی شوہر پر اسلام پیش کیا گیا ہے اور اس مسلمان نے اس کے ساتھ نکاح بھی نہیں کیا ہے، اب اس عورت کے بارے میں کیا حکم ہے، وہ نکاح کر سکتی ہے؟ یا پہلے عدت گزارنا اور اس کے سابقہ شوہر کو اسلام کی دعوت دینا ضروری ہوگا؟

﴿جواب﴾ جب کوئی غیر مسلمہ شادی شدہ عورت اسلام قبول کر لے اور اس کا شوہر غیر مسلم ہو تو اس کا نکاح از خود ختم ہو جاتا ہے، اب وہ عورت اگر دار الحرب میں ہے تو صرف تین حیض گزار کر کسی مسلمان مرد سے نکاح کر سکتی ہے اور اگر دار الاسلام میں ہے تو تفریق قاضی کے بعد دوبارہ نکاح کے لئے تین حیض گزارنا لازمی ہے۔ لیکن اس میں اختلاف ہے کہ اس بینونت کے بعد عدت اس عورت پر لازم ہے یا نہیں؟ صاحبین وجوب عدت کے قائل ہیں جیسا کہ شامی میں مذکور ہے اور اسی کو امام طحاوی لازمی قرار دیتے ہیں، لہذا صاحبین کی رائے کے موافق تین

حیض گزارنے کے بعد نکاح کر سکتی ہے اور یہی احوط ہے، جب کہ امام صاحب تین ماہواری مزید گزارنے کو ضروری نہیں جانتے۔

لہٰذا امام صاحب کی رائے کے موافق تین ماہواری یا تین مہینے گزر جانے کے بعد مذکورہ عورت نکاح کر سکتی ہے، جب کہ صاحبین کے قول کے مطابق کل چھ ماہواری یا چھ مہینے گزر جانے کے بعد نکاح کر سکتی ہے، اس سے پہلے نہیں اور حاملہ ہو تو بالاتفاق عدت وضع حمل ہے۔

سابقہ شوہر چونکہ دارالحرب میں ہے، اس لئے اس پر عرض اسلام (اسلام کی دعوت دینا) ضروری نہیں ہے؛ اس لئے کہ ان پر ہماری کوئی ولایت نہیں ہے، دارالاسلام میں ہوتا تو اس کو اسلام کی دعوت دینا ضروری ہوتا۔

لمافی الشامی، (باب: نکاح الکافر، ۱۹۱/۳ طبع: سعید)

"(ولواسلم احدھما) ای احدالمجوسیین اوامرأۃ الکتابی (ثمۃ) ای فی دار الحرب وملحق بھا کالبحر الملح (لم تبن حتی تحیض ثلثا) وتمضی ثلاثۃ اشھر (قبل اسلام الآخر) اقامۃ شرط الفرقۃ مقام السبب ولیس بعدۃ لدخول غیر المدخول بھا"۔

ولمافی الشامی: (۱۹۱/۳ طبع: سعید)

"قولہ: (لیست بعدۃ) ای لیست ھذہ المدۃ عدۃ، لان غیر المدخول بھا داخلۃ تحت ھذا الحکم ولوکانت عدۃ لاختص ذالک بالمدخول بھا وھل تجب العدۃ بعد مضی ھذی المدۃ فان کانت المرأۃ حربیۃ فلا، لانہ لاعدۃ علی الحربیۃ.

وان کانت ھی المسلمۃ فخرجت الینا فتمت الحیض ھنا فکذالک عند ابی حنیفۃ خلافا لھما، لان المھاجرۃ لاعدۃ علیھا عندہ خلافا لھما کما سیأتی بدائع وھدایۃ وجزم الطحاوی بوجوبھا. قال فی البحر: وینبغی حملہ علی اختیار قولھما"۔

ولمافی الھدایۃ (۳۶۲/۲، طبع: رحمانیہ)

"واذا اسلمت المرأۃ فی دار الحرب وزوجھا کافر اواسلم الحربی وتحتہ مجوسیۃ لم یقع الفرقۃ علیھا حتی تحیض ثلاث حیض ثم تبین من زوجھا وھذا لان الاسلام لیس سببا للفرقۃ والعرض علی الاسلام متعذر لقصور الولایۃ ولابدمن الفرقۃ رفعا للفساد فاقمنا شرطھا وھو مضی الحیض مقام السبب کما فی البئر واذا وقعت الفرقۃ والمرأۃ حربیۃ فلاعدۃ علیھا وان کانت ھی المسلمۃ فکذالک عند ابی حنیفۃ خلافا لھما وان کانت حاملا لم تتزوج حتی تضع حملھا"۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: کمیل الدین گلگتی

۱۹ صفر الخیر ۱۴۳۴ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۵۳۶

﴿خلع کیلئے میاں بیوی دونوں کی رضامندی شرط ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ خلع کی حقیقت کیا ہے؟ کوئی شوہر بیوی کے تمام حقوق بجالا رہا ہے خود دین پر چلنے کی کوشش کرتا ہے اور بیوی بچوں سے بھی چاہتا ہے کہ دین اسلام کے مطابق زندگی گذارنے کی کوشش کریں۔لیکن بیوی کسی معقول وجہ کے بغیر ساتھ بسنا نہیں چاہتی حالانکہ بچے بھی ہیں، وہ بضد ہے کہ کسی طرح میں اس کو چھوڑ دوں، اب ہمارا مسئلہ پنچائیت کے پاس ہے بالفرض اگر پنچائیت والے میری مرضی کے بغیر خلع کا فیصلہ دیدیں تو شریعت کی رو سے ایسا خلع معتبر ہے؟ حالانکہ میں کسی طرح خلع دینے کیلئے تیار نہیں ہوں۔

﴿جواب﴾ حق مہر وغیرہ واپس لینے کی شرط کیساتھ شوہر حقوق زوجیت سے دست بردار ہونے کیلئے تیار ہو اور بیوی کو بھی منظور ہو تو یہ خلع کی صورت ہے۔دونوں میں سے کسی ایک کو بھی اگر منظور نہیں ہے تو خلع نہیں کہلائیگا۔دونوں کو منظور ہو تو بیوی کے ذمہ حق مہر وغیرہ واپس کرنا لازم ہو جاتا ہے اور اس کے بدلے شوہر کے نکاح سے اس کو خلاصی مل جاتی ہے۔اس کے بعد بیوی عدت گذار کر دوسری جگہ چاہے تو نکاح کر سکتی ہے، خلع حکما ایک طلاق بائن سے عبارت ہے ۔لہذا آپ کو اگر منظور نہیں ہے اس کے باوجود پنچائیت والے یا کوئی بھی یکطرفہ خلع کا فیصلہ دیدیں تو شرعا ایسے خلع کا کوئی اعتبار نہیں ہے، نکاح برقرار رہیگا، عورت کا کسی دوسری جگہ نکاح نہیں ہو سکے گا۔

بیوی کے پاس کوئی معقول وجہ اگر نہیں ہے تو طلاق یا خلع کا مطالبہ کرنا سخت گناہ ہے اس کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اور اولاد پر شفقت کی خاطر صبر کرے اور اپنا گھر بسائے امید ہے خوشیاں دیکھیں گی۔

شوہر کو بھی چاہئے کہ بیوی کیساتھ ایسا رویہ رکھے جس سے نبھانے میں آسانی ہو اور ہر ایک دوسرے کیلئے راحت وسکون کا باعث بنے اور یہ گھر آباد رہے اور اگر تمام تر کوششیں کارگر ثابت نہ ہوں اور کافی عرصہ سے یہ مسئلے چل رہے ہیں اور ہر ایک دوسرے کیلئے دردسر بنا ہوا ہے اور زندگی مزید تلخ ہوتی جارہی ہے تو ایسی صورت میں بہتر یہی ہے کہ کسی بڑے نقصان کی نوبت پیش آنے سے پہلے یہ روز کی پریشانی دور ہو۔برادری کے بڑوں کے فیصلہ کا احترام کریں اور خلع

منظور کرلیں، اسی میں امید ہے خیر ہوگی۔

لما فی البحر: ۴/۷۰(طبع سعید)

الخلع لغة النزع يقال خلعت النعل وغيره نزعته وخالعت المرأة زوجها مخالعة اذا افتدت منه وطلقها على الفدية فخلعها هو خلعا والاسم الخلع بالضم وهو استعارة من خلع اللباس لان كل واحد منهما لباس للآخر فاذافعلا ذالک فكأن كل واحد نزع لباسه عنه كذا فی المصباح وشرعا على ما اخترناه ازالة ملک النكاح المتوقفة على قبولها بلفظ الخلع أو ما فی معناه

لما فی المبسوط السرخسی :(۶/۱۷۳،طبع:دار المعرفه بیروت)

قال شمس الائمه السرخسیؒ والخلع جائز عندالسلطان وغيره لانه عقد يعتمد التراضی كسائر العقود وهو بمنزلة الطلاق بعوض وللزوج ولاية ايقاع الطلاق ولها ولاية التزام العوض فلامعنى لاشتراط حضرة السلطان فی هذا العقد.

لما فی بدائع الصنائع :(۳/۱۴۵،طبع:سعید کراچی)

واما ركنه فهو الايجاب والقبول لانه عقد على الطلاق بعوض فلاتقع الفرقة ولايستحق العوض بدون القبول.

لما فی الشامی:۳/۴۴۹(طبع ایچ، ایم سعید کرچی)

قال الزيلعیؒ:ولا بد من قبولها لا نه عقد معاوضة أو تعليق بشرط فلاتنعقد بدون القبول ولاينزل المعلق بدون الشرط اذلاولاية لاحدهما فی الزام صاحبه بدون رضاه.

واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری غفرلہ ولوالدیہ — الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتوی نمبر: ۲۰۱۱ — ۱۷ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ

﴿صرف حامی بھرنے سے خلع نہیں ہوتا جب تک باقاعدہ ایجاب وقبول نہ کرے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میاں بیوی کے آپس میں ناچاقیاں تھیں، تنگ آکر انہوں نے اپنے رشتہ داروں کا جرگا بلوایا لیکن صلح کارگر نہیں ہوئی، بات چلتی رہی کہ فریقین نے خلع اختیار کرنے پر حامی بھردی، ابھی کاغذات تیار ہونے والے تھے کہ میاں بیوی پھر سے زندگی بھر ساتھ نبھانے کے لئے تیار ہوگئے، پوچھنا یہ ہے کہ شروع میں صرف حامی بھرنے سے خلع واقع ہوا ہے یانہیں؟ جبکہ ابھی تک باقاعدہ ایجاب وقبول نہیں ہوا تھا، البتہ بیوی کی طرف سے ستر ہزار (70,000) روپے کی ادائیگی پر اتفاق ہوا تھا، نیز اگر باقاعدہ

ایجاب وقبول کر لیتے ہیں پھر بیوی کی طرف سے وہ رقم ادا نہ ہو تو کیا واپس نکاح قائم تصور ہوگا۔

﴿جواب﴾ صرف حامی بھرنے سے خلع نہیں ہوتا جب تک باقاعدہ میاں بیوی خود یا ان کی طرف سے وکیل باقاعدہ ایجاب وقبول نہ کرے اور ایجاب وقبول کرنے کی صورت میں طلاق بائن واقع ہو جاتی ہے پھر باہمی رضامندی کے بغیر نکاح نہیں ہو سکتا۔

لما فی تنویر الابصار:(۴۳۹/۳،طبع سعید)

ولزالة الملک المتوقفة علی قبولها بلفظ الخلع أوفی معناه.

ولما فی الشامی:(۴۴۱/۳،طبع سعید)

وأما رکنه کما فی البدائع:فاذا کان بعوض الایجاب والقبول،لأنه عقد علی الطلاق بعوض فلاتقع الفرقة فلا یستحق العوض بدون القبول.

ولما فی العنایة فی شرح الهدایة:(۱۶۸/۷،طبع حقانیه)

وأما معناه الشرعی:فهو عبارة عن أخذ مال من المرأة بازاء ملک النکاح بلفظ الخلع وشرطه شرط الطلاق وحکمه حکم الطلاق البائن وصفته أنه من جانب المرأة معاوضة علی قول أبی حنیفةؒ ویمین من الجانبین عندهما.

ولما فی الشامی:(۴۴۰/۳،طبع سعید)

بخلاف ما اذا ذکر معه المال أو کان بلفظ المفاعلة أو الأمر فانه لابد من قبولها کما مر،لأنه معاوضة من جانبها کما یأتی.

ولما فی الهندیة:(۴۸۸/۱،طبع رشیدیه)

اذا تشاق الزوجان وخافا أن لا یقیما حدود الله فلا بأس بأن تفتدی نفسها منه بمال یخلعها به فاذا فعلا ذلک وقعت تطلیقة بائنة ولزمها المال کذا فی الهدایة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:صادق محمد سواتی غفرلہ ولوالدیہ

۱۸ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر:۳۰۶۴

﴿زیادتی شوہر کی ہو تو خلع کی صورت میں حق مہر سے زیادہ لینا ظلم ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ لڑکی کے والدین شادی سے پہلے لڑکے والوں سے ستر ہزار روپے لیتے ہیں، لڑکی کے جہیز کے لئے اور رخصتی کے وقت باقاعدہ نکاح ہوتا ہے، اور اس موقع پر مہر علیحدہ سے مقرر ہوتا ہے، مثلاً پانچ ہزار روپے۔

غرض مسئلہ یہ ہے کہ مطلقاً خلع (مال مقرر کئے بغیر) کرنے سے 70000 ہزار روپے خلع میں شمار ہونگے یا صرف 5000 ہزار روپے مہر کے شمار ہونگے؟ اور یہ بھی واضح فرمائیں کہ شوہر

اگر اس شرط پر خلع کرنے کو تیار ہو کہ مہر کے علاوہ بھی پیسے وغیرہ لوں گا تو کیا یہ جائز ہوگا؟ بعض شوہر ایسے بھی ہوتے ہیں کہ نہ بیوی بنا کر رکھتا ہے اور نہ طلاق دیتا ہے سونے یا نقد روپوں کی لالچ رکھتا ہے تو شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟ مستفتی: نور الوحید وزیرستانی

﴿جواب﴾ خلع میں حق مہر کے علاوہ کسی اور چیز کا اگر ذکر نہ ہو یعنی صرف حق مہر کے عوض اگر خلع کر لیا ہے تو ایسی صورت میں حق مہر جو نکاح کے موقع پر باقاعدہ مقرر ہوا تھا صرف وہی شمار ہوگا 70000 روپے یا وہ سامان جو اس پیسے سے خریدا گیا ہے شوہر کو لینے کا حق حاصل نہیں ہے۔

اگر کوئی شوہر نہ بیوی بنا کر رکھتا اور نہ ہی طلاق دیتا ہے اور دنیاوی لالچ رکھتے ہوئے خلع کی شرط پر بیوی کو آزاد کرنے کے لئے تیار ہے۔ تو ایسی صورت میں خلع کے ذریعہ کچھ بھی لینا یا اپنے ذمہ سے ساقط کرانا حرام ہے قرآن کریم میں واضح طور پر اس سے منع فرمایا ہے۔

خلع صرف اس صورت میں بلا کراہت جائز ہے اگر نشوز عورت کی طرف سے ہو یعنی عورت شوہر سے بلا وجہ جدائی چاہتی ہو تو حق مہر کی حد تک لینا جائز ہے شوہر بیوی کو نہیں رکھنا چاہتا یا ایسے حالات پیدا کرنے پر تلا ہوا ہے کہ کسی طرح بیوی جدائی کا مطالبہ کرے تو ایسی صورت میں بیوی سے کچھ لینا ہرگز جائز نہیں ہے ظلم اور رشوت ہے۔ تاہم بیوی کو ایسے ظالم شوہر کی قید و بند سے آزادی حاصل کرنے کیلئے مال دینا جائز ہے گناہ صرف شوہر کو ہوگا۔

لما فی الدر مع الرد:(۱۵۸/۳ طبع سعید کراچی)

(فرع) لو زفت الیہ بلا جہاز یلیق بہ فلہ مطالبۃ الاب بالنقدتنیۃ، زاد فی البحر عن المبتغی الا اذا سکت طویلا فلا خصومۃ لہ ،لکن فی النہر عن البزازیۃ الصحیح انہ لا یرجع علی الاب بشیء ،لان المال فی النکاح غیر مقصود ....

وحاصلہ ان ذالک المعجل لا یلزم کونہ ہو المہر المعجل دائما کما یوہمہ کلام الکافی حتی یرد انہ مقابل لنفسہا لا بجہاز ہا بل فیہ تفصیل وہو انہ ان جعل من جملۃ المہر المعقود علیہ فہو المہر المعجل وہو مقابل بنفس المرأۃ والا فہو مقابل بالجہاز عادۃ ،حتی لو سکت بعد الزفاف ولم یطلب جہازا علم انہ دفعہ تبرعا بلا طلب عوض وہو فی غایۃ الحسن وبہ یحصل التوفیق ،واللہ الموفق ،لکن الظاہر جریان الخلاف فی صورۃ ما اذا کان معقودا علیہ لانہ وان ذکر علی انہ مہر لکن من المعلوم عادۃ ان کثرتہ لاجل کثرۃ الجہاز فہو فی المعنی بدل لہ ایضا ،ولہذا کان مہر من لا جہاز لہا

الل من مهر ذات الجهار وان كانت اجمل منها.

يجاب بانه لما صرح بكونه مهرا وهو ما يكون بدل البضع.......

ولما في رد المحتار مع الدر:(۳/۴۴۵،۴۴۶ سعيد)

(وكره)تحريما(الاخذ منه)ويلحق به الابراء عما لها عليه (ان نشز وان نشزت لا) ولو منه نشوز ايضا ولو باكثر مما اعطاها على الاوجه فتح وصحح الشمني كراهة الزيادة ،وتعبير الملتقى لاباس به يفيد انها تنزيهية،وبه يحصل التوفيق

(قوله وكره تحريما الاخذ منه)اى قليلا كان اوكثيرا: والحق ان الاخذ اذا كان النشوز منه حرام قطعاً لقوله تعالى فلاتأخذوا منه شيأ—

(قوله وبه يحصل التوفيق) اى بين مارجحه في الفتح من نفي كراهة أخذالأكثر وهو رواية الجامع الصغير، وبين مارجحه الشمني من اثباتها وهو رواية الأصل.فيحمل الاول على نفي التحريمة والثاني على اثبات التنزيهية ، وهذاالتوفيق مصرح به في الفتح ، فانه ذكر ان المسالة مختلفة بين الصحابة وذكر النصوص من الجانبين ثم حقق ثم قال :وعلى هذا يظهر كون رواية الجامع وأوجه، نعم يكون اخذالزيادة خلاف الاولى والمنع محمول على الأولى ومشى عليه في البحر ايضاً .

وما في التنوير مع الرد ۳/۴۵۲،۴۵۳ طبع سعيد

ويسقط الخلع والمبارأة كل حق لكل منهما على الأخر مما يتعلق بذلك النكاح .

ولما في الشاميه:(۳/۴۶۰ طبع سعيد)

في شرح جامع الصغير لقاضيخان :خلعها ولم يذكرا العوض عندهما لايبرأ احدهما عن صاحبه عن المال الواجب بالنكاح وعن ابى حنيفة روايتان والصحيح براءة كل منهما عن صاحبه .وفي متن المختار: والمبارأة كالخلع يسقطان كل حق لكل منهما على لأخر مما يتعلق بالنكاح حتى لوكان قبل الدخول وقد قبضت المهر لا يرجع عليها بشئي ولولم تقبض شيأ لاترجع عليه بشئي ومثله في متن الملتقى وفي شرح درر البحار وشرح المجمع ان لم يسميا شيأ برئي كل منهما من الأخر قبضت المهر ام لا دخل بها ام لا.

لما في الهنديه:(۱/۴۹۰ طبع سعيد)

رجل خالع امرأته على ان ترد على الزوج جميع ما قبضت منه وكانت المرأة باعت ماقبضت منه أووهبت من انسان ودفعت اليه حتى تعذر عليها رد ذالك على الزوج كان عليها قيمة المقبوض ان كان من ذوات الامثال كان عليها مثل ذالك كذا في فتاوى قاضيخان.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: نصرت اللہ بنوی غفرلہ ولوالدیہ

۱۹ صفر المظفر ۱۴۳۳ھ فتویٰ نمبر: ۲۵۳۶

﴿ تعنت کی بنیاد پر عدالت تنسیخ نکاح کا یکطرفہ فیصلہ دے سکتی ہے ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ..... بنت سلیم احمد کی

شادی ندیم احمد ولد خلیل احمد کے ساتھ ہوئی تھی شادی سے پہلے یہ شخص بڑے بڑے دعوے کرتا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد پتہ چلا کہ یہ شخص ایک نمبر کا جھوٹا اور فریبی ہے، بات بات پر مجھے مارتا پیٹتا تھا، گھر کی ملازمہ جیسے سلوک کرتا تھا، مختلف قسم کے ظلم مجھ پر ڈھاتا تھا، نان نفقہ بالکل نہیں دیتا تھا اور نہ ہی طلاق یا خلع کیلئے تیار تھا، بالآخر تنگ آکر میں نے عدالت میں نان نفقہ نہ دینے کیوجہ سے تنسیخ نکاح کیلئے اپنے شوہر کیخلاف درخواست دائر کیا عدالت نے اسکے پاس کئی نوٹس بھیجے اور اسکو عدالت میں طلب کیا لیکن یہ شخص عدالت میں پیش نہ ہوا، پھر عدالت نے اخبار میں اشتہار کے ذریعے اسکو آخری بار اطلاع دی کہ اگر حاضر نہ ہوا تو ہم نکاح فسخ کر دیں گے (اخباری اشتہار کی کاپی ساتھ منسلک ہے) لیکن یہ شخص اطلاع کے باوجود حاضر نہ ہوا جس پر عدالت میں جج نے بحیثیت مسلمان کلمہ پڑھ کر گواہی لی اور گواہوں کی موجودگی میں میرا نکاح اس شخص سے فسخ کر دیا، اب یہ شخص عدالت کی کاروائی کے کاغذات مجھ سے مانگ رہا ہے اور کہتا ہے کہ تم میرے رشتے سے نکل چکی ہو، جلد از جلد نادرہ کے ادارے سے قانونی کاغذات دکھا کر نکالنا چاہتا ہوں، عدالت کے تمام دستاویز میرے پاس موجود ہیں (جنکی کاپی استفتاء کے ساتھ لف کی گئی ہے)

اب میں شریعت کی نظر میں رہنمائی چاہتی ہوں کہ عنداللہ میری علیحدگی ہوگئی ہے یا نہیں؟ برائے کرم وضاحت فرمائیں۔ مستفتیہ: بنت سلیم احمد

﴿جواب﴾ میاں بیوی کے باہمی تعلق کو رب تعالیٰ نے چین اور سکون کا ذریعہ قرار دیا ہے لیکن یہ اسوقت باعث چین اور سکون ہوگا جب طرفین سے ایک دوسرے کے حقوق کا خیال ہو، ورنہ زندگی اجیرن ہو جاتی ہے، گھروں کے گھر اجڑ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں چند اہل دانش کو جمع کر کے باہمی صلح و مصالحت کی کوشش کرنی چاہئے اگر یہ صورت بھی کارگر نہ ہو اور کسی طرح نباہ نہ ہو سکے تو شوہر کو چاہئے کہ سنت طریقے کے مطابق طلاق دیدے یا عورت کچھ مال وغیرہ دیکر خلع کر لے، لیکن اگر شوہر ان سب کیلئے تیار نہ ہو اور نہ ہی نان نفقہ دیتا ہو بلکہ بلاوجہ عورت کو اذیت میں رکھتا ہو تو عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ مذہب مالکیہ پر عمل کرتے ہوئے اپنا نکاح فسخ کرنے کیلئے شوہر کیخلاف درخواست دائر کرے پھر عدالت شوہر کو بلائیگی اس کو اس بات پر

آمادہ کریگی کہ یا تو بیوی کو معروف طریقہ کے مطابق نان نفقہ دیا کرے اور یا طلاق وخلع کیلئے تیار ہوجائے اگر وہ ان میں سے کسی ایک کیلئے بھی تیار نہ ہوتو عدالت نکاح فسخ کردے، عورت عدت گزارنے کے بعد دوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے۔صورت مسئولہ میں جب شوہر نان نفقہ نہیں دے رہا اور نہ طلاق وخلع کیلئے تیار تھا پھر عدالت کے کئی بار بلانے اور اخبار میں اشتہار شائع ہونے کے باوجود حاضر نہ ہوا تو یہ (حمعت ضدی اور ہٹ دھرم) ہے، لہذا عدالت نے یکطرفہ فیصلہ دیتے ہوئے جب نکاح فسخ کردیا تو نکاح فسخ ہوگیا اب عورت عدت گزارنے کے بعد جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے۔

لما فی فتاوی عثمانی ج۲/ ۳۶۲ (مکتبة معارف القرآن

ولما فی للحیلة الناجزة ص ۶۳، ۱۶۲ طبع دارالاشاعت کراچی۔

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: عاقل شاہ

۲۲ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ | فتویٰ نمبر: ۳۰۴۳

﴿شوہر اگر حمعت ہو تو قاضی کو نکاح فسخ کرنے کا اختیار ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت کی شادی کو چھ سال ہوئے ہیں، اس عرصہ میں اس کے خاوند نے اس کے حقوق کا خیال نہ رکھا، آئے دن جھگڑے ہوتے رہے، شوہر اسکو نہ ہی بساتے ہیں اور نہ ہی اپنے پاس چھوڑتے ہیں، وہ عورت اب اپنی ماں کے گھر میں ہے اور وہ ہر طرح سے یہ چاہتی ہے کہ ان کا گھر بنا رہے لیکن مذکورہ حالات اور شوہر کا رویہ انہیں اس طرح کرنے نہیں دیتا، اب وہ عورت خلع لینا چاہتی ہے جس کے لئے اس نے عدالت میں مقدمہ دائر کیا ہے، چنانچہ عدالت میں پیشی کے لیے پہلی تاریخ میں خاوند غیر حاضر رہا، اب اگر مزید تین تاریخوں میں وہ نہ آیا تو کیا عدالت کے خلع دینے سے خلع واقع ہوجائیگا یا نہیں؟ سائلہ: متعلمہ مدرسہ یوسفیہ بنوریہ شرف آباد کراچی

﴿جواب﴾ اللہ تعالیٰ نے شوہر اور بیوی کے باہمی تعلق کو ایک دوسرے کے لئے محبت اور سکون کا ذریعہ بنایا ہے اور یہ محبت اور سکون اس صورت میں حاصل ہوسکتا ہے جبکہ زوجین ایک دوسرے کے حقوق بجالاتے ہوں لیکن جب زوجین کے درمیان وہ تعلقات نہ رہیں جو ایک

مسلمان خاوند بیوی کے درمیان ہونے چاہئیں اور دونوں کے درمیان صلح کا بھی کوئی طریقہ کارآمد نہ رہے تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ نے طلاق کو مستحب قرار دیا ہے یعنی خاوند کو چاہیے کہ اپنی بیوی کو سنت طریقے کیساتھ طلاق دیکر علیحدہ کر دے لیکن اگر شوہر طلاق دینے پر راضی نہ ہو اور حقوق واجبہ سے بھی بدستور کوتاہی برتتا رہے تو ایسے حالات میں شریعت کی جانب سے عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ شوہر کو اپنی طرف سے کچھ مال دیکر اس کے بدلے میں اس سے علیحدگی کا مطالبہ کرے جسکو فقہی اصطلاح میں خلع کہتے ہیں۔

اور اسکا اصل طریقہ یہ ہے کہ میاں بیوی باہمی رضامندی سے خلع کریں لیکن کوئی درندہ صفت آدمی اس کے لئے بھی تیار نہ ہو اور بیوی کو بلاوجہ قید میں رکھتا ہو تو ایسی صورت میں مظلوم بیوی عدالت سے رجوع کرنے اور مسلمان قاضی (جج) کے ہاں درخواست دائر کرے، قاضی پر شرعاً لازم ہے کہ وہ مدعیہ کی شکایات کی تحقیق کرے، اب شوہر نے اگر صفائی پیش کی یا شکایات دور کرنے کا وعدہ کیا تو قاضی عورت کو گھر بسانے کا حکم دیگا اور اگر شوہر قاضی کے بلانے پر پیش نہیں ہوتا تو ایسی صورت میں شرعاً یہ شوہر متعنت ہے، لہٰذا قاضی کو یکطرفہ طور پر نکاح فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

لمافی قوله تعالیٰ:(سورة البقرة،آیت ۲۲۹)

فان خفتم الا یقیما حدود الله فلا جناح علیهما فیما افتدت به.....الأیة.

ولمافی الشامی:(۸۷/۵-۸۸،طبع امدادیه)

(لابأس به عند الحاجة)للشقاق بعدم الوفاق ای لوجود الشقاق وهو الاختلاف والتخاصم.وفی القهستانی عن شرح الطحاوی.السنة اذا وقع بین الزوجین اختلاف ان یجتمع اهلهما لیصلحوا بینهما فان لم یصطلحا جاز الطلاق والخلع.وهذا هو الحکم المذکور فی الأیة.....واما رکنه فهو کما فی البدائع اذا کان بعوض الایجاب والقبول لأنه عقد علیٰ الطلاق بعوض فلا تقع الفرقة ولا یستحق العوض بدون القبول.

ولمافی زاد المعاد لابن قیمؒ:(۲۲۸/۲،طبع المنار الاسلامیه بیروت)

وفی تسمیة صلی الله علیه وسلم الخلع الفدیة دلیل علیٰ ان فیه معنی المعاوضة ولهذا اعتبر فیه رضاء الزوجین.

ولماایضاًفی المحلیٰ بالأثار لابن حزمؒ:(۲۳۸/۹،طبع دارالفکر بیروت)

لیس فی الأیة ولا فی شیء من السنن للحکمین ان یفرقا ولا ان ذالک للحاکم.

ولما فی المبسوط السرخسیؒ:(۶/۱۷۳،طبع دار المعرفة بیروت لبنان)

والخلع جائز عند السلطان وغيره لانه عقد يعتمد التراضي.

ولما فی المغنی لابن قدامةؒ:(۱۰/۹۷،طبع القاهرة بیروت)

فان امتنع (المدعى عليه) من الحضور او توارى فظاهر كلام احمد: جواز القضاء عليه لما ذكرنا عنه في رواية حرب.

ولما فی الانصاف فی معرفة الراجح من الخلاف:(۱۱/۲۰۲،طبع دار احیاء التراث العربی)

فان امتنع من الحضور سمعت البينة وحكم بها في احدى الروايتين وهو المذهب.

الجواب صحیح:عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ والله اعلم بالصواب: ابوخزیمہ محمد کفایت اللہ

۱۹ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ فتوی نمبر:۲۰۵۷

﴿زوجہ معنت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں.... بنت سلیم احمد کی شادی ندیم احمد ولد خلیل احمد کے ساتھ ہوئی تھی شادی سے پہلے یہ شخص بڑے بڑے دعوے کرتا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد پتہ چلا کہ یہ شخص ایک نمبر کا جھوٹا اور فریبی ہے، بات بات پر مجھے مارتا پیٹتا تھا، گھر کی ملازمہ جیسے سلوک کرتا تھا، مختلف قسم کے ظلم مجھ پر ڈھاتا تھا، نان نفقہ بالکل نہیں دیتا تھا اور نہ ہی طلاق یا خلع کیلئے تیار تھا، بالآخر تنگ آکر میں نے عدالت میں نان نفقہ نہ دینے کیوجہ سے تنسیخ نکاح کیلئے اپنے شوہر کیخلاف درخواست دائر کیا عدالت نے اسکے پاس کئی نوٹس بھیجے اور اسکو عدالت میں طلب کیا لیکن یہ شخص عدالت میں پیش نہ ہوا، پھر عدالت نے اخبار میں اشتہار کے ذریعے اسکو آخری بار اطلاع دی کہ اگر حاضر نہ ہوا تو ہم نکاح فسخ کردیں گے (اخباری اشتہار کی کاپی ساتھ منسلک ہے) لیکن یہ شخص اطلاع کے باوجود حاضر نہ ہوا جس پر عدالت میں جج نے بحیثیت مسلمان کلمہ پڑھ وا کر گواہی لی اور گواہوں کی موجودگی میں میرا نکاح اس شخص سے فسخ کردیا، اب یہ شخص عدالت کی کاروائی کے کاغذات مجھ سے مانگ رہا ہے اور کہتا ہے کہ تم میرے رشتے سے نکل چکی ہو، جلد از جلد نادرہ کے ادارے سے قانونی کاغذات دکھا کر نکالنا چاہتا ہوں، عدالت کے تمام دستاویز میرے پاس موجود ہیں (جنکی کاپی استفتاء کے ساتھ لف کی گئی ہے)۔

اب میں شریعت کی نظر میں رہنمائی چاہتی ہوں کہ عنداللہ میری علیحدگی ہوگئی ہے یا نہیں؟ برائے کرم وضاحت فرمائیں۔ مستفتیہ:........بنت سلیم احمد

﴿جواب﴾ میاں بیوی کے باہمی تعلق کو رب تعالیٰ نے چین اور سکون کا ذریعہ قرار دیا ہے لیکن یہ اسوقت باعث چین اور سکون ہوگا جب طرفین سے ایک دوسرے کے حقوق کا خیال ہو، ورنہ زندگی اجیرن ہوجاتی ہے، گھروں کے گھر اجڑ جاتے ہیں۔ایسی صورت میں چند اہل دانش کو جمع کر کے باہمی صلح ومصالحت کی کوشش کرنی چاہئے اگر یہ صورت بھی کارگر نہ ہو اور کسی طرح نباہ نہ ہوسکے تو شوہر کو چاہئے کہ سنت طریقے کے مطابق طلاق دیدے یا عورت کچھ مال وغیرہ دیکر خلع کرلے،لیکن اگر شوہر ان سب کیلئے تیار نہ ہو اور نہ ہی نان نفقہ دیتا ہو بلکہ بلاوجہ عورت کو اذیت میں رکھتا ہو تو عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ مذہب مالکیہ پر عمل کرتے ہوئے اپنا نکاح فسخ کرنے کیلئے شوہر کیخلاف درخواست دائر کرے پھر عدالت شوہر کو بلائیگی اس کو اس بات پر امادہ کریگی کہ یا تو بیوی کو معروف طریقہ کے مطابق نان نفقہ دیا کرے اور یا طلاق وخلع کیلئے تیار ہو جائے اگر وہ ان میں سے کسی ایک کیلئے بھی تیار نہ ہو تو عدالت نکاح فسخ کردے ،عورت عدت گزارنے کے بعد دوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے۔صورت مسئولہ میں جب شوہر نان نفقہ نہیں دے رہا اور نہ طلاق وخلع کیلئے تیار تھا پھر عدالت کے کئی بار بلانے اور اخبار میں اشتہار شائع ہونے کے باوجود حاضر نہ ہوا تو یہ (متعنت ضدی اور ہٹ دھرم) ہے،لہذا عدالت نے یکطرفہ فیصلہ دیتے ہوئے جب نکاح فسخ کردیا تو نکاح فسخ ہوگیا اب عورت عدت گزارنے کے بعد جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے۔

لمافی فتاوی عثمانی ج۲/ ۴۶۲(مکتبۃ معارف القرآن

ولمافی الحیلۃ الناجزۃ ص ۷۳،۱۲۴ طبع دارالاشاعت کراچی۔

الجواب صحیح مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: عاقل شاہ

۲۲ ربیع الثانی ۱۴۳۵ | فتوی نمبر: ۳۰۴۳

﴿متعنت کے خلاف خلع ڈگری شرعاً بھی معتبر ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری ہمشیرہ مسماۃ ز

نرگس کا نکاح مسمی دلفراز ہوا تھا میری ہمشیرہ دلفراز کی زیادتیوں اور مظالم سے تنگ آکر عدالت گئی ،عدالت نے تحقیقات کرنے کے بعد بالآخر لڑکی کے حق میں فیصلہ کر دیا، ہم نے اس کے بعد اس فیصلہ کی کاپی لیکر دارالعلوم کراچی سے رجوع کیا کہ شریعت میں اس فیصلہ کا اعتبار ہے یا نہیں، فتوی منسلک ہے۔

اب دلفراز پنچائیت اور جرگہ کے ذریعہ ہم سے مطالبہ کر رہا ہے کہ نرگس میری بیوی ہے تم لوگ میرے حوالے کرو، براہ کرم آپ دارالعلوم کراچی کے فتوی اور عدالتی فیصلہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہماری راہنمائی فرمائیں کہ ہم لوگ زبردستی اپنی بہن دیدیں؟ جرگہ والوں کے لئے شریعت کیا حکم دیتی ہے ایسی صورت میں دلفراز کی حمایت کرنا شرعا مناسب ہے یا نہیں؟ مستفتی: حافظ بالقیاس

﴿جواب﴾ جیسا کہ جامعہ دارالعلوم کراچی کے مفتیان کرام نے فتوی دے دیا ہے، کہ آپکی بہن "نرگس" دلفراز کے نکاح سے خارج ہوگئی ہے اور اب چونکہ عدت بھی گزر گئی ہے اس لئے دلفراز کے لئے رجوع کا کوئی حق نہ رہا، اب بیوی ہونے کا دعوی غلط ہے یہ لڑکی آزاد ہے دوسری جگہ نکاح کرنا چاہے تو کر سکتی ہے، دلفراز کو اعتراض کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

البتہ لڑکی خوشی ورضامندی سے تجدید نکاح کے لئے اگر آمادہ ہے تو بغیر حلالہ شرعیہ کے دلفراز سے نئے حق مہر کے ساتھ نکاح ہوسکتا ہے، لیکن یہ اختیار صرف نرگس کو حاصل ہے آپ کو یا جرگہ والوں کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے اور زبردستی نکاح کرنا یا دھمکانا ہرگز جائز نہیں ہے اور لڑکی اگر چاہتی ہے کہ دلفراز سے دوبارہ نکاح کرے تو گھر والوں کے لئے منع کرنا جائز نہیں ہے۔

البتہ لڑکی کے حق میں جو بہتر نظر آئے تو گھر والے اور جرگہ والے اس کا مشورہ نرگس کو دے سکتے ہیں، تجدید نکاح کی صورت میں دلفراز کے پاس صرف دو طلاقوں کا حق باقی رہیگا کسی بھی موقع پر اگر دو طلاقیں دیدی تو بغیر حلالہ شرعیہ کے نکاح بھی نہ ہو سکے گا۔

لما فی "حیلہ ناجزہ" :(۴۲، طبع دارالاشاعت کراچی)

حقت اگر اپنی حرکت سے اس وقت باز آئے جبکہ حاکم اسکی زوجہ پر طلاق واقع کر چکے اور عدت بھی گزر چکے تو اب اس کا کوئی اختیار زوجہ پر نہیں رہتا (کیونکہ عدت گزرنے کے بعد رجوع کا حق نہیں رہتا گو طلاق رجعی ہی ہوا البتہ تراضی طرفین سے نکاح ہوسکتا ہے)

وایضا فی ابی داؤد:(۲۰۲/۱ طبع رحمانیة)

عن خنسأ بنت خدام الانصاریة ان اباها زوجها وھی ثیب فکرھت ذالک فجاءت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فذکرت ذالک فرد نکاحھا.

ولما فی الھندیة :(۲۸۷/۱طبع رشیدیة)

لایجوز نکاح احد علی بالغة صحیحة العقل من اب أو سلطان بغیر اذنھا بکرا کانت أو ثیبا فان فعل ذالک فالنکاح موقوف علی اجازتھا فان اجازتہ جاز وان ردتہ بطل.

ولما فی الھندیہ:(۲۸۹/۱طبع رشیدیة)

ولواستأذن الثیب فلا بد من رضاھا بالقول وکذا انبلغھا الخبر ھکذا فی الکافی۔

ولما فی البنایة:(۲۳/۶طبع حقانیة)

(ولانہ)ای ولأن ایقاع الواحدة(ابعد من الندامة)حیث ابقی لنفسہ التدارک بان یراجعھا فی العدة وبعدھا بتجدید النکاح من غیر تزوج اخر.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمن عفااللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب :نصرت اللہ بنوی غفرلہ ولوالدیہ

۴جمادی الاولی ۱۴۳۲ھ   فتوی نمبر:۳۶۹۸

﴿گناہ کے ڈر کیوجہ سے مرد سے خلع لینا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی اپنی بیوی سے پچھلے حصہ میں مباشرت کرتا ہے، وہ گناہ سے بہت ڈرتی ہے اور گناہ کے ڈر کی وجہ سے شوہر سے طلاق مانگتی ہے تو اس سے طلاق مانگنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ پچھلے حصہ میں مباشرت حرام ہے، ایسے شخص کیطرف اللہ تعالیٰ نظر رحمت نہیں فرماتے، سمجھانے کے باوجود یہ شخص اس غیر فطری گندے عمل سے باز نہیں آتا تو اسکی بیوی کو خلع لینا جائز ہے۔

لما فی قولہ تعالیٰ:(سورة البقرة،أیت ۲۲۳)فأتوحرثکم انی شئتم..... الأیة.

ولما فی جامع الترمذی:(۱۳۹/۱ طبع فاروقی ملتان)

قال رسول اللہ ﷺلاینظر اللہ الی رجل اتی رجلا اوامراۃ فی الدبر قال ھذاحدیث حسن غریب.

ولما فی مشکوۃ المصابیح:(۳۲۱/۲ طبع سعید)لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق.

ولما فی التنویر مع الرد:(۴۴۱/۳ طبع سعید)(ولا بأس بہ عندالحاجة)

وفی الشامیة: (قولہ للشقاق)ای لوجود الشقاق وھوالاختلاف والتخاصم وفی القھستانی عن شرح الطحاوی :السنة اذاوقع بین الزوجین اختلاف أن یجتمع أھلھما لیصلحوا بینھما فان لم یصطلحا جاز الطلاق والخلع..... الخ.

ولما فی الهداية:(۲/۲۱۳مطبع رحمانيه)

واذا تشاق الزوجان وخافا ان لا يقيما حدود الله فلا باس بان تفتدى نفسها منه بمال يخلعها به لقوله تعالى فلا جناح عليهما فيما افتدت به.

ولما فی فتاوى العصر(ص۲۲۷)

وللزوجة طلب الفسخ الزوج ان فعل ذلك (اللواطة) وجامعها..... الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: انیس طالب کان اللہ لہ

۲۱ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۵۳۸

﴿خلع اور مصاہرت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ میرا شوہر غلط کاریوں میں مبتلا ہے کئی عورتوں کیساتھ اس کے ناجائز تعلقات ہیں، مزید یہ کہ میری والدہ کو بلا حائل شہوت کیساتھ چھو بھی چکا ہے میری والدہ پورے وثوق کیساتھ یہ بات کہتی ہیں، مجھے اپنی والدہ کی اس بات پر پورا یقین ہے لیکن میرا شوہر اس بات کو نہیں مانتا ہے، میں اب تقریبا تین سال سے اسکے ساتھ نہیں رہتی اور عدالت سے خلع لے چکی ہوں، کیا ایسے شوہر سے میرا نکاح باقی ہے؟ مستفتیہ: ایک سائلہ کراچی

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ داماد اپنی ساس کو اگر شہوت کیساتھ چھولے تو یہ نہ صرف خطرناک گناہ بلکہ اس گھناؤنی حرکت سے ساس کی بیٹی (بیوی) ہمیشہ کے لے حرام ہوجاتی ہے لیکن معاملے کا تعلق چونکہ حقوق سے ہے، اس لئے محض ساس یا بیوی کے دعوی سے حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے حجت تامہ کا ہونا ضروری ہے، مسئولہ صورت میں شوہر چونکہ (لمس) چھونے سے انکار کررہا ہے، اس لئے شوہر ہی کا قول قسم کیساتھ معتبر ہے۔

لما فی الدر مع الرد:(۳/۳۷ طبع سعید)

(قوله وان ادعت الشهوة)فی تقبيله أو تقبيلها ابنه (وانكرها الرجل فهو مصدق)لا هی.

وفی الشامية:(قوله وان ادعت الشهوة فی تقبيله)ای ادعت الزوجة أنه قبل أحد أصولها أو فروعها قبلها بشهوة(قوله فهو مصدق)لأنه ينكر ثبوت الحرمة والقول للمنكر وهذا ذكره فی الذخيرة فی المس لا فی التقبيل كما فعل الشارح فانه مخالف لما مشى عليه المصنف اولا من أنه فی التقبيل يفتى بالحرمة مالم يظهر عدم الشهوة وقدمناه عن الذخيرة نقل الخلاف فی ذلك فما هنا مبنی على ما فی بيوع العيون.

ولما فی المحيط:(۲/۴۱مطبع ادارة القرآن)

اذا قبلها ثم قال:لم يكن عن شهوة ولمسها، أو نظر الى وجهها ثم قال لم يكن بشهوة فقد

ذكر الصدر الشهيدأن في القبلة يفتى بثبوت الحرمة مالم يتبين له أن قبل بغير شهوة وفي المس والنظر الى الفرج لايفتى بالحرمة الااذاتبين أنه فعل بشهوة ثم ذكر بعد صفحتين وان اختلفافالقول قول الزوج لانه ينكر ثبوت الحرمة القول قول المنكر.

لوگ خلع اور فسخ نکاح میں عام طور پر فرق نہیں کرتے، معلوم نہیں آپکو خلع کی ڈگری ملی ہے یا فسخ نکاح کی، حقیقت یہ ہے کہ خلع بھی دیگر عقود بیع اجارہ وغیرہ کیطرح ایک عقد ہے جسمیں جانبین کی رضامندی شرط ہے، اسلئے عدالتی خلع شوہر کی رضامندی کے بغیر درست نہیں، البتہ قاضی ان صورتوں میں نکاح فسخ کرسکتا ہے:

(۱) شوہر نامرد ہو یعنی وظیفہ زوجیت سے عاجز ہو (۲) نان نفقہ نہ دیتا ہو یعنی خرچ وغیرہ سے عاجز ہو (۳) پاگل ہو (۴) بالکل لاپتہ ہو گیا ہو (۵) بالکل لاپتہ تو نہ ہو لیکن غائب ہو گیا ہو۔

ان صورتوں میں سے کسی صورت کے پائے جانے کیوجہ سے قاضی نکاح فسخ کرسکتا ہے لیکن خلع کے ذریعے سے شوہر کی رضامندی کے بغیر قاضی کی تفریق معتبر نہیں۔

لمافي المبسوط:(۶/۱۷۳،طبع:دارالمعرفة بيروت)

(قال)والخلع جائزعند السلطان وغيره لأنه عقديعتمدالتراضي كسائرالعقود وهوبمنزلة الطلاق بعوض وللزوج ولاية ايقاع الطلاق ولهاولاية التزام العوض فلامعنى لاشتراط حضرة السلطان في هذاالعقد.

ولمافي بدائع الصنائع:(۳/۱۴۵،طبع سعيد)

واماركنه فهوالايجاب والقبول لأنه عقدعلى الطلاق بعوض فلاتقع الفرقة ولايستحق العوض بدون القبول(ثم قال بعدسطرين)وحضرة السلطان ليست بشرط لجوازالخلع عندعامة العلماء فيجوزعندغيرالسلطان والصحيح قول العامة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: طاہر زمان راولپنڈی

۱۱ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۰۰۰

﴿طلاق علی المال کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں اس مسئلہ کے بارے میں علماء کرام کہ مورخہ 26 مارچ 2006ء بروز اتوار بندہ کی رخصتی ہوئی اور ایک رات بھی ساتھ گزاری لیکن لڑکی کے والد نے رخصتی کے غالباً تین چار دن کے بعد طلاق کا مطالبہ کر دیا، بندہ نے طلاق دینے سے انکار کیا، لڑکی کے والد نے جب بہت اصرار کیا تو بندہ اس شرط پر راضی ہوا کہ میں طلاق دیتا ہوں مگر مجھے مہر

معاف کیا جائے، کیا اس صورت میں مہر معاف ہو جائے گا یا نہیں؟ مستفتی: محمد عطاء اللہ

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اگر شوہر بیوی سے یہ کہے کہ میں تمہیں اس شرط پر طلاق دیتا ہوں کہ تم مہر چھوڑ دو اور عورت قبول کرلے تو ایسا کرنے سے مہر معاف ہو جائے گا اور طلاق بائن واقع ہو جائے گی اور عورت پر عدت گزارنا بھی لازم ہوگا، شریعت کی اصطلاح میں اس کو خلع کہتے ہیں جس کا ذکر قرآن مجید میں پارہ نمبر۲ کے اندر آیا ہے:

لمافی قوله تعالی (سورالبقرة،آیت ۲۲۹)

فان خفتم الایقیما حدود الله فلاجناح علیهما فیما افتدت به.....الآیة.

خلع یا طلاق بائن واقع ہونے کی صورت میں شوہر کو رجوع کا حق حاصل نہیں ہوتا اور نہ خلع واپس لینے کا اختیار، ہاں دونوں کی رضامندی سے بغیر حلالہ دوبارہ نکاح ہو سکے گا لیکن آئندہ کے لئے شوہر کے پاس صرف دو طلاقوں کا حق رہے گا۔

لمافی الهندیة:(۴۸۹/۱،طبع رشیدیه)

ان خالعها علی مهرها فان کانت المرأة مدخولا بها وقد قبضت مهرها یرجع الزوج علیها بمهرها وان لم یکن مقبوضا سقط عن الزوج جمیع المهر ولایتبع احدهما صاحبه بشئی.وهکذافی الغایة علی الهندیة:(۵۲۹/۱،طبع رشیدیه)

ولمافی التنویرمع الدر:(۹۱/۵،طبع امدادیه)

(و)حکمه أن (الواقع به)ولوبلامال(وبالطلاق)الصریح (علی مال طلاق بائن)

ولمافی التنویرمع الدر:(۱۰۳/۵-۱۰۴-۱۰۵ طبع امدادیه)

(ویسقط الخلع)....(المبارأة).......(کل حق)......(لکل منهما علی الآخرممایتعلق بذلک النکاح) حتی لوأبانهاثم نکحهاثانیابمهرآخرفاختلعت منه علی مهرهابرئ عن الثانی لاالأول.

وفی الشامیة:وان کان بکل المهرفان کان مقبوضارجع بجمیعه والاسقط عنه کله مطلقا:أی قبل الدخول أوبعده.

ولمافی البحرالرائق:(۴۹/۲،طبع سعید)

وقدقال فی الجوهرة وان وقع الخلع علی المهرصح فان لم تقبضه المرأة سقط عنه وان قبضته استرده منها.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر:

﴿باب الظهار والایلاء﴾

﴿بیوی کو یہ الفاظ کہنا کہ ''تو دنیا و آخرت میں مجھ پر ماں ہے'' کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام دریں مسئلہ کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو حالت غصہ میں طلاق کی نیت سے یہ الفاظ کہے ''تو دنیا و آخرت میں مجھ پر ماں ہے'' اسکے بعد بیوی اس کے ساتھ رہی کہ ایک دوسرے موقع پر شوہر نے اسے تین طلاقیں دیں، مذکورہ صورت میں شوہر کیلئے کیا حکم ہے؟

سائل: محمد اسلم شیخ

﴿جواب﴾ شوہر نے پہلی مرتبہ یہی الفاظ بولے ہوں ''تو دنیا و آخرت میں مجھ پر ماں ہے'' یعنی تشبیہ کے حروف پر جملہ مشتمل نہ ہو تو یہ الفاظ لغو ہے، ان سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی اور نہ ظہار ہوا، البتہ دوسرے موقع پر شوہر نے تین طلاقیں دیں تو اب تین طلاقیں واقع ہوگئی ہیں۔

اب رجوع نہیں ہوسکتا اور حلالہ شرعیہ کے بغیر دوبارہ نکاح بھی نہیں ہوسکتا، عدت گزرنے کے بعد مطلقہ خاتون چاہے تو دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے۔

لمافی التنویر:(۳/۴۶۶،طبع سعید)

وشرعاتشبيه المسلم زوجته اوجزء شائع منهابمحرم عليه تابيدا.

ولمافی التنویرمع الدر:(۳/۴۷۰،طبع سعید)

(وان نوى بـانـت علـيّ مثل أميّ)اوكأمي وكذالوحذف على خانية(براوظهاراًوطلاقا صحت نيته)ووقع،مانواه لانه كناية(والا)ينوشيأاوحذف الكاف(لغا)وتعين الادنى اى البربمعنى الكرامة ويكره قوله انت امى ويا ابنتي وياختي ونحوه قلت:ويدل عليه ما نذكره عن الفتح من انه لابدمن التصريح بالأداة قوله:(لغا)لأنه مجمل في حق التشبيه فما لم يتبين مرادمخصوص لايحكم بشي......فعلم انه لابدفي كونه ظهارامن التصريح بأداة التشبيه شرعا.

ولمافی تنویرالابصارمع الرد المحتار:(۳/۲۳۲،طبع بسعید)

والبدعي ثلاث متفرقة اوثنتان بمرة اومرتين في طهرواحدقوله ثلاث متفرقة وكذا بكلمة واحدة بالأولى.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم: عبیداللہ عابد غفرلہ ولوالدیہ

۶ رجب المرجب ۱۴۳۰ھ

فتویٰ نمبر: ۲۳۵۶

﴿ظہار کے الفاظ میں حرف تشبیہ ہونا ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے غصہ میں

اپنے دوست سے کہا کہ اگر آئندہ میں آپکی دوکان پہ آیا تو "مجھ پر میری بیوی بہن ہو" کہنے والے کو کچھ نیت معلوم نہیں ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟ یہ الفاظ ظہار کے ہیں یا طلاق کے ہیں؟

﴿جواب﴾ یہ الفاظ نہ ظہار کے ہیں اور نہ طلاق کے۔ اس لیے کہ ظہار کے الفاظ میں اولی لفظ تشبیہ کا ہونا ضروری ہے، اور اس جملہ میں تشبیہ کا کوئی لفظ نہیں ہے، اور جو الفاظ ظہار کے نہیں بنتے تو طلاق کے بطریق اولی نہیں بنتے، البتہ تشبیہ کے الفاظ جملہ میں ہوتے تو طلاق کی نیت سے طلاق بائن واقع ہو جاتی، لہذا یہ الفاظ لغو ہیں ان سے نہ ظہار واقع ہے اور نہ طلاق، البتہ آئندہ کے لیے ایسا بولنے سے گریز کریں فقہائے کرام نے مکروہ لکھا ہے۔

لما فی تنویر الابصار:(٣/٤٦٦: طبع سعید)

وشرعاً تشبیه المسلم زوجته اوجزء شائع منها بمحرم علیه تابیداً.

ولما فی البحر الرائق:(٤/٩٨باب الظهار)

قال العلامه ابن نجیم: فعلم انه لا بد فی کونه ظهاراً من التصریح باداة التشبیه شرعاً.

ولما فی تنویر الابصار مع الدر:(٣/٤٧٠طبع سعید).

(وان نوی بانت علی مثل امی) او کامی وکذا لو حذف علی خانیه (براًاو ظهاراً) او طلاقاً صحت نیته زوقع ما نواه لانه کنایة(والا) ینو شیئا او حذف الکاف (لغا) وتعین الادنی ای البر یعنی الکرامة ویکره قوله انت امی ویا ابنتی ویا اختی ونحوه— قلت: ویدل علیه ما نذکره عن الفتح من انه لا بد من التصریح بالاداة(قوله لغا) لانه مجمل فی حق التشبیه مالم یتبین مراد مخصوص لایحکم بشئی...... فعلم انه لابد فی کونه ظهارا من التصریح باداة التشبیه شرعاً.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ	واللہ اعلم بالصواب: محمد تنویر عفا اللہ عنہ
١٦ ربیع الاول ١٤٣٢ھ	فتوی نمبر: ٣٦٠٨

﴿بیوی کو "تو میری بہن ہے" کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے اپنی بیوی کو غصہ کی حالت میں بغیر نیت طلاق کے تین بار یہ کہا کہ "آج سے تو میری بہن ہے" اس جملہ سے طلاق واقع ہوگئی یا نہیں کیا حکم ہے؟

مستفتی: قاری ارشد علی کورنگی اقصیٰ مسجد

﴿جواب﴾ زید کا اپنی بیوی کو یہ کہنا کہ "آج سے تو میری بہن ہے" مکروہ ہے اس سے

احتراز لازم ہے، تاہم اس جملے سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوتی، نکاح برقرار ہے۔

لمافی الشامی:(۴۷۰/۳ طبع ایچ ایم سعید)

والذی فی الفتح:وفی أنت أمی لایکون مظاهراً وینبغی أن یکون مکروها فقدصرحوا بان قوله لزوجته یاأخیة مکروه ......ومثله أن یقول لهایابنتی أویاأختی ونحوه.

ولمافی البحر:(۱۸/۴ طبع ایچ ایم سعید)

وقیدبالتشبیه لانه لوخلاعنه بان قال أنت أمی لایکون مظاهرالکنه مکروه لقربه من التشبیه وقیاساعلی قوله یاأخیة المنهی عنه فی حدیث أبی داؤدالمصرح بالکراهة ولولاالتصریح بهالامکن القول بالظهارفعلم أنه لابدفی کونه ظهارامن التصریح بأداة التشبیه شرعاومثله قوله یابنتی ویاأختی ونحوه.

ولمافی الهندیة:(۵۰۷/۱ طبع رشیدیه)

ولوقال لهاأنت أمی لایکون مظاهراوینبغی أن یکون مکروها....ولوقال أنت علی مثل أمی أوکأمی ینوی فان نوی الطلاق وقع بائناوان نوی الکرامة أوالظهارفکمانوی هکذا فی فتح القدیروان لم تکن له نیة فعلی قول أبی حنیفة لایلزمه شیء حملاللفظ علی معنی الکرامة کذافی الجامع الصغیروالصحیح قوله.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب:عباداللہ غفرلہ ولوالدیہ

۱۴صفرالخیر۱۴۳۲ھ   فتویٰ نمبر:۲۸۵۹

﴿بیوی کو بہن کہنا جھوٹ ہے ظہار نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک لڑکی کالج میں پڑھتی ہے اور ہوسٹل میں رہتی ہے۔لڑکی شادی شدہ ہے۔جب اس کا شوہر اس کو لینے کے لئے گیا تو چوکیدار نے پوچھا آپ لڑکی کے کیا لگتے ہو،لڑکا اس ڈر سے کہ کالج والوں کو معلوم نہ ہو جائے کہ لڑکی شادی شدہ ہے،لڑکے نے کہہ دیا کہ میں اس کا بھائی ہوں کیا اس صورت میں ظہار ہوگا یا نہیں؟

﴿جواب﴾ یہ الفاظ ظہار کے نہیں ہیں۔ان سے کوئی ظہار نہیں ہوتا،البتہ جھوٹ ہے لیکن دونوں کا آپس میں دینی رشتہ بھی ہے۔اس اعتبار سے تمام مسلمان بہن بھائی ہیں اگر اس طرح سوچ کر کہتے تو جھوٹ نہ ہوتا اور مقصد بھی پورا ہو جاتا بہرحال ان الفاظ سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

ولما فی العالمگیریه:(۵۰۷/۱ طبع رشیدیه)

لو قال لها انت امی لا یکون مظاهراً و ینبغی ان یکون مکروهاً و مثله ان یقول یا ابنتی و یا اختی ـــــــوان لم تکن له نیة فعلی قول ابی حنیفة رحمه الله تعالی لا یلزمه شی

حملاً للفظ علی معنی الکرامة کذا فی الجامع الصغیر والصحیح قوله هکذا فی غایة البیان وان نوی التحریم اختلف الروایات فیه والصحیح انه یکون ظهاراً عندالکل قال لها انت مثل امی و لم ینو شیئا لا یلزمه شئی فی قولهم کذا فی فتاوی قاضیخان۔

ولما فی ردالمحتار: (۳/۴۷۰، طبع سعید)

و یکره قوله انت امی و یا ابنتی و یا اختی و نحوه ـــــ والذی فی الفتح: و فی انت امی لا یکون مظاهراً و ینبغی ان یکون مکروهاً فقد صرحوا بان قوله لزوجته یا اخیة مکروه ۔و فیه حدیث رواه ابو داؤدان رسول الله ﷺ "سمع رجلاً یقول لامرأته یا اخیة فکره ذلک و نهی عنه" و معنی النهی قربة من لفظ التشبیه و لولا هذا الحدیث لامکن ان یقال هو ظهار، لان التشبیه فی انت امی اقوی منه مع ذکر الاداة، و لفظ یا اخیة استعارة بلاشک، و هی مبنیة علی التشبیه، ولکن الحدیث افاد کونه لیس ظهاراً حیث لم یبین فیه حکماً من التصریح باداة التشبیه شرعاو مثله ان یقول لها یا ابنتی او یا اختی و نحوه۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: محمد حامد یاسین، بھکر

۱۴ جمادی الثانی ۱۴۳۳ھ   فتویٰ نمبر: ۲۷۹۱

﴿آج کے بعد تو میرے لئے بہن ہے سے طلاق واقع نہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسألہ کے بارے میں کہ بندہ ایک دن اپنی بیوی کو کہدیا [ازیں بعد تو برائے من خوارم باشی] آج کے بعد آپ میرے واسطے بہن ہو۔ اور مجھے ایسا یاد ہے کہ یہ بات میں نے غصہ میں کہی تھی۔ لیکن اس سے طلاق کا ارادہ نہیں تھا۔ کیونکہ ہمارے یہاں طلاق دینے کا طریقہ اور رواج یہ ہے کہ دینے سے پہلے بہت مشورے اور جرگے ہوتے ہیں اور بڑوں کی طرف سے طلاق دینے یا نہ دینے میں دباؤ ہوتا ہے۔ اس واقعہ کو پیش آئے ہوئے سات یا آٹھ سال گزر چکے ہیں اب مجھے یہ فکر لاحق ہوئی ہے۔ کہ ایسا تو نہیں کہ میری بیوی مجھ پر حرام ہوگئی ہو۔ عرض یہ ہے کہ مذکورہ صورت میں بیوی مجھ پر حرام ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ اپنی بیوی کو اسطرح مخاطب کر کے کہنا" ازیں بعد تو برائے من خوارم باشی" یعنی آج کے بعد تو میرے واسطے بہن ہے مکروہ ہے ایسا نہیں کہنا چاہئے لہذا یہ لغو ہے اور آئندہ کیلئے احتیاط کریں۔

ولما فی الدر المختار (۳/۴۷۰ سعید کراچی)

(وان نوی بانت علی مثل امی) او کامی، وکذا لو خذف علی حانیه (برا او ظهارا او طلاقا صحت نیته) ووقع مانواه لانه

کنایۃ (والا) فہو شیئا او حذف الکاف (لغا) وتعین الادنی البر، یعنی الکرما، ویکرہ قولہ انت امی ویا ابنتی ویااختی ونحوہ

ولما فی الشامی، (ج:۳،۴۷۰/۳سعید)

والذی فی الفتح، وفی انت امی لایکون مظاہرا، وینبغی ان یکون مکروھا، فقد صرحوا بان قولہ لزوجتہ یااخیہ مکروہ، وفیہ

حدیث رواہ أبوداود "ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سمع رجلا یقول لامرأتہ یااخیۃ فکرہ ذالک ونہی عنہ"

لمافی الہندیۃ (ج۱/۵۰۷) کوئٹہ

لو قال لہا انت امی لایکون مظاہرا وینبغی ان یکون مکروھا ومثلہ ان یقول یاابنتی یا اختی ونحوہ ولو قال لہا أنت علی مثل امی او کامی ینوی فان نوی الطلاق وقع بائنا وان نوی الکرامۃ او الظہار فکما نوی ھکذافی فتح القدیر وان لم تکن لہ نیتہ فعلی قول ابی حنیفہ رحمہ اللہ تعالی لایلزمہ شئی حملاً للفظ علی معنی الکرامۃ کذا فی جامع الصغیر

ولما فی البحر (ج ۴ ۹۴طبع:سعید)

وقید بالتشبیہ لانہ لوخلا عنہ بان قال انت امی لایکون مظاہرا لکنہ مکروہ لقربہ من التشبیہ وقیاسا علی قولہ یااخیہ المنہی عنہ فی الحدیث ابی داود الصرح بالکرامۃ ولو لا التصریح بھا لامکن القول بالظاہر فعلم انہ لابد فی کونہ ظھارا من التصریح باداۃ التشبہ شرعا ومثلہ قولہ یاابنتی یا اختی ونحوہ۔

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: صفی اللہ

۱۷ ذی القعدہ ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۸۸۹

﴿اللہ کی قسم میں تیرے قریب نہیں آؤنگا" "تو مجھ پر حرام ہے" بولنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام درج ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ "اللہ کی قسم میں تیرے قریب نہیں آؤنگا" "اور اللہ کی قسم تو مجھ پر حرام ہے" اسکا کیا حکم ہے؟ مذکورہ جملوں کی آدائیگی کے بعد اس مرد کا نکاح اس عورت سے برقرار ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ صورت مسؤلہ میں پہلا جملہ یعنی "اللہ کی قسم میں تیرے قریب نہیں آؤنگا" ایلاء کا ہے، یہ جملہ ادا کرنے کے بعد اگر شوہر چار ماہ تک اپنی بیوی سے قربت نہ کرے تو اسکی بیوی کو خود بخود طلاق بائنہ ہو جاتی ہے اور اگر چار ماہ کے اندر قربت کرلے تو قسم توڑنے کی وجہ سے کفارہ ادا کرنا ہوتا ہے اور طلاق واقع نہیں ہوتی۔

اور دوسرا جملہ یعنی "تو مجھ پر حرام ہے" یہ بھی بظاہر پہلے جملے کی تاکید کے لئے ہے اور ایلاء

ہی کا حکم ہوگا، البتہ شوہر نے اس سے مستقل طلاق کی نیت کی ہو تو اس نیت کا اعتبار ہوگا۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲/۴۲۵،طبع سعید)

والفاظه صريح وكناية(ف)من الصريح(لوقال والله)......(لااقربك)....(اربعة اشهر)....الخ

ولمافی التنویر مع الدر:(۴۲۶/۲،طبع سعید)

(ففی الحلف بالله وجبت الكفارة،وفی غيره وجب الجزاء وسقط الايلاء لانتهاء اليمين (والا)يقربها(بانت بواحدة)بمضيها.

ولمافی الشامی:(۴۲۲/۲،طبع سعید)

وفيه انهما ايلاء ان يجب بالحنث فی احدهما الكفارة وفی الآخر الجزاء وان وقع عند البر طلاق واحد بدليل ماقالوافی:والله لااقربك اذاكرره ثلاثاًولم ينو التاكيدانه ايمان ثلاثة يجب لكل كفارة ويقع بهاطلقة واحدة---قال لامرأته انت علىّ حرام ايلاء ان نوى التحريم اولم ينو شيئاًوهدران نوى الكذب وتطليقة بائنة ان نوى الطلاق ثلاث ان نوهاويفتى بانه طلاق بائنة وان لم ينوه لغلبة العرف.

ولمافی الشامی:(۴۳۵/۲،طبع سعید)

هذافی القضاء،وامافی الديانة فلايقع مالم ينو،وعدم نية الطلاق صادق بعدم نية شیء اصلاً وبنية الظهاراوالايلاء فانه لايصدق قضاء كماصرح به الزيلعی قلت:الظاهرانه اذالم ينو شيئاًاصلاًيقع ديانة ايضاً.

ولمافی التنویر مع الدر:(۲۰۸/۲-۲۱۰،طبع سعید)

(لا)يلحق البائن(البائن)---(الااذاكان)البائن(معلقابشرط)

وفی الشامية:(قوله الااذاكان البائن معلقاً)يشمل مااذاآلیٰ من زوجته ثم أبانهاقبل مضی اربعة اشهر ثم مضت قبل ان يقربهاوهی فی العدة فانه يقع خلافاًلزفر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد کاشف عزیز

۱۹ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ　　　فتویٰ نمبر: ۲۰۵۹

«"اللہ کی قسم میں ایک سال تک تیرے قریب نہیں آؤنگا اگر آیا تو تجھے طلاق ہے"»

«سوال» کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے اپنی بیوی سے کہا "اللہ کی قسم میں ایک سال تک تیرے قریب نہیں آؤنگا، اگر آیا تو تمہیں طلاق ہے" تو اب شریعت میں زید کیلئے کیا حکم ہے کیونکہ اگر وہ سال گزرنے سے پہلے اپنی بیوی کے پاس جاتا ہے تو طلاق واقع ہوتی ہے، کیا وہ ایک سال تک بیوی سے دور رہے تو سال گزرنے کے بعد بھی انکا نکاح برقرار رہےگا یا نہیں؟

مستفتی: عبداللہ ٹانکوی

«جواب» مذکورہ صورت ایلاء کی ہے۔ ایلاء کا مطلب شریعت میں یہ ہے کہ

شوہر چار مہینے یا اس سے زیادہ مدت تک اپنی بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھالے، اور زید نے بھی چونکہ اسطرح کی قسم کھائی ہے لہٰذا اب اگر وہ اپنی بیوی کے پاس چار مہینے تک نہیں گیا تو اس کی بیوی پر ایک طلاق بائن واقع ہو جائیگی پھر زید اپنی بیوی کے ساتھ اگر ازدواجی تعلق قائم رکھنا چاہے گا تو باہمی رضامندی سے نئے حق مہر کے ساتھ تجدید نکاح کی ضرورت ہوگی۔

لیکن اگر زید اپنی قسم پر قائم نہیں رہتا اور چار ماہ گزرنے سے پہلے پہلے اپنی بیوی سے جماع کر لیتا ہے تو قسم توڑنے کی وجہ سے اسکی بیوی پر ایک طلاق رجعی واقع ہوگی اور یہ بہ نسبت پہلی صورت کے بہتر ہے کیونکہ اس صورت میں تجدید نکاح کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ عدت کے اندر اندر رجوع کرنے کا اسے حق حاصل ہوگا اور ہر دونوں صورتوں میں آئندہ کیلئے شوہر کے پاس صرف دو طلاقوں کا حق باقی رہے گا۔

لمافی التنویر مع الدر والرد (۲۲۲،۴۲۲/۳، طبع سعید)

(هو) لغة اليمين. وشرعا (الحلف على ترك قربانها) مدة ولو ذمیا..... (وحكمه وقوع طلقة بائنة ان بر) ولم يطأ (و) لزم (الكفارة أو الجزاء) المعلق (ان حنث) بالقربان.

(و) المدة (اقلها للحرة أربعة أشهر وللأمة شهران).

وفي الشامي: (قولها ان حنث بالقربان) أي الوطء حقيقة، فلا يحنث بالفئ باللسان عند العجز عن الوطء لأنه غير المحلوف عليه.

ولما في التنوير مع الدر والرد (۴۲۶،۴۲۵/۳، طبع سعيد)

(و) من الصريح (لو قال والله) وكل ما ينعقد به اليمين (لا أقربك)..... (أو) والله (لا أقربك) ..... (أو ان قربتك فعلي حج أو نحوه) مما يشق ..... (أو فانت طالق أو عبده حر)

وفي الشامي: (قوله فانت طالق أو عبده حر) كان ينبغي ذكره قبل قوله أو نحوه فان قربها تطلق رجعية ويعتق العبد.

ولما في التنوير مع الدر (۳۹۸،۳۹۷/۳ طبع سعيد)

باب الرجعة: بالفتح وتكسر يتعدى ولا يتعدى. (هي استدامة الملك القائم) بلا عوض مادامت (في العدة)

ولما في فتاوى قاضي خان (۳۴۲/۱، طبع قديمي)

المهر يتكرر بالعقد مرة وبالوطء أخرى ومرة يتكرر بهما.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: صدیق الور

۱۰ رجب المرجب ۱۴۳۲ھ　　　　فتویٰ نمبر ۳۲۵۰

﴿بیوی کو غصہ میں یہ کہنا کہ "تو مجھ پر میری ماں کی طرح ہے"﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کسی کام کے بارے میں کہا کہ فلاں کام کرو تو اس نے آگے سے انکار کردیا، اس پر اس شخص کو غصہ آیا اور کہا کہ تو مجھ پر میری ماں کی طرح ہے، مذکورہ الفاظ بولتے وقت کوئی بھی نیت نہیں تھی تو کیا مذکورہ صورت میں بیوی حرام ہوگئی یا نہیں؟ مستفتی: عبدالرحیم صاحب

﴿جواب﴾ مذکورہ جملہ بولتے ہوئے اس شخص کی واقعی اگر کچھ بھی نیت نہیں تھی تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی۔

لمافی الشامی: (۲/۴۷۰ طبع سعید)

(وان نوی بانت علیّ مثل امی) او کامی (برا او ظهارا او طلاق صحت نيته) ووقع مانواه لأنه كناية (والا) ينوشيئا (لغا) وتعين الأدنى اى البر يعنى الكرامة وكذافى البحر: (۲/۱۸ سعید)

ولمافی قاضی خان: (۱/۵۲۲ طبع قدیمی)

ان يقول لهاأنت مثل أمى ولم يقل علىّ ولم ينوشيئالايلزمه شئى فى قولهم ولوقال انت على كامى أومثل أمى ونوى به البرو الكرامة لايلزمه شئى وان نوى الظهار كان ظهاراوان لم ينوشيئالايلزمه شئى فى قول أبى حنيفةؒ، بهامش الهندية.

ولمافی الهندية: (۱/۵۰۷ طبع رشيديه)

ولوقال لهاأنت على مثل أمى أوكامى ينوى فان نوى الطلاق وقع بائناوان نوى الكرامة أوالظهار فكمانوى وان لم تكن له نيةفعلى قول أبى حنيفةؒ لايلزمه شئى حملا للفظ على معنىٰ الكرامة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: رضوان اللہ حقانی

۱۶ ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۱۶۲

﴿"اگر تو فلاں جگہ گئی تو تو مجھ پر میری بہن کی طرح ہے" کے الفاظ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر تو فلاں جگہ گئی تو تو مجھ پر میری بہن کی طرح ہے اور پھر اس کی بیوی وہاں چلی بھی گئی، شوہر نے بتایا کہ میرا ارادہ ان الفاظ سے صرف حرمت کا تھا، طلاق کا ارادہ نہیں تھا، اب سوال یہ ہے کہ ان الفاظ سے طلاق ہوگی یا ظہار ہوگا؟ مستفتی از لورلائی بلوچستان

﴿جواب﴾ سوال میں ذکر کردہ الفاظ اگر شوہر نے حرمت کے نیت سے بولے تھے تو ان

الفاظ سے ظہار ہوگا جس کا حکم یہ ہے کہ بیوی اس وقت تک شوہر پر حرام ہوجاتی ہے جبتک وہ کفارہ ادا نہ کرے، کفارہ ظہار یہ ہے کہ دو ماہ مسلسل روزے رکھے یا پھر عدم استطاعت کی صورت میں ساٹھ مساکین اور فقراء کو دو وقت کا کھانا کھلائے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۳/۴۷۰،طبع سعید)

(وان نوی بانت علی مثل امی)او کامی وکذالوحذف علی خانیة(برا اوظهارا اوطلاقا صحت نیته)ووقع مانواه لانه کنایة.....الخ.

وفی الشامیة:(قوله وان نوی الخ)بیان لکنایات الظهار واشارالیٰ انه صریحه لابدفیه من ذکرالعضو.بحر.....والکلام فی مجردانت کامی ای بدون لفظ حرام قلت:وقدیجاب بان الحرمة مرادة وان لم تذکرصریحا وکذالو نوی الحرمة المجردة ینبغی ان یکون ظهارا وینبغی ان لایصدق قضاء فی ارادة البر اذاکان فی حال المشاجرة وذکرالطلاق اه.وفی التاتارخانیة عن المحیط وان نوی التحریم لاغیرصحت نیته ....قلت وفی کافی الحاکم وان ارادالتحریم ولم یذکر الطلاق فهوظهار.

ولمافی الهندیة:(۱/۵۰۶،طبع رشیدیه)وحکم الظهارحرمة الوطء والدواعی الیٰ غایة الکفارة.

ولمافی فقه الاسلامی وادلته:(۷/۶۰۱ طبع دارالفکر بیروت)

تحریم الوطء بالاتفاق قبل التکفیر کذاعندالجمهور.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ والله اعلم:عبدالوہاب لنعمانی عفااللہ عنہ

۱۴رجب المرجب ۱۴۳۱ھ فتویٰ نمبر:۲۷۵

﴿کفارہ ظہار میں کان کٹا غلام آزاد کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کفارۂ ظہار میں ایسا غلام آزاد کیا جاسکتا ہے جو کانا ہو یا اس کا کان کٹا ہوا؟ مستفتی:اعجاز صاحب

﴿جواب﴾ جی ہاں کفارۂ ظہار میں کان کٹا ہوا غلام آزاد کیا جاسکتا ہے۔

لمافی الهندیة:(۱/۵۱۰،طبع رشیدیه)

اذااختلت المنفعة فهو غیرمانع حتی تجوزالعوراء ومقطوعة احدی الیدین واحدی الرجلین من خلاف بخلاف مااذاکانتامقطوعتین من جانب واحدحیث لایجوز.....

ویجزئ الخصی ومقطوع الاذنین ومقطوع المذاکیرعندنا.

ولمافی التنویر مع الرد:(۳/۴۷۴،طبع سعید)

تحریررقبة ولوصغیرا أوکافرا أواصم أوخصیا أومجبوبا أومقطوع الاذنین.

وفی الشامیۃ ای الارکان السمع والابصار لان الدلالۃ فی ھذہ المسائل الابصار

لابہ مقصودۃ فی الرائق۔

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: اسرار احمد

۹ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۹۶۳

﴿رجوع کے مسائل﴾

﴿دوران عدت طلاق رجعی کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت نے کہا کہ میرے شوہر نے مجھے صاف الفاظ میں دوطلاق دی ہیں یعنی مجھے کہا: "تجھے طلاق ہے، تجھے طلاق ہے" اسکے بعد وہ عورت اپنے میکے چلی گئی اور وہاں جا کر بتایا کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق دی ہے، گھر والوں نے شوہر سے طلاق کے بارے میں پوچھا تو شوہر نے کہا میں نے تو کوئی طلاق نہیں دی اسکے تین ماہ بعد شوہر دوبارہ بیوی کو گھر لے آیا جبکہ بیوی اس دوران حمل سے تھی۔ اب اس عورت کو شوہر کے پاس رہتے ہوئے دس سال ہوگئے ہیں، اور بچے بھی پیدا ہوگئے ہیں، لیکن وہ عورت پریشان ہے کہ کہیں مذکورہ صورت میں اسے طلاق تو واقع نہیں ہوئی تھی جسکی وجہ سے اسکا شوہر کے ساتھ رہنا صحیح نہ ہو؟

﴿جواب﴾ یاد رہے کہ مفتی غیب کا علم نہیں جانتا جو سوال ہوتا ہے اسکے مطابق جواب دیتا ہے، لہذا صورت مسئولہ میں اگر شوہر نے واقعی صاف لفظوں میں دو ہی مرتبہ یہ الفاظ زبان سے ادا کیے ہوں (تجھے طلاق ہے، تجھے طلاق ہے) تو اس سے بیوی پر دو طلاق رجعی واقع ہوئی ہیں، طلاق رجعی کی صورت میں چونکہ نکاح بالکل ختم نہیں ہوتا، بلکہ اگر شوہر بیوی کو بسانا چاہے تو وہ عدت کے اندر بیوی سے رجوع کرسکتا ہے۔ لہذا مسئولہ صورت میں اگر شوہر نے حالت حمل میں بیوی کو گھر لا کر اس سے رجوع کیا ہے تو انکا نکاح پہلے کی طرح برقرار ہے اور انکا آپس میں میاں بیوی کی طرح رہنا صحیح ہے لیکن آئندہ کیلئے شوہر کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہیگا، کسی بھی موقع پر شوہر نے اگر ایک طلاق دیدی تو حلالہ شرعیہ کے بغیر پھر نکاح نہیں ہو سکے گا لہذا احتیاط لازم ہے۔

لما فی الھدایۃ شرح القدوری (۲/۲۰۵) رحمانیہ

اذا طلق الرجل امرأتہ تطلیقۃ رجعیۃ أو تطلیقتین فلہ أن یراجعھا فی عدتھا رضیت بذلک أو لم ترض لقولہ تعالی "فامسکوھن بمعروف" من غیر فصل، ولا بد من قیام

العدة لأن الرجعة استدامة الملک ألا ترى أنه سمى امساکا وهو الابقاء وانما يتحقق الاستدامة فى العدة ،لأنه لا ملک بعد انقضائها ،والرجعة أن يقول :راجعتک أو راجعت امرأتى أو يطأها أويقبلها أو يلمسها بشهوة .أوينظر الى فرجها بشهوة.

ولما فى الدر المختار (۲۵۰/۳)سعيد

باب الصريح (صريحه ما لم يستعمل الا فيه)ولو بالفارسية (کطلقتک وأنت طالق و مطلقة ويقع بها)أى بهذه الفاظ وما بمعناها من الصريح (واحدة رجعية وان نوى خلافها)

ولما فى الدرالمختار(۵۱۱/۳)سعيد

(و)فى حق(الحامل)مطلقا ولو أمة أوکتابية او من زنا بان تزوج حبلى من زنا أو دخل بها ثم مات أو طلقها تعتد بالوضع جواهر الفتاوى (وضع)جميع حملها.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سیف اللہ

۴ شعبان ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر:

﴿باب العدة و احکامها﴾

﴿عدت سے متعلق احکام کا بیان﴾

﴿غیر مدخول بہا کی عدۃ الوفاۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں ایک لڑکے کی شادی ہو رہی تھی، شادی کے دوران لڑکے کے دشمن آ کر مجمع پر فائرنگ کر دی جسمیں وہ لڑکا بھی انتقال ہوا۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ ان کی منکوحہ بیوی جو غیر مدخول بہا ہے پر متوفی عنہا زوجہا کی عدت گزارنا لازم ہے؟

مستفتی: محمد ضابط کوہاٹی

﴿جواب﴾ میاں بیوی میں جدائی اگر موت سے واقع ہو، چاہے بیوی مدخول بہا ہو، یا غیر مدخول بہا۔ تو عورت پر عدۃ الوفاۃ (یعنی چار مہینے دس دن) گزارنا لازم ہے۔

لما فى الشامى: (۵۱۰/۳،طبع: سعيد)

(والعدة) (للموت لربعة اشهر) بالاهلة لو فى الغرة (عشر) من الايام بشرط بقاء النكاح صحيحاً الى الموت (مطلقاً) وطئت اولا ولو صغيرة او كتابية تحت مسلم.

ولما فى التاتار خانيه: (۲۲/۴،طبع: قديمى)

وعدة المتوفى عنها زوجها اذا كانت غير حامل وهى حرة أربعة اشهر وعشراً يستوى فى ذالک الدخول وعدم الدخول والصغر والكبر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ارشد سعید کوہاٹی

۴ رجب المرجب ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۳۲۸

﴿عدت کی ایک خاص صورت کے بارے میں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بندہ نے دیکھا کہ ایک آدمی کا انتقال ہو گیا اور اس کی بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی جب میت کو گھر سے نکالا گیا تو اسکی بیوی بھی میت کی چارپائی کو پکڑ کر چند قدم باہر آ گئی بندہ نے پوچھا کہ یہ کیا وجہ ہے تو بتایا گیا کہ جس عورت کی اولاد نہ ہوئی ہو اور اس کے خاوند کی وفات کے وقت عورت یہ عمل کرے تو عورت کو عدت نہیں گزارنی پڑتی، براہ کرم بندہ کو اس مسئلہ کا علم نہیں تھا کہ کیا اس طرح بھی کر سکتے ہیں، اب پوچھنا یہ ہیکہ یہ طریقہ شریعت کی روشنی میں اس طرح ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ یہ بات کہ جس شادی شدہ عورت کے ہاں کوئی اولاد نہ ہو تو اس کے شوہر کی وفات پر وہ جنازہ کیساتھ چند قدم باہر نکل آئے تو اس کے ذمہ سے عدت ساقط ہو جاتی ہے بالکل بے بنیاد اور جہالت پر مبنی ہے۔

عورت کی اولاد ہو یا نہ ہو اگر وہ حاملہ ہے تو وضع حمل سے اسکی عدت پوری ہوگی اور اگر غیر حاملہ ہے تو چار ماہ دس دن مکمل گزارنے سے اس کی عدت پوری ہوگی، لہٰذا علاقہ کے علماء اور دیگر ذمہ دار حضرات کے علم میں بھی یہ بات آنی چاہیے تاکہ وہ اس کا تدارک کر سکیں۔

لما فی الشامی :(۵۱۰/۳،طبع :سعید)

(قوله والعدة للموت)ای موت زوج الحرة ،وأما لامة فیاتی حکمها بعده ،قوله کما مر ای قریبا قوله من الایام ای واللیالی ایضا کما فی المجتبی.

ولما فی الهندیه:(۵۲۹/۱،طبع: رشیدیه)

عدة الحرة فی الوفاة اربعة اشهر وعشرة ایام سواء کان مدخولا بها او لا مسلمة أو کتابیة تحت مسلم صغیرة أوکبیرة أو آیسة وزوجها حر او عبد حاضت فی هذه الموت او لم تحض ولم یظهر حبلها کذا فی فتح القدیر.

ولما فی الهدایه:(۴۲۸/۲،طبع: رحمانیه)

وعدة الحرة فی الوفات اربعة اشهر وعشرا لقوله تعالی ویذرون ازواجا یتربصن بانفسهن اربعة اشهر وعشرا.

واللہ اعلم بالصواب: شاہ جہان غفرلہ ولوالدیہ
الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۳۳۱۶
رجب المرجب ۱۴۳۳ھ

﴿منگیتر کی وفات سے عدت لازم نہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ میری بہن کی منگنی ایک شخص کیساتھ ہوئی لیکن ابھی نکاح ورخصتی نہیں ہوئی تھی کہ اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا اور موقع پر مرگیا، معلوم یہ کرنا ہے کہ میری بہن متوفی عنہا زوجہا کی عدت گزارے گی یا اس سے پہلے پہلے اسکی شادی فوت شدہ آدمی کے بھائی کیساتھ کرا سکتے ہیں؟

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ عورت پر عدت گزارنا تب لازم ہوتا ہے جب نکاح کے بعد خاوند طلاق دے یا وہ فوت ہوجائے، مذکورہ صورت میں چونکہ صرف منگنی ہوئی تھی باقاعدہ نکاح نہیں ہوا تھا، اس لئے آپ کی بہن پر عدت نہیں ہے، لہٰذا عدت گزارے بغیر دوسری جگہ شادی کر سکتی ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۵۰۲/۳،طبع سعید)

(وسبب وجوبها) عقد (النكاح المتاكد بالتسليم وما جرى مجراه) من موت اوخلوة اى صحيحة فلا عدة بخلوة الرتقاء وشرطها الفرقة.

ولما فی البحر الرائق:(۵۰۲/۴،طبع سعید)

(قوله هى تربص يلزم المرأة عندزوال النكاح اوشبهه اى لزوم انتظار انقضاء مدة. وقد قالوا ان ركنها حرمات اى لزومات كحرمة تزوجها على الغير.

ولما فی الهندية:(۵۲۶/۱،طبع رشيديه)

هى انتظار مدة معلومة يلزم المرأة بعدزوال النكاح حقيقة اوشبهة المتأكد بالدخول او الموت كذا فى شرح النقاية للبرجندى.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سلمان احمد

۲ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۱۹۵۵

﴿حلالہ صحیح ہونے کے لئے زوج ثانی کا بیوی سے ہمبستری کرنا ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں پھر ایک مولانا صاحب سے پوچھا تو انھوں فرمایا کے اب بغیر حلالہ شرعیہ کے نکاح نہیں ہوسکتا پھر حلالہ شرعیہ کی صحیح صورت بتادی یہ شخص نہ مانا اور ایک دوسرے مولوی صاحب کے پاس چلا گیا تو انہوں نے کہا کہ نکاح ہوسکتا ہے اور پھر ایک آدمی سے اس شخص کی بیوی کا نکاح کروا دیا یہ آدمی اس عورت کے پاس گیا اور بغیر ہمبستری کیے کچھ دیر باتیں کر کے واپس آکر طلاق دے دی مولوی صاحب نے پہلے شوہر سے اسکا نکاح کر دیا، پوچھنا یہ ہے کہ یہ

نکاح منعقد ہو گیا؟ اگر نہیں تو ایسے مولوی صاحب کے ساتھ قربانی کرنا اس کے ساتھ صف میں نماز پڑھنا اور دیگر معاملات لین دین کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: سعید جان کوہستانی

﴿جواب﴾ تین طلاقیں دینے کے بعد بیوی پہلے شوہر کے لئے تب ہی حلال ہوگی جب اسکی عدت گزر جانے کے بعد کوئی دوسرا شخص اس سے نکاح کرلے اور باقاعدہ ہمبستری کرے پھر یہ شخص اگر مر جائے یا طلاق دے دے تو عدت گزر جانے کے بعد پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے، حلالہ صحیح ہونے کے لئے احناف زوج ثانی کے محض نکاح کو کافی نہیں سمجھتے، دخول ضروری ہے جیسا کہ حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے امراۃ رفاعۃ القرظی سے فرمایا تھا (لاحتی تذوقی عسیلتہ ویذوق عسیلتک) (حدیث) اور مسئلہ چونکہ مجتہد فیہا ہے اس لئے مسئلہ بتانے والے شخص کے ساتھ قربانی وغیرہ کرنا جائز ہے اور یہ شخص صحیح مسئلہ معلوم ہونے کے باوجود اگر بیوی بغیر حلالے کے اپنے پاس رکھتا ہے تو کبیرہ گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے۔

لمافی الهداية: (۴۰۹/۲، طبع رحمانیہ)

وان كان الطلاق ثلاثا في الحرة اوثنتين في الامة لم تحل له حتى تنكح زوجا غيره نكاحا صحيحا ويدخل بها ثم يطلقها اويموت عنها (ثم قال بعد سطور) وشرط الدخول ثبت باشارة النص وهو ان يحمل النكاح على الوطى حملا للكلام على الافادة دون الاعادة اذ العقد استفيد باطلاق اسم الزوج او يزاد على النص بالحديث المشهور وهو قوله عليه السلام لاتحل للاول حتى تذوق عسيلة الآخر...... الخ.

ولما في شرح الفقه الأكبر: (ص ۱۱۷، بيروت) ولا نكفر مسلما بذنب من الذنوب وان كانت كبيرة.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد غفر لہ ولوالدیہ

۲ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر:

﴿خلع کی صورت میں عورت پر کتنی عدت واجب ہوگی؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ اگر کوئی عورت اپنے شوہر سے خلع لے لے تو اس کی عدت کتنی ہوگی؟ نیز عدت کے دنوں کا نان ونفقہ شوہر کے ذمہ ہوگا یا نہیں؟ مستفتی: عمر فاروق

﴿جواب﴾ خلع سے طلاق بائن واقع ہوتی ہے، خلع لینے والی عورت کو ماہواری آتی ہو اور میاں بیوی میں خلوت صحیحہ بھی ہوئی ہو تو عورت کی عدت تین حیض ہوگی اور اگر عورت کو ماہواری نہ آتی ہو تو اسکی عدت تین ماہ ہوگی لیکن اگر خلع لینے والی عورت حاملہ ہو تو اس کی عدت وضع حمل ہی

ہوگی، عدت کے دنوں کا نان ونفقہ اور سکنی شوہر کے ذمہ ہوگا لیکن اگر خلع میں نفقہ کو ساقط کرنے کی صراحت کردی تو نفقہ ساقط ہوجائے گا، اسی طرح اگر سکنی سے بیوی نے شوہر کو بری کردیا تو شوہر سکنی سے بھی بری ہوجائے گا۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲/۴۴۶،طبع ایچ ایم سعید)

(خلعها او طلقها بخمر او خنزیر او میتة او نحوها) مما لیس بمال (وقع) طلاق (بائن فی الخلع رجعی فی غیره)

وفی الشامیة: قوله بائن فی الخلع لانه من الکنایات الدالة علی قطع الوصلة فکان الواقع به بائناً.

ولمافی التنویر مع الدر:(۲/۴۵۲-۴۵۳-۴۵۴-۴۵۵،طبع سعید)

(ویسقط الخلع)......(والمباراة)......(کل حق) ثابت وقتهما (لکل منهما علی الآخر مما یتعلق بذلک النکاح)......(الا نفقة العدة) وسکناها فلا یسقطان (الا اذا نص علیها) فتسقط النفقة لا السکنی لانها حق الشرع الا اذا ابرأته عن مؤنة السکنی فیصح فتح.

وفی الشامیة: قوله الا اذا ابرأته عن مؤنة السکنی بان کانت ساکنة فی بیت نفسها او تعطی الاجرة من مالها فیصح التزامها ولکن مقتضی هذا انه لا بد من التصریح بمؤنة السکنی مع انه ذکر فی الفتح وغیره فی فصل الاحداد لو اختلعت علی ان لا سکنی لها فان مؤنة السکنی تسقط عن الزوج ویلزمها ان تکتری بیت الزوج ولا یحل لها ان تخرج منه.

ولمافی الهدایة:(۲/۴۲۸،طبع رحمانیه)

اذا طلق الرجل امرأته طلاقا بائنا او رجعیا او وقعت الفرقة بینهما بغیر طلاق وهی حرة ممن تحیض فعدتها ثلثة اقراء وان کانت ممن لا تحیض من صغر او کبر فعدتها ثلثة اشهر ......کذا التی بلغت بالسن ولم تحض بآخر الآیة وان کانت حاملا فعدتها ان تضع حملها.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ	واللہ اعلم بالصواب: عدنان خدابخش
۲ ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ	فتوی نمبر: ۲۵۷۱

﴿حالت نفاس میں دی گئی طلاق میں عدت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں حضرات علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت کے ہاں رات کو بچے کی ولادت ہوئی صبح خاوند نے طلاق دیدی تو کیا اب یہ عورت نفاس کے خون کے علاوہ تین حیض عدت گزارے گی یا صرف نفاس کا خون رکنے تک اس کی عدت شمار ہوگی؟

﴿جواب﴾ نفاس کے خون پر عدت کا مدار نہیں ہے، لہٰذا تین حیض گذارنے پر ہی اس

عورت کی عدت طلاق پوری ہوگی۔

لما فی قوله تعالی:(سورة البقرة،آیت ۲۲۸) والمطلقت یتربصن بانفسهن ثلثة قروء---الآیة.

ولما فی الشامی:(۲۲۸/۲،طبع سعید)

ولی الفنیة ولدت ثم طلقها ومضی سبعة أشهر فنکحت آخر لم یصح لانها لم تحض ثلث حیض ولی الشامیة(ومضی سبعة أشهر)کذا المعنی انه لم یصح مالم تحض وان مضی تسعة أشهر الخ

ولما فی تنویر الابصار:(۵۰۵/۳،طبع سعید)

وهی فی حرة تحیض لطلاق أو فسخ بجمیع أسبابه----بعد الدخول حقیقة أو حکما ثلاثة حیض کوامل الخ.

ولما فی الغایة علی هامش الهندیة:(۵۲۹/۱،باب العدة،طبع رشیدیه)

وعدة الطلاق وتارة تکون بالحیض وتارة تکون بالشهور وتارة تکون بوضع الحمل الخ.

ولما فی الاشباه والنظائر:(ص ۳۶۳،طبع)وتنقضی العدة به(الحیض)دون النفاس الخ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:انیس طالب کان اللہ لہ

۲۸ صفر ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر:۲۳۶۴

﴿مسلم کا عیسائی عورت کو طلاق اور پھر عیسائی سے حلالہ نکاح کا حکم﴾

﴿سوال﴾ ایک مسلمان آدمی نے اپنی صحیح العقیدہ عیسائی بیوی کو تین طلاقیں دے دی تھیں۔ اب وہ پشیمان ہے اور چاہتا ہے کہ اپنی بیوی کے چچازاد بھائی سے حلالہ کرائے جبکہ وہ چچازاد بھی صحیح العقیدہ عیسائی ہے، کیا اس طریقہ سے حلالہ ہو جائیگا؟ جواب دیکر ممنون فرمائیں۔

﴿جواب﴾ سوال میں درج حلالہ کے جس طریقہ کا ذکر ہے اس طریقہ سے حلالہ کرنے اور کرانے والے پر حضور اقدس ﷺ نے لعنت فرمائی ہے، ایک مسلمان شخص کو طلاق دینے سے پہلے ہی اس کے انجام پر نظر رکھنی چاہیے تاکہ نہ طلاق کی نوبت آئے اور نہ حلالہ کی ضرورت پڑے تاہم سوال میں ذکر کردہ طریقہ سے اگر حلالہ کرادیا گیا تو یہ عمل اگرچہ شرعاً ناپسندیدہ ہے لیکن حلالہ درست ہو جائیگا اور بیوی پہلے شوہر کے لئے حلال ہو جائیگی۔

ولما فی البزازیة علی هامش الهندیة:(۲۶۲/۲،طبع رشیدیه)

مطلقة المسلم اذا کانت کتابیة فتزوجت بکتابی ودخل بها حلت للاول.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم:عبدالوہاب عفااللہ عنہ

۲۷ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر:۱۹۱

﴿جس گھر میں عدت واجب ہوئی اسی میں پوری کرے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں اگر معتدہ عورت کے گھر کے لوگ ایک مکان سے دوسرے مکان منتقل ہو رہے ہوں، اس وجہ سے کہ انکے خاندان کے افراد بہت زیادہ ہیں، اسی مکان میں رہنا بہت مشکل ہے، اس لئے کہ یہ مکان بالنسبت دوسرے مکان کے زیادہ چھوٹا ہے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ یہ تمام لوگ منتقل ہو رہے ہیں بمع اپنی تمام سازوسامان کے اور اسی گھر میں کوئی باقی نہیں رہتا اس صورت میں یہ متوفی عنھا زوجھا انکے ساتھ منتقل ہوسکتی ہے یا نہیں؟ برائے مہربانی واضاحت فرمائیں۔ مستفتی مولوی عمر فاروق لاہور

﴿جواب﴾ عدت جس گھر میں واجب ہو جاتی ہے اسی میں پوری کرنا واجب ہوتا ہے البتہ اس گھر میں جان یا عزت محفوظ نہ ہو یا گھر کرایہ کا ہو اور کرایہ کا بندوبست نہ ہو یا اس گھر میں دیگر ورثاء کا حق ہو اور عورت کا ذاتی حصہ رہائش کیلئے کافی نہ ہو اور ورثاء خالی کرنے کا مطالبہ کریں تو اس قسم کی مجبوری کیوجہ سے دوران عدت گھر تبدیل کرنے کی گنجائش ہوتی ہے، مذکورہ صورت میں گھر والے اسی گھر میں اس عورت کو عدت گزارنے کا موقع اگر دیں اور بقدر ضرورت اس کیلئے سامان بھی چھوڑ دیں اور اسکے ساتھ محرم بھی ہو تو ایسی صورت میں نکلنے کی گنجائش نہیں ہے اور ایسا انتظام کرنا اگر مشکل ہو یا گھر والے تعاون نہیں کرتے اور اکیلے رہنے میں عزت یا جان کا خطرہ ہو تو نکلنے کی گنجائش ہے۔

(لمافی الدر مع رد: ج۳/۵۳۶ کتاب الطلاق باب العدۃ فصل فی الحداد سعید)

(وتعتدان) ای معتدۃ طلاق وموت (فی بیت وجبت فیه) ھو مایضاف الیھا بالسکنی قبل الفرقة ولو غیر بیت الزوج ولا یخرجان منه (الا أن تخرج او ینھدم او تخاف) انھدامه او (تلف مالھا او تجد کراء البیت) ونحو ذلک من الضرورات لأقرب موضع الیه.

(لمافی التاتارخانیة: ج۴/۲۵۳، ۲، ۳ و ھندیہ)

وللمعتدة ان تخرج من بیتھا الی صحن الدار وتبیت فیه ای منزل شاءت الاان تکون فی الدار منازل لغیرھما فلا تخرج من بیتھا الی تلک المنازل، فان باتت المرأة مع زوجھا فی منزل ھو ملک الزوج فمات الزوج فان کان نصیبھا لا یکفیھا فان رضی ورثة الزوج ان تسکن فیه سکنت، وان أبو کانت فی سعة من التحول ویکون ذلک عذرا لھا وفی "الخانیة" وکذا اذا خافت علی متاعھا فی ذلک المنزل ثم لا تخرج بعد ذلک عن المکان الذی انتقلت الیه ـــــ وان خافت سقوط ذلک المنزل فلا بأس بان تخرج

وتسكن منزلا آخر لم لاتخرج من ذلك المنزل الابعذر ،واذلم يكن مع المعتدة فى منزل المعتدة احدوهى تخاف بالليل لامن اللصوص ولامن الجيران بل تخاف بالقلب من أمر الميت او الموت ان كان الخوف شديدا كان لها الانتقال وان لم يكن الخوف شديدا ليس لها الانتقال ،وهو بمنزل وحشا وجدت فى قلبها.

لمافى مجمع الانهر:(۱۵۲/۲،طبع المنار کوئٹہ)

وتعتد المعتدة فى منزل يضاف اليها وقت الفرق او الموت الاتخرج جبرا وخافت على مالها او انهدام او لم تقدر على كرائه ولاباس بكينونتهما معا بمنزل ــالخ

الجواب صحیح:مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ
واللہ اعلم بالصواب:صفی اللہ عفرلہ ولوالدیہ

۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ
فتویٰ نمبر:۴۴۳۹

﴿طلاق مغلظہ کی عدت دوسری جگہ گزارنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ طلاق مغلظہ واقع ہونے کے بعد بیوی کیلئے شوہر کے گھر میں اقامت اختیار کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے،ایسی صورت میں میکے میں عدت گزار سکتی ہے؟اور ایسی صورت میں نان ونفقہ کس کے ذمہ ہوگا؟بینوا توجرا۔

﴿جواب﴾ عورت پر اس گھر میں عدت گزارنا واجب ہے جہاں فرقت کے وقت وہ رہتی تھی اور سسرال والوں کیساتھ تعلقات کی خرابی یا ان سے ذہنی اذیت کیوجہ سے میکے میں عدت گزارنے کی اجازت نہیں،البتہ اگر سسرال میں جان ومال یا عزت وآبرو خطرہ میں ہو پھر قریب دوسری جگہ عدت گزارنے کی گنجائش ہے لیکن دوسری جگہ عدت گزارنے کی صورت میں شوہر کے ذمہ نان ونفقہ نہیں ہے۔

لمافی قولہ تعالیٰ:(سورۃ الطلاق،آیت ۱)

لاتخرجوهن من بيوتهن ولايخرجن الاان يأتين بفاحشة مبينة.....الآية.

ولمافى المظهرى:(۳۱۸/۹،طبع رشیدیہ)

ومن هذه الاية يثبت انه لايجوز للمطلقة رجعية كانت اوبائنة الخروج من بيت الزوج ليلا ونهارا الابضرورة فان الضرورة مستثناة فى العبادات وهى تبيح المحظورات والضرورة مثل انهدام البيت اوخوف السرقة اوعدم وجدان كراء البيت اوضيق المنزل عليها اوكون الزوج فسقا والطلاق بائنا ولم يكن هناك قادر على حيلولة اونحو ذلك.

ولمافى اعلاء السنن:(۲۱۷/۹،طبع دار الكتب بيروت)

لحديث:عن جابر رضى الله عنه عن النبى صلى الله عليه وسلم قال:المطلقة ثلاثا لها السكنى والنفقة.

ولما فی الهداية: (۲/۲۰۵، طبع رحمانيه)

ولا يجوز للمطلقة الرجعية والمبتوتة الخروج من بيتها ليلاً ولا نهاراً ... وعلى المعتدة ان تعتد فی المنزل يضاف اليها بالسكنى حال وقوع الفرقة

ولما فی التنوير مع الدر: (۲/۳۶ ۵، طبع سعيد)

(وتعتدان) أی معتدة طلاق وموت (فی بيت وجبت فيه) ولا يخرجان منه (إلا أن تخرج أو يتهدم المنزل أو تخاف) انهدامه أو (تلف مالها أو لا تجد كراء البيت) ونحو ذلك من الضرورات فتخرج لأقرب موضع إليه.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: فرمان اللہ غفر اللہ

۲۵ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۷۰۰

﴿عورت پر عدت شوہر کے گھر میں گزارنا لازم ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان صاحبان کہ میرے داماد کو گزشتہ ایام میں قتل کر دیا گیا ہے، میری بچی اپنے سسرال میں عدت گزار رہی تھی لیکن اسکے سسرال میں اسکی ساس، دیور، دیورانی (جو کہ میری دوسری بیٹی) ہے اسکے علاوہ کوئی محرم گھر میں نہیں ہے، میں اور کوئی اور محرم اپنی بچی کے ساتھ اسکے سسرال میں نہیں رہ سکتے، اسلئے میں اپنی بیٹی کو اپنے گھر لے آیا ہوں تا کہ عدت میرے پاس گزار سکے آپ حضرات سے گزارش ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں میرے اس عمل پر مطلع فرمائیں جناب کا مشکور ہونگا۔ مستفتی: محمد سلیم کراچی

﴿جواب﴾ شریعت مطہرہ نے عورت کو عدت اپنے شوہر کے گھر میں گزارنے کا حکم دیا ہے، الا یہ کہ عورت کو اپنی جان مال عزت وآبرو کے بارے میں فتنہ کا قوی اندیشہ ہوتو اسکو دوسری جگہ منتقل ہونے کی اجازت ہے، مذکورہ صورت میں آپکی بیٹی اپنے ہی گھر میں عدت گزار یگی یعنی شوہر کے گھر میں اسلئے کہ آپکی بیٹی کے ساتھ دوسری بہن (دیورانی) اور ساس بھی موجود ہے، اس گھر میں بظاہر ایسا کوئی شرعی عذر نہیں جسکی وجہ سے آپکی بیٹی آپکے گھر میں عدت گزارنے پر مجبور ہو آپ کو چاہیے اپنی بیٹی کو اسکے شوہر کے گھر پہنچادیں۔

لما فی الهداية: (۲/۲۰۵، طبع رحمانيه)

وعلى المعتدة ان تعتد فی المنزل الذی يضاف اليها بالسكنى حال وقوع الفرقة والموت لقوله تعالى ولا تخرجوهن من بيوتهن والبيت الذی تسكنه ولهذا لو زارت

اعلمها وطلقها وهما كان داعيان احد في منزلها للعدة وقال عليه السلام للتي قتل زوجها "اسكني في بيتك حتى يبلغ الكتاب اجله".

ولما في التنوير مع الدر(٥٣٦/٣ طبع سعيد)

(وتعتدان)اي معتدة طلاق وموت(في بيت وجبت فيه)ولا يخرجان منه(الا ان تخرج أو يتهدم المنزل او تخاف)انهدامه او(تلف مالها او لا تجد كراء البيت)ونحو ذلك من الضرورات فتخرج لاقرب موضع اليه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد طیب حسن ذلی

٢٨ صفر ١٤٣٠ھ — فتویٰ نمبر: ١٩٧٢

﴿خرچہ کا بندوبست نہ ہو تو بیوہ دن میں حکومتی امداد وصول کرنے کے لئے نکل سکتی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ میری ایک رشتہ دار عورت ہے اسکا شوہر سیکورٹی گارڈ تھا دو مہینے قبل ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہو گیا، اب حکومت کیطرف سے انکی گھر والی کو کچھ رقم مل رہی ہے لیکن رقم کی حصولی کیلئے حکومت نے انکی بیوی کی حاضری پشاور دفتر میں ضروری قرار دی ہے جبکہ فی الحال وہ عدت گزار رہی ہے اور ہمارے گاؤں سے پشاور آنے جانے میں تقریباً دس گھنٹے لگتے ہیں بلکہ یہ خدشہ بھی ہے کہ رات بھی پشاور میں ٹھہرنا پڑے (کیونکہ آج کل دفاتر میں چھوٹے سے چھوٹے کام کو بھی طویل بنا دیا جاتا ہے) تو کیا ایسی صورت میں وہ اپنے بھائی کیساتھ رقم وصول کرنے جا سکتی ہے؟ نیز اسکے شوہر کے بعد اب کوئی کمانے والا نہیں ہے۔

﴿جواب﴾ بیوہ عورت کے پاس اگر خرچ خوراک نہ ہو اور کوئی اور اسکا ضروری خرچہ برداشت کرنے کے لئے تیار نہ ہو تو ایسی صورت میں وہ عدت کے دوران دن کو کمانے کیلئے نکل سکتی ہے اور رات گزارنے کیلئے گھر لوٹنا ضروری ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں اگر اس عورت کا خرچہ برداشت کرنے کیلئے کوئی تیار نہ ہو اور عدت کے ایام کے خرچہ کا بندوبست کرنے کی کوئی صورت نہ بنتی ہو تو مجبوری کی ایسی صورت میں یہ عورت کسی محرم کیساتھ جا کر اتنی دیر گھر سے باہر رہ سکتی ہے کہ جتنی دیر میں وہ رقم وصول کر لے یا وصولی کی یقین دہانی انکو کرا دی جائے۔

لما في الدر مع الرد:(٥٣٦/٣ طبع سعيد)

(ومعتدة موت تخرج في الجديدين وتبيت)اكثر الليل (في منزلها)لان نفقتها عليها فتحتاج للخروج، حتى لو كان عندها كفايتها صارت كالمطلقة فلا يحل لها الخروج فتح.

وفي الشامية قال في الفتح: والحاصل ان مدار حل خروجها بسبب قيام شغل المعيشة فيتقدر

بقدره، فمتی انقضت حاجتها لا یحل لها بعد ذلک صرف الزمان خارج بیتها اه.

ولما فی فتح القدیر:(۱۶۵/۴، طبع رشیدیه)

والمتوفی عنها زوجها تخرج نهارا وبعض اللیل فی غیر منزلها) وقال صاحب الفتح وهو قوله لان نفقتها علیها وعسی لا تجد من یکفیها امر نفقتها فتحتاج الی الخروج لتقتلها غیران امر المعاش یکون بالنهار عادة دون اللیالی فابیح الخروج لها بالنهار دون اللیالی انتهی ویعرف من التعلیل ایضا انها اذا کان لها قدر کفایتها صارت کالمطلقة فلا یحل لها ان تخرج لزیارة ونحوها لیلا ولا نهارا والحاصل ان مدار الحل کون غیبتها بسبب قیام شغل المعیشة فیتقدر بقدره فمتی انقضت حاجتها لا یحل لها بعد ذلک صرف الزمان خارج بیتها.

ولما فی البحر الرائق:(۱۵۴/۴، طبع سعید)

(قوله ومعتدة الموت تخرج یوما وبعض اللیل) لتکتسب لاجل قیام المعیشة لانه لا نفقة لها حتی لو کان عندها کفایتها صارت کالمطلقة فلا یحل لها ان تخرج لزیارة ولا لغیرها لیلا ولا نهارا والحاصل ان مدار الحل کون خروجها بسبب قیام شغل المعیشة فیتقدر بقدره فمتی انقضت حاجتها لا یحل لها بعد ذلک صرف الزمان خارج بیتها.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　　　　　واللہ اعلم بالصواب: سلمان احمد

۲۷ جمادی الاول ۱۴۳۰ھ　　　　　　　　　　　　　　فتویٰ نمبر: ۲۲۰۷

﴿ کوئی معقول عذر نہ ہو تو عدت اپنے شوہر کے گھر میں گزارنا ضروری ہوتا ہے ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی اپنے اہل وعیال کیساتھ کراچی میں کرائے کے مکان میں رہائش پذیر تھا کہ اچانک اس کا انتقال ہو گیا۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا اس کی بیوی کرائے کے مکان میں عدت گزارے گی یا اپنے آبائی گاؤں منتقل ہو کر اپنے والدین کے ہاں عدت گزارے گی؟ برائے مہربانی وضاحت فرمائیں۔

﴿جواب﴾ عورت مطلقہ ہو خواہ "متوفی عنها زوجها" ہو اسے اپنے شوہر کے گھر میں عدت گزارنے کا حکم ہے، ہاں کوئی معقول مجبوری ہو جس کو شریعت بھی مجبوری تسلیم کرے مثلاً اس بیوہ کے پاس مکان کا کرایہ برداشت کرنے کیلئے پیسہ نہیں ہے اور مالک مکان کرایہ کا مطالبہ کرے یا اس مکان میں اس کی جان یا عزت محفوظ نہیں ہے، تو ایسی مجبوری میں وہ اپنے والدین کے ہاں عدت گزارنے جا سکتی ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۵۳۶/۳، ایچ ایم سعید)

(وتعتدان) ای معتدة طلاق وموت (فی بیت وجبت فیه) ولا یخرجان منه (الا ان تخرج

أو بانهدام المنزل أو تخاف انهدامه أو تلف مالها أو لا تجد كراء البيت ونحو ذلك من الضرورات فتخرج لأقرب موضع إليه.

كما في الفقه الحنفي وأدلته ، ٢/٢٧٥ (دار الكلم الطيب بيروت)

وتعتد المطلقة والمتوفى عنها زوجها في البيت الذي كانت تسكنه حال وقوع الفرقة، لأنه البيت المضاف إليها بقوله تعالى (من بيوتهن) لأنه هو الذي تسكنه، حتى لو طلقت في غير منزلها عادت إليه فوراً لتعتد فيه إلا أن ينهدم أو تخرج منه أو لا تقدر على أجرته فتنتقل.

كما في رد المحتار (٣/٥٣٦ ايچ ايم سعيد)

(قوله إلا أن تخرج) الأولى الإتيان بضمير التثنية فيه وفيما بعده، ويشمل إخراج الزوج ظلما أو صاحب المنزل لعدم قدرتها على الكراء أو الوارث إذا كان نصيبها من البيت لا يكفيها بحر: أي لا يكفيها إذا قسمته لأنه لا يجبر على سكناها معه إذا طلب القسمة أو المهايأة ولو كان نصيبها يزيد على كفايتها (قوله أو لا تجد كراء البيت) أفاد أنها لو قدرت عليه لزمها من مالها، وترجع به المطلقة على الزوج إن كان بإذن الحاكم.

الجواب صحیح: مفتی عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ ‏ ‏ ‏ واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری

٣ جمادی الثانی ١٤٣٥ھ ‏ ‏ ‏ فتویٰ نمبر: ٢١٧٦

﴿عورت عدت کہاں گزارے؟﴾

﴿سوال﴾ ایک شخص نے کسی کو اپنا مکان رہنے کیلئے دیا، اس آدمی نے اس شخص کے مکان پر قبضہ کرلیا پھر صاحب مکان نے عدالت سے رجوع کیا تو عدالت نے صاحب مکان کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے اس آدمی کو ٣١ دسمبر تک مکان خالی کرنیکا الٹی میٹم دیا، اس آدمی نے اسکو مان لیا لیکن ٣١ دسمبر کے بعد بھی اس نے مکان کو خالی نہیں کیا پھر صاحب مکان نے دوبارہ عدالت سے رجوع کرلیا تو اس آدمی نے عدالت سے مزید مہلت مانگی، عدالت نے ٣٠ اپریل تک کی مزید مہلت دیتے ہوئے یہ آرڈر جاری کیا کہ اگر ٣٠ اپریل کے بعد یہ آدمی مکان خالی نہ کرے تو انتظامیہ زبردستی اس سے یہ مکان خالی کروائے، مذکورہ تاریخ (٣٠ اپریل) آنے سے پہلے وہ آدمی فوت ہوگیا مکان خالی کرانے کی صورت میں بیوہ کیلئے کیا گنجائش ہے کہ وہ اپنے بیٹے یا کسی اپنے محرم کے گھر میں عدت گزارے؟ یا اسی مکان میں اس پر عدت گزارنا ضروری ہے؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں مکان پر ناجائز غاصبانہ قبضہ تھا، مرحوم پر لازم تھا کہ مکان خوشی سے خالی کرتا، خصوصاً جب عدالت نے بھی مکان خالی کرنے کا حکم دیا تو مرحوم کیلئے مزید مکان میں رہنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی اور اب مرحوم کے بعد پسماندگان پر لازم ہے کہ بلا تاخیر

مکان خالی کردیں، مرحوم کا دوسرا ذاتی مکان اگر نہیں ہے تو بیوہ عدت اپنے بیٹے یا دوسرے کسی محرم کے گھر میں گزار دے جو زیادہ قریب ہو۔

لما فی التنویر مع الدر:(۲/۵۳۶،طبع سعید)

اوتعتدان ای معتدة طلاق وموت(فی بیت وجبت فیه) ولا یخرجان منه(الا ان تخرج او یتھدم المنزل، أو تخاف انھدامه أو(تلف مالھا أو لاتجد کراء البیت) ونحو ذالک من الضرورات فتخرج لأقرب موضع الیه.

وفی الشامیة (قوله الا أن تخرج) ولی الاتیان بضمیر التثنیة فیه وفیمابعده ط وشمل اخراج الزوج ظلما أو صاحب المنزل لعدم قدرتھا علی الکراء أو الوارث اذاکان نصیبھا من البیت لایکفیھا بحر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفااللہ عنہ

۹ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۱۰۷

﴿عدت وفات کے فوراً بعد شروع ہو جاتی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک آدمی سعودی عرب میں کام کرتا تھا وہاں اس کا انتقال ہو گیا اس کی لاش بیس (۲۰) روز بعد پاکستان لائی گئی تو تب اس کی بیوی کو اس کے انتقال کا پتہ چلا، اب اس عورت کی عدت کب سے شمار کی جائیگی انتقال کے روز سے یا جب اس عورت کو اس کے انتقال کی خبر ملی ہے؟ مستفتی: عبدالواحد پشاور

﴿جواب﴾ شوہر کے انتقال کے دن سے ہی عورت کی عدت شروع ہو جاتی ہے اسکو وفات پانے کی خبر ہو یا نہ ہو، لہٰذا عورت اگر حاملہ نہیں ہے تو چار ماہ دس روز گزرنے سے عدت پوری ہو گی اور حمل کی صورت میں وضع حمل سے عدت پوری ہوگی چار ماہ دس روز گذرنے سے پہلے وضع حمل ہو یا بعد میں اسکی عدت وضع حمل سے پوری ہو جاتی ہے۔

لما فی قوله تعالی:(سورة الطلاق الایة:۴)﴿وأولت الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن﴾

ولما فی روح المعانی:(۱۷/۲۶۰ طبع رشیدیه)

(وأولت الاحمال اجلھن) ای منتھی عدتھن(ان یضعن حملھن)ولو نحو مضغة وخلقة والا فرق فی ذلک بین ان یکن مطلقات أو متوفی عنھن أزواجھن کما روی عن عمر—عن ابن عمر أنه سئل عن المرأة یتوفی عنھا زوجھا وھی حامل فقال:اذا وضعت حملھا فقد حلت—عن ابی بن کعب قال:قلت للنبی ﷺ(واولات الاحمال وأجلھن أن یضعن حملھن) أھی المطلقة ثلاثاً والمتوفی عنھا؟قال:"ھی المطلقة ثلاثا

والمتوفی عنها" وروی جماعة نحوه.

لما فی الدر المختار:(۵۲۰/۳،باب العدة ،طبع سعید)

ومبداء العدة بعد الطلاق وبعد الموت علی الفور وتنقضی العدة وان جهلت المراة بهما ای بعد الموت لانها اجل فلا یشترط العلم بمضیه وفی الشامیة(قوله لانها اجل) ای لان العدة اجل فلا یشترط العلم بمضیه ای بمضی الاجل۔

ولما فی تحفة الفقهاء:(۲۳۳،کتاب الطلاق، مکتبه معروفیه)

اذا کان الزوج غائباً، فطلق امراته او مات عنها والمراة لاتعلم بذالک حتی مضت مدة العدة فانه تنقضی العدة وتعتبر من وقت الطلاق ،والعلم لیس بشرط لمضی المدة فانها اجل وضع لبراء ة الرحم ، وانه یحصل بلا علم.

ولما فی البحر الرائق:(۱۴۲/۴،طبع سعید)

(ومبداء العدة بعد الطلاق والموت) یعنی ابتداء عدة الطلاق من وقته وابتداء عدة الوفاة من وقتها سواء علمت بالطلاق والموت او لم یعلم حتی لو تعلم ومضت مدة العدة فقد انقضت لان سبب وجوبها الطلاق او لوفاة فیعتبر ابتداؤها من وقت وجود السبب کذا فی الهدایه وشرح علیه العنایه وغایة البیان.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:محمد تنویر عفااللہ عنہ

۲۷ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ　　　　فتویٰ نمبر:۳۶۹۷

﴿عورت کی عدت کب سے شروع ہوگی؟﴾

﴿سوال﴾ ایک شخص بیرون ملک نوکری کررہا تھا اور فوت ہوگیا، اسکے بیوی بچوں کو اس کی موت کی خبر نہ ہوئی جبکہ اسکے تمام رشتہ داروں اور پڑوس والوں کو اسکی خبر پہنچ چکی ہے لیکن وہ اسکی نعش آنے تک اسکے بیوی بچوں کو بتانا نہیں چاہتے ،اس عرصہ میں عورت اپنے رشتہ داروں کے گھر بھی جاتی ہے اور زینت وغیرہ بھی اختیار کرتی ہے، جب اس آدمی کی نعش پہنچتی ہے یا اسکے بیوی بچوں کو اطلاع ہوتی ہے اس وقت تک اس عورت کی آدھی عدت یا پوری عدت گزر چکی ہوتی ہے، پوچھنا یہ ہے کہ اس عورت کی عدت کب سے شمار ہوگی؟ کیا موت کے وقت سے شمار کریں گے جو گزر چکی ہے یا جس وقت اسکو اطلاع ہوئی اس وقت سے شمار کریں گے؟ نیز یہ کہ جب رشتہ داروں اور پڑوس والوں کو موت کی خبر تھی اور اسکی عورت باہر جاتی تھی اور زینت اختیار کرتی تھی تو ان لوگوں کو اس عورت کو خبر نہ دینے کی وجہ سے گناہ ہوگا یا نہیں؟

﴿جواب﴾ عورت کی عدت شوہر کی وفات یا طلاق کے فوراً بعد شروع ہو جاتی ہے چاہے

عورت کو اسکا علم ہو یا نہ ہو، مذکورہ صورت میں بھی عورت کی عدت اسکے شوہر کی وفات کے دن سے شمار ہوگی اور عدت وفات چار ماہ اور دس دن ہوتی ہے اگر عورت حاملہ نہ ہو۔

حمل کی صورت میں وضع حمل سے عدت پوری ہو جاتی ہے، مذکورہ عورت کو اگر چار ماہ دس دن گزرنے کے بعد اطلاع ہوئی تو اس صورت میں اسکی عدت گزر چکی ہے اور اگر اس سے کم عرصہ میں اطلاع ہوئی تو موت کے وقت سے لیکر چار ماہ دس دن تک جو دن باقی ہیں وہ پورے کر کے عدت سے فارغ ہو جائے گی، حمل کی صورت میں وضع حمل سے عدت پوری ہوگی۔

لما فی الدر المختار: (۵/۲۰۲، طبع امدادیہ)

(ومبدأ العدة بعد الطلاق و) بعد (الموت) على الفور (وتنقضي العدة وإن جهلت) المرأة (بهما) أي بالطلاق والموت، لأنها أجل فلا يشترط العلم بمضيه سواء اعترف بالطلاق أو أنكر.

رشتہ داروں اور پڑوس والوں کو موت کی اطلاع ہوتے ہی اسکی بیوی کو خبر دے دینی چاہیے تھی تاکہ وہ گھر میں رہ کر عدت گزارتی، اطلاع نہ کرنے کی وجہ سے یہ لوگ گنہگار ہوں گے۔

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ
۵ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ | فتویٰ نمبر: ۹۵

﴿دوران عدت مطلقہ عورت کا ٹیلی فون پر شادی کے بارے میں گفتگو کرنا ناجائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا دوران عدّت طلاق شدہ عورت ٹیلیفون پر کسی اجنبی شخص کے ساتھ شادی کے بارے میں بات کر سکتی ہے؟ یعنی یہ معاہدہ کر سکتی ہے کہ ہم بعد از ختمِ عدت شادی کر لیں گے؟

﴿جواب﴾ چونکہ نکاح اللہ تعالیٰ کے عمدہ ترین انعامات میں سے ہے جس کے زائل ہو جانے پر (خواہ طلاق کی وجہ سے ہو یا وفاتِ خاوند کے سبب سے) بہر صورت عورت کے ذمہ عدت گزارنے کے ساتھ ساتھ افسردگی کا اظہار بھی لازم ہے، چنانچہ خوشبو لگانا، سرمہ وغیرہ کا استعمال کرنا اور بلا ضرورت گھر سے باہر نکلنا سب عورت کے لئے ایک معیّن مدّت تک کیلئے ممنوع ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح دورانِ عدّت دیگر لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اس سے بھی منع فرما دیا ہے کہ وہ عدت گزارنے والی خاتون کو پیغامِ نکاح دے دیں جب دیگر لوگوں کو منع کیا گیا ہے تو عورت کا (دورانِ عدّت) اس قسم کا معاملہ یعنی ٹیلیفون وغیرہ پر کسی کے ساتھ اس موضوع پر گفت وشنید اور

بھی زیادہ ممنوع ہے، نیز فقہاءِ کرام نے اس کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی ہے کہ عورت کی دورانِ عدت اس قسم کی حرکات شوہر (اوّل) کی ناراضگی اوردل شکنی کا سبب بن سکتی ہیں جوایک ناجائز عمل ہے، نیز اسمیں خاونداول کی حق تلفی بھی ہے، لہٰذا دورانِ عدت معتدہ کو ان امور سے حتی الامکان گریز کرنا چاہیے۔

لمافی روح المعانی:(۱۵۲/۲،طبع رشیدیہ)

(ولاجناح علیکم فیما عرّضتم به من خطبة النسآء اواکننتم فی انفسکم علم الله الآیة)ولایمکن حملها علی الاستغراق لان من النسآء من یحرم التعریض بخطبتهن فی العدة کالرجعیات والبائنات وفیه: تحت قوله:"ولاتعزموا عقدة النکاح حتیٰ یبلغ الکتاب اجله"ای ینتهی ماکتب وفرض من العدة.

ولمافی الشامی:(۵/ ۲۲۲،طبع امدادیه)

(لاالمطلقة اجماعا)۔۔۔وشمل المطلقة البائن وبه صرّح الزیلعی

وفی الفتح ان التعریض لایجوزفی المطلقة بالاجماع فانه لایجوزلهاالخروج من منزلهااصلاً فلایتمکن من التعریض علیٰ وجه لایخفیٰ علی الناس ولااضمانه الیٰ عداوة المطلق.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم: محمد شریف حسین عفااللہ عنہ

۲۴ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر: ۲۱۳

﴿عدت وفات میں زیورات کا استعمال ممنوع ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تین ماہ ہو گئے ہیں کہ میرے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے، اب میرے بڑے بیٹے کی شادی ہے تو کیا اس میں میں اپنے گھر کے اندر زیورات لاکٹ، چوڑیاں وغیرہ پہن سکتی ہوں یا نہیں؟ مستفتیہ: ام نعمان پشاور

﴿جواب﴾ شوہر کے انتقال پر عورت کو چار ماہ دس روز تک سوگ کرنے کا حکم ہوتا ہے، شرعی اصطلاح میں اس کو "حداد" کہتے ہیں، یعنی زیب وزینت کے تمام چیزوں سے اجتناب ضروری ہوتا ہے، چوڑیاں اور لاکٹ وغیرہ بھی چونکہ زینت کی اشیاء ہیں لہٰذا دوران عدت گھر میں بھی پہننے کی گنجائش نہیں ہے۔

لما فی قوله تعالی (البقرة: ۲۳۴)

﴿والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجاً یتربصن بانفسهن اربعة اشهر وعشرا.﴾

الجوهرة النیرة:(۹۷/۲ ،کتاب العدة میر محمد کتب خانه کراچی)

واذا مات الرجل عن امرأته الحرة فعدتها اربعة اشهر وعشرة وهذه العدة لاتجب الا فی نکاح صحیح.

ولما فی البدائع الصنائع:(۲۰۸/۳، فصل فی احکام العدۃ طبع سعید)

الاحداد فی اللغۃ عبارۃ عن الامتناع من الزینۃ یقال احدت علی زوجھا وحدت ای امتنعت من الزینۃ وھو ان تجتنب الدھن والکحل ولا تختضب ولا تمتشط ولا تلبس حلیا ولا تتشوف.

ولما فی الھدایہ:(۴۲۲/۲، باب العدۃ طبع رحمانیہ)

وعلی المبتوتۃ والمتوفی عنھا زوجھا اذا کانت بالغا مسلمۃ الحداد، والحداد ان تترک الطیب والزینۃ والکحل والدھن المطیب وغیر المطیب الا من عذر.

ولما فی الدر المختار مع الشامی :(۵۳۰/۳، فصل فی الحداد، طبع سعید)

(تحد مکلفۃ مسلمۃ اذا کانت معتدۃ بت او موت بترک الزینۃ) وفی الشامیۃ قولہ بترک الزینۃ بحلی ای بجمیع انواعہ من فضۃ وذھب وجواھر بحر، قال القھستانی: والزینۃ ما تتزین بہ المرأۃ من حلی او کحل کما فی الکشاف ..... ویؤیدہ ما فی قاضیخان: المعتدۃ تجتنب عن کل زینۃ.

ولما فی البحر الرائق:(۱۵۰/۴، فصل فی الحداد طبع سعید)

قال العلامۃ ابن نجیم مصری رحمہ اللہ: وشمل لبس الحریر بجمیع انواعہ وألوانہ ولو أسود وجمیع انواع الحلی من ذھب وفضۃ وجواھر، زاد فی التتارخانیہ القصب.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد تنویر عفا اللہ عنہ

۲۷ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر: ۳۶۹۱

﴿عدت طلاق میں شوہر کا انتقال ہو جائے تو عدت وفات لازمی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت کو شوہر نے ایک طلاق رجعی دی اس کی عدت پوری نہیں ہوئی تھی کہ اس کا شوہر انتقال کر گیا، تو اب اس عورت پر کون سی عدت لازم ہوگی عدت طلاق یا عدت وفات؟ مستفتی: محمد نعیم پشاور

﴿جواب﴾ طلاق رجعی کی صورت میں عدت طلاق رجعی کی تھی لیکن شوہر کے انتقال کے بعد اب پوری عدت وفات گزارنا ضروری ہے یعنی وفات کے دن سے چار ماہ دس دن مکمل عدت میں بیٹھنا عورت پر لازم ہے۔

لما فی فقہ الاسلامی وادلتہ:(۷۱۸۹/۹، طبع رشیدیہ)

اذا مات الرجل فی اثناء عدۃ زوجتہ التی طلقھا طلاقا رجعیا انتقلت بالاجماع من عدتھا بالاقراء او الاشھر الی عدۃ وفاۃ وھی اربعۃ اشھر وعشرۃ ایام سواء کان الطلاق فی حال الصحۃ ام فی حال مرض الموت ،لان المطلقۃ رجعیا تعد زوجۃ ما دامت فی العدۃ ،وموت الزوج یوجب علی زوجتہ عدۃ الوفاۃ فتلغوا احکام الرجعۃ وسقطت بقیۃ عدۃ الطلاق ،فتسقط نفقتھا ،وتثبت احکام عدۃ الوفاۃ من احداد وغیرہ

ولما فی فقه الحنفی وادلته:(۲/۲۰۵، دار الکلم بیروت)

وعدة الوفاة لمن توفی عنها زوجها اربعة اشهر وعشرا لقوله تعالیٰ "والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا یتربصن بانفسهن اربعة اشهر وعشرا".

ولما فی بدائع الصنائع:(۳/۳۰۰،بیان انتقال العدة وتغیرها ،طبع سعید)

اذا طلق امرأته ثم مات فان کان الطلاق رجعیاً انتقلت عدتها الی عدة الوفاة سواء طلقها فی حالة المرض او الصحة وانهدمت عدة الطلاق وعلیها ان تستانف عدة الوفاة فی قولهم جمیعا لانها زوجته بعد الطلاق اذالطلاق الرجعی لایوجب زوال الزوجیة وموت الزوج یوجب علی زوجته عدة الوفاة.

والله اعلم بالصواب: محمد تنویر عفا الله عنه

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا الله عنه

فتویٰ نمبر: ۳۷۵۷

۷ جمادی الثانی ۱۴۳۳ھ

﴿خلع کے بعد عدت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری لڑکی سدرہ کا تین سال پہلے کامران ولد اعجاز سے نکاح ہوا تھا لیکن رخصتی نہیں ہوئی تھی اور نہ کبھی ملاقات ہوئی تھی بعد میں ناچاقی پیدا ہوگئی اور کامران نے رخصتی لینے سے انکار کیا اور آخر کار زبانی کہا کہ مجھے خلع منظور ہے اور کورٹ کے ذریعے ہم نے خلع لے لیا، معلوم کرنا ہے کہ سدرہ پر عدت گزارنا لازم ہے یا بغیر عدت کے بھی کسی دوسرے سے نکاح کر سکتی ہیں؟

مستفتی شیخ محمد اسلم

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ طلاق کے بعد عدت کی ضرورت تب ہی پیش آتی ہے جب منکوحہ کے ساتھ صحبت یا خلوت صحیحہ کی نوبت آئی ہو، بصورت دیگر عدت کی ضرورت نہیں ہوتی۔

لما فی قوله تعالیٰ:(پارہ ۲۲ سورۃ الاحزاب، آیت ۴۹)

یاایها الذین امنوا اذانکحتم المؤمنت ثم طلقتموهن من قبل ان تمسوهن فمالکم علیهن من عدة تعتدونها.....الأیة.

مذکورہ صورت میں سدرہ کے ساتھ نہ تو شوہر کی صحبت ہوئی ہے اور نہ خلوت صحیحہ، لہٰذا سدرہ دوسری جگہ عدت گزارے بغیر نکاح کر سکتی ہے بشرطیکہ خلع صحیح ہوئی ہو۔

واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۳۶

۱۶ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ

﴿صغیرہ مطلقہ کا عدت گزارنے کے درمیان حیض آنے سے عدت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ مسماۃ ہندہ نابالغہ ہے اس کو شوہر نے طلاق دیدی تو اس نے مہینوں کے ذریعے عدت گزارنی شروع کی، ابھی تین ماہ مکمل نہیں ہوئے تھے کہ اسے حیض آنا شروع ہو گیا، اب یہ مہینوں کے ذریعے عدت مکمل کرے یا نئے سرے سے تین حیض پورے ہونے تک عدت میں رہے گی؟

﴿جواب﴾ چونکہ مذکورہ صورت میں ہندہ کو تیسرا مہینہ مکمل ہونے سے تھوڑی دیر پہلے حیض آگیا ہے، اس لئے نئے سرے سے حیض کے حساب سے عدت شمار کرے گی اور تین حیض پورے کرنا اس پر لازم ہے۔

لما فی الهندية:(۵۳۱/۱ طبع رشیدیه)

صغيرة طلقها زوجها فمضت ثلاثة أشهر الا يوما ثم حاضت فمالم تحض ثلاث حيض لاتنقضي عدتها.

ولما في التنوير مع الدر:(۱۹۵/۵-۱۹۶ طبع امدادیه)

(والصغير تلو حاضت بعد تمام الأشهر (لا) تستانف (الا) اذا حاضت في أثنائها) فتستانف بالحيض.

وفي الشامية:قوله:(في أثنائها) أي قبل تمامها ولو بساعة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم:صلاح الدین ڈیروی

۳۰ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ | فتویٰ نمبر:۲۳۲

﴿تنہائی مکان کی وجہ سے عدت وفات دوسرے گھر میں گزارنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ ایک عورت کا شوہر مر گیا ہے اور وہ اپنے مرحوم شوہر کے گھر میں اکیلی ہے تو کیا اس صورت میں یہ عورت اپنے بیٹے یا بیٹی کے گھر میں عدت گزار سکتی ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اگر اس عورت کو اپنے شوہر کے گھر میں مال، جان یا عزت کا خطرہ ہو تو ایسی صورت میں یہ اپنے بیٹے یا بیٹی کے گھر میں عدت گزار سکتی ہے، البتہ اگر اس گھر میں کوئی غیر محرم ہو تو اس سے پردہ ضروری ہے۔

لما في مبسوط السرخسي:(۳۲/۶ طبع دار المعرفة بيروت)

وان كانت في منزل مخوف على نفسها او مالها وليس معها رجل كانت في سعة من الرحلة لان المقام مع الخوف لايمكن وفي المقام ضرر عليها في نفسها ومالها وذلك عذر في حق اسقاط الشرع.

ولما فی فتاوی قاضیخان:(۶/۳۲،طبع دار المعرفة بیروت)

المعتدة اذا كانت فی منزل ليس معها احد الی ان قال .وان كانت الخوف شديدا كان لها ان تنتقل لانها لولم تنتقل يخاف عليها من ذهاب العقل ونحوه.

ولما فی التنوير مع الدر:(۲/۵۳۶،طبع ایچ ایم سعید)

(وتعتدان)ای معتدة طلاق وموت(فی بيت وجبت فيه)ولا يخرجان منه(الا ان تخرج او يتهدم المنزل او تخاف)انهدامه او(تلف ماله اولا تجد كراء البيت)ونحو ذلك من الضرورات فتخرج لاقرب موضع اليه.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:محمد عبداللہ چارسدوی

۹ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر:۶۶۳

﴿طلاق بائن والی عورت کیلئے زینت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ طلاق بائنہ والی عورت دوران عدت زینت اختیار کرسکتی ہے یعنی نئے کپڑے خوشبو سرمہ وغیرہ لگاسکتی ہے؟

﴿جواب﴾ طلاق بائنہ والی عورت دوران عدت زینت اختیار نہیں کرسکتی،البتہ کسی عذر کی وجہ سے بغیر خوشبو کا تیل لگاسکتی ہے،اسی طرح سرمہ وغیرہ بھی استعمال کرسکتی ہے،بلاعذران چیزوں کا استعمال صحیح نہیں۔

لما فی الهندية:(۱/۵۵۸،طبع قدیمی)

على المبتوتة والمتوفى عنها زوجها اذا كانت بالغة مسلمة الحداد فی عدتها كذا فی الكافی.والحداد الاجتناب عن الطيب والدهن والكحل والحناء والخضاب ولبس المطيب والمعصفر والثوب الأحمر وما صبغ بزعفران.

ولما فی تنوير الابصار:(۲/۵۳۱،طبع سعید)

(اذا كانت معتدة بت او موت بترك الزينة والطيب والدهن والكحل والحناء ولبس المعصفر والمزعفر الابعذر)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:عبدالستار

۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر:۸۹۳

﴿بوڑھی عورت بھی پوری عدت گزاریگی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے والد صاحب کے

فوت ہونے کے پچیس (۲۵) تیس (۳۰) دن بعد میری والدہ (جنکی عمر ساٹھ (۶۰) سال سے زیادہ ہے) علاج کیلئے ایک رشتہ دار ڈاکٹر کے پاس گئیں تو اس ڈاکٹر نے علاج معالجہ کے بعد رات گزارنے کا کہا والدہ نے ایام عدت کا کہہ کر معذرت کر لی جس پر ڈاکٹر نے کہا کہ بوڑھی عورت پر عدت نہیں ہے، پوچھنا یہ ہے کہ واقعی بوڑھی عورت پر عدت نہیں ہے؟ اگر ہے تو علاج معالجے کیلئے گھر سے نکل سکتی ہے یا نہیں اور کتنے دن عدت گزاریگی؟ مستفتی: فرمان علی پورن

﴿جواب﴾ ڈاکٹر کا یہ کہنا کہ "بوڑھی عورت پر عدت نہیں" درست نہیں ہے، بوڑھی عورت بھی غیر حاملہ جوان عورت کی طرح چار مہینے اور دس دن عدتِ وفات گزاریگی، دوران عدت اگر گھر پر علاج معالجہ کا بندوبست ہوسکتا ہو تو بہتر ہے ورنہ بدرجہ مجبوری گھر سے نکلنے کی بھی گنجائش ہے، ضرورت پوری کر کے گھر واپس لوٹنا ضروری ہے، رات باہر گزارنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

لما فی التنویر مع الدر والرد: (۵۱۰/۳، طبع سعید)

(و) العدۃ (للموت اربعۃ اشھر) بالاھلۃ لو فی الغرۃ کما مر (وعشر) من الایام ..... (مطلقا) وطئت اولا ولو صغیرۃ او کتابیۃ تحت مسلم ولو عبدا فلم یخرج عنہا الا الحامل". (قولہ من الایام) أی واللیالی ایضاً کما فی المجتبیٰ.

ولما فیہ ایضاً: (۵۳۶/۳ طبع سعید)

(ومعتدۃ موت تخرج فی الجدیدین وتبیت) اکثر اللیل (فی منزلھا) لان نفقتھا علیھا فتحتاج للخروج، حتی لو کان عندھا کفایتھا صارت کالمطلقۃ فلا یحل لھا الخروج فتح. وجوّز فی القنیۃ خروجھا لاصلاح ما لا بد لھا منہ کزراعۃ ولا وکیل لھا. (قولہ وجوز فی القنیۃ الخ) قال فی النھر: ولا بد أن یقید ذلک بأن تبیت فی بیت زوجھا.

ولما فی الھندیۃ: (۵۲۹/۱ طبع رشیدیہ)

"عدۃ الحرۃ فی الوفاۃ اربعۃ أشھر وعشرۃ أیام سواء کانت مدخولا بھا او لا مسلمۃ او کتابیۃ تحت مسلم صغیرۃ أو کبیرۃ أو آیسۃ۔ المعتبر عشر لیال وعشرۃ أیام عند الجمھور کذا فی معراج الدرایۃ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد شاکر اللہ

۱۱ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۶۰۲

﴿دوران عدت حج کیلئے جانا منع ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ میاں بیوی اس سال دونوں حج کیلئے جانے والے تھے، دونوں نے فارم جمع کروایا تھا، رمضان المبارک کے آخر میں شوہر کا

انتقال ہوگیا، اب سوال یہ ہے کہ عورت اس حالت عدت میں حج کیلئے جاسکتی ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ دوران عدت عورت کیلئے حج پر جانا منع ہے، عدت گزارنے کے بعد اپنا ذاتی مال اتنا اس کے پاس ہو جس سے وہ اپنے ساتھ کسی محرم کا خرچہ برداشت کر سکے تو دوبارہ اس پر حج فرض ہوگا ورنہ نہیں۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲/۴۶۵ طبع سعید)

(وعدم عدة عليها مطلقا) أية عدة كانت ابن ملك (والعبرة لوجوبها) اى العدة المانعة من سفرها (وقت خروج اهل بلدها) وكذا سائر الشروط بحر.

وفى الشامية:(قوله ومع عدم عدة الخ) اى فلا يجب عليها الحج اذا وجدت كما فى شرح المجمع واللباب قال شارحه وهو مشعر بانه شرط الوجوب.... (قوله اية عدة كانت) اى سواء كانت عدة وفاة او طلاق بائن او رجعى.

ولما فى الهندية:(۱/۲۱۹ طبع رشيديه)

(ومنها عدم قيام العدة فى حق المرأة) عدة وفاة كانت او عدة طلاق والطلاق بائن او رجعى هكذا فى شرح الطحاوى فلا تخرج المرأة الى الحج فى عدة طلاق او موت.

ولما فى قاضيخان على هامش الهندية:(۱/۵۵۴ رشيديه) المعتدة لا تسافر لحج ولا لغيره.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد حسن پورلوی

۱۱ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۶۵۵

﴿دوران عدت کن کن امور سے احتراز لازمی ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ میرے والد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے۔ میری والدہ عدت گذار رہی ہیں تو ان پر کن کن امور سے احتراز کرنا لازم ہے؟ میرا تایازاد بھائی (جسکی عمر پندرہ سال ہے جب کہ میری والدہ عمر رسیدہ خاتون ہیں) اچانک ہمارے گھر آگیا تو اس سے عدت پر کوئی فرق تو نہیں پڑے گا؟ اس پر ہمارے گھر میں ایک بحث چھڑگئی ہے کوئی کیا کہتا ہے کوئی کیا؟

نیز ہمارے گھر میں ایک خانساماں بھی ہے جس کی عمر تقریباً بیس سال ہے میری والدہ پر اس سے کتنا پردہ کرنا لازمی ہے؟

مستفتی: علی بن یعقوب

﴿جواب﴾ عدت وفات چار ماہ دس دن ہوتی ہے اگر بیوہ حاملہ نہ ہو، حاملہ ہو تو وضع حمل

سے عدت پوری ہوتی ہے، عدت کے دوران عورت کے لئے گھر سے باہر نکلنا جائز نہیں ہوتا اور گھر پر رہتے ہوئے بھی سوگ کی صورت اختیار کرنے کا حکم ہوتا ہے، میک اپ کرنا، نیا کپڑا پہننا اسی طرح زیب وزینت کی اشیاء کا استعمال منع ہوتا ہے۔ غیر محرم سے پردہ کا حکم تو عام حالات میں بھی ہے البتہ عدت میں اس کی تاکید زیادہ ہوجاتی ہے، آپ کا تایازاد بھائی اگر بالغ ہے تو اس سے پردے کا حکم تو ہے لیکن اس طرح بے دھیانی میں آجانے سے کوئی ایسا گناہ نہیں ہوا جس سے عدت کے حکم میں فرق آتا ہو اور نہ ہی ایسی بات ہے کہ اب اس پر بحث ہوتی رہے۔

آپکی والدہ اگر عمر رسیدہ ہیں اور خادم اور خانساماں سے کام لینے میں کسی قسم کے فتنے کا اندیشہ اگر نہیں ہے تو اب بھی اس سے کام لینے کی گنجائش ہے۔

لمافی التنویر مع الدر المختار:(۵۳۰/۳تا۵۳۱،طبع سعید کراچی)

تحد بضم الحاء وكسرها كما مر مكلفة مسلمة ولو امة منكوحة بنكاح صحيح ودخل بها بدليل قوله اذ كانت معتدة بت او موت وان امر المطلق او الميت بتركه لانه حق الشرع اظهارا للتاسف على فوات النكاح بترك الزينة بحلي او حرير او امتشاط بضيق الاسنان والطيب وان لم يكن لها كسب الا فيه والدهن ولو بلا طيب كزيت خالص والكحل والحناء ولبس المعصفر والمزعفر ومصبوغ بمغرة او ورس الا بعذر راجع للجميع اذ الضرورات تبيح المحظورات.

ولما فی فتاوی عالمگیریہ:(۵۳۳/۱طبع رشیدیہ کوئٹہ)

على المبتوتة والمتوفى عنها زوجها اذا كانت بالغة مسلمة الحداد في عدتها كذا في الكافي والحداد الاجتناب عن الطيب والدهن والحناء والخضاب ولبس المطيب والمعصفر والثوب الاحمر وما صبغ بزعفران الا اذا كانت غسيلا لا ينفض ولبس القصب و الخز والحرير ولبس الحلي التزين والامتشاط كذا في التتارخانيه قال شمس الائمه المراد من الثياب المذكورة ما كان جديدا منها تقع به الزينة اما اذا كان خلقا لا تقع به الزينة فلا بأس به كذا في المحيط.

ولما فیہ ایضا:(۵۳۵/۱ طبع رشیدیہ کوئٹہ)

وان كان المنزل لزوجها وقد مات عنها فلها ان تسكن في نصيبها ان كان ما يصيبها من ذلك ما يكفي به في السكنى وتستتر عن سائر الورثة ممن ليس بمحرم لها كذا في البدائع

ولما فی التنویر مع الدر المختار:(۳۶۹/۶ طبع سعید کراچی)

وينظر من الاجنبية ولو كافرة مجتبى الى وجهها وكفيها فقط للضرورة قيل والقدم والذراع اذا اجرت نفسها للخبز.

ولما فیہ ایضا:(۳۶۸/۶طبع سعید کراچی)

اما العجوز التي لا تشتهى فلا بأس بمصافحتها ومس يدها اذا امن.

ولما فی الهندیه: (۳۲۹/۵، طبع رشیدیه کوئٹه)

واما النظر الی الاجنبیات فنقول یجوز النظر الی مواضع الزینة الظاهرة منهن وذالک الوجه والکف فی ظاهر الروایة کذا فی الذخیرة وان غلب علی ظنه انه یشتهی فهو حرام کذا فی الینابیع النظر الی وجه الاجنبیة اذالم یکن عن شهوة لیس بحرام لکنه مکروه کذا فی السراجیه ـــــ ولا یحل له ان یمس وجهها ولا کفها وان کان یأمن الشهوة وهذا اذا کان شابة تشتهی فان کانت لاتشتهی لا بأس بمصافحتها ومس یدها کذا فی الذخیرة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد اویس غفرلہ ولوالدیہ

۲۰ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۶۲۳

﴿دوران عدت ہم بستری کرنے سے تجدید عدت لازم نہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی گواہان کی موجودگی میں تین طلاق دینے کے بعد بیوی شوہر کے گھر میں ہی رہی شوہر اسکے ساتھ مار پیٹ اور ہم بستری کرتا رہا، دس ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا جبکہ دونوں کے چار بچے ہیں جن میں دو فوت ہو چکے ہیں اور دو حیات ہیں، اب وہ والد کے پاس ہیں اور عورت تو موقع دیکھ کر گھر سے بھاگ گئی۔

پوچھنا یہ ہے کہ وہ عورت از سر نو عدت گزار کر دوسری جگہ نکاح کرے یا بغیر عدت کے بھی نکاح کر سکتی ہے جبکہ طلاق ہوئے تقریباً سال ہونے کو ہے، ابھی وہ عورت دوسرے شہر آ گئی ہے اور کسی دوسرے شخص سے نکاح کرنا چاہتی ہے، دین اسلام میں اس بارے میں کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ تین طلاقیں دیکر بھی مطلقہ بیوی کو بیوی کی طرح رکھنا بڑا گناہ ہے اور اس سے ملنا زنا ہے جبکہ زنا سے عدت واجب نہیں ہوتی، طلاق دیئے ہوئے سال گذر گیا ہے تو بظاہر عدت گذر گئی ہے، لہٰذا اگر عدت گزر گئی ہے تو یہ عورت دوسری جگہ شادی کر سکتی ہے، عدت طلاق کے بعد تین ماہواری گزرنے پر پوری ہو جاتی ہے۔

لما فی ردالمحتار: (۲۰۰/۵، طبع امدادیه)

قوله: (بشبهة) متعلق بقوله: "وطئت" وذالک کالموطوءة للزوج فی العدة بعد الثلاث بنکاح وکذا بدونه اذا قال: ظننت أنها تحل لی، أو بعد ما أبانها بألفاظ الکنایة، وتمامه فی الفتح، ومفاده انه لو وطئها بعد الثلاث فی العدة بلا نکاح عالما بحرمتها لاتجب عدة أخری لأنه زنا.

ولما فی الهندیة: (۱/۵۳۲، طبع رشیدیه)

واما المطلقة ثلاثا اذا جامعها زوجها فی العدة مع علمه انها حرام علیه ومع اقراره بالحرمة لاتستأنف العدة ولکن یرجم الزوج والمرأة.

ولما فی البزازیة علی هامش الهندیة: (۲/۲۵۷ طبع رشیدیه)

طلقها ثلاثا ووطئها فی العدة مع العلم بالحرمة لاتستأنف العدة وتنقضی العدة بثلاث حیض ویرجمان اذا علما بالحرمة ووجد شرائط الاحصان۔(۱)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: خلیل اللہ دیروی

۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۴۱۵

﴿معتدۃ الوفاۃ کے لئے شرعی احکامات﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی عورت کے شوہر کا انتقال ہو جائے تو شریعت نے اس عورت پر عدت لازم کی ہے، پوچھنا یہ ہے کہ شوہر کے گھر میں ہی عدت گزارنا لازم ہے یا کہیں اور بھی عدت کے ایام گزار سکتی ہے؟

اسی طرح کونسی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے عورت گھر سے نکل سکتی ہے اور عدت کے دوران کن کن چیزوں سے عورت کو منع کیا گیا ہے؟ مستفتی: گلزار اللہ پشاور

﴿جواب﴾ عدت وفات شوہر کے گھر میں گزارنا ضروری ہے یعنی شوہر کے انتقال کے وقت جس گھر میں یہ عورت رہائش اختیار کی ہوئی تھی اسی گھر میں عدت پوری کرنا واجب ہے، البتہ اس گھر میں عورت کی عزت یا جان کا خطرہ ہو یا اس گھر میں کھانے پینے کی اشیاء کا بندوبست کرنا ممکن نہ ہو یا مکان کرائے کا ہو اور مالک مکان خالی کرانے پر اصرار کرے تو ایسی مجبوریوں میں ولی کے گھر میں عدت گزارے۔ دوران عدت عورت پر لازم ہے کہ گھر سے باہر نہ نکلے البتہ فطری ضروریات کے لئے مثلاً روزی کا انتظام کرنا یا علاج کے لئے باہر جانا پڑ جاتا ہے اور گھر میں وہ ضرورت پوری نہ ہو سکتی ہو تو دن میں پردے کے ساتھ نکلنے کی گنجائش ہے، رات بہر حال گھر میں گزارنے کا حکم ہے۔

مذکورہ پابندیوں کے علاوہ شریعت نے دوران عدت نکاح اور دواعی نکاح سے بھی سختی کے ساتھ منع کیا ہے، اس لئے سوگ کا حکم ہے یعنی کسی قسم کی زینت اختیار کرنا گناہ ہے، لہٰذا نیا کپڑا پہننا اسی طرح میک اپ کرنا، خوشبو لگانا سب منع ہیں، پردہ کا اہتمام ویسے بھی ضروری ہے لیکن

عدت کے دنوں میں اس حکم کی تاکید بہت زیادہ ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۵۳۶/۳،طبع سعید)

(ومعتدة موت تخرج في الجديدين وتبيت)أكثر الليل(في منزلها)لان نفقتها عليها فتحتاج للخروج وجوز في القنية خروجها لاصلاح ما لابد لها منه كزراعة ولا وكيل لها ....(وتعتدان)أي معتدة طلاق وموت(في بيت وجبت فيه)ولا يخرجان منه(الا ان تخرج او ينهدم المنزل او تخاف)....(تلف مالها او لا تجد كراء البيت)ونحو ذلك من الضرورات فتخرج لاقرب موضع اليه.

وفي الشامية:(قوله في بيت وجبت فيه)هو ما يضاف اليهما بالسكنى.

ولما في الهندية:(۵۳۳/۱،طبع رشیدیہ)

على المبتوته والمتوفى عنها زوجها اذا كانت بالغة مسلمة الحداد في عدتها— والحداد الاجتناب عن الطيب والدهن والكحل والحناء والخضاب ولبس المطيب..... ولبس الحلي والتزين ولا متشاط كذا في التاتارخانيه قال شمس الائمة المراد من الثياب المذكورة ما كان جديدا منها تقع به الزينة—وانما يلزمها الاجتناب في حالة الاختيار اما في حالة الاضطرار فلا باس بها ان اشتكت راسها او عينها فصبت عليها الدهن او اكتحلت لاجل المعالجة فلا باس به ولكن لا تقصد به الزينة كذا في المحيط.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب:نعیم اقبال عفا اللہ عنہ

۱۸صفر الخیر ۱۴۳۱ھ　　فتوی نمبر:۲۴۵۰

﴿حمل ساقط کروانے سے عدت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے اپنی بیوی ہندہ کو جو پانچ ماہ کی حاملہ تھی، تین طلاق دیدی، ہندہ نے پانچ ماہ والا حمل اسقاط کروادیا، مذکورہ حالت میں ہندہ کی عدت کیا ہوگی؟　　مستفتی:محمد طارق

﴿جواب﴾ اگر اسقاط شدہ حمل میں بچہ کی شبیہ یا خلقت کسی حد تک ظاہر ہوگئی تھی تو ہندہ کی عدت مکمل ہوگئی ہے لیکن ایسے بچے کو ساقط کرنا قتل جیسا گناہ ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۵۱۱/۳-۵۱۲،طبع سعید)

(و)في حق(الحامل)مطلقا ولو امة او كتابية او من زنا بان تزوج حبلى من زنا ودخل بها ثم مات او طلقها تعتد بالوضع جواهر الفتاوى(وضع)جميع(حملها)لان الحمل اسم لجميع ما في البطن وفي البحر:خروج اكثر الولد كالكل في جميع الاحكام الا في حلها للازواج احتياطا ولا عبرة بخروج الراس ولو مع الاقل.

وفی الشامیۃ: (قولہ لان الحمل الخ) علۃ لتقدیر لفظ الجمیع فلو ولدت وفی بطنھا آخر تنقضی العدۃ بالآخر، واذا اسقطت سقطا ان استبان بعض خلقہ انقضت بہ العدۃ لانہ ولد والا فلا.

ولما فی البحر الرائق: (۱۴۵/۴، طبع سعید)

واذا اسقطت سقطا استبان بعض خلقہ انقضت بہ العدۃ لانہ ولد ولو لم یستبن بعض خلقہ لم تنقض لان الحمل اسم لنطفۃ متغیرۃ بدلیل ان الساقط اذا کان علقۃ او مضغۃ لم تنقض بہ العدۃ لانہا لم تتغیر فلا یعرف کونہا متغیرۃ بیقین الا باستبانۃ بعض الخلق کذا فی المحیط.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: نعمان اقبال عفا اللہ عنہ

۱۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ | فتویٰ نمبر: ۲۷۰۰

﴿باب فی الحضانۃ وثبوت النسب﴾

﴿طلاق کے بعد بچے کی پرورش کا حق کس کو حاصل ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان دین متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، اس بیوی سے زید کی ایک بچی بھی ہے، طلاق کے بعد یہ بچی اپنی ماں کے پاس رہی، کچھ عرصہ کے بعد اس کی ماں نے دوسرا نکاح کرلیا، اب زید جو اس بچی کا باپ ہے وہ کہہ رہا ہے کہ بچی میرے پاس رہے گی اور نانی کہتی ہے کہ بچی کی تربیت وپرورش کا حق مجھے حاصل ہے، شریعت کی رو سے بچی کی پرورش کا حق کس کو حاصل ہے باپ کو یا نانی کو؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں بچی کی والدہ نے جب دوسرا نکاح کرلیا تو اس سے اس کا حق حضانت ساقط ہوگیا، اب اس کی تربیت وپرورش کی زیادہ حقدار اس کی نانی ہے نہ کہ بچی کا باپ، تاہم بچی کے تمام اخراجات باپ کے ذمہ ہوں گے۔

لما فی الہدایۃ: (۴۳۸/۲، باب حضانۃ الولد ومن احق بہ، طبع رحمانیہ)

واذا وقعت الفرقۃ بین الزوجین فالام احق بالولد لما روی ان امرأۃ قالت یارسول اللہ ان ابنی ھذا کان بطنی لہ وعاء وحجری لہ حوی وثدیی لہ سقاء وزعم ابوہ انہ ینزعہ منی فقال علیہ السلام انت احق بہ مالم تتزوجی ولان الام اشفق واقدر علی الحضانۃ فکان الدفع الیہا انظر...... والنفقۃ علی الاب علی مانذکر...... فان لم تکن لہ ام فام الام اولی من ام الاب وان بعدت لان ھذہ الولایۃ تستفاد من قبل الامہات

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۲۲ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ | فتویٰ نمبر: ۱۶۸

﴿نکاح کے تین ماہ بعد پیدا ہونے والی بچی کی پرورش اور ولایت کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے بھائی کی شادی کے تین ماہ بعد اس کی بیوی کے ہاں بچی کی پیدائش ہوئی، جو شادی سے پہلے بھائی کے ساتھ غلط تعلق کا نتیجہ تھا، ابھی وہ بچی تقریباً آٹھ سال کی ہے اور بھائی نے بیوی کو حالت حمل میں تین طلاقیں دی ہیں، عورت اپنے میکے میں عدت گزار رہی ہے۔

پوچھنا یہ ہے کہ کیا حالت حمل میں طلاق واقع ہو جاتی ہے؟ اس کے علاوہ یہ بھی بتادیں کہ نکاح کے تین ماہ بعد پیدا ہونے والی بچی کا خرچہ اور پرورش کس کے ذمہ ہے؟ جبکہ میرا بھائی نکاح سے پہلے تعلق کو تسلیم کرتا ہے، مزید یہ کہ اس کم سن لڑکی کا نکاح ہم کر سکتے ہیں یا نہیں؟

﴿جواب﴾ طلاق حالت حمل میں بھی واقع ہو جاتی ہے، لہٰذا یہ خاتون عدت گزار کر کسی دوسری جگہ چاہے تو نکاح کر سکتی ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۲۳۲/۳،طبع سعید)(وحل طلاقھن)أی الآیسة والصغیرة والحامل.

لڑکی کے بارے میں اس شخص کے اقرار کو دیکھا جائیگا اگر وہ کہتا ہے کہ یہ میری لڑکی ہے، غلط کاری کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے، اس طرح کی کوئی وضاحت نہیں کرتا تو یہ لڑکی ثابت النسب ہوگی، اس شخص کو ولایت حاصل ہوگی، بالغ ہونے سے پہلے والد اس کا نکاح بھی مناسب جگہ کر سکتا ہے اور نان نفقہ بھی اسکے ذمہ ہوگا، ایک دوسرے کے وارث بھی ہوں گے اور اگر وضاحت کیساتھ کہتا ہے کہ زنا سے یہ لڑکی پیدا ہوئی ہے تو اس صورت میں لڑکی صرف ماں کی طرف منسوب ہوگی اور ولایت بھی اسی کو حاصل ہوگی۔

لما فی التنویر مع الرد:(۴۹/۳،طبع سعید)

[فروع]لونکحھا الزانی حل له وطؤھا اتفاقاوالولدله ولزمه النفقة.

وفی الشامیة:(قوله والولدله)أی ان جاء ت بعدالنکاح لستةاشھر مختارات النوازل،فلو لاقل من ستة اشھر من وقت النکاح لایثبت النسب ولایرث منه الاان یقول ھذاالولد منی،ولایقول من الزنی خانیة.

ولما ایضافیھا:(۷۸/۳،طبع سعید)

(فان لم یکن عصبة فالولایة للأم)وفی الشامیة:(قوله فالولایة للأم الخ)أی عندالامام ومعه ابویوسف فی الأصح وقال محمدلیس لغیر العصبات ولایة وانماھی للحاکم

والاول الاستحسان،والعمل علیه الافی مسائل لیست هذه منها.

ولمافی الهندیة:(۱/ ۵۴۰،طبع رشیدیه)

ولوزنیٰ بامرأة فحملت ثم تزوجها فولدت ان جاءت به لستة اشهر فصاعدا ثبت نسبه وان جاءت به لاقل من ستة اشهرلم یثبت نسبه الاان یدعیه ولم یقل انه من الزنا أما ان قال انه منی من الزنافلایثبت نسبه ولایرث منه.کذافی الینابیع.

ولمافی البحر:(۸/ ۵۰۳،طبع سعید)

(ولایرث ولدالزناواللعان من جهة الام فقط)۔۔۔ ولایتصورأن یرث هوأو یورث بالعصوبة۔۔۔۔وکذامویرث معتقه اومعتق معتقه أوولده بذلک وقدتقدم.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:خلیل اللہ دیروی عفااللہ عنہ

۲۲ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر:۱۳۷۹

﴿بچی کا حق پرورش نو سال تک ماں کو حاصل ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے بھائی کی اہلیہ نے کورٹ کے ذریعے خلع لیا ہے،اور اس سے میرے بھائی کی ایک بچی بھی ہے جس کی عمر تقریباً ۱۳/۱۴سال ہے،اب ماں نے اس لڑکی کے غیر محرم کیساتھ دوسرے جگہ شادی کر لی ہے اور لڑکی بھی اسی کے پاس رہ رہی ہے،لڑکی کا خرچہ والد صاحب یعنی میرے بھائی ادا کر رہے ہیں ،پوچھنا یہ ہے کہ شرعاً ایسی صورت میں مذکورہ لڑکی کی پرورش کا حق کسے حاصل ہے،جبکہ ابھی وہ جوان ہونے کے قریب ہے،اور ہمارے لئے بھی یہ بڑی عار کی بات ہے کہ ہماری بچی غیر کے پاس رہے،لڑکی کی دادی ابھی تک حیات ہیں اور ہمارے ہاں گھر پہ ہی رہائش پزیر ہیں نیز اس کی نانی بھی حیات ہے لیکن وہ بیرونی ملک کسی غیر مسلم ملک میں رہ رہی ہے۔ مستفتی:محمد آصف

﴿جواب﴾ لڑکی کا حق پرورش نو'۹' سال کی عمر تک ماں کو حاصل ہے بشرطیکہ ماں نے اس لڑکی کے غیر محرم کیساتھ شادی نہ کی ہو،اگر شادی کی ہو تو اس کا حق پرورش ساقط ہو جاتا ہے۔ صورت مذکورہ میں چونکہ ماں نے لڑکی کے غیر محرم کیساتھ شادی کی ہے اس لئے اسکا حق پرورش باقی نہیں رہا،اور اس کے علاوہ چونکہ اب لڑکی کی عمر نو سال سے زیادہ ہوگئی ہے اس لئے اب والد کو یہ حق حاصل ہے کہ لڑکی اپنے پاس رکھے۔

لمافی الدر المختار :(۳/ ۵۶۵،طبع سعید)

(و)الحاضنة(یسقط حقها بنکاح غیر محرمه)ای الصغیر وکذابسکناها عند المبغضین

له لمالى القنية او تزوجت الام بآخر فامسكته ام الام فى بيت الراب فللأب أخذه

ولمافى الدر المختار :(۵۶۷/۳، طبع:سعید)

(وغيرهما احق بهما حتى تشتهى)وقدر بتسع وبه يفتى وبنت احدى عشرة مشتهاة اتفاقا زيلعى (وعند محمد أن الحكم فى الام والجدة كذلك)وبه يفتى لكثرة الفساد زيلعى

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عزیز اللہ آغا عفی عنہ

۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۲۲۸

﴿باپ کی وفات کے بعد نابالغ بچوں کی پرورش کا حق کس کو حاصل ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان شرع دین متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے بھائی کا ڈھائی سال قبل انتقال ہوگیا تھا اس نے ترکہ میں کچھ نہیں چھوڑا ہے ان کے لواحقین میں انکی بیوہ اور دو بیٹیاں تھیں وہ اپنے شوہر کی وفات کے بعد ڈھائی سال تک ہمارے ساتھ رہی اب وہ اپنے والدین کے گھر جانا چاہتی ہے، پوچھنا یہ ہے کہ کیا وہ اپنے ساتھ اپنے بچوں کو لے جاسکتی ہے یا نہیں یعنی وہ انکی پرورش کرسکتی ہے؟ نیز بلوغت کے بعد وہ بچے ازروئے شریعت کس کے پاس رہینگے؟ دوسری بات یہ پوچھنی ہے کہ میری بھابی کو میرے والد صاحب کی جائیداد میں حصہ کے مطالبہ کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ جبکہ میرے والد ابھی حیات ہیں، برائے مہربانی شریعت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

مستفتی: محمد صابر سخاکوٹ

﴿جواب﴾ بچیوں کی پرورش کا حق بالغ ہونے تک انکی والدہ کو حاصل ہے اور خرچہ بچیوں کے ولی یعنی دادا کے ذمہ ہے۔ بلوغت کے بعد انکا دادا بچیوں کو اپنے پاس رکھ سکتے ہیں آپکے بھائی مرحوم کی ذاتی جائیداد وغیرہ اگر نہیں تھی تو والد صاحب کی جائیداد میں انکی بیوی بچوں کا کوئی حصہ نہیں بنتا البتہ بچیوں کا دادا چاہے تو زندگی مین بطور ھبہ اپنی پوتیوں کو دے سکتے ہیں اور ایک تہائی کی حد تک ان کیلئے وصیت کرنا چاہے تو کرسکتے ہیں۔

(والحاضنة)أما أو غيرها(أحق به)أى با لغلام (والأم والجدة) لأم أو لأب (أحق بها)أى بالصغيرة(حتى تحيض) أى تبلغ فى ظاهر الرواية،

وفى الشامى:۵۶۶/۳، طبع سعيد)

وفى الخلاصة وغيرها:واذا استغنى الغلام وبلغت الجارية فالعصبة أولى، يقدم الأقرب فالأقرب ولاحق لابن العم فى حضانة الجارية اهـ

أيضا وفي الفتح:ويجبر الأب على أخذالولد بعد استغنائه عن الأم لأن نفقته وصيانته عليه بالاجماع۱ھ

ولما في التنوير مع الدر:(۵۶۶/۳، طبع سعيد)

(وغيرها أحق بها حتى تشتهى)وقدر بتسع، وبه يفتى، وبنت احدى عشرة مشتهاة اتفاقا زيلعي (وعن محمد أن الحكم في الأم والجدة كذالک)

ولما في البدائع:(۳۶۳۵/۴طبع سعيد)

ولو كان لهم جد موسر لم يفرض النفقة على الجد ولكن يؤمر الجد بالانفاق عند حاجتهم......وان لم يكن الأب قادرا على الكسب بان كان زمنا قضى بنفقتهم على الجد لأن عليه نفقة أبيهم فكذا نفقتهم.

ولما في الشامي :(۷۵۸/۶،طبع سعيد)

وموضوعه(أى موضوع علم الفرائض)التركات.....وأركانه ثلاثة:وارث،ومورث، وموروث

ولما في شرح المجلة المادة۱۱۹۲:(۱۳۲/۴، طبع رشيديه)

كل يتصرف في ملكه كيف شاء لكن اذا تعلق حق الغير به يمنع المالک من تصرفه على وجه الاستقلال.

ولما في البحر:(۴۰۲/۸،طبع سعيد)

(وهي مستحبة)يعني الوصية مستحبة(ولاتصح بما زاد على الثلث)

الجواب صحیح:مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:عمران الحق سواتی

۲ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ فتویٰ نمبر:۲۰۰۸

﴿طلاق کے بعد بچے کی پرورش کا حق کس کو ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جاوید نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی ہے، جاوید کا اس بیوی سے ایک دودھ پیتا بچہ بھی ہے، مطلقہ بیوی عدت گزرنے کے بعد بچے کو لیکر میکے چلی گئی، اب اس بچے کے بارے میں اختلاف ہورہا ہے، جاوید بچے کے لینے کا اصرار کرتا ہے اور عورت دینے سے انکار کررہی ہے اور کہتی ہے کہ پرورش کا حق مجھے حاصل ہے، عرض یہ ہے کہ شریعت کی رو سے پرورش کا حق ماں کو حاصل ہے یا نہیں؟ اگر حاصل ہے تو کتنے عرصے تک حاصل ہے؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ بچے کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہے بشرطیکہ وہ کسی دوسری جگہ شادی نہ کرے شادی کرنے کی صورت میں اس کا یہ حق ساقط ہوجاتا ہے، البتہ بچے کے محرم سے شادی کر لی تو

اس صورت میں اس کا یہ حق باقی رہے گا، لہٰذا مذکورہ صورت میں یہ عورت بچے کو سات سال تک اپنے پاس رکھ سکتی ہے اور اس کے خرچہ کا جاوید سے مطالبہ کرسکتی ہے۔

لمافی الھدایۃ:(۱/۴۳۸-۴۳۹-۴۴۰،طبع رحمانیہ)

واذاوقعت الفرقة بين الزوجين فالام احق بالولد ..... والنفقة على الاب..... والام والجدة احق بالغلام حتى ياكل وحده ويشرب وحده ويلبس وحده ويستنجي وحده ..... لان تمام الاستغناء بالقدرة على الاستنجاء..... والخصاف قدرالاستغناء بسبع سنين..... الخ.

ولمافی الھندیۃ:(۱/۵۴۱-۵۴۲،طبع رشیدیہ)

أحق الناس بحضانة الصغير حال قيام النكاح أوبعدالفرقة الام الاان تكون مرتدةأو فاجرة غير مامونة كذافي الكافي..... والام والجدةأحق بالغلام حتى يستغني وقدربسبع سنين.

ولمافی التنویرمع الدر:(۳/۵۵۵تا۵۶۶،باب الحضانة،طبع سعید)

(تثبت للأم)..... (ولو)..... (بعدالفرقة .....)..... (وتستحق)الحاضنة(اجرة الحضانة.....) .....(و)الحاضنة(يسقط حقهابنكاح غيرمحرمه)اى الصغير..... (والحاضنة) أماأوغيرها (أحق به)اى بالغلام حتى يستغني عن النساء وقدربسبع وبه يفتى.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:عبداللہ عفااللہ عنہ

۲۸جمادی الثانی۱۴۲۸ھ فتویٰ نمبر:۱۰۲۴

﴿تفریق کی صورت میں سات سال کی عمر تک حق پرورش ماں کو حاصل ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں حضرات مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں، کہ میری بہن کو طلاق ہوئی اور اسکا مہر تقریباً 5 لاکھ روپے تھا، ہم نے جب ان لوگوں سے بہن کیلئے مہر کا مطالبہ کیا تو انہوں نے کچھ عرصے کیلئے مہلت مانگی جو کہ وہ پوری ہوگئی، انہوں نے بچے کے بارے میں کہا کی وہ بھی ہمیں دیں چونکہ میں نے بہن اور ماں سے کوئی مشورہ نہیں کیا تھا اس لئے کچھ نہ کہہ سکا، لیکن وہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ آپنے وعدہ کرلیا تھا، تو پوچھنا یہ ہے کہ اب اس بچے کی پرورش کا حق دار کون ہے؟ یہ بھی واضح رہے کہ اس بچے کی نانی بھی حیات ہے۔

﴿جواب﴾ میاں بیوی کی تفریق کی صورت میں بچے کی پرورش کا حق اسکی والدہ کو حاصل ہے، سات سال کی عمر تک وہ اپنے پاس رکھ سکتی ہے اور اس کے ضروری خرچے بچے کے والد کے ذمہ ہے۔ البتہ یہ خاتون اگر دوسری ایسی جگہ شادی کرلے جو بچے کیلئے محرم نہ ہوں تو اسکا یہ حق ساقط ہوجاتا ہے، اور بچے کی نانی پھر پرورش کا حق رکھتی ہے۔ آپ نے بالفرض اگر ان لوگوں کے

ساتھ یہ عہد کر لیا تھا کہ بچہ آپ لوگوں کے حوالہ کروں گا تو اس کا آپ کو کوئی حق حاصل نہیں ہے، نومولود بچے کی ضروریات کا خیال اسکی والدہ ہی بہتر رکھ سکتی ہے اور بالفرض اس بچے کی والدہ کسی وجہ سے بچہ اپنے پاس اگر نہیں رکھتی تو نانی چونکہ حیات ہے پھر اس کا حق ہے لہذا بچے کی والدہ اور نانی کی رضامندی کے بغیر آپ ازخود اس فیصلہ کا مجاز نہیں ہے کہ بچہ اس کے والد کے حوالہ کریں۔

لما فی التنویر مع الدر: ۳/۵۵۵،۵۶۲،۵۶۳ طبع سعید

تربیة الولد (تثبت للأم) ثم بعد الام بان ماتت أو لم تقبل أو تزوجت باجنبی (ام الام) ثم ام الاب ثم الاخت لاب وأم ثم لام ثم الاخت لاب ـ ثم الخالات کذالک.

ولما فی التنویر مع الدر أیضا: ۳/۵۶۶ طبع سعید

والحاضنة احق به ای بالغلام حتی یستغنی عن النساء وقدر بسبع وبه یفتی لانه الغالب ولو اختلفا فی سنه فان اکل وشرب ولبس واستنجی وحده دفع الیه ولو جبرا والا لا.

ولما فی الشامی: ۳/۵۶۲ طبع سعید

فان کان الاب معسرا والصغیر له مال أو لا یقال للام اما ان تمسکیه مجانا أو تدفعیه للعمة مثلا المتبرعة صونا لماله لو له مال، وان کان الاب موسرا والصغیر له مال فکذالک، لان الاجرة حینئذ علی الصغیر، وان کان الاب موسرا ولا مال للصغیر فالام مقدمة وان طلبت الاجرة نظرا للصغیر بلا ضرر له فی ماله.

ولما فی التنویر مع الدر: ۳/۵۵۹ طبع سعید

واذا اسقطت الام حقها صارت کمیتة او متزوجة فتنتقل للجدة بحر ولا تقدر الحاضنة علیٰ ابطال حق الصغیر فیهما حتی لو اختلعت علیٰ ان تترک ولدها عند الزوج صح الخلع وبطل الشرط لانه حق الولد فلیس لها ان تبطله بالشرط ولو لم یوجد غیرها اجبرت بلا خلاف وهذا یعم مالو وجد وامتنع من القبول بحر.

ولما فی الشامی ایضاً: ۳/۵۵۹

فتنتقل للجدة ای تنتقل الحضانة لمن یلی الام فی الاستحقاق کالجدة ان کانت والا فلمن یلیها فی ما یظهر واستظهر الرحمتی أن هذا الاسقاط لا یدوم فلها الرجوع لان حقها یثبت شیئا فشیئا فیسقط الکائن لا المستقبل ای فهو کاسقاطها القسم لضرتها فلا یرد ان الساقط لا یعود لان العائد غیر ساقط۔ ثم رایت بخط بعض العلماء وعن المفتی ابی السعود مسئلة فی رجل طلق زوجته ولها ولد صغیر منه واسقطت حقها من الحضانة وحکم بذالک حاکم فهل لها الرجوع باخذ الولد؟ الجواب: نعم لها ذالک فان اقوی الحقین فی الحضانة للصغیر ولئن اسقطت الزوجة حقها فلا تقدر علیٰ اسقاط حقه ابدا.

ولمالی الشامی ایضا ۲/ ۵٦۱

قال فی البحر: فعلی هذا یجب علی الاب ثلثة: اجرة الرضاع، واجرة الحضانة، ونفقة الولد، ومثله فی الشرنبلالیة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۳ صفر المظفر ۱۴۳۴ھ — فتوی نمبر: ۲۵۰۴

﴿اخلاقی نقصان کی وجہ سے عورت کا حق پرورش ساقط ہو جائیگا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کہ بارے میں کہ میری شادی ۲۰۰۸ء میں اجالہ فرخ بنت سید جواد شاہ سے ہوئی جس سے میرا ایک بیٹا بھی ہے، میں اپنی بیوی کی تمام ضروریات پوری کرتا ہوں، اور اس کو ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن وہ میرے ساتھ رہنے پر راضی نہیں، اور اصل بات یہ ہے کہ اس کے والدین اپنی بیٹیوں سے کمائی کرتے ہیں، ایک جوان بیٹی فیشن ڈیزائنر ہے بازار میں مردوں کے ساتھ مخلوط ماحول میں کام کرتی ہے اور میری بیوی کو آرٹی فیشل اسٹال پر مارکیٹ میں بٹھاتے ہیں، اس کے علاوہ ان کے گھر کا ماحول دینی لحاظ سے انتہائی خراب ہے، میری بیوی بغیر کسی خلع وطلاق کے اپنے والدین کے گھر پر ہے اور وہ میرے چار سالہ بیٹے کو بھی اپنے ساتھ رکھنے کا مطالبہ کرتی ہے جبکہ بیٹے کو اس کے ساتھ چھوڑنے میں اس کے خراب ماحول میں بڑے نقصان ہونے کا اندیشہ ہے، اس ماحول میں پاک تربیت سے محروم ہو جائے گا بلکہ بالکل بیکار سا ہو جائے گا، جبکہ میں اور میرے والدین اپنے بیٹے کا ہر طرح سے خیال رکھتے ہیں اور اس کو "حق اکیڈمی اسکول" میں بھی داخل کرا دیا ہے اور نماز کی بھی عادت ڈلواتے ہیں۔

غرض مسئلہ یہ ہے کہ کیا ان حالات کے باوجود مجھ پر اپنے بیٹے کو اپنی بیوی کے حوالے کرنا ضروری ہے؟ مستفتی: فرخ پٹیل

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ مفتی غیب نہیں جانتا، اور سوال میں درج شدہ باتوں کی حقائق تک رسائی بھی مفتی کی ذمہ داری نہیں ہے مفتی تو سوال کے مطابق جواب دیتا ہے، لہذا آپ نے سسرال کے متعلق جو احوال لکھے ہیں یہ باتیں اگر سچ ہیں تو ایسی صورت حال میں بچے کو ننیال میں اس کے ماں کے حوالے کرنا جائز نہیں ہے، یہ بچے کیساتھ زیادتی ہوگی، اور آپ کو قدرت ہو تو

اپنی بیوی کو بھی اپنے گھر میں پابند کریں نرمی سے بات نہ مانے تو زبردستی اور سختی کی بھی گنجائش ہے نکاح میں ہوتے ہوئے کسی بھی عورت کو شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر جانے کی شریعت اس کے خود کو کوئی اجازت نہیں دیتی، چہ جائے کہ وہ اپنے بچے کو بھی ساتھ لے جائے، البتہ طلاق یا خلع کی صورت میں پرورش کا حق سات سال کی عمر تک والدہ کو مشروط طور پر حاصل ہے۔

(۱) کہ کسی ایسے آدمی سے وہ شادی نہ کرے جو بچے کے لئے غیر محرم ہو، ایسی جگہ شادی کرنے سے اس کا حق پرورش ساقط ہو جائے گا۔ نمبر (۲) والدہ بچے کو ایسے ماحول میں نہ رکھے جہاں اس کے جان یا اخلاق کے نقصان کا قوی اندیشہ ہو ایسی صورت اگر ہو تو پرورش کا حق اس کو حاصل نہیں۔

(۳) عورت مجبوراً اگر کمانے کے لئے نکلتی ہے اور کام کاج کی وجہ سے بچے پر شفقت کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتی تو ایسی صورت میں بھی اس کا یہ حق باقی نہیں رہتا۔ لیکن آپ کی بیوی تو تا حال آپ کے نکاح میں ہے اس کے لئے اپنی ذات کو آپ سے الگ دور رکھنا جائز نہیں ہے چہ جائیکہ وہ بچے کو آپ سے جدا کرے۔

لما فی الشامی: (۵۵۵/۳، طبع: سعید)

قال الرملی: ویشترط فی الخضانۃ ان تکون حرۃ بالغۃ عاقلۃ امینۃ قادرۃ ـــ والمراد بکونها امینۃ ان لا یضیع الولد عندها باشتغالها عنه بالخروج من منزلها کل وقت،

ولما فیه أیضاً: (۵۵۷/۳ طبع: سعید)

والحاصل ان الخضانۃ ان کانت فاسقۃ فسقاً یلزم منه ضیاع الولد عندها سقط حقها والا فهی احق به الی ان یعقل فینزع منها کالکتابیۃ (قوله بان تخرج کل وقت الخ) المراد کثرۃ الخروج لان المراد علی ترک الولد ضائعاً والولد فی حکم الامانۃ عندها، ومضیع الامانۃ لا یستأمن، ولا یلزم ان یکون خروجها لمعصیۃ حتی یستغنی عنه بما قبله فانه قد یکون لغیرها، کما لو کانت قابلۃ أو غاسلۃ أو بلانۃ أو نحو ذالک۔

ولما فی فتاوی عالمگیریه: (۵۴۱/۱، طبع رشیدیه کوئٹه)

أحق الناس بحضانۃ الصغیر حال قیام النکاح أو بعد الفرقۃ الام الا ان تکون مرتدۃ أو فاجرۃ غیر مأمونۃ کذا فی الکافی۔

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد اویس عفی عنہ

۸ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر: ۳۵۶۶

﴿عورت کا اپنے شوہر کیساتھ ایگریمنٹ کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ میاں بیوی کی تفریق کی

صورت میں اگر عورت نے اپنے شوہر کے ساتھ یہ معاہدہ (ایگریمنٹ) کرلیا کہ جب بچہ پیدا ہو جائیگا تو آپ کے پاس رہے گا حالانکہ شوہر کے پاس دودھ کا انتظام بھی نہیں ہے تو کیا یہ حق بچہ کی ماں کو حاصل ہے؟ اور یہ کہ پرورش کا حق فقہاء کرام نے جس تفصیل سے بیان فرمایا ہے یہ حق پرورش والے کا ہے یا بچے کا؟ اگر بچے کا حق ہے تو والدہ کو اس طرح کا معاہدہ کرنے کا اختیار ہوگا؟

﴿جواب﴾ حق پرورش سے متعلق شرعی احکام میں بچے اور ماں وغیرہ دونوں کی طبعی ضرورت اور طبعی محبت وشفقت ملحوظ ہے۔ یہ حق نہ صرف ماں اور دیگر پرورش ذمہ داروں کا ہے اور نہ صرف بچے کا ہے بلکہ دونوں کا ہے۔ چنانچہ ماں وغیرہ پرورش سے اگر انکار کریں تو بلا وجہ ان کو مجبور نہیں کیا جائیگا لیکن بچے کی غذائی ضرورت وغیرہ کے لئے دوسرا کوئی انتظام اگر نہ ہو سکے تو ایسی صورت میں ماں وغیرہ کو انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ گناہ کے علاوہ قاضی یا پنچایت کے لوگ مجبور بھی کر سکتے ہیں۔ لھذا بچہ پیدا ہونے سے پہلے عورت نے اس طرح کا معاہدہ اگر کیا ہے اور بچے کے والد کے پاس واقعی بچے کی ضروریات پورا کرنے کے لئے انتظام بھی ہے اور پرورش کی حق دار باقی عورتوں کو مثلاً نانی، بہن، وغیرہ کو بھی کوئی اعتراض نہ ہو۔ تو اس معاہدہ کے مطابق بچہ کو والد کے حوالہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن بچے کے والد کے پاس بچے کے لئے مناسب غذا وغیرہ کا اگر بندوبست نہ ہو اور عورت کو بھی اس کا علم ہو تو ایسی صورت میں بچے کی ماں وغیرہ کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ بچہ اس کے والد کے حوالہ کریں اور یہ بھی واضح رہے کہ حق پرورش ایسا حق ہے کہ ساقط کرنے کے باوجود کسی بھی وقت واپس اس کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے یعنی معاہدہ کے باوجود ماں چاہے تو بلا وجہ بھی مطالبہ کر سکتی ہے۔ اور بچے کے والد پر ایسی صورت میں واجب ہوگا کہ بچہ اسکی والدہ کے حوالہ کریں یعنی معاہدہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

لما فی تنویر مع الدر: (۵۵۹/۳ طبع: سعید)

ولا تجبر من لها الحضانة عليها الا اذا تعينت لها بان لم ياخذ ثدی غيرها او لم يكن للاب ولا للصغير مال به يفتی خانيه

ولما فی الشامی: (۵۶۰/۳ طبع: سعید)

قلت: ولم يوخذ من هذا التوفيق بين القولين وذالک ان ما فی المحيط يدل على ان لكل من الحضانه والمحضون حقا فی الحضانه ومثله ما قدمناه عن المفتی ابی السعود فقول من قال انها حق الحضانة فلا تجبر محمول على ما اذا لم تتعين

لها والقصر على انها حقها لان المحضون حينئذ لا يضيع حقه لوجود من يحضنه غيرها ومن قال انها حق المحضون فلتجبر محمول على ما اذا تعينت والقصر على انها حقه لعدم من يحضنه غيرها والدليل على ذالک ايضاً ما مر عن الظهيرية حيث عزى الى الفقهاء الثلاثة القائلين بالجبرانها تجبر عندهم اذا لم يوجد غيرها لا اذا وجد.

ولما فی البحر:(۲۰۲/۴،طبع: سعید)

(قوله ولا تجبر امه لترضع) لانه كالنفقة وهي على الاب وعسى لا تقدر فلا تجبر عليه قضاءً تؤمر به ديانةً لانه من باب الاستخدام وهو واجب عليه ديانةً كما قدمناه اطلقه فشمل ما اذا كان الاب لا يجد من يرضعه او كان الولد لا يأخذ ثدي غيرها ، و نقل الزيلعي الاتقاني انه ظاهر الرواية يتغذى بالدهن وغيره من المائعات فلا يؤدى الى ضياعه و نقل عدم الاجبار في هذه الحالة في المجتبى عن البعض ، ثم قال والاصح انها تجبر عند الكل و جزم به في الهداية و في الخانية و عليه الفتوى و ذكر في فتح القديرانه الاصوب،لان قصر الرضيع الذي لم يأنس الطعام على الدهن والشراب سبب تمريضه وموته.وفي الخانية وان لم يكن للاب ولا للولد الصغير مال تجبر الام على الارضاع عند الكل فمحل الخلاف عند قدرة الاب بالمال.

ولما فی البدائع ۴/۴۰ طبع سعید کراچی

و لكنها ان ابت لا تجبر عليه لما قلنا الا اذا كان لا يوجد من يرضعه فحينئذ تجبر على ارضاعه اذ لو لم تجبر عليه لهلک الولد ، و لو التمس الاب لولده مرضعاً فأرادت الام ان ترضعه بنفسها فهي اولى لانها اشفق عليه .

ولما فی الشامی:(۳/۵۶۹،طبع: سعید)

(فتنتقل للجدة) اى تنتقل الحضانة لمن يلى الام في الاستحقاق كالجدة ان كانت ، و الا فلمن يليها فيما يظهر و استظهر الرحمتي ان هذا الاسقاط لا يدوم فلها الرجوع لان حقها يثبت شيأ فشيأ فيسقط الكائن لا المستقبل ، اى فهو كاسقاطها القسم لضرتها ، فلا يرد ان الساقط لا يعود لان العائد غير الساقط ــــ ثم رأيت بخط بعض العلماء ، و عن المفتي ابى السعود مسئلة في رجل طلق زوجته و لها ولد صغير منه و اسقطت حقها من الحضانة و حكم بذالک حاكم فهل لها الرجوع بأخذ الولد؟الجواب نعم لها ذالک .

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۱۰ صفر الخیر ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۵۲۵

﴿غیر کی منکوحہ سے نکاح اور اس سے ہونے والی اولاد کے نسب کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ ایک شخص نے ایک عورت کے ساتھ جعلی شناختی کارڈ بنوا کر گواہوں اور قاضی کے سامنے نکاح کرلیا تھا اور اب اس کی شادی کو سات آٹھ سال ہو چکے ہیں اور اولاد بھی ہے جبکہ اس عورت کا پہلے سے بھی ایک نشئی آدمی کے

ساتھ نکاح اور رخصتی ہو چکی ہے اور یہ بات دونوں کے علم میں تھی کہ اس پہلے والے آدمی نے طلاق نہیں دی، مسئلہ یہ معلوم کرنا ہے کہ کیا ان کا نکاح قاضی کے پڑھانے سے ہو گیا؟ ان کی موجودہ اولاد کا نسب کس سے ثابت ہوگا؟

مستفتی: شوکت علی ضیاء کالونی کورنگی

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں عورت کا دوسرا نکاح شرعاً کالعدم اور باطل ہے، پہلا نکاح بدستور باقی ہے، اس عورت پر واجب ہے کہ پہلے والے شوہر کے پاس لوٹ جائے، البتہ جو بچے پیدا ہوئے ہیں، ان کا حکم یہ ہے کہ جب تک وہ اپنے اصل شوہر کے نکاح میں ہے اس وقت تک وہ بچے اس کے شوہر ہی کے سمجھے جائیں گے۔

ہاں اگر شوہر ان بچوں کو اپنے طرف منسوب کرنے سے انکار کرے تو عدالت میں جا کر لعان کے ذریعے انکار کردے یا تو عدالت عورت کو سزا سنائے گی یا پھر دونوں کے درمیان نکاح کو فسخ کردے گی، ایسی صورت میں بچے شوہر کی طرف نہیں بلکہ ماں کی طرف منسوب ہونگے۔

لما فی صحیح البخاری:(۲/۱۰۲۱،طبع رحمانیه)الولد للفراش وللعاهر الحجر.

ولما فی اعلاء السنن:(ج۱۵ص۳۸۹،طبع دار الكتب العلمية)

لان مدار النسب على الفراش لا علىٰ المخلوقية من الماء.

ولما فی الشامی:(۳/۵۱۶،طبع سعيد)

اما نكاح منكوحة الغير ومعتدته فالدخول فيه لا يوجب العدة ان علم انها للغير لانه لم يقل احد بجوازه فلم ينعقد اصلا.

ولما فيه ايضا:(۳/۵۵۰،مطلب الفراش علىٰ اربع،طبع سعيد)

(قوله علىٰ اربع مراتب)۔۔۔وقوى وهو فراش المنكوحة ومعتدة الرجعى فانه فيه لا ينتفى الا باللعان.

ولما فی الهندية:(۱/۵۳۶،طبع رشيديه)

قال اصحابنا لثبوت النسب ثلاث مراتب(الاولى)النكاح الصحيح وما هو فى معناه من النكاح الفاسد والحكم فيه انه يثبت النسب من غير دعوة ولا ينتفى بمجرد النفى وانما ينتفى باللعان.

ولما فی بدائع الصنائع:(۲/۳۳۱،طبع سعيد)

ومنها ثبوت النسب وان كان ذلك حكم الدخول حقيقة لكن سببه الظاهر هو النكاح لكون الدخول امرا باطنا فيقام النكاح مقامه فى اثبات النسب ولهذا قال النبى صلى الله عليه وسلم الولد للفراش وللعاهر الحجر وكذا لو تزوج المشرقى بمغربية فجاءت بولد يثبت النسب وان لم يوجد الدخول حقيقة لوجود سببه وهو النكاح.

والله اعلم بالصواب: عبد الوہاب لغمانی عفا اللہ عنہ — الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۵۸۴ — ۵ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ

﴿طلاق کے بعد ٹھہرنے والا حمل غیر ثابت النسب ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق مغلظہ دینے کے باوجود اس سے تعلقات بدستور قائم رکھے اور وہ بیوی (مطلقہ مغلظہ) اس سے حاملہ بھی ہو جائے تو کیا اس حمل کا اسقاط جائز ہے؟ اور کیا یہ بچہ ثابت النسب ہوگا؟

﴿جواب﴾ پیٹ میں موجود بچے میں جان پڑنے سے پہلے کسی خاص وجہ سے اسقاط جائز ہے بلا وجہ جائز نہیں ہے۔ اور بچہ میں جان پڑنے کی مدت فقہاء کرام چار ماہ بتاتے ہیں۔

صورت مسئولہ میں بچہ کا نسب اس شخص سے چونکہ ثابت نہیں ہوگا تو یہ بھی اسقاط کے جواز کے لئے ایک وجہ ہے لیکن چار ماہ سے پہلے اسقاط کی گنجائش ہے اس کے بعد نہیں۔

لما فی الشامی :(۱۷۶/۳،طبع: سعید کراچی)

قال فی النهر بقی هل یباح الاسقاط بعد الحمل؟ نعم یباح مالم یتخلق منه شیئ ولن یکون بعد ذلک الا بعد مائة وعشرین یوما وهذا یقتضی انهم ارادو بالتخلق نفخ الروح والا فهو غلط۔

ولما فی الشامی :(۳۷۴/۶،طبع: سعید کراچی)

وفی الذخیرة: لو ارادت القاء الماء بعد وصوله الی الرحم قالوا ان مضت مدة ینفخ فیه الروح لایباح وقبله اختلف المشائخ فیه والنفخ مقدر بمائة وعشرین یوما بالحدیث قال فی الخانیة: ولا اقول به لضمان المحرم ببیض الصید لانه اصل الصید، فلا اقل من ان یلحقها اثم وهذا لو بلا عذر۔ویاتی تمامه قبیل احیاء الموات۔والله اعلم۔

ولما فی جامع الترمذی:(باب الولد للفراش ص:۱۳۸،طبع: فاروقی کتب خانه)

عن ابی هریرة رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ الولد للفراش وللعاهر الحجر۔

وفی حاشیة الترمذی تحت هذا الحدیث

الولد للفراش ای لمالکه وهو الزوج والمولی لانهما یفترشانها وللعاهر الزانی من عهر عهرًا او عهورا اذا اتی المرأة لیلا للفجور ثم غلب علی الزنا مطلقا عینی۔لاحظ للزانی فی الولد وانما هو لصاحب ام الولد وهو زوجها او مولاها۔

ولما فی الهدایة :(۴۳۵/۲،طبع: رحمانیه لاهور)

واذاجاء ت به لتمام سنتین من وقت الفرقة لم یثبت لان الحمل حادث بعد الطلاق فلا یکون منه لان وطیها حرام الا ان یدعیه لانه التزمه وله وجه بان وطیها بشبهة فی العدة۔

ولما فی کفایت المفتی :(۱/۹،طبع :ادارة الفاروق)

بہت سی صورتوں میں بوجہ شبہۃ الحل نہ ہونے کے باوجود وطی حرام ہونے کے نسب ثابت نہیں

ہوتا۔ جیسے مطلقہ ثلاثہ سے حالت عدت میں وطی کر لی تو باوجود دعوے کے نسب ثابت نہیں ہوگا۔

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد اویس غفر اللہ لہ ولوالدیہ

۱۰ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ　　　فتویٰ نمبر: ۳۵۸۰

﴿مجہول النسب کے شناختی کارڈ کے خانہ ولدیت میں کس کا نام لکھا جائے گا؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ میاں اور بیوی کی اولاد نہیں ہو رہی تھی، شوہر نے اپنے دوست کے معروف النسب بچے کو اسکی اجازت سے اور ایک مجہول النسب بچے کو راستے سے اٹھا کر دونوں بچوں کی پرورش کی اور اب دونوں جوان ہو گئے ہیں۔

پوچھنا یہ ہے کہ ان دونوں بچوں کی نسبت کس کی طرف کیجائیگی؟ جبکہ آج کل کے دور میں دنیا کے ہر کونے خصوصاً پاکستانی شناختی کارڈ میں نام مع ولدیت لکھنا ضروری ہے تو شناختی کارڈ کے خانہ ولدیت میں کس کا نام لکھا جائے گا؟　　　مستفتی: عمران اللہ کبل سواتی

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں دوست کا بچہ چونکہ معروف النسب ہے، اس لئے اس کی نسبت اپنے حقیقی باپ کی طرف کرنا شرعاً وقانوناً واجب اور ضروری ہے، لہذا شناختی کارڈ کے خانہ ولدیت میں اسکے حقیقی باپ ہی کا نام لکھا جائے گا۔

اور جو بچہ جھولے یا راستے سے اٹھا کر لیا ہے وہ چونکہ مجہول النسب ہے، اس لئے اس کی نسبت پرورش کنندہ کی طرف کرنا شرعاً ناجائز اور حرام ہے، لہذا شناختی کارڈ کے خانہ ولدیت میں اسکے پرورش کنندہ کا نام لکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔

البتہ حکومت پاکستان کے قانون کے تحت چونکہ شناختی کارڈ میں نام مع ولدیت لکھنا ضروری ہے، لہذا مذکورہ ضرورت اور مجبوری کی وجہ سے شناختی کارڈ کے خانہ ولدیت میں لفظِ عبد اللہ لکھنے کی شرعاً گنجائش ہے جبکہ لغوی معنی (اللہ کا بندہ) مراد لیا جائے اور محکمہ نادرا والوں سے معلومات کرنے پر معلوم ہوا کہ ایسی صورت میں وہ بھی ''عبد اللہ'' یعنی اللہ کا بندہ شناختی کارڈ میں لکھتے ہیں۔

لمافی قوله تعالی: (سورة الاحزاب آیت ۵)

أدعوهم لآبآئهم هو أقسط عندالله فان لم تعلموا آبآئهم فاخوانكم في الدين..... الآية.

ولما فی صحیح البخاری:(۵۲۳/۲،باب من ادعی الی غیر أبیه ،طبع رحمانیه)

عن سعد قال سمعت النبی صلی الله علیه وسلم یقول من ادعی الی غیر أبیه وهو یعلم أنه غیر أبیه فالجنة علیه حرام.

ولما فی سنن أبی داود:(۳۵٦/۲،رقم الحدیث۵۱۱۳،طبع رحمانیه)

عن سعد بن مالک قال سمعته اذنای ووعاه قلبی من محمد ﷺ أنه قال من ادعی الی غیر أبیه وهو یعلم أنه غیر أبیه فالجنة علیه حرام.

ولما فی أحکام القرآن:(۲۹۱/۳،طبع ادارة القرآن والعلوم الاسلامیة)

اطلاق الأب والابن بطریق الادعاء لایجوز،وعلی سبیل الشفقة یجوز ولایستحسن. الثالث:ان اطلاق الأبوة والبنوة لایجوز الافی النسب بخلاف الأخوة،فان اطلاقها کمایجوز فی النسب یجوز فی غیره من الأسباب والعلائق الدینیة والدنیویة،ولذلک لایجوز أن یقول الرجل لولد غیره:ابنی،وکذا أن یقول الرجل لغیر أبیه:أبی،فقد نهی الله سبحانه وتعالی عن دعاء غیر أبیه ابنه بالبنوة فی هذه الأیة"أدعوهم لأبآئهم" وروی الأئمة البخاری ومسلم والترمذی"ان ابن عمر رضی الله عنهما قال:ماکنا ندعو زید بن حارثة الازید بن محمد حتی نزلت"أدعوهم لأبآئهم هو أقسط عندالله" وحرم رسول الله صلی الله علیه وسلم دعاء غیر أبیه بالأب،فقال:(من ادعی الی غیر أبیه وهو یعلم أنه غیر أبیه فالجنة علیه حرام".

ولما فی روح المعانی:(ج۲۱-۲۲ص۱۹۷-۱۹۸ سورة الاحزاب آیت۵،طبع رشیدیه)

(أدعوهم لأبآئهم)ای انسبوهم الیهم وخصوهم بهم،أخرج الشیخان والترمذی والنسائی وغیرهم عن ابن عمر رضی الله تعالی عنهما أن زید بن حارثة مولی رسول الله صلی الله علیه وسلم ماکنا ندعوه الازید بن محمد حتی نزل القرآن"أدعوهم لأبآئهم"......فدعی زید بن حارثة.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: صادق محمد سواتی غفرلہ ولوالدیہ

یکم صفر ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر:۲۸۲٦

﴿شادی کے ایک ماہ بعد پیدا ہونے والے بچہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ کسی نے اپنی منگیتر سے زنا کیا پھراس کے بعد اس سے نکاح ہوا شادی کے ایک ماہ بعد اس کے یہاں بچہ پیدا ہوا اس بچہ کو کس کی طرف منسوب کریں اور یہ بچہ اسکی میراث میں شریک ہوگا یا نہیں؟ واضح رہے کہ یہ حمل اس زنا کے نتیجہ میں تھا، نیز حالت حمل میں نکاح ہوجاتا ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ نکاح کئے بغیر منگیتر سے ملنا بڑا گناہ ہے، لڑکے اورلڑکی دونوں کے والدین کی بھی ذمہ داری ہے کہ منگنی کے بعد دونوں کے بارے میں گناہ کا اندیشہ ہوتو فوراً شرعی نکاح

کرادیں، شادی کی رسومات بجالانا کوئی ضروری نہیں ہے اور چاہے تو دوبارہ بھی دکھلاوے کیلئے نکاح کرادیں لیکن شرعاً پہلے ہی نکاح کا اعتبار ہوگا، اس نکاح ثانی کی شرعی کوئی حیثیت اگرچہ نہیں ہوگی لیکن کم از کم اصل نکاح کیوجہ سے گناہ سے تو بچ جائیں گے۔

مذکورہ صورت میں شادی کے ایک ماہ بعد یہ بچہ پیدا ہوا ہے، اس بچے کے بارے میں اگر یہ شخص اقرار کرتا ہے کہ یہ میرا بچہ ہے تو اسی کا بچہ سمجھا جائیگا اور ثابت النسب ہوگا بشرطیکہ وہ خود اعتراف نہ کرے کہ میں نے زنا کیا تھا جس سے یہ بچہ پیدا ہوا، باقی لوگوں کیلئے جائز نہیں کہ وہ از خود تبصرے کرتے رہیں کہ شادی کے ایک ماہ بعد یہ بچہ پیدا ہوا، لہٰذا یہ ولد الزنا ہے وغیرہ شرعی ثبوت کے بغیر اندازوں سے زنا کی نسبت کسی مسلمان کیطرف کرنا کبیرہ گناہ ہے بلکہ جہاں تک ممکن ہو مسلمان کے بارے میں اچھا خیال کرنا ضروری ہے۔

لہٰذا ایسی صورت میں اس طرح خیال کرنے سے کوئی گناہ نہ ہوگا کہ ممکن ہے دونوں نے آپس میں پہلے سے نکاح کیا ہوگا اور بعد میں یہ دوسرا نکاح صرف رسمی درجہ میں تھا۔

(۲) حالت حمل میں نکاح منعقد ہو جاتا ہے۔

لما فی التنویر مع الرد:(۴۹/۳،طبع سعید کمپنی)

لو نكحها الزاني حل له وطؤها اتفاقا والولد له ولزمه النفقة.

وفي الشامية:(قوله والولد له)اى ان جاءت بعد النكاح لستة اشهر مختارات النوازل،فلو لأقل من ستة اشهر من وقت النكاح،لا يثبت النسب،ولا يرث منه الاان يقول هذا الولد مني،ولا يقول من الزنى خانية.هكذا في الهندية:(۵۴۰/۱،طبع)

لما في التنوير مع الدر:(۴۸/۳،طبع سعيد)(و)صح نكاح(حبلى من زنى لا)حبلى(من غيره)

وفي الشامية:(قوله وصح نكاح حبلى من زنى)اى عندهما،وقال ابو يوسف لا يصح والفتوى على قولهما،كما في القهستاني عن المحيط.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر اکرام

۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۶۹۲

﴿نکاح فاسد سے ثبوت نسب کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام دریں مسئلہ کہ پہلے زید کے جمیلہ سے ناجائز تعلقات تھے، بعد میں زید کا نکاح جمیلہ کی لڑکی سے ہوگیا، کچھ عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ زید کا جمیلہ کی لڑکی

سے نکاح شرعاً جائز نہیں تھا، اب زید کے لئے کیا حکم ہے؟ اور جو اولاد جمیلہ کی لڑکی سے پیدا ہو چکی ہے، اس کے نسب کا کیا حکم ہے؟ مستفتی: عبدالحمید صاحب

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت نکاح فاسد کی ہے، لہٰذا زید اس عورت کو فوراً اپنے سے علیحدہ کردے اور جو اولاد پیدا ہوئی ہے وہ زید ہی سے ثابت النسب ہوگی اور زید ہی کی اولاد کہلائے گی کیونکہ نکاح فاسد سے نسب ثابت ہو جاتا ہے۔

واضح رہے کہ باقاعدہ جدائی کے بعد اس عورت کے ذمہ عدت گزارنا واجب ہے عدت گزارنے کے بعد دوسری جگہ شادی کر سکتی ہے۔

لمافی التنویر مع الدر (۵۱۶/۳، باب العدۃ، طبع سعید)

(وعدۃ المنکوحۃ نکاحا فاسدا) فلا عدۃ فی باطل وکذا موقوف قبل الاجازۃ اختیار، لکن الصواب ثبوت العدۃ والنسب بحر.

وفی الشامیۃ: (قولہ نکاحا فاسدا) ھی المنکوحۃ بغیر شھود، ونکاح امرأۃ الغیر بلا علم بانھا متزوجۃ ونکاح المحارم مع العلم بعدم الحل فاسد عندہ خلافا لھما فتح.

ولمافی فتح القدیر: (۲۸۸/۴ طبع رشیدیہ)

قولہ: (والمنکوحۃ نکاحا فاسدا) وھی المنکوحۃ بغیر شھود..... ونکاح المحارم مع العلم بعدم الحل فاسد عند ابی حنیفۃ خلافا لھما الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۲۲ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۴۵۶

﴿نکاح کے سات ماہ بعد پیدا ہونے والا بچہ ثابت النسب ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا نکاح سات مہینے پہلے یکم دسمبر ۲۰۰۶ کو مسماۃ ریحانہ سے ہوا پھر نکاح کے ٹھیک سات ماہ بعد یعنی پرسوں تیس جون کی رات کو میرا بیٹا پیدا ہوا، اب گھر کے سب لوگ شک میں مبتلا ہیں کہ یہ بیٹا میرا ہے کہ نہیں؟ میں خود بھی پریشان ہوں، براہ کرم میری راہنمائی فرمائیں۔ مستفتی: خیر الدین

﴿جواب﴾ صورت مذکورہ میں نکاح کے سات ماہ بعد آپ کا جو بیٹا پیدا ہوا ہے، شرعاً یہ آپ ہی کا بیٹا ہے، شریعت نے کم از کم چھ ماہ کی مدت کو بچے کی پیدائش کیلئے ضروری قرار دیا ہے، اس عرصہ میں پیدا ہو جائے تو ثابت النسب ہے، نیز تجربہ بھی شاہد ہے کہ سات ماہ میں بھی بچہ پیدا

ہو جاتا ہے اور صحیح سلامت رہتا ہے، اس لئے کسی قسم کے شک میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔

لما فی الھدایۃ:(۲/۴۳۸،طبع رحمانیہ)

واقلہ ستۃ اشھر لقولہ تعالی وحملہ وفصالہ ثلاثون شھرا ثم قال وفصالہ فی عامین فبقی للحمل ستۃ اشھر.

ولما فی الھندیۃ:(۱/۵۳۶،طبع رشیدیہ)

واذا تزوج الرجل امرأۃ فجاءت بالولد لاقل من ستۃ اشھر منذ تزوجھا لم یثبت نسبہ وان جاءت بہ لستۃ أشھر فصاعدا یثبت نسبہ منہ اعترف بہ الزوج أو سکت.

ولما فی الشامی:(۳/۴۹،طبع سعید)

(قولہ والولد لہ)ای ان جاءت بعد النکاح لستۃ اشھر مختارات النوازل،فلو لأقل من ستۃ أشھر من وقت النکاح لا یثبت النسب.

واللہ اعلم بالصواب: اسرار عزیز

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر:۹۹۸

۱۸ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ

﴿اصل باپ کے علاوہ کسی کی طرف منسوب کرنا گناہ ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ''شادی کارڈ یا اسکول کالج کے سرٹیفکیٹ، نکاح فارم پر حقیقی والد کا نام چھوڑ کر پالنے والے کا نام لکھوانا کیسا ہے کیا شرعاً اس میں کوئی قباحت ہے۔ اس سے نکاح پر کوئی اثر تو نہیں پڑتا؟ مستفتی: قاری محمد طاہر کراچی

﴿جواب﴾ اپنے حقیقی والد کے علاوہ کسی غیر کی طرف اپنے کو منسوب کرنا یا کوئی دوسرا جاننے کے باوجود غیر کی طرف کسی کو منسوب کرے تو قرآن کریم کے واضح حکم کے خلاف ہے سخت گناہ ہے، بعض صورتوں میں اس سے نکاح پر بھی اثر پڑتا ہے لھذا اس سے اجتناب ضروری ہے ہاں پرورش کرنے والے کا نام لکھنا ضروری ہو تو ایسی صورت میں وضاحت کے ساتھ ''پرورشی والد'' ساتھ لکھیں تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

لما فی سورۃ الاحزاب آیت ۵

ادعوھم لابائھم ھو اقسط عنداللہ فان لم تعلموا اباء ھم فاخوانکم فی الدین و موالیکم

ولما فی روح المعانی:(۲۱،۲۲/۱۹۷،۱۹۸،طبع رحمانیہ)

(ادعوھم لابائھم)ای انسبوھم الیھم و خصوھم بھم واخرج الشیخان والترمذی و النسائی و غیرھم عن ابن عمر رضی اللہ تعالی عنھما ان زید بن حارثۃ مولی رسول اللہ ﷺ ماکنا ندعوہ الا زید محمد حتی نزل القران "ادعوھم لابائھم۔۔۔فدعی زید بن حارثۃ

ولما فی کنز العمال :(۶/۸۲۸، ۶۱، طبع رحمانیه)

ومن تولی غیر موالیه او ادعی الی غیر ابیه فعلیه لعنة الله و الملائکة و الناس اجمعین لا یقبل الله منه صرفاً ولا عدلاً.

وفیه ایضاً:﴿ان من الفری الفری ان یعتزی الرجل الی غیر والدیه ﴾

ولما فی العالمگیریه:(۱/۲۶۸، طبع رشیدیه)

و لو کان الشهود یعرفونها و هی غائبة فذکر الزوج اسمها لا غیر و عرف الشهود انه ارادا به المرأة التی یعرفونها جاز النکاح کذا فی محیط السرخسی.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد حامد یاسین، بھکر

۲۵ جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر: ۳۸۱۰

﴿مفقود سے متعلق مسائل﴾

﴿لاپتہ شخص کی بیوی کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ایک شخص لاپتہ ہوا، باوجود تحقیق وتفتیش کے معلوم نہ ہوسکا کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے! کیا اسکی بیوی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی دوسرے شخص سے نکاح کرے، اگر یہ حق حاصل ہے تو اسکو کچھ وقت انتظار کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ ایسی عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مسلمان قاضی کی عدالت میں اپنا مقدمہ پیش کرے اور گواہوں کے ذریعے ثابت کرے کہ فلاں شخص سے اسکا نکاح ہوا ہے اور پھر اسکے لاپتہ ہونے کو بھی گواہوں سے ثابت کرے اسکے بعد قاضی اپنے طور پر تحقیق وتفتیش کرے اور جب لاپتہ آدمی کے ملنے سے مایوسی ہوجائے تو قاضی عورت کو مزید چار سال انتظار کرنے کا حکم کرے اس دوران بھی اگر اسکا پتہ نہ چلے تو قاضی اس شخص کے مردہ ہونے کا فیصلہ سنادے اسکے بعد عورت چار ماہ دس دن عدت وفات گزار کر دوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے۔

(۱) یہ اس وقت ہے جب عورت کے پاس نفقہ موجود ہو اور گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ نہ ہو (۲) اور اگر اسکے پاس نفقہ بالکل نہیں جس سے وہ اپنا گزارہ چلا سکے تو پھر چار سال انتظار کی بھی ضرورت نہیں بلکہ قاضی ایک ماہ انتظار کے بعد اسکا نکاح فسخ کرے۔

(۳) اور اگر گناہ میں مبتلا ہونے کا شدید اندیشہ ہو تو پھر دیکھیں گے اس شخص کے لاپتہ ہونے کے بعد ایک سال گزرا ہے یا نہیں؟ اگر ایک سال گزرا ہے تو قاضی بغیر انتظار کے اسکا

نکاح فسخ کرے اور اگر ایک سال نہیں گزرا تو ایک سال انتظار کا حکم کرے اسکے بعد نکاح فسخ کرے، نیز یہ بات یاد رہے کہ آخری دونوں صورتوں میں عورت عدت طلاق گزارے گی۔

لمافی حیلة الناجزة:(ص۱۲۲-۱۲۳-۱۲۴،طبع دار الاشاعت)

اذا کان المفقود فی ارض الاسلام وله مال ینفق منه علی زوجته المتروکة فی المقام هو مافی الموطا والمدونة وغیرهما عن مالک عن یحیی بن سعید ان عمر بن خطابؓ قال ایما امرأة فقدت زوجها فلم تدر این هو فانها تنتظر اربع سنین ثم تعتد اربعة اشهر وعشرا ثم تحل۔۔۔۔۔۔أن المفقود بالنسبة لاجل لامرأته مادامت نفقتها والا طلقت بعدم النفقة وقضی ﷺ فی الرجل لایجد ماینفق علی امرأته بان یفرق بینهما رواه الدار قطنی والبیهقی۔۔۔۔ وهذا بعد التلوم بنحو شهر او باجتهاده عند المالکیة۔۔۔۔وان کان لخوفها الزنا وتضررها بعدم الوطی والمنامع وجود النفقة والغنا فبعد صبر ماسنة فاکثر عند جل المالکیة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: افتخار احمد کلکتی

۲/۱/۱۴۳۰ھ — فتوی نمبر:۱۸۰۲

﴿فصل فی نفقة الزوجة والاولاد والآباء والامهات وسکناهم﴾

﴿مریض بیوی کا علاج کس کے ذمہ ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ بیوی اگر بیمار ہو جائے تو اس کا علاج شوہر کے ذمہ واجب ہے یا نہیں؟ مستفتی: سبحان الدین

﴿جواب﴾ میاں بیوی کا رشتہ اور تعلق ایسا نازک ہے کہ یہ ضابطہ سے نہیں رابطہ سے ہی قائم رہ سکتا ہے، چنانچہ شوہر پر اگر ضابطہ کے تحت بیوی کا علاج ضروری نہیں تو بیوی پر اس کی خدمت مثلاً کھانا تیار کرنا گھر کی صفائی کا انتظام کرنا اور بچوں کو کھلانا وغیرہ بھی ضروری نہیں ہے، اس لئے دونوں کو چاہیے کہ واجب حقوق کے علاوہ خوش اخلاقی اور ایثار کا مظاہرہ آپس میں کریں تاکہ یہ رشتہ مضبوط رہے اور دونوں خوشی اور الفت کی زندگی گزاریں۔

لمافی الهندیة:(۱/۵۴۹،طبع رشیدیه)

ولا یجب الدواء للمرض ولا أجرة الطبیب ولا الفصد ولا الحجامة کذا فی السراج الوهاج.

ولمافی الدر مع الرد:(۵/۲۸۵،طبع امدادیه) کما لا یلزمه مداواتها.

وفی الشامیة:أی اتیانه لها بدواء المرض ولا أجرة الطبیب ولا الفصد ولا الحجامة.

ولمافی الهندیة:(۱/۵۴۸،طبع رشیدیه)

وان قالت لا أطبخ ولا أخبز قال فی الکتاب لا تجبر علی الطبخ والخبز وعلی الزوج أن

یاتیها بطعام مهیا أو یاتیها بمن یکفیها عمل الطبخ والخبز قال الفقیه ابو اللیث رحمه الله ان امتنعت المرأة عن الطبخ والخبز انما یجب علی الزوج أن یاتیها بطعام مهیا

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۱۵ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتوی نمبر: ۱۳۴

﴿محتاج والدین کے نفقے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی کے چار بیٹے ہیں اور سب کی شادیاں کرا کر ہر ایک کو الگ مکان دیا ہوا ہے اور ہر ایک اپنا کام چلاتا ہے اور والد صاحب چونکہ عمر رسیدہ ہیں کوئی کام نہیں کر سکتے تو بیٹوں کو الگ کرتے وقت ہر ایک کے ذمے کچھ رقم مقرر کی تھی، اب بعض بیٹے اسمیں تساہل اور سستی سے کام لیتے ہیں تو اس سستی اور غفلت کی وجہ سے وہ بیٹے گناہ گار ہونگے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: بلال احمد صوابی

﴿جواب﴾ والدین اگر محتاج ہوں تو اولاد پر انکا نفقہ واجب ہے اور نہ دینے والا گنہگار ہوگا لیکن اگر والدین غنی ہوں تو اولاد کو انکے اخراجات پر مجبور نہیں کیا جائیگا، اولاد چاہے مالدار کیوں نہ ہو اور اولاد خود اگر محتاج ہے تو بھی والدین کا خرچہ اسکے ذمہ نہیں ہے اگرچہ والدین محتاج ہوں۔

لما فی التنویر مع الدر: (۶۲۳/۳، طبع ایچ ایم سعید)

(النفقة لاصوله الفقراء) ولو قادرین علی الکسب

وفی الشامیة: (قوله الفقراء) قیدبه لانه لاتجب نفقة الموسر الا الزوجة.

ولما فی الهندیة: (۵۶۴/۱، طبع رشیدیه)

قال ویجبر الولد الموسر علی نفقة الابوین المعسرین مسلمین کانا او ذمیین قدرا علی الکسب اولم یقدرا

ولما فی الهدایة: (۴۴۸/۲، طبع رحمانیه)

وعلی الرجل ان ینفق علی ابویه واجداده وجداته اذا کانوا فقراء وان خالفوه فی دینه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: احمد علی عفی عنہ

۱۶ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ — فتوی نمبر: ۲۵۲۶

﴿بچے کو دودھ پلانا دیانۃً ماں کے ذمہ واجب ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک دوست ہے اسکی

بیوی سرکاری ملازمت کرتی ہے اسکے شیر خوار بچے ہیں، بلا کسی شرعی عذر کے جبکہ ڈاکٹر نے بھی منع نہیں کیا ہے بلکہ صرف اس عذر پر کہ وہ ملازمت کرتی ہے اور بچے کو دودھ پلانے سے کمزوری واقع ہوگی، یا حسن میں بگاڑ پیدا ہوگا بچے کو دودھ نہیں پلاتی۔ آپ فرمائیں کہ از روئے شرع ایسی عورت کا کیا حکم ہے؟

مستفتی: سمیع اللہ صاحب

﴿جواب﴾ بچے کو دودھ پلانا دیانۃً ماں کی ذمہ واجب ہے، بغیر کسی صحیح عذر کے اس کیلئے انکار کرنا جائز نہیں ہے اور چونکہ اسکے اخراجات شوہر کے ذمہ ہیں اس لئے ملازمت کا عذر معقول نہیں، اسی طرح حسن میں بگاڑ کا عذر بھی صحیح نہیں۔ مذکورہ اعذار کیوجہ سے اپنے بچے کو دودھ نہ پلانا بچے کیساتھ بڑی زیادتی ہے۔

(سورۃ البقرہ پارہ ۲ ایت ۲۳۳) ﴿والوالدت یرضعن اولادھن حولین کاملین لمن اراد ان یتم الرضاعة وعلى المولودله رزقهن وكسوتهن بالمعروف لاتكف نفس الا وسعها ولا تضار والدة بولدها ولا مولودله بولده وعلى الوارث مثل ذلك ـ الخ

(صحیح البخاری ج۲/۸۱۶ کتاب النفقات رحمانیه) وقال یونس عن الزهری نهى الله ان تضار والدة بولدها وذلک ان تقول الوالدة لست مرضعته وهى امثل له غذاء واشفق عليه وارفق به من غيرها فليس لها ان تابى بعد ان يعطيها من نفسه ما جعل الله عليه وليس للمولوله ان يضار بولده والدته فيمنعها ان ترضعه ضرارا لها الى غيرها فلا جناح عليها ان يسترضعها عن طيب نفس الوالد والوالدة فان اراد افصالا فلا جناح عليها بعد ان يكون ذلک عن تراض منهما وتشاور فصاله فطامه ـ

(الدر المختار ج۳/۵۷۱ باب النفقة سعيد)

هى لغة ماينفقه الانسان على عياله وشرعا (هى الطعام والكسوة والسكنى) وعرفا هى الطعام (ونفقة الغير تجب على الغير باسباب ثلاثة: زوجية وقرابة وملک) ـ (فتجب للزوجة) بنكاح صحيح (على زوجها) لانها جزاء الاحتباس، وكل محبوس لمنفعة غيره كمفتى وقاض ووصى زيلعى ـ

(وايضا فيها: ۳/۵۹۹/سعيد)

ونفقات الزوجات المختلفة مختلفة بحالها (قوله ونفقات الزوجات ـ) ـ واذا كان للرجل نسوة بعضهن احرار مسلمات وبعضهن اماء ذميات فهن فى النفقة سواء ـ قال فى البحر وينبغى ان يكون هذا مفرعا على ظاهر الرواية من اعتبار حاله. واما على المفتى به فليس فى النفقة سواء لاختلاف حالهن يسارا وعسرا فليست نفقة الموسرة كنفقة المعسرة ولا نفقة الحرة كالامة كما لا يخفى ـ

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: صفی اللہ غفرلہ

۲۷ جمادی الاولی ۱۴۳۵ھ — فتوی نمبر: ۳۱۸۱

﴿والدنہ ہوں تو معذور بہن کا خرچہ بھائیوں کے ذمہ ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ معذور بہن کا نفقہ بھائی پر لازم ہے یا نہیں؟ جبکہ اس کے والدین بھی انتقال کر گئے ہوں اور چچا وغیرہ بھی نہ ہوں۔

﴿جواب﴾ جب تک والد زندہ ہوں تو یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے نابالغ اور معذور بچوں کے اخراجات خرچہ وغیرہ کا بندوبست کریں، اور والد کے انتقال کے بعد یہ ذمہ داری دیگر ورثاء پر بقدر الارث لازم ہوجاتی ہے، لہٰذا معذور بہن کا نفقہ اس کے بھائی پر لازم ہے اور بھائی ایک سے زیادہ ہو تو خرچہ سب کے ذمہ برابر واجب ہوگا۔

لما فی الهندیہ:(۱/۵۶۵،الفصل الخامس فی نفقة ذوی الارحام)

والنفقة لكل ذى رحم محرم اذا كان صغيراً او كانت امرأة بالغة فقيرة او كان ذكرا فقيراً زمنا او اعمى ،ويجب ذلک على قدر الميراث ويجبر عليه۔

ولما فی الهدایہ:(۲/۴۴۹،کتاب الطلاق طبع رحمانیہ)

والنفقة لكل ذى رحم محرم اذا كان صغيرا فقيرا او كانت امرأة بالغة فقيرة او كان ذكرا بالغا فقيرا زمنا او اعمى لان الصلة فى القرابة القريبة واجبة دون البعيدة والفاصل ان يكون ذا رحم محرم وقد قال الله تعالى وعلى الوارث مثل ذلک وفى قراة عبد الله بن مسعود وعلى الوارث ذى الرحم المحرم مثل ذلک ويجب ذلک على مقدار الميراث ويجبر عليه، لان التنصيص على الوارث تنبيه على المقدار ولان الغرم بالغنم والجبر لايفاء حق مستحق۔

ولما فی تنویر الابصار مع الدر:(۳/۶۲۷،۶۲۸،طبع سعید)

وتجب ايضا (لكل ذى رحم محرم صغير او انثى)مطلقا ولو كانت الانثى بالغة صحيحة او كان الذكر بالغا لكن عاجزا عن الكسب بنحو زمانة كعمى وعته وفلج مزاد فى الملتقى والمختار :اولا يحسن الكسب لحرفة_بقدر الارث لقوله تعالى وعلى الوارث مثل ذلک ولذا يجبر عليه _وفى الشامية (قوله بقدر الارث) اى تجب نفقة المحرم الفقير على من يرثونه اذا مات بقدر ارثهم منه

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ والله اعلم بالصواب: محمد تنویر عفا اللہ عنہ

۷ جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ فتویٰ نمبر: ۳۷۵۵

﴿ڈلیوری کیس (ولادت) کا خرچہ شوہر کے ذمہ ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل ڈلیوری کیس (ولادت) پر خرچہ بہت زیادہ ہوتا ہے تو کیا ڈلیوری کیس (ولادت) کا خرچہ شوہر کے ذمہ لازم

ہے یا بیوی خود اسکا انتظام کرے؟

﴿جواب﴾ ڈلیوری کیس (ولادت) کا خرچہ شوہر کے ذمہ لازم ہے۔

لما فی البحر الرائق:(۲/۲۰۱،طبع ایچ ایم سعید)

وان الاب ینفرد بتحمل نفقة الولد ولا یشارکه فیها احد وان الولد اذا کان غنیا والاب محتاجا لم یشارک الولد احد فی نفقة الوالد ذکره المصنف فی شرح المنار قید بالطفل وهو الصبی حین یسقط من البطن الی ان یحتلم.

ولما فی التاتارخانیه:(۲/۱٦۷،طبع قدیمی)

وفی "المنافع" ونفقة الصغیر واجبة علی ابیه وان خالفه فی دینه.

ولما فی التنویر مع الدر:(۳/٦۱۲،طبع سعید)(وتجب)النفقة بانواعها علی الحر(لطفله)

وفی الشامیة:هوالولد حین یسقط من بطن امه الی ان یحتلم.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: بلال احمد

۲۵ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر:۷۰۱

﴿محتاج والدین کا نان ونفقہ اولاد پر لازم ہے﴾

﴿سوال﴾ میں ایک بوڑھی بیوہ اور تنگدست عورت ہوں اور میرے تین بیٹے کمانے والے ہیں، دو شادی شدہ ہیں اور ایک بیٹے کی ابھی شادی نہیں ہوئی، ان تین بیٹوں میں سے کوئی بھی میرا خرچہ برداشت نہیں کرتا اگر خرچہ کا مطالبہ کروں تو کہتے ہیں کہ ہمارے ذمہ نہیں، پوچھنا یہ ہے کیا میرا نان ونفقہ میرے بیٹوں کے ذمے ہے یا نہیں؟ — مستفتیہ:ام یحییٰ کورنگی

﴿جواب﴾ ماں باپ جب محتاج ہوں اور ان کا ذریعہ آمدن کچھ نہ ہو یا ہو لیکن کافی نہ ہو تو ان کا نان ونفقہ اولاد پر لازم ہے اگر اولاد بدبخت ہو،بخوشی خرچہ نہ دے تو کسی بھی انکل سے یا عدالت کے تعاون سے خرچہ وصول کرنے کا حق والدین کو حاصل ہے۔

لما فی المظهری:(۷/۲۵٦،طبع رشیدیه)

وصاحبهما فی الدنیا معروفا(سورة لقمان)(مسئلة)یجب بهذه الآیة الانفاق علی الابوین المفتقرین وصلتهما وان کانا کافرین الخ.

ولما فی الهدایة:(۲/۴۲۸،طبع رحمانیه)

وعلی الرجل ان ینفق علی ابویه واجداده وجداته اذا کانوا فقراء وان خالفوه فی دینه.

ولما فی البحر الرائق:(۴/۲۰۵،طبع سعید)

(قوله ولابویه واجداده وجداته لو فقراء)ای تجب النفقة لهؤلاء اما الابوان فلقوله تعالی

"وصاحبهما فی الدنیا معروفا" انزلت فی الابوین الکافرین ولیس من المعروف ان الابن یعیش فی نعم اللہ تعالی ویترکھما جوعا.

ولما فی التنویر مع الدر:(۲/۶۲۱-۶۲۲، سعید)(و) تجب (علی موسر...... النفقة لاصوله الفقرآء)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد حسین

۱۱ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۹۸۴

﴿تین طلاق اور بچوں کے نان نفقے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ عرض یہ ہے کہ ایک شخص نے آج سے ساڑھے تین سال پہلے اپنی بیوی کو غصے کی حالت میں دو طلاقیں دیں، گھر میں صلح صفائی دونوں کی کرادی گئی وہ دونوں پھر سے گھر میں میاں بیوی کی حیثیت سے رہنے لگے پھر ساڑھے تین سال بعد اس شخص نے اپنی بیوی کو ایک اور طلاق دی، صرف ایک بار کہا، آیا بیوی کو طلاق ہوگئی یا نہیں؟ عدت کس طرح گزارے؟ چھ بچے ہیں: بڑا 16 سال کا، سب سے چھوٹا ساڑھے 4 سال کا، بیوی چاہتی ہے کہ عدت کس طرح گزارے؟ اگر وہ عدت نہ گزارے تو کوئی اور صورت نکلتی ہو تو بتائیں، بچوں کا کیا ہوگا؟! شوہر بچے نہیں رکھنا چاہتا، بیوی بچوں کو کیسے رکھے؟ ان کا خرچہ وغیرہ شوہر اٹھانا نہیں چاہتا، اب آپ قرآن وسنت کی روشنی میں کچھ بتائیں۔ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں تین/۳ طلاقیں پڑ چکی ہیں، اس لئے مطلقہ خاتون خاوند پر ہمیشہ کے لئے حرام ہوگئی جب تک کہ حلالہ شرعیہ کے بعد دوبارہ نکاح نہ کرلے، عدت پوری کرکے دوسری جگہ چاہے تو شادی کرسکتی ہے۔

لما فی قوله تعالی:(سورۃ البقرۃ، ایت ۲۳۰)

فان طلقها فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجا غیره...... الأیة.

مطلقہ عورت وہیں عدت گزارے گی جہاں اس کو طلاق ہوئی ہے، بچوں کی پرورش کا حق ان کی ماں کو ہی حاصل ہے جب تک کہ بچے سات سال کے اور بچیاں بالغ نہ ہوجائیں، تاہم بچوں کا نان نفقہ باپ کے ذمہ ہی ہے، نہ دے تو عدالت کے ذریعے وصول کرسکتی ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۵/۲۲۳ تا ۲۲۹، طبع امدادیه)

(ولا تخرج معتدة رجعی وبائن) ای فرقة... (مکلفة من بیتها اصلاً...... وتعتدان...... فی بیت وجبت فیه...... الا ان تخرج...... وتنتقل المعتدة...... أو تضررت بالمکث فی المکان)

ولما فیه ایضا:(۳۲۶/۵ فی باب النفقة،طبع امدادیه)

(وتجب)النفقه بانواعها على الحر (لطفله .....الفقير)

وفى الشامية:قوله:(لطفله)هو الولدحين يسقط من بطن امه الى ان يحتلم..... قوله:(الفقير)اى ان لم يبلغ حدالكسب،فان بلغه كان للأب ان يؤجره اويدفعه فى حرفة ليكتسب الخ.

ولما فيه ايضا:(ص ۲۵۲ فى باب الحضانة،طبع امداديه)

تربية الولد(تثبت للأم ولوبعدالفرقةالاان تكون مرتدة)

ولما فى التنويرمع الدر:(۲۶۷/۵-۲۶۸،باب الحضانة،طبع امداديه)

(والحاضنة احق به)اى بالغلام حتى يستغنى عن النساء وقدربسبع وبه يفتى.....(والام والجده احق بها)بالصغيرة(حتى تحيض)اى تبلغ فى ظاهرالرواية.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم:محمد شریف حسین

۹رجب ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر:۵۱۶

﴿بیوی کیلئے نان ونفقہ کے علاوہ شوہر کی تنخواہ پر کوئی حق حاصل نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں حضرات علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ شوہر کی تنخواہ پر بیوی کا حق مقدم ہے یا کہ والدین کا؟ نیز اگر کوئی شخص نان ونفقہ اپنی بیوی کو مکمل پابندی کے ساتھ دیتا رہتا ہے لیکن تنخواہ اپنے غریب والدین کو دیتا ہے تو کیا ایسی صورت میں بیوی شوہر سے نان ونفقہ کے علاوہ تنخواہ کا مطالبہ کرسکتی کہ نہیں؟ براہ کرم شرعی حکم سے مطلع فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

﴿جواب﴾ تنخواہ خاوند کی ذاتی ملکیت ہے جس میں اسکو ہر طرح تصرف کرنے کا مکمل اختیار حاصل ہے تاہم شوہر پر بیوی کا نان ونفقہ واجب ہے خواہ بیوی مالدار ہو یا غریب،اس کے علاوہ بیوی کو شوہر کے مال میں ایسا کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ شوہر کو والدین وغیرہ پر خرچ کرنے سے منع کرے۔اور والدین اگر فقیر وتنگدست ہوں تو ان کا نان ونفقہ بھی اپنے بیٹے کے ذمہ واجب ہے۔

لمافى المشكوة:ج۲،۲۲۱/۲(طبع سعيد)

عن ابى امامة ان رجلاقال يارسول الله ماحق الوالدين على ولدهماقال هماجنتك ونارك.

ولمافى الدرمع الرد:۲/(طبع سعيد)

(لأن طاعتهمافرض عين)—وفيه لايحل سفر فيه خطر الاباذنهماوماغير هؤلاء كاالزوجة والأولادوالأخوات والأعمام فانه يخرج بلااذنهم الااذاكانت نفقتهم واجبة عليه وخاف عليهم الضيعة.

ولمافي التنوير :ج/۵۷۲(طبع سعيد)

(ونفقة الغير تجب على الغير باسباب ثلاثة :زوجية وقرابة وملك ، فتجب للزوجة بنكاح صحيح.

ولمافي الهندية:ج ۱/۵۶۵(طبع سعيد)

الأب اذاكان فقيرامعسراوله أولادصغار محاويج وابن كبير موسر يجبر الابن على نفقة ابيه ونفقة اولاده الصغار.

ولمافي شرح المجلة: ج ۱۳۱/۴(طبع رشيديه)وكل يتصرف في ملكه كيف يشاء.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: فضل حق زیزاروی

۱۵ جمادی الاولی ۱۴۳۵ھ فتوی نمبر: ۱۴۴۷

﴿بیوی کے لئے الگ مکان کی تحدید﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے بیٹے حافظ محمد رضوان کی شادی محمد نعیم کی بیٹی انعم سے ہوئی اور اسی ماہ انعم امید سے ہوگئی، پہلے ماہ ہی سے وہ اپنے شوہر سے الگ گھر کی ضد کرنے لگی اور شادی کے دو ماہ بعد اپنے میکے جا کر بیٹھ گئی، شوہر کے بار بار رابطہ کرنے پر اسکے گھر والوں نے کہا کہ یا تو الگ گھر لیکر دو یا طلاق دے دو، ہماری بار بار کوشش کے باوجود وہ لوگ نہیں مانے اور ہم پر طرح طرح کے الزامات لگا دیئے، میں نے وقت کو آگے بڑھانے کے لئے کہہ دیا کہ جب تک اولاد نہیں ہوتی ہم کوئی فیصلہ نہیں کریں گے یہ سوچ کر کہ شاید بچے کی پیدائش کے بعد انکا دل پھر جائے اور لڑکی واپس اپنے گھر آجائے۔

ہم اسکو اپنی بلڈنگ میں گراؤنڈ فلور جو کے تین کمروں پر مشتمل ہے میں منتقل کرنے پر راضی ہو گئے مگر وہ لوگ نہیں مانے، بالآخر ایک دن ہمیں اطلاع دی کہ اگر آپ کو بچے کے کان میں اذان دینی ہے تو ہسپتال آجائیں، ہم سب گھر والے ہسپتال گئے اور میں نے بچے کے کان میں اذان دی، اسکے بعد انعم کے والد مجھے ایک طرف لے گئے اور کہا کہ ہماری بیٹی آپکے گھر نہیں جانا چاہتی اور آپ اس مسئلہ کو ختم کر دیں اور بچے کا جو بھی فیصلہ کرنا ہے کر لیں، میں تو اسی وقت یہ بچہ لپیٹ کر آپ کو دے دیتا لیکن ہسپتال والے نہیں مانیں گے، میں نے ڈاکٹر سے دودھ کا ڈبہ لکھوالیا ہے، میں بچے کو ماں کا دودھ نہیں پلواؤں گا اور گھر میں بچے کو ماں کے ساتھ بھی نہیں رکھوں گا، آپ چار پانچ دن میں اسکا فیصلہ کر لیں، رضوان اب بھی گھر بسانا چاہتا ہے اور ماں بیٹے کو گھر لانا

چاہتا ہے، برائے مہربانی شریعت کی روشنی میں ہمارے لئے کیا حکم ہے؟ مستفتی: محمد شاہد

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ شوہر پر بیوی کیلئے علیحدہ مکان کا انتظام کرنا شرعاً لازم ہے، یہ اسکا حق ہے جسکا وہ مطالبہ کرسکتی ہے لیکن اسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ مستقل الگ گھر دینا ضروری ہے، چنانچہ بڑے گھر میں ایک الگ کمرہ جسکے ساتھ باورچی خانہ اور باتھ روم بھی ہو اور سامان وغیرہ اس میں وہ بحفاظت رکھ سکتی ہو اور دیگر شرعی فطری تقاضے اطمینان سے اس میں پورے کرسکتی ہو تو یہ کافی ہے، اس سے زیادہ کا وہ مطالبہ نہیں کرسکتی، لہٰذا اگر آپ اپنی بلڈنگ میں گراؤنڈ فلور دے رہے ہیں تو شرعاً یہ کافی ہے، اس سے زیادہ کا مطالبہ کرنا اسکے لئے جائز نہیں۔

لما فی قوله تعالیٰ: (سورۃ الطلاق آیت ٦) اسکنوهن من حیث سکنتم من وجدکم ...... الآیة.

ولما فی الهدایة: (ص ٤١٧-١٨ مطبع رحمانیه)

وعلی الزوج ان یسکنها فی دار مفردة لیس فیها احد من اهله ــ ولو اسکنها فی بیت من الدار مفردة وله غلق کفاها.

اسکے علاوہ کسی وجہ سے میاں بیوی کی ناراضگی اس حد تک پہنچ چکی ہو کہ بڑوں کی نصیحت سے بھی معاملہ ٹھیک ہوتا نظر نہ آ رہا ہو، لڑکی طلاق کا مطالبہ کرتی ہو اور شوہر بھی تفریق پر آمادہ ہو تو صرف ایک طلاق دیدے تاکہ تین ماہواری تک رجوع کا موقع مل سکے پھر اس دوران اگر میاں بیوی کا ذہن صاف ہو جائے اور شوہر چاہے تو رجوع کرسکتا ہے اور اگر شوہر رجوع نہیں کرنا چاہتے تو عدت گزار کر بیوی دوسری جگہ شادی کرسکے گی، مزید طلاق کی ضرورت نہیں۔

لیکن یاد رہے کہ طلاق کی صورت میں پورا حق مہر بیوی کو دینا ضروری ہوگا اور اگر دیا ہے تو واپسی کا مطالبہ شوہر نہیں کرسکتا، البتہ خلع کی صورت میں حق مہر شوہر واپس لے سکتا ہے اور خلع کی صورت میں مزید طلاق دینے کی ضرورت نہیں رہتی، صرف خلع پر دونوں رضامندی ظاہر کردیں تو یہ طلاق بائن شمار ہوگی، شوہر رجوع نہیں کرسکے گا، البتہ باہمی رضامندی سے عدت کے اندر اور عدت کے بعد بھی نئے حق مہر کے ساتھ نکاح ہوسکے گا۔

لما فی قوله تعالیٰ: (سورۃ البقرة آیت ٢٢٩)

الطلاق مرتٰن فامساك بمعروف او تسریح باحسان ولا یحل لکم ان تاخذوا مما اٰتیتموهن شیئا الا ان یخافا الا یقیما حدود الله فان خفتم الا یقیما حدود الله فلا جناح علیهما فیما افتدت به ــ الآیة.

ولما فی الھدایۃ:(۲/۲۱۳،طبع رحمانیہ)

واذاتشاقاالزوجان وخافاان لایقیماحدوداللہ فلاباس بان تفتدی نفسھامنہ بمال فاذافعل ذلک وقع بالخلع تطلیقۃ بائنۃ ولزمھاالمال.

تفریق کی صورت میں بچے کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہے، وہ دوسری جگہ شادی نہ کرے تو سات سال کی عمر تک بچے کو اپنے پاس رکھ سکتی ہے اور بچے کا خرچہ والد کے ذمے ہوتا ہے لیکن وہ دودھ نہیں پلا رہی اور بچہ اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتی تو یہ بچے کے ساتھ زیادتی ہے، ایسی صورت میں والد خود بچے کی پرورش کا انتظام کرلے۔

لما فی قولہ تعالیٰ:(البقرۃ آیت ۲۳۳)والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین----الآیۃ.

ولما فی البحر:(۴/۱۶۷،طبع سعید)

(قولہ احق بالولدامہ قبل الفرقۃ وبعدھا)ای فی التربیۃ والامساک.

ولما فی للھدایۃ:(اولین ص ۴۱۱،طبع رحمانیہ)

واذا وقعت الفرقۃ بین الزوجین فالام احق بالولد والنفقۃ علیٰ الاب ولا تجبر الام علیہ.

ولما فی البحرایضا:(۴/۲۰۲،طبع سعید)

(وقولہ لاتجبرامہ لترضع)لانہ کالنفقۃوھی علیٰ الاب وعسیٰ ان لاتقدرفلاتجبرعلیہ قضاء وتؤمربہ دیانۃ لانہ من باب الاستخدام وھوواجب دیانۃ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:فیاض احمد

۲۳ جمادی الاول ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر:۲۱۷۸

﴿بیوی کے لئے الگ مکان دلوانا اس کا حق ہے﴾

﴿سوال﴾ میری چھ بہنیں ہیں، میں سب سے بڑا ہوں، بھائی کوئی نہیں، تین بہنوں کی شادی ہوگئی ہے، تین غیر شادی شدہ ہیں، میری اپنے والد اور بہنوں سے کبھی نہیں بنی یہاں تک کہ میری بہنیں مجھے مارتی بھی تھیں، تنگ آکر میں نے اپنی ماں کے مشورے سے اپنی شادی کی، شادی سے پہلے ہی اپنا گھر کرائے پر لے لیا، کبھی میری ماں بھی میرے ساتھ رہنے آجاتی ہیں۔

اب میں چاہتا ہوں بیوی کو لیکر باپ کے گھر رہنے جاؤں مگر میری بیوی راضی نہیں ہے، میری بیوی کہتی ہے کہ تمہارے امی ابو کے ساتھ رہ لوں گی مگر تمہاری بہنوں کے ساتھ نہیں رہوں گی، میری بہنیں سروس کرتی ہیں اور ان کی زبان بہت خراب ہے مجھے بتائیں کہ میں کیا کروں؟

مستفتی علی احمد

جبکہ میری بیوی میرے اور میرے ماں باپ کے ساتھ بہت اچھی ہے؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں بہنوں کی شادیاں باآسانی جلدی سے ہوسکتی ہیں تو بہت اچھا، شادی کے بعد اپنی بیوی کو اپنے والدین کے گھر لے جا کر رہائش اختیار کرلیں اور اگر بہنوں کی شادیوں میں دیر ہے اور بیوی اصرار کررہی ہے الگ مکان میں رہنے کا، بہنوں کے ہوتے ہوئے والدین کے ساتھ رہنا آپ کی بیوی کے لئے مشکل ہورہا ہے تو بیوی کو الگ مکان دلوانا شرعاً اس کا حق ہے۔

لما فی تنویر الابصار:(۲/۵۹۹-۶۰۰،طبع سعید)

(وكذاتجب لها السكنى في بيت خال عن اهله)

وفي الشامية:(قوله خال عن اهله الخ)لانها تتضرر بمشاركة غيرها فيه،لانها لاتأمن على متاعها ويمنعها ذلك من المعاشرة مع زوجها ومن الاستمتاع الأن تختار ذلك، لانها رضيت بانتقاص حقها.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم:صلاح الدین ڈیروی

۱۴۲۷ھ فتوی نمبر:

﴿بیوی کے نان ونفقہ کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ ایک آدمی کا نکاح ہوا کچھ عرصہ میاں بیوی ایک ساتھ رہے پھر عورت اپنے والدین کے گھر گئی اور چند دن وہاں رہی پھر شوہر نے اسکو کبھی نہیں بلایا، زوجہ اور اسکے والدین کے تقاضا کے باوجود شوہر اسکو لینے نہیں آیا اور نہ اس کو اپنے گھر آنے کی اجازت دی، اب اسکے والدین یہ چاہتے ہیں کہ یہ اپنی زوجہ کو اپنے پاس بلالے یا یہیں رہتے ہوئے اسکا نان نفقہ دے مگر شوہر کسی امر پر بھی راضی نہیں ہوتا، کیا اس صورت میں عورت نفقہ کا مطالبہ کرسکتی ہے؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں شوہر کے ذمہ عورت کا نفقہ لازم ہے کیونکہ عورت کی طرف سے کوئی نافرمانی نہیں پائی گئی، لہٰذا عورت بذریعہ دعویٰ وغیرہ اپنا نفقہ لے سکتی ہے اور بصورت دیگر عدالت کے ذریعہ خلع بھی لے سکتی ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۲/۵۷۲تا۵۷۵،طبع سعید)

(فتجب للزوجة على زوجها ـــــــــ ولو هي في بيت أبيها)اذالم يطالبها الزوج

بالنقلة به يفتى، وكذا اذا طالبها ولم تمتنع الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفااللہ عنہ

۲۷ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتوی نمبر: ۴۷۴

﴿بیوی کی رہائش اور نان ونفقے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ میرے سسر صاحب میری اہلیہ کو اپنے گھر لے گئے، کافی عرصہ گزر چکا ہے لیکن وہ انھیں دوبارہ ہمارے گھر نہیں بھیج رہے ہیں، صورتِ حال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی صاحبزادی کے واسطے الگ رہائش کا مطالبہ کر رہے ہیں، نیز چند روز قبل میرے سسر صاحب نے یہ پیغام بھی بھیجا تھا کہ میں اس دورانیے کا خرچہ بھی تم سے وصول کروں گا جس دوران تمہاری اہلیہ ہمارے گھر رہ چکی ہیں، براہ کرم شرع شریف کی روشنی میں ارشاد فرمائیں کہ کیا بیوی کیلئے الگ رہائش کا انتظام کرنا شوہر پر ضروری ہے؟ نیز یہ بھی وضاحت ہو کہ اس دورانیے کا نفقہ بھی میرے اوپر لازم ہے؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ بیوی اگر شوہر کے اہلِ خانہ کے ساتھ رہنے پر راضی نہ ہو تو شوہر پر بیوی کیلئے الگ گھر مہیا کرنا لازم ہے، ایسی صورت میں دیکھیں گے اگر بیوی کا تعلق مالدار گھرانے سے ہو تو اسکے لئے باقاعدہ الگ گھر کا انتظام کرے اور اگر بیوی کا تعلق امیر گھرانے سے نہ ہو تو شوہر کے ذمہ بیوی کیلئے الگ گھر میسر کرنا ضروری نہیں، البتہ یہ ضروری ہے کہ اسی گھر کے اندر بیوی کیلئے کم از کم ایک ایسا کمرہ مہیا کرے جس کا کنٹرول مکمل طور پر بیوی کے ہاتھ میں ہو۔

رہا نفقے کا مسئلہ سو اگر بیوی شوہر کی اجازت کے بغیر بلا کسی عذرِ شرعی کے میکے چلی جائے تو وہ ناشزہ (نافرمان) قرار پائے گی، اس کا نفقہ خاوند پر لازم نہیں ہوگا جبتک کہ وہ نافرمانی چھوڑ کر شوہر کی اطاعت نہ کرلے، لہٰذا مذکورہ دورانیے میں آپکی اہلیہ کا نفقہ بھی آپ پر لازم نہیں ہے۔

لما في فتح القدير: (۱۹۲/۴، طبع رشیدیه)

(وان نشزت فلا نفقة لها حتى تعود الى منزله) لان فوت الاحتباس منها فاذا عادت جاء الاحتباس فتجب النفقة. قال الله تعالى: اسكنوهن من حيث سكنتم من وجدكم (سورة الطلاق).

ولما في الشامي: (۳۲۲/۵، طبع امدادیه)

والحاصل ان المشهور وهو المتبادر من اطلاق المتون انه يكفيها بيت له غلق من

دار ... وذٰلک یختلف باختلاف الناس، فلی الشریفة ذات الخدم لابد من الراد ها فی دار ومتوسط الحال بکلیها بیت واحد من دار ..... وهذا التفصیل هو الموافق لما مر من ان المسکن یعتبر بقدر حالهما ... اذ لا شکّ ان المعروف ان یختلف باختلاف الزمان والمکان، فعلی المفتی ان ینظر الی حال اهل زمانه وبلده، اذ بدون ذٰلک لا تحصل المعاشرة بالمعروف.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم: محمد شریف حسین چترالی

۱۵ جمادی الاولی ۱۴۲۷ھ | فتویٰ نمبر: ۳۲۲

﴿عدت طلاق میں عورت کے نان نفقہ کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام کہ طلاق ہو جانے کے بعد عورت کے کھانے پینے اور کپڑے وغیرہ کا انتظام کس کے ذمے ہوتا ہے شوہر پر یا عورت کے دیگر اولیاء پر؟

﴿جواب﴾ عورت کو طلاق ہو جانے کے بعد اسکے کھانے، پینے اور کپڑے وغیرہ کا انتظام اس کے شوہر پر لازم ہوتا ہے جب تک کہ اسکی عدت ختم نہ ہو جائے اور جب اس کی عدت گزر جائے تو شوہر پر مذکورہ چیزیں لازم نہیں ہوں گی۔

لما فی الدر المختار: (۵/۳۳۲ طبع امدادیہ)

(و) تجب (لمطلقة الرجعی والبائن والفرقة بلا معصیة کخیار عتق وبلوغ وتفریق بعدم کفاءة النفقة والسکنیٰ والکسوة) ان طالت المدة.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم: محمد شریف حسین چترالی

۴ جمادی الاولی ۱۴۲۷ھ | فتویٰ نمبر: ۴۳۷

﴿متوفیٰ عنہا زوجہا کے نفقہ کا شرعی حکم﴾

﴿سوال﴾ فاطمہ کے شوہر زید کا انتقال ہو گیا، اب عدت کے دوران فاطمہ کا نان ونفقہ کس کے ذمہ ہے؟ بینوا توجروا۔

مستفتی: عبد الرحیم صاحب

﴿جواب﴾ جب تک شوہر حیات ہو تو بیوی کے اخراجات شوہر ہی کے ذمہ ہوتے ہیں لیکن جب شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے تو باہمی تعلق منقطع ہونے کی وجہ سے شوہر سے یہ ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے، اب یہ عورت شوہر کے ورثاء سے بھی نان ونفقہ کا مطالبہ نہیں کر سکتی، اس عورت کو اپنے اخراجات خود برداشت کرنے ہوں گے، البتہ جہاں کہیں عورت اپنے اخراجات خود برداشت

کرنے سے عاجز ہو تو اس صورت میں عورت کے ذی رحم محرم (رشتہ داروں) پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس عورت کے نان ونفقہ کا خیال رکھیں۔

لما فی الهندية: (۵/۲۲۳، طبع رشيديه)

ولا نفقة للمتوفى عنها زوجها لأن احتباسها ليس لحق الزوج بل لحق الشرع فان التربص عبادة منها الاترى ان معنى التعرف عن براءة الرحم ليس بمراعى فيه حتى لاتشترط بعدم كفاءة النفقة والسكنى والكسوة ان طالت المدة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم: محمد شریف حسین چترالی

۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر:

﴿زوجہ کی تجہیز وتکفین کا خرچہ شوہر پر ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ کیا زوجہ کی وفات پر کفن دفن کا خرچہ شوہر پر واجب ہے؟ کیا زوجہ کے وفات پانے پر میاں بیوی کا تعلق ختم نہیں ہوا؟

﴿جواب﴾ زوجہ کی تجہیز وتکفین کی ذمہ داری شرعاً شوہر پر واجب ہے بشرطیکہ تجہیز وتکفین سنت طریقے پر ہو، سنت طریقے سے ہٹ کر جو اسراف اور تعدی کی جاتی ہے وہ شوہر کے ذمہ شرعاً واجب نہیں۔

لما فی التنوير مع الدر: (۲/۱۰۱ طبع امداديه)

(واختلف في الزوج، والفتوى على وجوب كفنها عليه) عندالثانی (وان تركت مالاً) خانية. ورجحه في البحر بأنه الظاهر لانه ككسوتها.

وفي الشامية: اعلم أنه اختلفت العبارات في تحرير قول أبي يوسف: ففي الخانية والخلاصة والظهيرية: أنه يلزمه كفنها وان تركت مالاً وعليه الفتوى وفي المحيط والتجنيس والواقعات وشرح المجمع لمصنفه: اذا لم يكن لها مال فكفنها على الزوج وعليه الفتوى.

ولما في البحر: (۲/۲۰۰ طبع سعيد)

فلاتجب نفقتها عليه ولأن النفقة شيئاً فشيئاً ولا ملك له بعد الموت فلايمكن ايجابها في ملك الورثة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر:

﴿عورت شوہر کی اجازت کے بغیر میکے چلی جائے تو اس کے نفقے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت اپنے

شوہر کے گھر سے بغیر اس کی اجازت کے اپنے میکے چلی گئی، شوہر کے گھر میں رہتے ہوئے اس عورت اور اس کے ساس سسر اور اس کے شوہر کے درمیان کئی مرتبہ جھگڑا ہوا۔

علاقے کے معزز حضرات اس عورت کو قصوروار ٹھہراتے ہیں اور یہ عورت کئی بار بغیر شوہر کی اجازت کے میکے جا چکی ہے، آخری بار جانے کے بعد واپس آنے کو تیار نہیں اور اپنے شوہر سے نان نفقہ کا مطالبہ کر رہی ہے، کیا اس کا مطالبہ درست ہے؟ کیا اس صورت میں شوہر کے ذمہ نان نفقہ واجب ہے؟ اور اگر شوہر بغیر مطالبہ نفقہ کے خود اپنی مرضی سے بیوی کے لئے نفقہ بھیج دے تو اس کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ بیوی کا نان نفقہ شوہر پر تب لازم ہے کہ اگر وہ اپنے شوہر کے گھر رہتے ہوئے حقوق زوجیت ادا کر رہی ہو، شوہر کی اجازت کے بغیر بیوی اگر میکے چلی گئی ہے تو شوہر کے ذمہ اس کا نفقہ واجب نہیں جب تک وہ واپس نہ آئے اور اس کو مطالبہ کا بھی حق حاصل نہیں، البتہ اگر شوہر بیوی کی زیادتی کے باوجود نفقہ اس کے گھر پر بھیج رہا ہے تو یہ اس کا احسان اور تبرع ہے۔

لمافی الهندية:(۱/۵۴۵)وان نشزت فلا نفقة لها حتى تعود الى منزله.

ولمافی التنويرمع الدر:(۳/۵۷۵-۵۷۶،طبع سعيد)

(لا)نفقة لاحدعشر:ـــو(خارجة من بيته بغيرحق)وهى الناشزة حتى تعود.]

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۱۹ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ | فتویٰ نمبر: ۵۲

﴿شوہر کا مال اس کی اجازت کے بغیر کسی پر خرچ کرنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان شرع دین متین مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنے بیوی کو تین طلاقیں دیکر فارغ کر دیا عورت نے عدت گزارنے کے بعد دوسرے مالدار آدمی سے عقد نکاح کر لیا، جبکہ اس عورت کے سابقہ شوہر سے تین نابالغ اور ایک بالغ بیٹا بھی ہے وہ عورت اپنے موجودہ شوہر کی اجازت کے بغیر اس کا مال اپنے بیٹوں کو نان ونفقہ کی صورت میں دیتی ہے جبکہ ان بچوں کو پتہ بھی ہے کہ ہماری والدہ اپنے موجودہ شوہر کا مال اس کی اجازت کے بغیر بطور نان ونفقہ ہمیں دیتی ہے۔ اب پوچھنا یہ ہیکہ آیا ان اولاد کا خرچہ والد کے ذمہ لازم یا ان کے والدہ کے، نیز یہ بھی بتائیں کہ عورت نے اپنے موجودہ شوہر کا جو مال اس

کی اجازت کے بغیر اپنے سابقہ شوہر کے بیٹوں کو نان ونفقہ کی صورت میں دیا ہے وہ مال ان بچوں کیلئے ازروئے شرع حلال ہے کہ نہیں؟ اور کیا عورت کو اس بات کا اختیار حاصل ہے۔ وہ اپنے موجودہ شوہر کا مال اس کی اجازت کے بغیر اپنے سابقہ شوہر کی اولاد پر خرچ کرے؟ براہ کرم شریعت مطہرہ کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر ممنون ومشکور فرمائیں۔ مستفتی: عبید اللہ شانگلہ

﴿جواب﴾ نابالغ اولاد کا نان ونفقہ والد کے ذمہ ہوتا ہے نہ کہ والدہ کے ذمہ، والد اپنے نابالغ اولاد کا خرچہ اگر برداشت نہیں کرتا تو یہ ان بچوں کے ساتھ ظلم ہے برادری کے لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنے عزیز کو سمجھائیں تاکہ وہ اپنے معصوم بچوں کے خرچ کا انتظام بلوغت تک کرتا رہے اگر سمجھانے کے باوجود بھی وہ شخص اپنے معصوم بچوں کو خرچہ دینے سے انکار کرے تو پھر شریعت مطہرہ کی رو سے اس کو قید کیا جائیگا، البتہ جب لڑکے بالغ ہو جائیں تو ان کو چاہیے کہ خود محنت مزدوری کر کے اپنے لئے خرچ کا انتظام کریں والد یا والدہ کیلئے بوجھ نہ بنیں، اور اس عورت کیلئے شریعت مطہرہ کا حکم یہ ہے کہ اپنے موجودہ شوہر کے مال میں خیانت ہرگز نہ کرے سابقہ شوہر کے بچوں کا بوجھ اپنے موجودہ شوہر پر نہ ڈالے بچے اگر بالغ ہوں اور ان کو معلوم بھی ہو کہ ہماری والدہ اپنے موجودہ شوہر کی اجازت کے بغیر ان کے مال سے ہم پر خرچہ کر رہی ہے تو ان بچوں کیلئے بلاشبہ یہ مال چوری کا ہے گناہ میں والدہ کے ساتھ بچے بھی شریک ہیں۔ البتہ اس عورت کیلئے شوہر نے ایک خاص مقدار پہلے سے مقرر کر لی ہو یا ابھی مقرر کر لی کہ وہ اپنی بیوی کو بطور نفقہ اتنی رقم دیتا رہیگا پھر عورت اسی خرچہ میں سے بچا کر اپنے بچوں پر خرچ کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے یا شوہر نے اپنے بیوی کو اجازت دیدی کہ اپنے سابقہ شوہر کے بچوں پر بھی خرچ کرتی رہے تو اس میں بھی عورت پر کوئی گناہ نہیں ہے، اور اب تک ایسی کوئی غلطی اگر عورت سے ہوئی ہے تو اس کا حل یہ ہے کہ کسی طرح اتنا مال شوہر کو واپس کر دیا جائے جرم کا اظہار موجودہ شوہر کے سامنے بیشک نہ کرے کہ مجھ سے ایسی غلطی ہوئی ہے کسی بھی بہانہ سے وہ مال شوہر کو واپس کر دیا جائے یا ان کے غیر موجودگی میں ان کے مال میں شامل کر دیا جائے۔

لما فی الهدایه: ۲/۴۴۷ (طبع رحمانیة)

ونفقة اولاد الصغار علی الأب لا یشارکه فیها أحد کما لا یشارکه فی نفقة الزوجة لقوله تعالی وعلی المولود له رزقهن والمولود له هو الأب

ولما فی قاضی خان: ۲۸۶/۱(طبع قدیمی)

نفقة أولاد الصغار والاناث المعسرات على الأب لايشاركه في ذلك أحد ولاتسقط بفقره ولايجب عليه نفقة الذكور الكبار الأأن يكون الولد عاجزا عن الكسب لزمانة أو مرض وكذا لو فرض القاضى على لأب نفقة الولد فتركه لأ ب لانفقة فاستدانت لأم وأنفقت بأمر القاضى كان لها أن ترجع بذلك على لأب ويحبس الأب بنفقة الولد وان كان لايحبس بسائر ديونه

ولما فی الهندية: ۵۸۲/۱، ۵۸۳(طبع قديمى)

ونفقة أولاد الصغار على الأب لايشاركه فيها احد كذا فى الجوهرة النيرة فان أبى ان يكتسب وينفق عليهم يجبر على ذلك ويحبس كذا فى المحيط ويحبس لأب بنفقة الولد وان كان لايحبس بسائر ديونه

ولما فی التاتار خانية: ۱۷۳/۳(طبع قديمى)

ووجه الفرق أن نفقة الصغير على لأب وان كان معسرا فأما نفقة ابن الكبير فليست على لأب

ولما فی الهندية: ۵۵۷/۱(طبع رشيديه)

وليس لها أن تعطى شئا من بيته بغير اذنه

ولما فی المشكوة: ۲۵۵/۱(طبع سعيد)

وعن ابى حرة الرقاشى عن عمه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ألا لاتظلموا ألالايحل مال امرئ الا بطيب نفس منه

ولما فی البحر ۱۷۳/۴(طبع سعيد)

وظاهر من غاية البيان ان نفقة المفروضة تصير ملكا للمرأة اذا دفعها اليها فلها التصرف فيها من بيع وهبة وصدقة وادخار

ولما فی التنوير مع الدر: ۱۱۰/۳(طبع سعيد)

وترد العين لو قائمة وان باعها أو وهبها لبقائها على ملك مالكها

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: فضل حق زیزاروی

۲۰ صفر الخیر ۱۴۳۵ھ　　　فتویٰ نمبر: ۳۹۰۲

﴿بیوی کے پاس خرچہ میں سے بچ جائے تو کیا حکم ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کوئی آدمی اپنی بیوی کو ایک ماہ کا خرچہ دے جو کہ متوسط طریقہ سے خرچ کیا جائے تو پورا ہوجاتا ہے اگر بیوی خرچہ انتہائی کم کر کے اس میں سے کچھ بچالے تو کیا وہ بچا ہوا شوہر کو واپس کرنا ضروری ہے یا شوہر کو بتائے بغیر بھی اس کو خرچ کر سکتی ہے؟

مستفتی: ایک سائل

﴿جواب﴾ خرچے سے مراد اگر صرف بیوی کا ذاتی خرچہ ہے تو ایسا خرچہ بیوی کی ملکیت

ہے بچ جائے تو شوہر کو لوٹانا ضروری نہیں ہے لیکن پاک و ہند میں عموماً شوہر بیوی کو پورے گھر کا چولھا چلانے کیلئے خرچ دیتا ہے، بیوی کی ذات کے علاوہ بچوں کا خرچہ بھی شامل ہوتا ہے، ایسے خرچے میں سے بچا کر بیوی مالک نہیں بنتی، شوہر کو لوٹانا ضروری ہے۔

لما فی البحر الرائق: (۱۶۳/۴، طبع سعید)

وظاهر ما في غاية البيان أن النفقة المفروضة تصير ملكا للمرأة إذا دفعها إليها فلها التصرف فيها من بيع وهبة وصدقة وادخار.

ولما في الفتاوى قاضي خان: (۲۲۵/۱، طبع قديمي)

قال وليس في النفقة عندنا تقدير لازم وإنما يجب عليه كفايتها بالمعروف وذلك يختلف باختلاف الأماكن والأوقات وكما يجب لها ذلك قدر الكفاية من الخبز فكذلك الإدام لأن الخبز لا يؤكل عادة إلا مأدوما وقالوا في تأويله قوله تعالى من أوسط ما تطعمون أهليكم أما في عرفنا نفقة المرأة تختلف باختلاف الناس والأوقات ولا تقدر النفقة بالدراهم.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: شاہد محمود عفا اللہ عنہ

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۳۷۳

﴿بدکردار بیوی کے مہر اور نان ونفقہ کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک لڑکی جس کی شادی کے دو سال ہوئے ہیں، وہ غیر محرم کیساتھ ناجائز قسم کے تعلقات قائم کئے ہوئے ہے، ناجائز تعلقات کا ثبوت یہ بھی ہے کہ اس نے غیر محرم آدمی کے ساتھ ناجائز قسم کی تصویریں کھینچوائی ہے جن کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اس بناء پر لڑکی کے خاوند نے جب یہ بات سنی تو کہا کہ میں اس لڑکی کو نہیں رکھتا اور وہ لڑکی والدین کے گھر پہنچادی ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب سے لڑکی کو والدین کے گھر پہنچادیا گیا ہے، اس وقت سے طلاق کے وقت تک جو عرصہ درمیان میں گزرا ہے، آیا اس دوران میں لڑکی کا نفقہ وخرچہ خاوند کے ذمہ واجب ہے یا نہیں؟ اور ایسی لڑکی کا مہر خاوند کے ذمہ واجب الاداء ہے یا نہیں؟ نیز ایسی صورت میں لڑکی خاوند سے خلع لے سکتی ہے یا نہیں؟ مستفتی: عبدالستار صاحب

﴿جواب﴾ کوئی لڑکی اگر کسی کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم رکھتی ہے تو یہ گناہ کبیرہ ہے، شادی شدہ کے لئے گناہ کے علاوہ شوہر کے ساتھ بے وفائی کا ثبوت بھی ہے، مسلمان غیرتمند

آدمی کے لئے ایسی بیوی کو بسانا واقعی مشکل ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں شوہر اگر اسکو نہیں رکھنا چاہتا تو طلاق دینے میں کوئی حرج نہیں، تاہم طلاق کی صورت میں مہر واجب الاداء ہوگا۔

لما فی الدر مع الرد:(۵۰/۴،طبع سعید)

وفی اخر حظر المجتبی:لایجب علی الزوج تطلیق الفاجرة ولاعلیها تسریح الفاجر الا اذا خافا ان لا یقیما حدود الله فلا بأس أن یتفرقا.

وفی الشامیة:عن البحر بدلیل الحدیث،أن رجلا اتی النبی ﷺ فقال یارسول الله ان امرأتی لاتدفع ید لامس فقال علیه السلام طلقها فقال انی احبها وهی جمیلة فقال استمتع بها.

بیوی اگر سمجھتی ہے کہ اس خطا کے بعد اب میں اس قابل نہ رہی کہ یہ شوہر مجھے بسالے، اسلئے نکاح سے خلع چاہتی ہو تو شوہر سے خلع لے لے جسکی صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ بیوی حق مہر سے دست برداری کا اظہار کردے تو شوہر کے ذمہ سے حق مہر ساقط ہوجائے گا اور اگر ادا کر دیا ہے تو بیوی حق مہر لوٹا دے تو اس سے ایک طلاق بائن واقع ہوجائے گی اور عدت گزارنے کے بعد عورت دوسری جگہ چاہے تو شادی کر سکے گی۔

لما فی الهدایة:(۴۰۴/۲،طبع رحمانیه)

واذا تشاق الزوجان وخافا ان لا یقیما حدود الله فلا باس بان تفتدی نفسها منه بمال یخلعها به لقوله تعالی فلا جناح علیهما فیما افتدت به،فاذا فعل ذلک وقع بالخلع تطلیقة بائنة ولزمها المال وان کان النشوز منه یکره له ان یاخذ منها اکثر مما اعطاها.

ولما فی التنویر مع الدر:(۹۶/۵،طبع امدادیه)

(وان زادت من مال أو دراهم ردت)علیه فی الاولی(مهرها)ان قبضته والالاشئ علیها.

طلاق یا خلع سے پہلے بیوی کا نفقہ شوہر کے ذمہ واجب الاداء رہتا ہے لیکن جو وقت گزرا اور خرچہ لڑکی کے والدین نے برداشت کیا تو اس کا مطالبہ شوہر سے نہیں کیا جا سکتا، البتہ اگر شوہر طلاق یا خلع پر آمادہ نہیں ہے تو بذریعہ عدالت یا پنچائت آئندہ کے خرچہ کا پابند کیا جا سکتا ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۲۱۱/۵-۲۱۲،طبع امدادیه)

(والنفقة لاتصیر دینا الا بالقضاء أو بالرضاء)..... فقبل ذلک لایلزمه شئی.

وفی الشامیة:أی لایلزمه عما مضی قبل الفرض بالقضاء أو الرضاء.

ولما فی البحر الرائق:(۱۸۶/۴ طبع ایچ ایم، سعید)

ولاتجب نفقة مضت الا بالقضاء اوالرضاء لان النفقة صلة ولیست بعوض عندنا فلم یستحکم الوجوب فیها الا بالقضاء والمراد بعدم وجوبها عدم کونها دینا علیه فلاتکون دینا علیه یطالب به

ويحبس عليه الا باحدى هذين الشيئين فحينئذ تصير دينا عليه فلا تطالبه بها

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم: محمد اسلم چترالی المراہ

۲۵ ذی الحجہ ۱۴۲۹ھ

فتوی نمبر: ۱۰۴۸

﴿نابالغ اولاد کے مال میں والدین ولی کی حیثیت سے تصرف کر سکتے ہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض والدین اپنے نابالغ بچوں کی اشیاء مثلاً کپڑے جوتے وغیرہ یا کھلونے دوسرے بچوں کو صدقہ کر دیتے ہیں اس وجہ سے تاکہ ضائع یا خراب نہ ہو جائے اور اس کے بدلے ان کے لیے اپنی طرف سے نئی چیزیں خرید لیتے ہیں تو آیا اس طور پر بچوں کا مال دوسروں کو دینا جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ نابالغ اور ناسمجھ اولاد کے مال میں والدین کو ولی کی حیثیت سے ہر مفید تصرف یا کم از کم کسی مصلحت کی خاطر تصرف کرنے کا اختیار حاصل ہے، البتہ واضح نقصان دہ تصرف کا اختیار حاصل نہیں ہے، اس لیے بچوں کی قیمتی اشیاء دوسروں کو ھبہ کرنا یا صدقہ کرنا جائز نہیں ہے، البتہ ایسی اشیاء جو کسی بھی درجہ میں اپنے بچوں کے کام میں نہیں آتی اور دوسروں کے کام آتی ہیں تو ایسی اشیاء کو بطور صدقہ یا ھبہ کے دینا جائز ہے اس لیے ایسی چیزیں اپنے بچوں کے حق میں اب ردی اشیاء کے حکم میں ہیں تو کچرے میں ڈالنے سے زیادہ بہتر یہی ہے کہ کسی کے کام آجائیں، اور ایسی اشیاء کے بدلے دوسری کارآمد اشیاء اپنی طرف سے بچوں کو دلوانے کا بھی ارادہ ہو تو یہ زیادہ اولی ہے اور احتیاط کے مطابق ہے۔

لما فی تنویر الابصار (۵/۵۲۸) طبع سعید)

(والولاية فی مال الصغير الى الاب ثم وصييه ثم وصی وصيه)

ولما فی الفقه الاسلامی وادلته (۱۰/۷۳۳۱) طبع رشيديه)

اولاً: الولی علی المال، اذا كان للقاصر مال كان للاب الولاية على ماله حفظا واستثمارا باتفاق المذاهب الاربعة،

وفيه ايضاً۔۔ص ۷۳۳۲ تصرفات الولی علی المال)

تصرف الولی فی مال القاصر مقيد بالمصلحة للمولی عليه، فلا يجوز له مباشرة التصرفات الضارة ضررا محضا كهبة شيئ من مال للمولی عليه اوالتصدق به اوالبيع والشراء بغبن فاحش، ويكون تصرفه باطلا وله مباشرة التصرفات النافعه نفعاً محضاً كقبول الهبة والصدقة والوصية، وكذا التصرفات المترددة بين الضرر

والنفع كالبيع والشراء والاجارة والاستجار والشركة والقسمة،

ولما في الدر المختار (۲۹۰/٦) طبع سعيد)

وجاز (شراء ما لا بد للصغير منه وبيعه) اى بيع ما لا بد للصغير منه لاخ وعم وام،

ولما في بدائع الصنائع (۱۵۲/۵ طبع سعيد)

واما الولاية، فالولاية في الاصل نوعان نوع يثبت بتولية المالك ونوع يثبت شرعاً لا بتولية المالك، اما الاول فهو ولاية الوكيل... واما الثانى فهو ولاية الاب والجد اب الاب والوصى والقاضى، وهو نوعان ايضاً ولاية النكاح وولاية غيره من التصرفات۔ واما ولاية غيره من التصرفات.. فسبب هذا النوع من الولاية في التحقيق شئيان احدهما الابوة والثانى القضاء، اماالابوة فلانهما داعية الى كمال النظر في حق الصغير لوفور شفقة الاب وهو قادر على ذالك لكمال رايه وعقله والصغير عاجز عن النظر لنفسه بنفسه وثبوت ولاية النظر للقادر على العاجز عن النظر امر معقول مشروع لانه من باب الاعانة على البر ومن باب الاحسان ومن باب اعانة الضعيف واعانة اللهفان وكل ذالك حين عقلاً وشرعاً،

وفيه ايضاً۔ (۱۵۳/۵)

واما شرائطها۔ واماالذى يرجع الى المولى فيه فهو ان لا يكون من التصرفات الضارة بالمولى عليه لقوله عليه السلام لا ضرر ولا اضرار في الاسلام وقال عليه الصلاة والسلام من لم يرحم صغيرنا فليس منا والاضرار ليس من المرحمة في شئى فليس له ان يهب مال الصغير من غيره بغير عوض لانه ازالة ملكه من غير عوض فكان ضرراً محضاً وكذا ليس له ان يهب بعوض عند ابى حنيفة وابى يوسف وعند محمد له ذالك.

ولما في تبيين الحقائق (۱۸/٦ طبع سعيد)

(فلو وهب لذى رحم محرم منه لايرجع فيها) لقوله عليه السلام:اذا كانت الهبة لذى رحم محرم لم يرجع فيها" لان المقصود منها صلة الرحم وقد حصل وفى الرجوع قطعية الرحم فلا يرجع فيها.

والله اعلم بالصواب: محمد تنویر عفا الله عنه

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا الله عنه

فتویٰ نمبر: ۳۵۵۹

۲٦ صفر المظفر ۱۴۳۳ھ

﴿کتاب الأیمان والنذور﴾

﴿غیر اللہ کی قسم کھانا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ غیر اللہ کی قسم کھانا جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر کسی نے کھالی تو اس کا کیا حکم ہے؟ مستفتی: محمد حسن پشاوری

﴿جواب﴾ غیر اللہ کی قسم کھانا جائز نہیں ہے کسی نے کھالی ہو تو شرعاً یہ کوئی قسم نہیں ہے، اس لئے اس کی پاسداری واجب نہیں یعنی خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قسم توڑنے کا کفارہ وغیرہ واجب نہیں ہوتا، ہاں غیر اللہ کی قسم کھانے کی وجہ سے سخت گناہ ہوا اس لئے توبہ واستغفار ضروری ہے، البتہ قرآن کریم چونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے، اس لئے قرآن کریم کی قسم معتبر ہے توڑنے کی صورت میں کفارہ واجب ہوگا۔

لما فی الترمذی:(۱۸۵/۱،باب فی کراهیة الحلف بغیر الله تعالی،طبع فاروقی ملتان)

عن ابن عمر أن رسول الله صلی الله علیه وسلم ادرك عمر وهو فی رکب وهو یحلف بابیه فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم ان الله ینهاکم ان تحلفوا بآبائکم لیحلف حالف بالله او لیسکت.

ولما فی التنویر مع الدر:(۷۱۲/۳،طبع سعید)

(لا)یقسم(بغیر الله تعالی کالنبی والقرآن والکعبة)

وفی الشامیة:(قوله لا یقسم بغیر الله تعالی)عطف علی قوله والقسم بالله تعالی:ای لا ینعقد القسم بغیره تعالی ای غیر اسمائه وصفاته ولو بطریق الکنایة کما مر،بل یحرم کما فی القهستانی،بل یخاف منه الکفر فی نحو وحیاتی وحیاتک کما یأتی.

ولما فی الفقه الاسلامی وادلته:(۲۲۷۱/۳،طبع رشیدیه)

اذا حلف الانسان بغیر الله تعالی کالاسلام او-----او بالآباء او الامهات او الابناء او-----

ومثل:(لعمرك وحیاتک وعیشک وحقک)فلا یکون یمینا باجماع العلماء، وهو مکروه قال الشافعی:اخشی ان یکون معصیة ولا تجب علیه کفارة،لانه حلف بغیر الله تعالی والناس وان تعارفوا الحلف بالآباء ونحوهم لکن الشرع نهی عنه-----ولان هذا النوع من الحلف لتعظیم المحلوف به وهذا التعظیم لا یستحقه الا الله تعالی.

ولما فی الدر المختار:(۷۱۲/۳،طبع سعید)

ولا یخفی ان الحلف بالقرآن الآن متعارف فیکون یمینا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: محمد شعیب پشاوری

۱۹صفر الخیر ۱۴۳۲ھ | فتویٰ نمبر: ۲۸۸۲

﴿قسم معلق کی ایک صورت اور اس کا کفارہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے کہ اگر کسی نے قسم کھائی کہ " قسم دے باران بہ نہ ڈاشی " قسم ہے بارش نہیں ہوگی ، اور بارش ہوگئی تو اس کا کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اس کی قسم منعقد ہوگئی ہے ، اور بارش ہونے پر قسم ٹوٹ گئی ہے لہذا اس پر قسم کا کفارہ لازم ہے ، دس مسکینوں کو صبح وشام کا کھانا کھلائے ، یا بقدر ستر پوشی کپڑا پہنائے ، اور اگر یہ نہ کر سکے تو مسلسل تین روزے رکھے۔

لما فی التنویر :(۳/۷۸۶ طبع : سعید)

(امکان تصور البر فی المستقبل شرط انعقاد الیمین) ولو بطلاق (وبقائها) اذ لا بد من تصور الأصل لتنعقد فی حق الخلف وهو الکفارة.

ولما فی الشامی :(۳/۷۸۶ طبع سعید کراچی)

قلت :لکن عبر فی البحر وعلیه فالمراد بتصوره کونه ذا صورة أی کونه موجوداً فالمراد امکان وجوده فی المستقبل أی امکانه عقلاً وان استحال عادة احترازاً عما لا یمکن عقلاً ولا عادة کما فی المثال الآتی فهذا لا تنعقد فیه الیمین ولا تبقی منعقدة ، بخلاف ما أمکن وجوده عقلاً وعادة أو عقلاً فقط مع استحالته عادة کما فی مسئلة صعود السماء و قلب الحجر ذهباً فانها تنعقد کما سیأتی .

ولما فی الهدایة اؤلین :(ص ۴۷۹ طبع رحمانیه)

قال کفارة الیمین عتق رقبة یجزی فیها ما یجزی فی الظهار وان شاء کسا عشرة مساکین کل واحد ثوباً فما زاد ، وادناه ما یجوز فیه الصلوة ، وان شاء أطعم عشرة مساکین کالاطعام فی الظهار ، والأصل فیه قوله تعالی :فکفارته اطعام عشرة مساکین الأیة ، و کلمة أو للتخییر فکان الواجب احد الأشیاء الثلثة قال فان لم یقدر علی احد الأشیاء الثلاثة صام ثلثة ایام متتابعات .

الجواب صحیح : مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب : محمد ابرار عفی عنہ

۱۹ صفر الخیر ۱۴۳۳ھ　　　فتویٰ نمبر : ۳۵۳۰

﴿یمین غموس کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص نے گزرے ہوئے زمانے کے کسی واقعے پر جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھائی تو اس کا کیا حکم ہے اور اس کا کیا کفارہ ہے؟

﴿جواب﴾ گزشتہ زمانے کے کسی واقعے یا بات پر جھوٹی قسم کھانا یمین غموس کہلاتا ہے ،

غموس کے معنی غوطہ زن ہونا گویا ایسا شخص گناہ میں سرتاپا ڈوب جاتا ہے تو یہ انتہائی سخت اور بڑا گناہ ہے اور اس کا مستقل کفارہ تو نہیں ہے، البتہ توبہ و استغفار ضروری ہے، نیز اس قسم کے ذریعے اگر کسی کا مالی نقصان کیا ہو یا عزت نفس وغیرہ کو مجروح کیا ہو تو اس کی تلافی بھی ضروری ہے، اس کے بغیر توبہ و استغفار سے بھی یہ گناہ معاف نہ ہوگا۔

لما فی قوله تعالیٰ:(سورة النحل،آیت۹۴)

ولا تتخذوا ایمانکم دخلا بینکم فتزل قدم بعد ثبوتها الأیة.

ولما فی البخاری:(۹۸۸/۲،باب الیمین الغموس،طبع رحمانیه)

عن عبدالله بن عمرو عن النبی صلی الله علیه وسلم قال الکبائر الاشراک بالله وعقوق الوالدین وقتل النفس والیمین الغموس.

ولما فی الشامی:(۷۰۵/۳،کتاب الایمان،طبع سعید)

(وهی کبیرة مطلقا) ای اقتطع بها حق مسلم اولا.

ولما فی التنویر مع الرد:(۷۰۵/۳-۷۰۶،کتاب الایمان،طبع سعید)

(وهی غموس ان حلف علی کاذب عمدا کوالله مافعلت عالما بفعله اوکوالله ماله علی الف عالما بخلافه ووالله انه بکر عالما بانه غیره ویأثم بها)

وفی الشامیة:(قوله ویأثم بها) ای اثما عظیما کما فی الحاوی......(قوله فتلزمه التوبة) اذلاکفارة فی الغموس یرتفع بها الاثم فتعینت التوبة للتخلص منه.

ولما فی تکملة فتح الملهم:(۳۵/۶،باب قبول توبة القاتل،طبع دار العلوم کراتشی)

اذا کان فی وسعه ان یتدارك حق خصمه او یطلب منه العفو فلاتوبة الابه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد شعیب پشاوری

۱۴ صفر الخیر ۱۴۳۳ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۸۸۰

﴿منت، قسم اور اس کے کفارہ کا حکم﴾

﴿لاینعقد القسم بغیر اسماء الله تعالیٰ وصفاته﴾

﴿سوال﴾ مردی سوگند خورد با این الفاظ قسم بہ شریعت محمدی۔ آیا سوگند شماری شود؟ ام اسکندر

﴿جواب﴾ سوگند خوردن بہ الفاظ مذکورۃ قسم شمار نہ می شود زیرا این قسم خوردن بغیر اللہ است و این از نگاہی شرع ممنوع است واللہ اعلم۔

لما فی البدائع:(۸/۳،طبع سعید)

ولو قال ودین الله اوطاعته اوشرائعه اوانبیائه وملائکته اوعرشه لم یکن یمینا لانه حلف بغیر الله.

ولما فی الدر والرد:(۲/۷۱۵، طبع سعید) وشرعه ودینه وحدوده الخ

وفی الشامية: لا محل لذكر هذا لانها ليست من الصفات، لان المراد بها الاحكام المتعبد بها وهی غيره تعالى فلا يقسم بها وان تعورف الخ

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد ...

۱۱ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۲۹۸

﴿غیر ارادی طور پر قسم کھانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی بات بات پر قسم کھاتا ہے گویا کہ اسکا تکیہ کلام بن گیا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ شریعت میں اس کا کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ ایسا شخص جو ماضی، حال کی ہر بات پر غیر ارادی طور پر قسم کھاتا ہو خود بخود اسکی زبان پر جاری ہو جاتی ہو تو ایسی قسم یمین لغو کہلاتی ہے، ایسی قسم پر اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ مؤاخذہ نہیں فرمائیں گے لیکن اگر قسم معلق کر لی مثلاً یوں کہے اللہ کی قسم فلاں کام نہیں کروں گا، یہ یمین لغو نہیں کہلاتی خواہ غیر ارادی طور پر ایسا بولا ہو بلکہ یہ یمین منعقدہ کہلاتی ہے جس کا حکم یہ ہے کہ حانث ہونے کی صورت میں اس کا کفارہ ادا کرنا ضروری ہے۔

لما فی قوله تعالى:(سورة البقرة، آیت ۲۲۵) لا يؤاخذكم الله باللغو فی ایمانكم ---الآية.

ولما فی المظهری:(۱/۲۸۷ طبع رشيديه)

واللغو ---- ههنا ما جرى من اليمين على اللسان من غير عقد وقصد سواء كان فی الانشاء او الخبر الماضی او المستقبل وهذا التفسير مروی عن عائشة روى الشافعی انها قالت: لغو اليمين قول الانسان لا والله الخ واخرجه أبو داود---- وكذا لا ينعقد عند الشافعیؒ اذا كان هذا القسم من اليمين فی الانشاء فلا يجب عليه الكفارة ان حنث والحجة له هذه الاية بهذا التفسير وقال أبو حنيفةؒ ينعقد اليمين ويجب الكفارة ان حنث الخ.

ولما فی الخلاصة:(۲/۱۲۳ طبع رشيديه)

واللغو لا يؤاخذ به صاحبه الا فی الطلاق والعتاق والنذور.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد احمد عفی عنہ

۹ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۶۲۵

﴿قسم اٹھوانے والے کے سامنے "ہاں میں ہاں" ملانا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں حضرات علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے

ایک لڑکی کا ہاتھ زبردستی قرآن پر رکھا اور کہا کہ تم میرے علاوہ کسی سے شادی مت کرنا اور لڑکی نے بھی گھبراہٹ کی وجہ سے "ہاں میں ہاں" ملادی اور اب اس لڑکی کی شادی کسی دوسری جگہ ہوگئی ہے تو کیا یہ حانث ہوگئی؟ اور اگر حانث ہوگئی ہے تو اس کا کفارہ کیا ہے؟ مستفتیہ: ام عمارہ کورنگی

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں اس شخص کا مقصد قسم دلوانا ہی تھا لیکن "ہاں" کرتے ہوئے اس لڑکی کا ارادہ قسم کا نہیں تھا، اس لئے ان دونوں میں سے کسی ایک پر بھی قسم لازم نہیں ہوئی اور خلاف کرنے کی صورت میں کوئی بھی حانث نہیں ہوا۔

لمافی فتاوی قاضی خان:(۱/۵۲۷،طبع قدیمی)

ولو قال:والله لتفعلن كذاوكذاغدافقال الآخر:نعم فهوعلى خمسة أوجه:احدها:ان ينوى المبتدى الحلف على نفسه والمجيب بقوله:نعم يريدالحلف على نفسه وفى هذاالوجه كل واحدمنهمايكون حالفاالخ والثاني:ان يريدالمبتدى استحلاف المجيب والمجيب بقوله نعم يريداليمين على نفسه الخ والثالث:ان يريدالمبتدى استحلاف المجيب بقوله نعم يريدالوعدفى ذلك دون اليمين وفى هذاالوجه لايكون احدهما حالفا.

ولمافى الفتاوى البزازية:(۱/۲۲۲،طبع قديمى)

(نوع آخر)الله ليفعلن كذاأومع الواوفقال الآخرنعم — ان قصدالمبتدى الاستحلاف والمجيب ان لايكون عليه يمين ويكون قوله نعم على معناه بلايمين،فهوكمانوى ولايمين على واحدمنهماالخ.ومثله فى التاتارخانية:(۴/۲۹۲،طبع قديمى)

ولمافيه ايضا:(۴/۳۰۰،طبع قديمى)

اليمين على نية الحالف ان كان مظلوماوان كان ظالمافعلى نية المستحلف.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: انیس طالب کان اللہ لہ

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۵۹۲

﴿مستحلف کو نعم سے جواب دیا جائے، تو کیا حکم ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے میری سہیلی نے اصرار کر کے قسم دلوائی یعنی تجھے قسم ہو کہ آئندہ کے لئے پاپڑ نہیں کھانا، میں نے "ہاں" کرلی لیکن قسم کا کوئی ارادہ نہیں تھا، بلکہ ہاں کرتے وقت خیال تھا، کہ میرے لیے چھوڑنا مشکل ہے تو کیا میں قسم کھانے والی ہوگئی؟ مستفتیہ: طالبہ یوسفیہ بنوریہ

﴿جواب﴾ ظاہر ہے کہ آپکی سہیلی کا مقصد اس جملہ سے آپ ہی کو قسم دلوانا تھا لیکن ہاں

کرتے ہوئے آپ کا ارادہ قسم کا نہیں تھا، اس لئے آپ دونوں میں سے کسی ایک کی بھی قسم عائد نہیں ہوئی، خلاف کرنے کی صورت میں کوئی بھی حانث نہیں ہوگا۔

لما فی الدرمع الرد:(۵/ ۱۶۵-۱۶۱، طبع امدادیہ)

فروع: قال لغیرہ: واللہ لتفعلن کذا فھو حالف..... مالم ینو الاستحلاف.

وفی الشامیۃ: قولہ: (مالم ینو الاستحلاف)..... قال فی الخانیۃ: ولو قال: واللہ لتفعلن کذا فقال الاخر نعم، فھو علی خمسۃ اوجہ: احدھا: ان ینوی کل من المبتدی والمجیب الحلف علی نفسہ فھما حالفان اما الاول فظاھر وأما الثانی فلأن قولہ نعم یتضمن اعادۃ ماقبلہ، فکانہ قال واللہ لافعلن کذا، فان لم یفعل حنثا جمیعا. الثانی: ان یرید المبتدی الاستحلاف والمجیب الیمین علی نفسہ، فالحالف ھو المجیب فقط. الثالث: ان لا یرید المجیب الیمین بل الوعد فلا یکون احدھما حالفا الرابع: ان لا یکون لاحدھما نیۃ، فالحالف ھو المبتدی فقط. الخامس: ان یرید المبتدی الاستحلاف والمجیب الحلف، فالمجیب حالف لا غیر اھ. ملخصاً. قلت ھذا الاخیر ھو عین الثانی، فتامل.

ولما فی الدرمع الرد:(۵/ ۵۷۱، طبع امدادیہ)

عرض علیہ الیمین فقال: نعم..... عن التاتر خانیۃ انہ بنعم لا یصیر حالفا ھو الصحیح.

وفی الشامیۃ: قولہ: (کان حالفا) لانہ اذا قال واللہ لتفعلن کذا فقال نعم کانہ یصیر قال واللہ لافعلن، لان مافی السوال معاد فی الجواب کما سیاتی فی آخر الایمان..... مانقلہ ح عن البحر.

الجواب صحیح: عبد الرحمن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: عزیز الرحمن چارسدوی

۵ جمادی الاولی ۱۴۲۹ھ   فتوی نمبر: ۱۴۰۹

﴿دوسرے کی صفائی کیلئے قسم کھانا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دوسرے کی صفائی کیلئے قسم کھانا جائز ہے یا ناجائز؟ نیز اگر قسم غلط ثابت ہوجائے تو مواخذہ ہوگا یا نہیں؟

﴿جواب﴾ کسی شخص کا اس واقعہ کے علم کے بغیر دوسرے کی طرف سے قسم کھانا یا وکیل بن کر قسم کھانا تو درست نہیں ہے، البتہ اگر اسے اس چیز کے بارے میں علم ہو جس پر قسم کھا رہا ہے تو علم پر قسم کھانا درست ہے مثلاً یوں کہے کہ اللہ کی قسم میرے علم کے مطابق فلاں نے یہ کام نہیں کیا ہے، ایسی صورت میں قسم غلط ثابت ہوجائے تو عند اللہ مواخذہ نہیں ہوگا، جان بوجھ کر دوسرے کی طرف سے جھوٹی قسم کھائی تو سخت گنہگار ہوگا اور توبہ کے علاوہ قسم کیوجہ سے اگر کسی کا مالی نقصان ہوا

ہے تو اسکی تلافی بھی واجب الذمہ ہوگی۔

لما فی فقہ الاسلامی:(۲۰۹/۸،طبع الباب المتلق علیہا،ما یہ بیروت)

فلا تقبل الیمین النیابۃ لصلتھابذمۃ الحالف، وذہنہ فلا یحلف الوکیل أوولی القاصر ویوقف الامرحتی یبلغ.

ولما فی التنویر مع الدر:(۵۵۲/۵،طبع سعید)

(التحلیف علی فعل نفسہ یکون علی البتات)ای القطع بانہ لیس کذلک(و)التحلیف (علی فعل غیرہ)یکون(علی العلم)

ولما فی فقہ الاسلامی:(۲۰۲/۸،طبع الباب النیۃفی الیمین،طبع بیروت)

یحلف الشخص فی فعل غیرہ علی نفی علمہ مطلقا،سواء کان اثباتاام نفیا لما ثبت فی الصحیح ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم حلف الیہودفی القسامۃ"باللہ ماقتلتم ولاعلمتم لہ قاتلا"ولان الانسان لاعلم لہ بفعل غیرہ ولایدرک حقیقۃ تصرفاتہ فیحلف علی نفی العلم.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:عبدالحکیم کشمیری

۱۳ربیع الاول ۱۴۲۹ھ — فتوی نمبر:۱۲۰۳

﴿طلاق کی قسم اٹھانے اوراس پر مجبور کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں اگر کسی پر چوری وغیرہ کا الزام ہوتو اس سے طلاق کی قسم کھلواتے ہیں، پوچھنا یہ ہے کہ اگر وہ تعلیقاً قسم کھالے اوراس نے چوری بھی کی ہوتو طلاق واقع ہوجائے گی یا نہیں؟ اسی طرح اگر تعلیق ذکر نہ کرے بلکہ یوں کہے کہ''میری بیوی کو طلاق ہو میں نے چوری نہیں کی ہے'' یا صرف یوں کہے کہ''میری بیوی کو طلاق ہو'' آخری جملہ ذکر نہ کرے تو اسکا شرعاً کیا حکم ہے؟ نیز ایسے موقع پر جج یا ثالث کو طلاق پر مجبور کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ مستفتی:محمد عظیم خان ڈیرہ اسمٰعیل خان

﴿جواب﴾(۱) مذکورہ صورت میں جب بیوی کی طلاق کو معلق کرکے قسم کھالے کہ اس نے چوری نہیں کی ہے اور واقع میں اس نے چوری کی ہوتو طلاق واقع ہوجائے گی، اسی طرح اپنی بات کو باقاعدہ تعلیق کے بغیر بولے جیسا کہ دوسری صورت میں ہے تو اسکا بھی یہی حکم ہے یعنی اگر چوری کی ہوتو طلاق واقع ہوجائے گی ورنہ نہیں،البتہ تیسری صورت میں جب وہ صرف یوں کہتا ہے

کہ ”میری بیوی کو طلاق ہو“ اور اسکے ساتھ مزید کوئی بات نہیں کہتا تو بہرصورت ایک طلاق رجعی واقع ہوجائے گی، اس لئے کہ یہاں اگرچہ اسکی مراد تعلیق ہے لیکن تعلیق کی کوئی صورت نہیں پائی جاتی۔

لمافی الدر المختار:(۸۵۱/۲،طبع سعید)

قیل له ان کنت فعلت کذافامرأتک طالق فقال نعم وقدکان فعل طلقت...... ادعی علیه فحلف بالطلاق ماله علیه شئی فبرهن بالمال حنث به یفتی.

ولمافی التاتارخانیة:(۳۲۷/۴،طبع قدیمی)

رجل ادعی علی اخر أنه سرق ثوبه فأخذالمدعی علیه ثوب المدعی وقال:امرأته طالق(که من جامه تونی برداشته ام)فقدقیل لاتطلق امرأته ان لم یکن سرق ثوبه، وقیل تطلق قضاء اعتبار لصورة الشرط والاول اظهر.

ولمافیه ایضا:(۱۸۹/۲-۱۸۸،طبع قدیمی)

وطلاق اللاعب والهازل واقع وکذالرجل یریدان یتکلم بکلام فسبق لسانه بالطلاق فالطلاق واقع......وفی المنتقی:قال ابوحنیفة رحمه الله لایجوزالغلط فی الطلاق.

(۲) جب مدعی کا اصرار ہو یا مدعیٰ علیہ ایسا شخص ہو جو حق تعالیٰ کے نام کی حرمت کی پرواہ نہ کرتا ہو اور قاضی یا جج حلف بالطلاق میں مصلحت سمجھتا ہو تو اسکے لئے طلاق پر قسم لینے کی گنجائش ہے، عام ثالث کو چونکہ اختیار کلی حاصل نہیں ہوتا، لہٰذا وہ طلاق کی قسم کھلانے پر مجبور نہیں کرسکتا۔

لمافی التنویرمع الرد:(۵۵۵/۵،طبع سعید)(لابطلاق وعتاق)

وفی الشامیة:وظاهره أن القائل بالتحلیف بهمایقول أنه غیرمشروع ولکن یعرض علیه لعله یمتنع فان من له ادنی دیانة لایحلف بهماکاذبافانه یؤدی الی طلاق الزوجة وعتق الامة اولمساکهمابالحرام بخلاف الیمین بالله تعالی فانه یتساهل به فی زمانناکثیراتأمل.

ولمافی فقه الاسلامی:(۲۰۵/۸،طبع الباب الیمین بالطلاق،طبع بیروت)

وأجازمتأخروالحنفیة الحلف بالطلاق اذاطلبهاالخصم وألحّ فیهااوکان الحالف لا ینزجرالابهالفسادالزمان وقلة المبالات بالحلف بالله تعالی.

ولمافی الهدایة:(۲۱۵/۳،طبع رحمانیه)

ولایستحلف بالطلاق ولابالعتاق لماروینا وقیل فی زمانناإذاألح الخصم ساغ للقاضی أن یحلّف بذلک لقلة المبالاة بالیمین بالله وکثرة الامتناع بسبب الحلف بالطلاق.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:عبدالحکیم کشمیری

۱۳ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۳۶۱

﴿یمین معلق کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ میری اور پھوپھی کے درمیان تلخ کلامی ہوئی تو پھوپھی نے کہا کہ تجھے قرآن کی

قسم تو آئندہ ہمارے گھر نہ آنا، میں نے کہا ٹھیک ہے میں نہیں آؤنگی اب پھوپھی پریشان ہیں اور مجھے اپنے گھر آنے پر مجبور کررہی ہیں، پوچھنا یہ ہے کہ میرے جانے سے میں حانث ہوجاؤنگی یا نہیں؟ نیز حانث ہونے کی صورت میں کفارہ کیا ہوگا؟ مستفتیہ: ام اشفاق سوات

﴿جواب﴾ محض کسی کو یہ کہنا کہ'' تجھے قرآن کی قسم آئندہ ہمارے گھر نہ آنا'' اس سے قسم منعقد نہیں ہوتی، البتہ اسکے جواب میں (ہاں ٹھیک ہے میں نہیں آؤنگی) قسم کی نیت سے اگر کہہ دیا ہے تو قسم منعقد ہوگئی ہے جیسا کہ سوال میں مذکور ہے صرف وعدہ مقصود ہو اور قسم کی نیت نہ ہو تو بھی قسم منعقد نہ ہوگی، لہٰذا (ہاں ٹھیک ہے میں نہیں آؤنگی) جواب میں کہتے ہوئے اگر آپکی نیت قسم کی تھی تو اس صورت میں آپ پھوپھی کے گھر جانے سے حانث ہوجائیں گی، کفارہ قسم لازم ہوگا اور ایسی قسم کا توڑنا بہتر ہے، لہٰذا آپ پہلے پھوپھی کے گھر چلی جائیں پھر دس مسکینوں کو کھانا کھلائیں یا دس مسکینوں کو ستر چھپانے کی بقدر کپڑا دیدے اور اگر اسکی استطاعت نہ ہو تو تین دن متواتر یعنی پے درپے روزے رکھیں۔

لما فی قوله تعالی:(پاره۷،سورة المائدة،آیت۸۹)

فكفارته اطعام عشرة مسكين من اوسط ماتطعمون اهليكم اوكسوتهم اوتحرير رقبة فمن لم يجد فصيام ثلثة ايام......الأية.

ولما فى الدر المختار:(۷۱۲/۳-۷۱۳،طبع سعيد)

قال الكمال:ولا يخفى أن الحلف بالقرآن الان متعارف فيكون يمينا واما الحلف بكلام الله فيدور مع العرف.وقال العينى:وعندى أن المصحف يمين لاسيما فى زماننا.

ولما فى الدر المختار:(۸۲۹/۳،طبع سعيد)

ولو قال عليك عهد الله ان فعلت كذافقال:نعم فالحالف المجيب.

وفى الشامية:ولو قال:والله لتفعلن كذافقال الآخر نعم،فهو على خمسة أوجه:—الثانى أن يريد المبتدئ الاستحلاف والمجيب اليمين على نفسه فالحالف هو المجيب فقط.الثالث: أن لا يريد المجيب اليمين بل الوعد فلا يكون أحدهما حالفا.الرابع:أن لا يكون لأحدهما نية فالحالف هو المبتدئ فقط.الخامس:أن يريد المبتدئ الاستحلاف والمجيب الحلف فالمجيب حالف لاغيراه ملخصا.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:حبیب الوہاب سواتی

۱۴ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر:۱۵۲۷

﴿غصے کی حالت میں قسم کھانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ جناب مفتی صاحب! میں کپڑوں کی سلائی کا کام کرتی تھی، ایک دن غصے میں آکر میں نے قسم کھائی کہ آج کے بعد کپڑوں کی سلائی کا کام نہیں کرونگی لیکن چند سال کے بعد میں نے پھر سلائی کا کام شروع کیا، اب میرے لئے شرعی حکم کیا ہے؟ مستفتیہ: ایک سائلہ سنگل بانڈی

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں آپ پر قسم توڑنے کا کفارہ لازم ہوگیا ہے، کفارہ کی تفصیل یہ ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے یا دس مسکینوں کو کم از کم ستر پوشی کے بقدر کپڑا دیا جائے اور اگر اسکی استطاعت نہ ہو تو تین روزے مسلسل رکھے جائیں۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲/۷۲۵-۷۲۱، طبع سعید)

(وكفارته)(تحرير رقبة او اطعام عشرة مساكين)(او كسوتهم بما)يصلح للاوساط وينتفع به فوق ثلاثة اشهر، و(يستر عامة البدن)فلم يجز السراويل الا باعتبار قيمة الاطعام

ولما في مختصر القدوري:(ص ۲۲۳، طبع قديمي)

وكفارة اليمين عتق رقبة يجزء فيها ما يجزء في الظهار وان شاء كسا عشرة مساكين كل واحد ثوبا فما زاد وادناه ما يجوز فيه الصلوة وان شاء اطعم عشرة مساكين كالاطعام في كفارة الظهار فان لم يقدر على احد هذه الاشياء الثلاثة صام ثلاثة ايام متتابعات

ولما في كنز الدقائق:(۱/۱۱۵-۱۱۶، طبع قديمي)

وكفارته(اى كفارة اليمين)تحرير رقبة او اطعام عشرة مساكين كما في الظهار او كسوتهم بما يستر عامة البدن فان عجز عن احدها صام ثلاثة ايام متتابعات

ولما في الهداية:(۲/۴۷۱، طبع رحمانيه)

كفارة اليمين عتق رقبة يجزء في الظهار وان شاء كسا عشرة مساكين كل واحد ثوبا فما زاد وادناه ما يجوز فيه الصلوة وان شاء اطعم عشرة مساكين كالاطعام في كفارة الظهار والاصل فيه قوله تعالى فكفارته اطعام عشرة مساكين الاية وكلمة او للتخيير فكان الواجب احد الاشياء الثلاثة

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد وارث خان

۲۹ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۲۷۷

﴿اليمين قد يكون على فعل واجب﴾

﴿سوال﴾ رجل لا يصلي الفجر اكثر الايام فقال يوما والله لأصلين الفجر غدا النام

ولم یصل هل یجب علیه الکفارة؟ ام احمد

﴿جواب﴾ نعم یجب علیه الکفارة فان الکفارة یتعلق بالحنث وقد وجد فیجب الکفارة والله اعلم.

لما فی البدائع:(۱۷/۳،طبع سعید)

وان کان علی فعل الواجب بان قال والله لأصلین صلوۃ الظهر أولاصوم رمضان فانه یجب علیه الوفاء ولایجوزله الامتناع عنه لقوله ﷺ من حلف أن یطیع الله فلیطعه ولوامتنع یأثم ویحنث ویلزمه الکفارة(ثم قال)ان الکفارة لایمتنع وجوبها لعذرفی الحانث بل یتعلق بمطلق الحنث سواء کان الحانث ساهیاأوخاطئاأونائماأو مغمی علیه.

ولمافی الدرالمختار:(۷۲۸/۳،طبع سعید)کحلفه لیصلین الظهرالیوم وبره فرض.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:محمد سلمہ

۲۸جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر:۲۲۲۵

﴿الفاظ قسم لکھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ اگر کوئی شخص قسم کے الفاظ بولنے کے بجائے لکھ دے تو قسم منعقد ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اور اسے پورا کرنا لازم ہوتا ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ ضرورت کی وجہ سے کتابت کو زبان سے بولنے کے قائم مقام قرار دیا گیا ہے، لہٰذا کوئی خوشی اور رضامندی سے قسم کے الفاظ لکھ دے تو قسم منعقد ہوگی اور توڑنے کی صورت میں بھی حانث ہوگا، البتہ جبراً کسی سے قسم کے الفاظ لکھوائے گئے زبان سے نہیں بولے تو قسم منعقد نہیں ہوگی اور خلاف کرنے کی صورت میں حانث بھی نہ ہوگا۔

لما فی البحرالرائق:(۲۲۶/۳،طبع سعید)

وقیدنابکونه علی النطق لانه لواکره علی ان یکتب طلاق امرأته فکتب لاتطلق لان الکتابة اقیمت مقام العبارة باعتبارالحاجة ولاحاجة هناکذافی الخانیةوفی البزازیة أکره علی طلاقهافکتب فلانة بنت فلان طالق لم یقع اه وفی الخزانة لأبی اللیث وجملة ما یصح معه ثمانیة عشرشیئاالطلاق والرضاع والیمین والنذر.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:شاہد محمود

۸صفر ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر:۱۱۷۸

﴿قرآن مجید کی قسم کھانا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ میں حلفیہ کہتا ہوں کہ آئندہ خالد کو قرض نہیں دوں گا لیکن کچھ عرصہ کے بعد جب خالد زید کے پاس قرض مانگنے آیا تو زید نے پھر خالد کو قرض دے دیا، مذکورہ صورت میں کفارہ کن چیزوں کا ادا کریگا؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: محمد اسلم

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں زید حانث ہوگیا اور زید کے ذمہ کفارہ لازم ہے، کفارہ کی تفصیل یہ ہے کہ دس مسکینوں کو دو وقت کا کھانا کھلایا جائے اگر چاہے تو ہر مسکین کو صدقہ فطر کی مقدار غلہ یعنی پونے دو سیر گندم یا اسکی قیمت بھی دے سکتے ہیں یا دس مسکینوں کو لباس مہیا کیا جائے اگر کھانا کھلانے یا اس کی قیمت دینے وغیرہ کی گنجائش نہ ہو تو تین دن مسلسل روزہ رکھے۔

لمافی الهداية:(۴۷۸/۲-۴۷۹طبع رحمانيه)

ولو قال اقسم او اقسم بالله او احلف او احلف بالله او اشهد او اشهد بالله فهو حالف لأن هذه الألفاظ مستعملة في الحلف۔ قال: كفارة اليمين عتق رقبة يجزى فيها مايجزى في الظهار وان شاء كساعشرة مساكين كل واحد ثوبا فمازاد وأدناه مايجوز فيه الصلوٰة وان شاء أطعم عشرة مساكين كالاطعام في كفارة الظهار والأصل فيه قوله تعالىٰ "فكفارته اطعام عشرة مساكين من أوسط ماتطعمون الاية وكلمة او للتخيير فكان الواجب احدالأشياء الثلثة قال فان لم يقدر على احدالأشياء الثلثة صام ثلثة ايام متتابعات كذافي الدر والهندية والبحر.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۱۶ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۱۳۸

﴿قرآن کریم کی قسم منعقد ہو جاتی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قرآن پاک کی قسم کھانے سے قسم منعقد ہو جاتی ہے یا نہیں؟ قسم منعقد ہونے کی صورت میں کفارہ لازم ہوگا یا نہیں؟ اگر کفارہ لازم ہے تو ادائیگی کی کیا صورت ہے؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ قرآن پاک کی قسم کھانے سے قسم منعقد ہو جاتی ہے اور کفارہ بھی لازم ہو جاتا ہے اور قسم کا کفارہ یہ ہے کہ اس کو اختیار ہے چاہے وہ ایک غلام آزاد کرے یا دس مسکینوں کو پیٹ

بھر کر دو وقت کھانا کھلائے یا دس مسکینوں کو کپڑا پہنائے اور اگر مالی کفارہ ادا کرنے کی قدرت نہ ہو تو تین دن مسلسل روزے رکھے۔

لما في الهداية:(٢/ [illegible] مطبع رحمانيه)

[illegible] ان يكون [illegible] وقال محمد [illegible]

[illegible]

ولما في فتح القدير:(٢/ [illegible] مطبع رشيديه)

ثم ان علم ان الحلف [illegible] ان يكون [illegible] كما هو قول الائمة الثلاثة

ولما في الهداية:(٢/ [illegible] مطبع رحمانيه)

كفارة اليمين عتق رقبة يجزئ فيها ما يجزئ في الظهار وان شاء كسا عشرة مساكين كل واحد ثوبا فما زاد وادناه ما يجوز فيه الصلاة وان شاء اطعم عشرة مساكين كالاطعام في كفارة الظهار فان لم يقدر على احد الاشياء الثلاثة صام ثلاثة ايام متتابعات

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۱۷ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ　　　فتوی نمبر: ۳۰

﴿بھائی سے بات نہ کرنے کی قسم کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے قسم کھائی کہ میں اپنے حقیقی بھائی سے بات نہیں کروں گا، اب چونکہ اس سے زید کی والدہ ناراض ہوتی ہے، اس لئے زید دوبارہ اپنے حقیقی بھائی سے تعلقات بحال کرنا چاہتا ہے اگر زید قسم توڑ دے تو شرعاً اس کے لئے کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔　　　مستفتی: محمد اسلم

﴿جواب﴾ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ "جب تم کسی بات کی قسم کھالو پھر دیکھو کہ دوسری صورت بہتر ہے یعنی قسم کے خلاف کرنا بہتر ہے تو جو کام بہتر ہو کرلو اور اپنی قسم (کے توڑنے) کا کفارہ ادا کردو"۔ مشکوٰۃ: (۲۹۶/۲، طبع سعید)

یہ حدیث شریف اس سوال کا جواب ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں زید اپنی قسم توڑ دے اور قسم کا کفارہ ادا کرے، قسم کا کفارہ ہے دس مسکینوں کو دو وقت کا کھانا کھلانا یا ان کو لباس دینا اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو تین روزے مسلسل رکھنا۔

لما في الهداية:(٢/ ٤٧٩، طبع رحمانيه)

قال ومن حلف على معصية مثل ان لا يصلي او لا يكلم اباه او ليقتلن فلانا ينبغي ان

يحنث نفسه ويكفر عن يمينه لقوله عليه السلام من حلف على يمين ورأى غيرها خيرا منها فليأت بالذي هو خير ثم ليكفر عن يمينه ولأن فيما قلناه تفويت البر إلى جابر وهو الكفارة ولا جابر للمعصية في ضده.

وقال أيضا كفارة اليمين عتق رقبة يجزئ فيها ما يجزئ في الظهار وإن شاء كسا عشرة مساكين كل واحد ثوبا فما زاد وأدناه ما يجوز فيه الصلوة وإن شاء أطعم عشرة مساكين كالإطعام في كفارة الظهار والأصل فيه قوله تعالى فكفارته إطعام عشرة مساكين الآية وكلمة أو للتخيير فكان الواجب أحد الأشياء الثلاثة قال فإن لم يقدر على أحد الأشياء الثلاثة صام ثلاثة أيام متتابعات.

وكذا في البحر الرائق:(۲۸۹/۴-۲۹۱،طبع سعيد)وكذا في الدر المختار:(۷۲۵/۳،طبع سعيد)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم:صلاح الدین ڈیروی

۲۲ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ　　　　فتویٰ نمبر:۱۶۷

﴿قسم کے ٹوٹنے کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام کہ بندہ نے کچھ عرصہ قبل یہ قسم کھائی تھی کہ میں مدرسے سے وظیفہ نہیں لوں گا پھر بعد میں نادم ہوا، اب جبکہ ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے، کیا بندہ کے لئے مدرسہ سے وظیفہ وصول کرنا جائز ہے؟ نیز کیا کوئی دوسرا فرد میری اجازت سے یعنی وکیل بن کر) مذکورہ وظیفہ وصول کرسکتا ہے؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں وظیفہ خواہ آپ خود وصول کریں یا کوئی اور آپ کا وکیل بن کر حاصل کرلے، بہرصورت آپ حانث ہوجاؤ گے یعنی آپ کی قسم ٹوٹ جائیگی اور کفارہ ادا کرنا آپ کے ذمے واجب ہوگا۔

لما في التنوير مع الرد:(۱۲۷/۵-۱۲۸-۱۲۹،طبع سعيد)

(ويحنث بفعله وفعل مأموره في النكاح والطلاق　　والصدقة والقرض والاستقراض)

وفي الشامية:قوله:(والصدقة)هي كالهبة فيما مر قال ابن وهبان:وكذا ينبغي أن يحنث في حلفه أن لا يقبل صدقة فوكل بقبضها.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم:محمد شریف حسین چترالی

۹ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ　　　　فتویٰ نمبر:۳۹۴

﴿نہ مارنے کی قسم کھائی تو بال کھینچنے سے بھی حانث ہو جائے گا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں ایک شخص نے قسم کھائی کہ میں اپنی بیوی کو نہیں ماروں گا پھر ایک مرتبہ اس نے غصہ میں آکر اپنی بیوی کے بال کھینچے، کیا اس صورت میں حانث ہوگا یا نہیں؟

مستفتی: عادل احمد کیماڑی کراچی

﴿جواب﴾ غصہ کی حالت میں کسی کے بال کھینچنا بھی مارنا ہے، لہذا یہ شخص حانث ہو گیا ہے اس پر کفارہ قسم لازم ہے۔

لما فی التنویر مع الدر والرد:(۸۳۶/۳،طبع ایچ ایم سعید)

(لا یضرب زوجته فمد شعرها او خنقها او عضها او قرصها) ولو ممازحا خلافا لما صححه فی الخلاصة ــــــــ (قوله خلافا لما صححه فی الخلاصة) قال فی النهر: واطلاقه یعم حالة الغضب والرضا لکن فی الخلاصة لو عضها او اصاب راس انفها لما دماها ففی الجامع الصغیر ان کان فی حالة الغضب یحنث وان کان فی حالة الملاعبة لا یحنث وهو الصحیح وذکره فی البحر ایضا عن الظهیریة.

ولما فی الهندیة:(۱۲۸/۲،طبع رشیدیه کوئٹه)

رجل حلف ان لا یضرب امراته فقرصها او عضها او خنقها او مد شعرها فاوجعها حنث فی یمینه قالوا هذا اذا لم یکن فی الملاعبة وان کان فی الملاعبة لا یحنث وهو الصحیح---- والصحیح ان یکون حانثا اذا کان علی وجه الغضب.

ولما فی فتاوی قاضی خان علی هامش هندیة:(۱۱۱/۲،طبع رشیدیه کوئٹه)

رجل حلف ان لا یضرب امراته فقرصها او عضها او خنقها او مد شعرها حنث فی یمینه قالوا هذا اذا لم یکن فی الملاعبة وان کان فی الملاعبة لا یحنث.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۱۵ صفر الخیر ۱۴۳۱ھ | فتویٰ نمبر: ۲۴۳۹

﴿غیر اللہ کی قسم کھانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے قسم کھائی کہ میرے باپ کی قسم میں امتحان نہیں دوں گی لیکن اب میں امتحان دینا چاہتی ہوں تو قسم توڑنے کا کیا کفارہ ادا کروں؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ غیر اللہ کی قسم ہونے کیوجہ سے مذکورہ قسم منعقد ہی نہیں ہوئی، لہذا آپ پر کوئی

کفارہ لازم نہیں، آپ امتحان دے سکتی ہیں، البتہ غیر اللہ کی قسم کھانے کی وجہ سے گناہ ہوا ہے، اس لئے توبہ واستغفار لازم ہے اور آئندہ غیر اللہ کی قسم کھانے سے اجتناب کریں کیونکہ غیر اللہ کی قسم کھانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، ایسی قسمیں کھانا گناہ ہے۔

لمافی الدرالمختار:(۷۰۵/۳،طبع ایچ ایم سعید کمپنی)

وهل يكره الحلف بغير الله تعالى؟قيل نعم للنهي وعامتهم لا،وبه افتوالاسيما في زماننا،وحملواالنهي على الحلف بغير الله لاعلى وجه الوثيقة كقولهم بابيك ولعمرك ونحوذلك عيني.

لمافی الهدایة:(۴۷۷/۲،طبع رحمانیه)

ومن حلف بغير الله لم يكن حالفاكالنبي والكعبة لقوله عليه السلام من كان منكم حالفابالله أوليذر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد ضیاء الدین

۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۸۸۹

﴿اپنے والد کو پیسے نہ دینے کی قسم کھانا﴾

﴿سوال﴾ ایک شخص قرآن کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ وہ اپنے والد کو پیسے نہیں دے گا جبکہ قسم کھانے کے بعد اپنے والد کو پیسے دے دیتا ہے، سوال یہ ہے کہ قرآن مجید کی قسم کھانے سے قسم منعقد ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اگر ہو جاتی ہے تو قسم توڑنے کا کفارہ کیا ہے؟ مستفتی محمد اسلم کمالیہ

﴿جواب﴾ والد کو پیسے نہ دینے کی قسم کھانا ناجائز بات کی قسم ہے اولاً تو اس طرح کی قسم کھانا گناہ ہے، اس سے پرہیز ضروری ہے اور اگر غلطی سے کسی نے اس طرح کی غلط قسم کھالی تو اس کا توڑنا ضروری ہے اور بعد میں اس کا کفارہ ادا کرنا بھی ضروری ہے۔

قسم صرف اللہ تعالیٰ کے نام کی کھانی چاہیے، تاہم قرآن مجید کی قسم کوئی کھائے تو شرعاً یہ بھی معتبر ہے۔

لمافی البحرالرائق:(۲۸٦/۴،طبع سعید)

وفي فتح القدير ثم لايخفى ان الحلف بالقرآن الآن متعارف فيكون يمينا.

ولمافی الدرالمختار:(۷۱۲/۳،طبع سعید)

(لا)يقسم(بغير الله تعالى كالنبي والقرآن والكعبة)قال الكمال:ولايخفى ان الحلف بالقرآن الآن متعارف فيكون يمينا.

قسم توڑنے کا کفارہ یہ ہے کہ دس محتاجوں کو دو وقت کا کھانا کھلا دے یا ان کو کپڑا پہنا دے اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو پھر تین دن کے لگا تار روزے رکھے۔

لمافی الهداية:(۲/۴۷۹،طبع رحمانیه)

(قال:كفارة اليمين عتق رقبة يجزى فيها ما يجزى فى الظهار وان شاء كسا عشرة مساكين كل واحد ثوبا فما زاد وادناه مايجوز فيه الصلاة وان شاء اطعم عشرة مساكين كالاطعام فى كفارة الظهار) والاصل فيه قوله تعالى فكفارته اطعام عشرة مساكين الاية وكلمة او للتخيير فكان الواجب احد الاشياء الثلاثة (قال فان لم يقدر على احد الاشياء الثلاثة صام ثلاثة ايام متتابعات)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:خضر حیات کمالوی

۱۸ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ　　　　فتویٰ نمبر:۱۰۰۸

﴿الفاظ قسم بولے بغیر قرآن پر ہاتھ رکھنے سے قسم نہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان شرع دین متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر یا قرآن مجید سر پر رکھ کر کہا کہ میں فلاں کام نہیں کرونگا، کیا اس سے قسم منعقد ہو جائیگی۔اور اگر وہ یہ کام کرے تو کفارہ واجب ہوگا یا نہیں؟

﴿جواب﴾ قرآن مجید پر ہاتھ رکھنا یا قرآن کریم سر پر رکھنا کوئی قسم نہیں ہے، البتہ قسم کے الفاظ بھی ساتھ بولے ہوں مثلاً کلام پاک کی قسم یا اس پر ہاتھ رکھ کر بولا ہو کہ اس کی قسم، اسکی حرمت کی قسم یا اسکی مار پڑے وغیرہ۔کہ آئندہ میں یہ فلاں کام نہیں کرونگا یا فلاں کام کرنا مجھ پر لازم ہے تو قسم منعقد ہو جاتی۔لیکن مذکورہ صورت میں قسم کا کوئی لفظ نہیں بولا۔اس لئے قسم منعقد نہیں ہوئی اور خلاف کرنے کی صورت میں کوئی کفارہ واجب نہ ہوگا۔

لما فى مجمع الانهر:(۲/۲۵۹، طبع:منار)

اليمين تقوية (أحد طرفى الخبر) من الفعل والترك (بالمقسم به)

ولما فى البحر:(۴/۲۷۷، طبع سعيد)

وعرفها فى الكافى بأنها عبارة عن تحقيق ما قصده من البر فى المستقبل نفيا أو اثباتا، وعرفها فى التبيين بأنها عقد قوى به عزم الحالف على الفعل أو الترك، وفى شرح النقاية بأنها تقوى الخبر بذكر الله أو بالتعليق۔۔۔۔وركنها اللفظ المستعمل فيها.

ولما فى البدائع:(۲/۵، طبع سعيد)

وأما ركن اليمين با الله تعالى فهو اللفظ الذى يستعمل فى اليمين بالله تعالى، وأنه

مركب من المقسم عليه والمقسم به ثم المقسم به قد يكون اسماً وقد يكون صفة

ولما في الهندية:(۲/۵۱، طبع رشيديه)

فاليمين في الشريعة عبارة عن عقد قوى به عزم الحالف على الفعل أو الترك وهي نوعان يمين بالله تعالى أو صفته ويمين بغيره أي بغير الله وهي تعليق الجزاء بالشرط، وأما اليمين بغير الله فنوعان أحدها اليمين بالآباء والانبياء.........

والثاني الشرط والجزاء، وهذا النوع ينقسم الى قسمين يمين بالقرب ويمين بغير القرب، وأما اليمين بالقرب فهو أن يقول ان فعلت كذا فعلي صوم.... وأما اليمين بغير القرب فهي الحلف بالطلاق والعتاق، وأما ركن اليمين بالله فذكر اسم الله أو صفته وأما ركن اليمين بغيره فذكر شرط صالح وجزاء صالح.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفی اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عمران الحق سواتی

۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ فتویٰ نمبر:

﴿لفظ بخدا سے قسم کھانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے اپنے دوست کی کسی بات پر تنقید کی اور بعد میں مجھے احساس ہوا اور تنقید کو نامناسب سمجھ لیا تو میں نے اس سے کہا بخدا میں آئندہ آپ کو ایسی بات نہیں کہوں گا جبکہ میں نے یہ کہتے ہوئے قسم کا ارادہ نہیں کیا تھا بلکہ بے دھیانی سے منہ سے یہ الفاظ جاری ہو گئے تو کیا ایسے کہنے سے قسم منعقد ہو جائے گی؟

﴿جواب﴾ لفظ بخدا کے ساتھ قسم کھانے سے قسم منعقد ہو جاتی ہے کیونکہ یہ لفظ فارسی میں لفظ اللہ کا ترجمہ ہے۔

لما في البحر الرائق:(۴/۲۸۱،طبع سعید)

(قوله:والیمین بالله تعالى والرحمن والرحيم وجلاله وكبريائه واقسم واحلف واشهد) بيان لالفاظ اليمين المنعقدة.

معلق قسم میں نیت وارادے کا اعتبار نہیں ہوتا ہے الفاظ قسم کے ساتھ قسم کھانے سے قسم منعقد ہو جاتی ہے خواہ اس نے قسم کھانے کا ارادہ کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

لما في فتح القدير:(۵/۵۱،طبع رشيديه)

(والقاصد في اليمين والمكره عليه والناسي) وهو من تلفظ باليمين ذاهلا عنه ثم تذكر انه تلفظ به وفي بعض النسخ الخاطي وهو من اراد ان يتكلم بكلام غير الحلف فجرى على لسانه اليمين فاذا حنث لزمته الكفارة (لقوله عليه الصلاة والسلام ثلاث جدهن

جدو هزلهن جد النكاح والطلاق واليمين. هكذا في البحر الرائق: (۲/ ۲۸۰، طبع سعيد) والتاتارخانية: (۲/ ۲۰۶، طبع قديمی). والهندية: (۲/ ۵۱، طبع رشيديه) والشامية: (۵/ ۴۷۹، طبع امداديه)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: خضر حیات کمالوی

۲۲ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۱۰۰۷

﴿کفارہ یمین کے روزے لگاتار رکھنا ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قدوری، کنز، ھدایہ وغیرہ میں مذکور ہے کہ کفارہ قسم کے روزے لگاتار رکھے جائیں جبکہ ایک مفتی صاحب نے بتایا کہ کفارہ یمین کے روزے متفرق طور پر بھی درست ہیں، لہٰذا مذکورہ مسئلہ کی وضاحت مطلوب ہے۔

﴿جواب﴾ کفارہ کے روزے متواتر رکھنا ضروری ہے، متفرق طور پر رکھنا درست نہیں ہے۔

لما في التنوير مع الدر: (۳/ ۷۲۷، طبع سعيد)

(صام ثلاثة أيام ولاء) ويبطل بالحيض بخلاف كفارة الفطر.

وفي الشامية: (قوله ولاء) بكسر الواو والمد: أي متتابعة لقراءة ابن مسعود وأبي فصيام ثلاثة أيام متتابعات (قوله بخلاف كفارة الفطر) أي كفارة الافطار في رمضان، فان مدتها لاتخلو غالبا عن الحيض.

ولما في البحر الرائق: (۴/ ۲۹۰، طبع سعيد)

(قوله وان عجز عن أحدها صام ثلاثة أيام متتابعة)... وشرطنا التتابع عملا بقراءة ابن مسعود متتابعات... كذا في الغاية وقيد بالتتابع لانه لو صام الثلاثة متفرقا لا يجوز له.

ولما في خلاصة الفتاوى: (۲/ ۱۲۵، طبع رشيديه)

كفارة المعسر صيام ثلاثة ايام متتابعات فلو حاضت المرأة في ثلاثة استقبلت بخلاف كفارة صيام رمضان والله اعلم..

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد وارث خان

۳ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۵۳۰

﴿قسم توڑنے پر کفارہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ جناب مفتی صاحب! ایک عورت کی وجہ سے مجھے بہت تکلیف پہنچی تھی تو میں نے قسم کھائی تھی کہ کبھی بھی اس عورت کو معاف نہیں کروں گی، بعد میں اس عورت کی موت کے وقت

اس کے بیٹوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں اسے معاف کردوں تو میں نے معاف کردیا، پوچھنا یہ ہے کہ مجھ پر کوئی کفارہ لازم ہوگا یا نہیں؟ مستفتیہ ایک سائلہ سکل ہائٹری

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں قسم توڑنے پر گناہ نہیں ہے بلکہ اس طرح کی قسم کو توڑنے میں ثواب ہے، تاہم کفارہ بہرصورت لازم ہے اور وہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو دونوں وقت کا کھانا کھلایا جائے یا دس مسکینوں کو کپڑا دیا جائے اور اگر اسکی طاقت نہ ہو تو تین روزے مسلسل رکھے جائیں۔

لمافی الهدایة:(۲/۴۷۹،طبع رحمانیه)

کفارة الیمین عتق رقبة یجزی فیهامایجزی فی الظهاروان شاء کساعشرة مساکین کل واحد ثوبافمازادوادناه یجوزفیه الصلاة وان شاء اطعم عشرةمساکین کالاطعام فی کفارة الظهارفان لم یقدرعلی احدالاشیاء الثلاثة صام ثلاثة ایام متتابعات.

ولمافی الکنزالدقائق:(ص۱۶۵ طبع قدیمی)

وکفارته تحریررقبة أواطعام عشرة مساکین کمافی الظهارأوکسوتهم بمایستر عامة البدن فان عجزعن احدهاصام ثلاثة ایام متتابعات.

ولمافی القدوری:(ص۲۲۳ طبع قدیمی)

وکفارة الیمین عتق رقبة یجزی فیهامایجزی فی الظهاروان شاء کساعشرةمساکین کل واحدثوبافمازادوادناه مایجوزفیه الصلاة وان شاء اطعم عشرة مساکین کالاطعام فی کفارة الظهارفان لم یقدرعلی احدهذه الاشیاء الثلاثة صام ثلاثة ایام متتابعات.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد وارث خان

۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۴۷۱

﴿کفارہ یمین میں ایک خاص صورت کی وضاحت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں اگر کوئی شخص قسم کا کفارہ اسطرح ادا کرے کہ بیس مسکینوں کو ایک ہی وقت کا کھانا کھلا دے یا دس مختلف مسکینوں کو دو وقت کھلا دے تو کیا اس سے کفارہ ادا ہو جائے گا؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ کفارہ یمین میں دس مسکینوں کو دو وقت کھانا کھلانا ضروری ہے یا ایک مسکین کو دس دن تک صبح شام کھانا کھلا دینا ضروری ہے اگر صبح ایک مسکین کو اور شام کے وقت کسی دوسرے مسکین کو کھلا دیا تو اس سے کفارہ ادا نہیں ہوگا، لہٰذا سوال میں ذکر کردہ پہلی صورت میں بیس مسکینوں کو ایک وقت کھلا دینے سے کفارہ ادا نہیں ہوگا، البتہ دوسری صورت میں دس مختلف

مسکینوں کو دو وقت کھلا دینے سے کفارہ ادا ہو جائے گا بشرطیکہ شام کو کھانے والے وہی ہوں جنہوں نے صبح کو کھایا تھا۔

لما فی الجوهرة النیرة:(۲/۲۵۲،طبع میر محمد)

وان غداعشرة وعشاعشرة غیرهم لم یجزیه وكذا اذاغدامسكینا وعشاغیره عشرة ایام لم یجزیه لانه فرق طعام العشرة علی عشرین فلم یحصل لكل واحدمنهم المقدار المقدر كمااذافرق حصة المسكین علی مسكینین.

ولما فی رد المحتار:(۳/۷۲۵،طبع سعید)

(قوله عشرة مساكین)ای تحقیقااو تقدیرا حتی لواعطی مسكیناواحدافی عشرة ایام كل یوم نصف صاع یجوز.....واذاغدامسكیناوعشی غیره عشرة ایام لم یجزه لانه فرق طعام العشرة علی عشرین كمااذافرق حصة المسكین علی مسكینین.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:رشید عالم مروت

۲۱ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ　　　　فتویٰ نمبر:۱۴۲۸

﴿قسم کا دار و مدار عرف پر ہوتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ میرے لئے کھانا لانا تو اس کے جواب میں میں نے یہ الفاظ کہے کہ" خدا کی قسم آج کے بعد آپ کیلئے کھانا بالکل نہیں لاؤں گا" پھر چند دنوں کے بعد میں اس کیلئے صرف روٹی لیکر گیا،اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا ان الفاظ کے کہنے کے بعد بغیر سالن کے روٹی لیجانے کیوجہ سے میں حانث ہو گیا ہوں؟ اگر ہاں تو پھر اس کا کفارہ کیا ہے؟ برائے مہربانی وضاحت فرمائیں۔

﴿جواب﴾ (۱)عام لوگ روٹی کو کھانا شمار کرتے ہیں ،لہذا روٹی لانے سے آپ نے قسم توڑ دی ہے اس لئے آپ حانث ہو گئے ہیں۔

لما فی البدائع :(۳/۱۲۰ دار العلم بیروت)

ولو حلف لایاكل طعاما فان ذالک یقع علی الخبز واللحم والفاكهة سوی التمر ونحو ذالک ویقع علی مایؤكل علی سبیل الادام مع الخبز ،لان الطعام فی اللغة اسم لمایطعم الاانه فی العرف اختص بما یؤكل بنفسه اومع غیره عادة.

لما فی الولوالجیة:(۲/۱۷۹ طبع فاروقیه پشاور)

ولو حلف لایاكل طعاما ینصرف الی كل مطعوم وهو مایطعم عادة خبزا كان اوفاكهة اولحما اوغیره.

(۲) اس کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو دو وقت کا کھانا کھلایا جائے یا دس مسکینوں کو کپڑا دیا جائے اور اگر اس کی طاقت نہ ہو تو تین روزے مسلسل رکھے جائیں۔

لما فی الهداية: (۲/۴۱۷ طبع رحمانیہ)
كفارة اليمين عتق رقبة يجزي فيها ما يجزي في الظهار وان شاء كسا عشرة مساكين كل واحد ثوبا فما زاد وادناه ما يجوز فيه الصلوة ان شاء اطعم عشرة مساكين كالاطعام في كفارة الظهار ـــ فان لم يقدر على احد الاشياء الثلثة صام ثلثة ايام متتابعات.

لما في الهندية: (۲/۶۱ طبع رشیدیہ)
ان قدر عتق رقبة يجزي فيما يجزي في الظهار أو كسوة عشرة مساكين لكل واحد ثوب فما زاد وادناه ما يجوز فيه الصلوة أو اطعامهم والطعام فيها كالاطعام في كفارة الظهار ـــ والاصح أنه يجزي التكفير بالصوم كذا في المبسوط

واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری غفرلہ ولوالدیہ
الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ
فتویٰ نمبر: ۳۲۲۷
۸ رجب المرجب ۱۴۲۵ھ

﴿کتاب النذر﴾

﴿منت ماننے کے مسائل﴾

﴿نذر میں دار و مدار الفاظ پر ہوتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے دل میں یہ کہا کہ اگر میرا یہ پیر اچھا ہو گیا تو میں ایک دن کا روزہ رکھوں گی لیکن غلطی سے میری زبان سے یہ نکل گیا کہ ایک مہینے کا روزہ رکھوں گی تو اب پیر اچھا ہونے کے بعد مجھ پر ایک روزہ رکھنا ضروری ہے یا ایک مہینہ؟ اگر ایک مہینہ ہو تو پھر مسلسل رکھنا ضروری ہے یا نہیں؟ حالانکہ میری نیت نہ تو پورا مہینے کی تھی اور نہ ہی تسلسل کی۔

مستفتی: ایک محلہ حیدرآباد

﴿جواب﴾ نذر میں دار و مدار الفاظ پر ہوتا ہے نیت کا اتنا دخل نہیں ہوتا، لہٰذا مذکورہ صورت میں آپ پر ایک مہینے کے روزے رکھنا ضروری ہے البتہ اس میں آپ کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ پورے مہینے کے روزے آپ ایک ساتھ لگاتار رکھیں یا ایک ایک کر کے رکھ لیں۔

لما في الشامي: (۲/۴۲۳ مطلب في الكلام على النذر، طبع سعيد)
قال في شرح الملتقى والنذر عمل اللسان ـــ سواء قصد ما تلفظ به او لا ولهذا قال في

الولوالجیہ: رجل اراد ان یقول للہ علی صوم یوم فجری علی لسانہ صوم شہر کان علیہ صوم شہر بحراہ، وکذا لو اراد ان یقول کلاما فجری علی لسانہ النذر لزمہ لان هزل النذر کالجد کالطلاق.

ولما فی الهندیہ:(۲۰۹/۱، الباب السادس فی النذر، طبع رشیدیہ)

ولو قال للہ علی ان صوم شهرا متتابعاً لزمہ التتابع، وان اطلق بخیر۔ولو قال للہ علی ان اصوم یومین او ثلاثة او عشرة لزمہ ذلک ویعین وقتا یودی فیہ فان شاء فرق وان شاء تابع الا ان ینوی التتابع عند النذر فحینئذ یلزمہ متتابعاً.

ولما فی تنویر الابصار مع الدر:(۷۳۵/۳، کتاب الایمان مطلب فی احکام النذر، طبع سعید)

ومن نذر نذراً مطلقا او معلقا بشرط وکان من جنسہ واجب وهو عبادة مقصودة ووجد الشرط المولق بہ لزم الناذر لحدیث "من نذر وسمی فعلیہ الوفاء بما سمی".

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد تنویر عفا اللہ عنہ

۱۹ جمادی الثانیہ ۱۴۳۲ھ　　　　فتوی نمبر: ۳۸۰۳

﴿وجود شرط سے پہلے نذر ادا کرنا﴾

﴿سوال﴾ زید نے کہا کہ اگر میرا بیٹا سفر سے بخیریت واپس آ گیا تو میں اتنی رقم اللہ کے نام پر دوں گا، اب اگر وہ بیٹے کے آنے سے پہلے ہی نذر دیدے تو کیا اس سے نذر ادا ہو جائے گی یا نہیں؟ یا بیٹے کے آنے کے بعد نذر پوری کرنا ضروری ہے؟　　　　مستفتی محمد اسلم

﴿جواب﴾ نذر کو جب کسی شرط کے ساتھ معلق کیا جائے تو شرط پائے جانے سے پہلے نذر واجب نہیں ہوگی، ادائیگی کی صورت میں نفل شمار ہوگی، لہٰذا مذکورہ صورت میں زید بیٹے کے آنے سے پہلے نذر دینے سے فارغ الذمہ نہیں ہو سکتا بلکہ بیٹے کے آنے کے بعد زید کو دوبارہ نذر پوری کرنی ہوگی۔

لما فی بدائع الصنائع:(۹۳/۵، طبع سعید)

وان کان معلقاً بشرط نحو ان یقول ان شفی اللہ مریضی أو ان قدم فلان الغائب فللہ علیٰ أن أصوم شہراً أو أصلی رکعتین أو أتصدق بدرهم ونحو ذلک فوقتہ وقت الشرط فما لم یوجد الشرط لا یجب بالاجماع ولو فعل ذلک قبل وجود الشرط یکون نفلا لان المعلق بالشرط عدم قبل وجود الشرط وهذا لان تعلیق النذر بالشرط هو اثبات النذر بعد وجود الشرط کتعلیق الحریة بالشرط اثبات الحریة بعد وجود الشرط فلا یجب قبل وجود الشرط لانعدام السبب قبلہ وهو النذر فلا یجوز تقدیمہ علی الشرط لأنہ یکون اداء قبل الوجوب وقبل وجود سبب الوجوب فلا یجوز کما لا یجوز التکفیر قبل الحنث لأنہ شرط ان یودیہ بعد وجود الشرط

فيلزمه مراعاة شرطه لقوله عليه الصلوة والسلام: المسلمون عند شروطهم۔

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ
واللہ اعلم: صلاح الدین ایروی

۱۶ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ
فتوی نمبر: ۱۴۶

﴿نذر کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ ایک عورت نے نذر مانی کہ فلاں دن مثلاً ہفتے کے دن میں سو رکعت نفل نماز پڑھوں گی پھر جب وہ دن آیا تو عورت حائضہ ہوگئی تو کیا یہ نذر اب اس سے ساقط ہو جائے گی یا قضا کرنی ہوگی؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اس عورت پر نذر کی قضا لازم ہے کیونکہ حیض کا آنا نماز کے ادا کرنے سے مانع ہے نذر کے وجوب سے مانع نہیں لہٰذا جب پاک ہو جائے تو قضا کرے۔

لما في التنوير مع الدر: (۲/۲۲ طبع ایچ ایم سعید)

(ولو نذرت عبادة كصوم وصلاة (في غد فحاضت فيه يلزمها قضاؤها) لأنه يمنع الأداء لا الوجوب۔

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ
واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

۲۸ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ
فتوی نمبر: ۴۸۷

﴿نذر ماننے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ منت ماننا کیسا ہے جائز یا ناجائز؟ اس کے صحیح ہونے کے لئے کوئی شرط ہو تو تحریر کریں اگر قرآن خوانی کی نذر مانی ہو تو اس کو پورا کرنا لازم ہوگا یا نہیں؟ مستفتی: خلیل الرحمٰن کورنگی

﴿جواب﴾ اللہ تعالیٰ کے نام کی منت ماننا جائز ہے مگر اس سے بہتر یہ ہے کہ بغیر منت کے صدقہ وخیرات کی جائے، منت صحیح ہونے کے لئے چند شرطیں ہیں:

(۱) کہ منت اللہ تعالیٰ کے نام کی مانی جائے غیر اللہ کے نام کی منت جائز نہیں بلکہ گناہ ہے۔

(۲) کہ منت صرف عبادت کے کام کی صحیح ہے جو کام عبادت نہیں اس کی منت بھی صحیح نہیں ہے۔

(۳) کہ عبادت بھی ایسی ہو کہ اس طرح کی عبادت کبھی فرض یا واجب ہوتی ہے، جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ، اور عبادت مقصودہ ہو، لہٰذا ایسی عبادت کہ اس کی جنس کبھی فرض یا واجب نہیں جیسے مریض کی عیادت یا مقصود ہی نہیں جیسے تکفین میت وغیرہ تو اس کی منت بھی صحیح نہیں، مروجہ

قرآنی خانی عبادت مقصودہ نہیں ہے، لہذا مروجہ قرآن خوانی کی نذر مانی ہو تو وہ لازم نہیں ہوتی اور نہ اس کا پورا کرنا واجب ہے، البتہ خود قرآن کریم کی تلاوت کرے تو نذر پوری ہو جائیگی۔

لمافی المشکوٰۃ:(۲۹۷/۱، باب فی النذور، طبع سعید)

عن ابی هريرة وابن عمر قالا قال رسول الله صلی الله عليه وسلم(لا تنذروا فان النذر لا يغنی من القدر شيئا وانما يستخرج به من البخيل) متفق عليه: وعن عائشة ان رسول الله صلی الله عليه وسلم قال(من نذران يطيع الله فليطعه ومن نذران يعصيه فلا يعصه) روه البخاری.

لمافی الشامی:(۳۸/۲، طبع سعید)

(قوله لم يلزمه) وكذالو نذر قراءة القرآن وعلله القهستانی فی باب الاعتكاف بأنها للصلاة...... قلت وهو مشكل فان القراءة عبادة مقصودة ومن جنسها واجب.

ولمافی البحرالرائق:(۲۹۲/۲، طبع سعید)

واعلم بأنهم صرحوا بأن شرط لزوم النذر ثلاثة كون المنذور ليس بمعصية وكونه من جنسه واجب وكون الواجب مقصودا لنفسه الیٰ قوله وكذالو نذر سجدة التلاوة وفی الواقعات ولو نذر تكفين ميت لم يلزم لأنه ليس بقربة مقصودة كالوضوء الی قوله واما الاعتكاف وهو اللبث فی مكان من جنسه واجب وهو القعدة الأخيرة فی الصلاة.

ولمافی التنویر مع الدر:(۵/۵۱۵تا ۵۱۸، طبع امدادیہ)

(ومن نذر نذرا مطلقا أو معلقا بشرط وكان من جنسه واجب وهو عبادة مقصودة) خرج الوضوء وتكفين الميت(ووجد الشرط لزم الناذر كصوم وصلاة وصدقة واعتكاف(ولم يلزم) الناذر ماليس من جنسه فرض كعيادة مريض وتشييع جنازة ودخول مسجد) ولو مسجد الرسول صلی الله عليه وسلم أو الاقصی لانه ليس من جنسها فرض مقصود وهذا هو الضابط كما فی الدرر وفی البحر شرائطه خمس فزاد ان لا يكون معصية لذاته.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۲۵۴

﴿نذر کے روزوں میں تسلسل کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ایک شخص نذر مانے کہ میرا فلاں کام ہو جائے تو میں دس روزے یا آٹھ روزے رکھوں گا پھر وہ کام پورا ہو جائے تو کیا اب نذر کے روزے تسلسل سے رکھنا ضروری ہے یا بغیر تسلسل کے بھی رکھ سکتے ہیں؟

﴿جواب﴾ اگر نذر مانتے وقت تسلسل سے روزے رکھنے کی نیت نہیں کی تو متفرق طور پر

بھی رکھ سکتے ہیں ورنہ تسلسل سے رکھنا لازمی ہے۔

لمافی الهندية:(۱/۲۱۰،طبع رشیدیه)

ولوقال لله علی ان اصوم شهرامتتابعالزمه التتابع وان اطلق یخیر.

ولمافی فتاوی قاضیخان:(۱/۲۱۸،طبع قدیمی)

وعن ابی جعفرؒ لوقال لله علی صوم مثل شهر رمضان قال ان ارادمثله فی الوجوب فله ان یفرق وان ارادفی التتابع فعلیه ان یتابع.

ولمافی الدرالمختار مع الرد:(۲/۴۳۵،طبع سعید)ولونذرصوم شهرغیرمعین متتابعا.

وفی الشامية:(قوله متتابعا)افادلزوم التتابع ان صرح به وکذااذانواه امااذالم یذکره ولم ینوه ان شاء تابع وان شاء فرق.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: اسرار عزیز

۱۴ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۹۸۹

﴿مسجد کے لئے نذر ماننے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے متعلق کہ میں نے نذر مانی کہ یہ بکرا بیچ کر اس کی رقم مسجد کی ضروریات میں خرچ کروں گا ایک ماہ گذرنے کے بعد بکرا مر گیا اب میرے لئے شرعا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔　　　　مستفتی: فضل الٰہی ایردی

﴿جواب﴾ مذکورہ بالا صورت میں آپکا نذر ماننا درست نہیں کیونکہ نذر عبادت مقصودہ کی مانی جاتی ہے نہ کہ عبادت غیر مقصودہ کی اور مسجد میں رقم خرچ کرنے کی نذر عبادت غیر مقصودہ ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں آپ پر کچھ بھی لازم نہیں ہوتا ہاں خرچ کرنا چاہیں تو اللہ تعالیٰ کے گھر میں رقم خرچ کرنے کا ثواب ملیگا لیکن اس کو نذر نہ کہا جائے۔

لمافی بدائع الصنائع:(۵/۸۲،طبع ایچ ایم سعید)

ومنهاان یکون قربة مقصودة فلایصح النذربعیادة المرضی وتشییع الجنائزوالوضوء والاغتسال ودخول المسجدومس المصحف والاذان وبناالرباطات والمساجدوغیر ذلک وان کانت قربالانهالیست بقرب مقصودة.

ولمافی الفقه الاسلامی:(۳/۴۷۱،طبع دارالفکربیروت)

فلایصح النذربعیادة المرضی وتشیع الجنائزوالوضوء وتکفین المیت والاغتسال ودخول المسجدومس المصحف والاذان وبناالرباطات والمساجد ونحوهاالان هذه الاموروان کانت قربالله الاانهالیست قربامتصودة لذاتهاعادة ومن المعلوم ان النذر

قربة مقصودة لذاتها كاليمين فلا يصح نذر ما ليس عبادة او طاعة مقصودة

ولما في فتح القدير: (۴/۳۷۲ مطبع رشیدیه کوئٹه)

ومنها (اى طاعة مقصودة للشئ) او من جنسها واجب الشروط لزوم النذر فخرج النذر بالوضوء لكل صلوة فانه لا يلزم لانه غير مقصودة وكذا النذر بعيادة المريض لانه ليس من جنسه واجب

ولما في الشامي: (۵/۵۱۸ مطبع امدادیه ملتان)

المنذور اذا كان له اصل في الفروض لزم الناذر كالصوم والصلاة والصدقة والاعتكاف وما لا اصل له في الفروض فلا يلزم الناذر كعيادة المريض وتشييع الجنازة ودخول المسجد وبناء القنطرة والرباط والسقاية ونحوها هذا هو الاصل الكلي.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ولی اللہ ڈیروی

۱۳ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۶۷۲

﴿کسی بزرگ کی قبر کی زیارت کی نذر ماننے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے اپنے ایک اہم کام کے لیے نذر مانی تھی کہ اگر میرا فلاں کام ہوگیا تو فلاں بزرگ کی قبر کی زیارت کے لیے جاؤں گی اب میرا کام ہوگیا ہے تو کیا میرے لیے ضروری ہے کہ بزرگ کی قبر کی زیارت کو جاؤں؟ نیز مفتی صاحب کیا شرعاً نذر ماننا درست ہے؟ مستفتیہ: ام عدنان

﴿جواب﴾ نذر صرف اللہ کے نام کسی مقصودی عبادت کی مانی جاتی ہے بزرگوں کی قبر کی زیارت کوئی مقصودی عبادت نہیں ہے بلکہ عورتوں کے لیے عام حالات میں بزرگوں کی قبروں کی زیارت کے لیے جانا عبادت نہیں گناہ ہے، لہٰذا اس پر توبہ واستغفار کریں آئندہ کے لیے کوئی اہم کام درپیش ہو تو صلوٰۃ حاجت اور صدقہ کے ذریعے حل کرانے کی کوشش کریں اور اس کے لیے نذر ماننا بھی جائز ہے لیکن صرف اللہ کے نام غریبوں کو صدقہ یا نوافل وغیرہ کی نذر مانا کریں۔

لما في الترمذي: (۱/۱۸۵: طبع فاروقی).

عن ابي هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تنذروا فان النذر لا يغني من القدر شيئا وانما يستخرج من البخيل،

ولما في التنوير الابصار (۳/۷۳۵: طبع سعید).

ومن نذر نذرا مطلقا او معلقا بشرط وكان من جنسه واجب وهو عبادة مقصودة ووجد الشرط لزم الناذر،

ولما فی البدائع الصنائع (۸۲/۵ طبع سعید).

ومنها ان یکون قربة فلا یصح النذر بما لیس بقربة..... ومنها ان یکون قربة مقصودة فلا یصح النذر بعیادة المرضى وتشييع الجنائز والوضوء.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ناجد محمود کہوٹہ

۲۶ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ — فتوی نمبر: ۳۶۰۵

﴿نذر کے روزوں میں تسلسل کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے نذر مانی کہ اگر میرا یہ کام ہوگیا تو میں پندرہ دن مسلسل روزے رکھوں گا، اس کا وہ کام ہو جاتا ہے، اب اس پر مسلسل روزے رکھنا واجب ہے یا متفرق طور پر بھی رکھ سکتا ہے؟ مستفتی: سعید احمد

﴿جواب﴾ جب نذر مانی ہے کہ مسلسل روزے رکھوں گا تو مسلسل رکھنا لازم ہوں گے۔

لما فی الهندية: (۲۱۰/۱ طبع رشیدیه)

ولو قال لله على ان اصوم شهرا متتابعا لزمه التتابع وان اطلق يخير.

ولما فی الشامی: (۲۳۶/۲ طبع سعید)

ولو اوجب على نفسه صوما متتابعا فصامه متفرقا لم يجز وعلى عكسه جاز.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالستار

۳ رجب المرجب ۱۴۲۸ھ — فتوی نمبر: ۱۰۵۱

﴿نذر کا مصرف﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص نے نذر مانی تھی کہ اللہ تعالیٰ میرا یہ مقصد پورا کر دے تو میں اتنی رقم کسی غریب کو دونگا پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے وہ مقصد پورا کر دیا اور اس نے وہ پیسے ایک غریب شخص کو دیدیئے لیکن وہ شخص سید تھا، سید کو نذر کے پیسے دے سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو دوبارہ ادا کرنا ضروری ہے؟

﴿جواب﴾ نذر کا مصرف وہی ہے جو زکوۃ کا مصرف ہے نذر کے پیسے بھی کسی سید کو نہیں دے سکتے، لہٰذا سید کو نذر کے پیسے دینے سے نذر ادا نہیں ہوئی دوبارہ ادا کرنا ضروری ہے۔

لما فی المبسوط السرخسی: (۱۲/۳ طبع دار المعرفة)

وكذلك لو صرفها الى هاشمي او مولى هاشمي وهو يعلم بحاله لا يجوز لقوله ﷺ لا تحل

الصدقة لمحمد ولا لآل محمد ﷺ

ولما فی الھندیة:(۱/۱۸۹،طبع رشیدیه)

ولایدفع الی بنی هاشم هذا فی الواجبات کالزکاة والنذر والعشر والکفارة فأما التطوع فیجوز الصرف الیهم

ولما فی الدر المختار:(۲/۳۳۱،طبع سعید)

مصرف الزکاة وهو مصرف أیضا لصدقة الفطر والکفارة والنذر وغیر ذلک من الصدقات الواجبة

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: فرمان اللہ غفرلہ اللہ

۳۰ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۱۰۲۰

﴿نذر شدہ چیز واجب التصدق ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے ایک واقعہ کی وجہ سے یہ نذر مانی کہ میرا بیٹا اگر ٹھیک ہوگیا تو میں ایک بکری اللہ کی رضا کیلئے ذبح کرونگا اب وہ آدمی خود اس نذر میں سے کچھ کھا سکتا ہے کہ نہیں؟　　　　مستفتی: عارف شاہ خان

﴿جواب﴾ نذر شدہ چیز واجب التصدق ہے، اسکا مصرف فقراء و مساکین ہیں اس لئے نذر سے اغنیاء کو کھلانا جائز نہیں ہے اور نہ وہ شخص خود کھا سکتا ہے اگرچہ وہ فقیر ہی کیوں نہ ہو۔

لما فی التنویر مع الدر:(۶/۳۲۰-۳۲۱،طبع ایچ ایم سعید کمپنی)

(ناذر)فاعل تصدق (المعینة)ولو فقیرا أولو ذبحها تصدق بلحمها ولو تصبها تصدق بقیمة النقصان أیضا ولا یأکل الناذر منها فان أکل تصدق بقیمة ما أکل.

ولما فی الشامی:(۶/۳۲۷،طبع ایچ ایم سعید کمپنی)

(قوله ولا یأکل من لحم الأضحیة الخ)هذا فی الأضحیة الواجبة والسنة سواء اذا لم تکن واجبة بالنذر وان وجبت به فلا یأکل منها شیئا ولا یطعم غنیا سواء کان الناذر غنیا أو فقیرا لأن سبیلها التصدق ولیس للمتصدق ذلک ولو أکل فعلیه قیمة ما أکل.

ولما فی خلاصة الفتاوی:(۴/۳۲۰،طبع رشیدیه)لا یأکل الناذر منها ولو أکل منها فعلیه قیمتها.

ولما فی بدائع الصنائع:(۵/۶۸،طبع سعید)

وکذلک لو أوجب علی نفسه أن یتصدق بها لا یأکل منها اذا ذبحها بعد وقتها أو فی وقتها سواء

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: علی خان غفرلہ ولوالدیہ

۱۷ صفر الخیر ۱۴۳۱ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۳۵۹

﴿نذر کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک آدمی نے نذر مانی کہ "میں ایک خاص جانور (مثلاً بکرا) ذبح کر کے صدقہ کروں گا" پھر اس کا ارادہ یہ ہوا کہ کسی غریب کو وہ جانور زندہ دیدے تو کیا شرعی نقطہ نظر سے وہ زندہ جانور کسی غریب کو دے سکتا ہے؟ کیا اس سے نذر پوری ہو جائیگی؟

﴿جواب﴾ جائز ہے، نذر ادا ہو جائیگی۔

لما فی التنویر مع الدر:(۲/۷۴۱، طبع سعید)

(نذران یتصدق بعشرۃ دراہم من الخبز فتصدق بغیرہ جازان ساوی العشرۃ) کتصدقہ بثمنہ.

وفی الشامیۃ [تنبیہ] انما لم یختص فی النذر بزمان ونحوہ خلافا لزفر لان لزوم ماالتزمہ باعتبار ماہو قربۃ لاباعتبارات اخر لادخل لھافی صیرورتہ قربۃ کمامر.

ولما فی التنویر مع الدر:(۲/۷۴۱-۷۴۰، طبع سعید)

(ولو قال ان برئت من مرضی ھذا ذبحت شاۃ اوعلی شاۃ اذبحھا فبرئ لایلزمہ شئ) لان الذبح لیس من جنسہ فرض بل واجب کالاضحیۃ (فلا یصح) (الا اذا زاد وتصدق بلحمھا فیلزمہ) لان الصدقۃ من جنسھا فرض وھی الزکوٰۃ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: خالد الرحمٰن کرکی

۱۱ رجب المرجب ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۳۸۶

﴿ظالمانہ ٹیکس سے نجات کیلئے نذر ماننا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس بارے میں کہ ٹیکس وصول کرنے والے مجھ سے ایک لاکھ روپے کا مطالبہ کر رہے تھے تو میں نے ان سے خلاصی کیلئے یہ نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس ظالمانہ ٹیکس سے نجات دی تو میں پچاس ہزار روپے اللہ کی راہ میں صدقہ کرونگا، پھر سفارش وغیرہ کے ذریعہ وہ ایک لاکھ کے بجائے ۲۲ ہزار پر راضی ہو گئے۔ پوچھنا یہ ہے اب بھی نذر کے وہ پچاس ہزار میرے ذمے ہے یا نہیں؟ مستفتی: ڈاکٹر حازم صاحب

﴿جواب﴾ ٹیکس وصول کرنے والے آپ سے ایک لاکھ کا مطالبہ کر رہے تھے جس کو ایک ظالمانہ ٹیکس سمجھ کر اس سے خلاصی کیلئے آپ نے پچاس ہزار کی نذر بھی مان لی تھی، پھر ۲۲ ہزار روپے میں آپ کو اس سے نجات مل گئی۔

اب دیکھنا یہ ہوگا کہ آپ جیسے آمدنی والے کا ٹیکس بلا کسی رشوت ۲۲ ہزار کے لگ بھگ بنتا ہے یا نہیں؟ اگر آپ کی آمدنی جیسی آمدنی سے بلا کسی رشوت ۲۲ ہزار کے لگ بھگ ٹیکس وصول کیا جاتا ہے پھر تو آپ کی منت گویا پوری ہوگئی یعنی آپ کو ظلم سے نجات مل گئی ہے، لہذا پچاس ہزار نذرانے کے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا آپ پر لازمی ہے، اور اگر اس جیسی آمدنی سے یہ ٹیکس وصول نہیں کیا جاتا ہے تو منت پوری نہ ہونے کی وجہ سے نذرانے کے پچاس ہزار صدقہ کرنا لازمی نہیں ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۷۳۸/۳ طبع ایچ ایم سعید)

ومن نذر نذراً مطلقا بشرط أو معلقا بشرط وكان من جنسه واجب وهو عبارة مقصودة ووجد الشرط لزم الناذر كصوم وصلاة وصدقة ... ثم ان المعلق فيه تفصيل فان علقه بشرط يريده كأن قدم غائبي أو شفي مريضي يوفي وجوبا ان وجد الشرط.

لما فی الفقه الاسلامی وادلته:(۲۵۶۷/۳ طبع رشیدیه کوئٹه)

واما اذا كان المنذور معلقا بشرط: ان شفى الله مريضي أو ان قدم فلا نالغائب فلله على صوم شهر او صلاة ركعتين أو التصدق بليرة ونحوه فان وجد الشرط فعليه الوفاء بالنذر نفسه، لأن المعلق بالشرط كالمنجز فلو فعل المشروط قبل وجود الشرط يكون نفلاً.

لما فی التاتارخانیة:(۲۱/۵ طبع قدیمی)

وأما اذا كان المنذور معلقا بالشرط وانه على وجهين ايضاً ان كان شرطا يريدوجوده اما لجلب المنفعة أو لدفع المضرة بأن قال" ان مريضي فان ردالله غائبي فان مات عدوي فعلي صوم سنة" فوجد الشرط يلزمه الوفاء بالمسمى ولا يخرج عن العهدة بالكفارة بلا خلاف.

لما فی الشامی:(۸۲۲/۳ طبع ایچ ایم سعید)

ورأيت في طلاق الذخيرة في ترجمة المسائل التي ينظر فيها الى شرط البر: وهب لرجل مالا فقال الواهب امرأتي طالق ثلاثا ان انفقت هذ المال الذي وهبتك الا على اهلك ثم انه انفق بعضه على أهله وقضى بالباقي دينا أوحج أو تزوج لا تطلق امرأة الحالف ذكره خواهرزاده في شرح الحيل وعلله بأن شرط بره انفاق جميع الهبة على أهله فيكون شرط حنثه ضد ذالك وهو انفاق جميعها على غيرهم ولم يوجد.

وفيه ايضاً.

لو حلف لا يأخذ ماله على فلا ن الاجميعا وأخذ البعض دون البعض لا يحنث لأن شرط بره أخذ جميع الدين جملة فيكون شرط حنثه ضد ذالك وهو اخذ جميع الدين متفرقا ولم يوجد ذالك، وحاصله أنه لا يحنث بمجرد قبض البعض جملة أو متفرقا مالم يقبض الباقي كما مر فاذا ترك البعض بأن لم يقبضه اصلا بابراء او بدونه لم

ينعقد لعدم شرطه وهو المعنى لله علي ... أى منه الله.

الجواب صحیح: مفتی محمد الرحمن مدظلہ واللہ اعلم بالصواب: محمد عبد الحمید دار الافتاء دار العلوم

۲۸ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ فتویٰ نمبر: ۲۰۷

﴿عرفاً نذر کیلئے مستعمل صیغوں سے بھی نذر منعقد ہو جاتی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے کوئی کام درپیش تھا، جس کے پورے ہونے کیلئے میں نے یہ الفاظ کہے ''میرا یہ کام ہو گیا تو میں دس رکعات نفل نماز پڑھوں گا'' ان الفاظ سے میری نذر کی کوئی نیت نہیں تھی اور پھر میرا وہ کام ہو گیا، اب کیا نذر پوری کرنا میرے ذمہ لازم ہے یا نہیں؟ برائے مہربانی وضاحت فرمائیں۔

﴿جواب﴾ نذر صحیح ہونے کیلئے جملہ میں لزوم کے صیغوں کا موجود ہونا شرط ہے اس کے بغیر نذر منعقد نہیں ہوتی۔ البتہ ایسا جملہ جو عرفاً نذر ہی کیلئے بولا جاتا ہو تو اس میں لزوم کے صیغے اگرچہ نہ ہوں، لیکن استحساناً نذر صحیح ہو جاتی ہے، لہذا آپ کے ذمہ روزے رکھنا لازم ہے۔

لمافی الدر مع الرد:(۳/۱۲۲طبع سعید)

فان الأيمان مبنية على العرف فما تعورف الحلف به فيمين وما لافلا وفى الشامية فان الأيمان مبنية على العرف فما يتعارف الناس الحلف به يكون يمينا وما لافلا.

لمافی البزازية على الهندية:(۳/۲۷۲طبع رشيديه كوئته)

ان عوفيت صمت كذا لم يجب مالم يقل لله علي وفى الاستحسان يجب وان لم يكن تعليقا لا يجب قياسا واستحسانا كما اذا قال انا احج فلا شئى ولو قال ان فعلت كذا فانا احج ففعل يجب عليه الحج.

لما فى الشامى:(۳/۷۳۵طبع سعيد)

وانما ذكر النذر فى الأيمان لما يأتى من انه لو قال على نذر ولا نية له لزمه كفارة ومر فى آخر كتاب الصيام انه لو نذر صوما فان لم ينو شيأ أو نوى النذر وأن لا يكون يمينا كان نذرا .... وان نواهما أو نوى اليمين كان نذرا أو يمينا.

لمافى الشامى:(۳/۷۴۰طبع سعيد)

فأفاد ان عدم الصحة لكون الصيغة المذكورة لا تدل على النذر أى لأن قوله نبحت شاة وعد لا نذر ويؤيده ما فى البزازية لو قال ان اسلم ولدى أصوم ما عشت فهذا وعد لكن فى البزازية أيضا ان عوفيت صمت كذا لم يجب مالم يقل لله على وفى الاستحسان يجب ولو قال ان فعلت كذا فانا احج ففعل يجب عليه الحج، فعلم ان

تعليل الدرر مبنی علی القياس والاستحسان خلافه.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری غفرلہ ولوالدیہ

۱۲ رجب المرجب ۱۴۳۵ھ   فتویٰ نمبر ۴۲۳۹

﴿نذر معلق کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ مصیبت میں مبتلا شخص نے نذر مانی کہ اللہ میاں اس مصیبت سے نجات دے تو ختم قرآن کرونگا اور اسکی مصیبت رفع ہوگئی، پوچھنا یہ ہے کہ اس صورت میں ایفاء واجب ہے یا نہیں؟ اگر واجب ہے تو اُجرت لیکر پڑھنے والے پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟   مستفتی: محمد اکرام

﴿جواب﴾ نذر ایسی چیز کی صحیح ہوتی ہے جو کہ عبادۃ مقصودہ ہو اور جنس واجب سے ہو چنانچہ قراءت قرآن بھی ایسی عبادت ہے چونکہ قراءت نماز میں فرض ہے تو قراءتِ قرآن کی نذر بھی صحیح ہوگی، لہٰذا اس صورت میں نذر پوری کرنا ضروری ہے، دوسرے سے اُجرت پر قرآن ختم کرانا (پڑھوانا) معصیت ہے اس سے پرہیز ضروری ہے، لہٰذا خود پڑھنا ضروری ہے، دوسرے سے نہ پڑھوائے۔

لمافی الشامی: (۳/ ۷۳۸، طبع سعید)

(قوله لم يلزمه) وكذالونذرقراءة القرآن وعلله القهستاني في باب الاعتكاف بأنها للصلاة.....قلت وهومشكل فان القراءة عبادة مقصودةومن جنسهاواجب.

ولمافی البحرالرائق: (۲/ ۲۹۴، طبع سعید)

واعلم بأنهم صرحوابأن شرط لزوم النذرثلاثة كون المنذورليس بمعصية وكونه من جنسه واجب وكون الواجب مقصودالنفسه الى قوله وكذالونذرسجدة التلاوة وفى الواقعات ولونذرتكفين ميت لم يلزم لأنه ليس بقربة مقصودة كالوضوء الى قوله واما الاعتكاف وهواللبث فى مكان من جنسه واجب وهوالقعدة الأخيرة فى الصلاة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: ظہور احمد شمس

یکم جمادی الاولی ۱۴۲۹ھ   فتویٰ نمبر: ۱۳۷۱

﴿منت کے روزے اگر نہ رکھ سکے تو فدیہ ادا کرے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا بچہ گم ہوگیا تھا، میری بیوی نے یہ منت مانی کہ اگر میرا بچہ مل جائے تو میں تین مہینے روزے رکھونگی، اب

میرا بچہ مل گیا ہے لیکن میری بیوی بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے روزے نہیں رکھ سکتی، لہٰذا اس کا فدیہ کیا ہوگا؟
مستفتی: عزت رحمٰن بنارس قصبہ کالونی کراچی

﴿جواب﴾ ایسی صورت میں ہر ایک روزہ کے بدلہ میں فدیہ دیا کریں اور ہر مہینہ ۳۰ دن کا شمار کیا جائیگا، فدیہ دینے کی تفصیل یہ ہے کہ ہر ایک دن کے بدلے کسی مسکین کو پیٹ بھر کر صبح وشام کا کھانا کھلائیں یا ۹۰ دن کے بدلے ۱۸۰ کلو گندم یا اسکی قیمت اسکو دے جسکو زکوٰۃ دی جاسکتی ہو۔

لمافی الدر المختار: (۴۲۶/۲، طبع سعید)

لو نذر صوم الأبد فضعف عن الصوم لاشتغاله بالمعيشة له ان يطعم ويفطر لأنه استيقن انه لا يقدر على القضاء.

ولمافی خلاصة الفتاوى: (۲۲۵/۱، طبع رشیدیه)

لو نذر ان يصوم ابداله ان يفطر ويتصدق لكل يوم نصف صاع من الحنطة.

ولمافی بدائع الصنائع: (۹۱/۵، طبع سعید)

لو نذر الشيخ الفاني بالصوم يصح نذره وتلزمه الفدية لانه عاجز عن الوفاء بالصوم حقيقة فيلزمه الوفاء به تقدير ابخلفه.

ولمافی الهندية: (۲۰۹/۱، طبع رشیدیه)

ولو اخر القضاء حتى صار شيخا فانيا او كان النذر بصيام الأبد فعجز لذلك او باشتغاله بالمعيشة لكون صناعة شاقة فله ان يفطر ويطعم لكل يوم مسكينا على ماتقدم وان لم يقدر على ذلك لعسرته يستغفر الله انه هو الغفور الرحيم.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: حبیب الوہاب سواتی

۱۱ محرم الحرام ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:

﴿لزوم کے صیغوں کے بغیر بھی نذر معلق منعقد ہو جاتی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت نے نذر مانی کہ اگر میرا خاوند بیماری سے ٹھیک یعنی شفایاب ہو جائے تو میں بیس کلو چاول اور پانچ کلو گوشت پکا کر غریبوں کو صدقہ کرونگی تو آیا عورت کے ان الفاظ سے نذر لازم ہوگئی یا نہیں؟

﴿جواب﴾ عورت کے مذکورہ الفاظ نذر کے ہیں، لہٰذا خاوند کے شفایاب ہونے سے اس پر مذکورہ نذر کی ادائیگی لازم ہوگی۔

لمافی الشامی: (۷۴۰/۳، طبع سعید)

ويؤيده مافي البزازية قال ان سلم ولدي اصوم ماعشت فهذا وعد لكن في البزازية

ایضاً ان عوفیت صمت کذالم یجب مالم یقل للہ علی وفی الاستحسان یجب ولوقال:
ان فعلت کذافانا احج ففعل یجب علیہ الحج اھ.فعلم ان تعلیل الدرر مبنی علی
القیاس والاستحسان خلافہ وفی البدائع:(۵/ ۸۲-۸۵،طبع سعید)

ولمافی البزازیۃ علی ہامش الھندیۃ:(۲۷۲/۴،طبع رشیدیہ)

ان عوفیت صمت کذالم یجب مالم یقل للہ علی وفی الاستحسان یجب وان لم یکن تعلیقالایجب
قیاساولاستحساناکمااذاقال انا احج فلا شیئ ولوقال ان فعلت کذافانا احج ففعل یجب علیہ الحج

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:محمد وارث خان

۱۳رجب المرجب ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر:۱۷۱۷

﴿نذر معلق کی ایک صورت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں مرغی کے نیچے انڈے رکھ کرنذر مان لیتی تھی کہ اگر ان انڈوں سے سارے یا اکثر چوزے پیدا ہوجائیں اور زندہ رہ کر بڑے ہوجائیں تو ان میں سے ایک چاہے مرغ ہو یا مرغی صدقہ کرونگی،تقریباً آٹھ سال سے جب بھی چوزے انڈوں سے نکلتے تھے تو میں مذکورہ الفاظ دہراتی تھی حالانکہ ابھی تک مذکورہ خواہش پوری ہونے کے باوجود صدقہ نہیں دے سکی تو اب میرے لئے کیا حکم ہے؟یعنی اس مذکورہ صورت میں نذر واقع ہوئی یا نہیں؟بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ عورت کے مذکورہ الفاظ سے نذر واقع ہوئی ہے اور جو نذر مانی ہے اس کا پورا کرنا لازم ہے اور جو نذر ابھی تک پوری نہیں کی گئی اسکو اب پورا کرنا ضروری ہے۔

لمافی البزازیۃ علی ہامش الھندیۃ:(۲۷۲/۴،طبع رشیدیہ)

ان عوفیت صمت کذالم یجب مالم یقل للہ علی وفی الاستحسان یجب وان لم یکن تعلیقالایجب
قیاساولاستحساناکمااذاقال أناأحج فلاشیئ ولوقال ان فعلت کذافأناأحج ففعل یجب علیہ الحج

ولمافی الشامی:(۷۴۰/۳،طبع سعید)

ویؤیدہ مافی البزازیۃ ولوقال ان سلم ولدی أصوم ماعشت فھذاوعد لکن فی البزازیۃ ایضاًان عوفیت صمت کذالم یجب مالم یقل للہ علی وفی الاستحسان یجب ولو قال: ان فعلت کذافانا احج ففعل یجب علیہ الحج اھ فعلم ان تعلیل الدرر مبنی علی القیاس والاستحسان خلافہ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:محمد وارث خان

۱۶رجب المرجب ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر:۱۷۱۸

﴿نذر معلق کو وجود فعل کے بعد پورا کرنا ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت کے چار بیٹے ہیں تو جب بھی اس عورت کے ہاں کوئی لڑکا پیدا ہوتا تو وہ عورت نذر مانتی کہ میں ہر مہینے میں اس لڑکے کی طرف سے دو دو روپیہ صدقہ کرونگی اور اب اس عورت کے چار بیٹے ہیں پہلے بیٹے کی عمر تقریباً تیس سال ہے اور دوسرے بیٹے کی عمر تقریباً ستائیس سال ہے تیسرے بیٹے کی عمر اٹھارہ سال ہے اور چوتھے بیٹے کی عمر آٹھ سال ہے حالانکہ اس عورت نے ابھی تک ایک بیٹے کی طرف سے بھی ہر مہینے میں دو دو روپے ادا نہیں کئے، اب اس عورت کیلئے کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ ہر بیٹے کی پیدائش پر مہینے میں دو دو روپیہ لازم کرنا نذر کی قبیل سے ہے، لہٰذا بیٹے کی پیدائش پر ہر مہینے میں دو دو روپیہ لازم ہونگے اگر ابھی تک پیسے صدقہ نہ کئے ہوں تو اس کو چاہیے کہ حساب لگا کر اپنے اوپر لازم کردہ رقم صدقہ کرے۔

لما فی البزازیۃ علی هامش الهندیۃ:(۴/۲۷۲،طبع رشیدیہ)

ان عوفیت صمت کذالم یجب مالم یقل لله علی وفی الاستحسان یجب وان لم یکن تعلیقا لایجب قیاسا واستحسانا کما اذاقال أنا أحج فلاشئ ولو قال ان فعلت کذافانا أحج ففعل یجب علیه الحج وفی ردالمحتار:(۳/۷۴۰،طبع سعید)

ولما فی البدائع:(۵/۸۴-۸۵،طبع سعید)

ولو قال انا احرم او انا محرم لواهدی اوامشی الی البیت فان نوی به الایجاب یکون ایجابا ـــــ هذا اذالم یعلقه بالشرط فان علقه بالشرط بان قال ان فعلت کذافانا احرم فهو علی الوجوه التی بیناانه ان نوی الایجاب یکون ایجابا وان نوی الوعدیکون وعدا لما قلنا وان لم یکن له نیۃ فهو علی الایجاب بخلاف الفصل الاول لان العدات لا تتعلق بالشروط وان الواجبات تتعلق بها فالمعرفۃ الی الایجاب بقرینۃ التعلیق بالشرط ولم توجد القرینۃ فی الفصل الاول فصار الحاصل ان هذا اللفظ فی غیر المعین بالشرط علی الوعد الا ان ینوی به الایجاب وفی المعلق یقع علی الایجاب الا ان ینوی به الوعد.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد وارث خان

۱۱ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۷۲۰

﴿نذر کے روزے شرط سے پہلے رکھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ایک طالب علم نے نذر مانی تھی کہ اگر میں فلاں

مدرسے سے فارغ ہوا تو ایک مہینہ روزے رکھونگا، اب وہ اس مدرسہ میں دورہ حدیث پڑھ رہا ہے اور ان شاء اللہ سال کے آخر میں فراغت ہوجائیگی تو وہ چاہتا ہے کہ ابھی سے روزے رکھوں تو کیا وہ فراغت سے پہلے روزے رکھ سکتا ہے یا نہیں؟ مستفتی: بخت منیر سواتی

﴿جواب﴾ نذر معلق میں شرط پائے جانے کے بعد حکم کا وجوب ہوتا ہے، لہٰذا فراغت سے پہلے روزے رکھ لئے تو وہ نفلی ہوں گے فراغت کے بعد دوبارہ رکھنا لازم ہوگا۔

لما فی الشامی: (۲/۱۲۷، طبع سعید)

بخلاف النذر المعلق فانه لایجوز تعجیله قبل وجود الشرط۔۔۔ ان المعلق علی شرط لاینعقد سببا للحال بل عند وجود شرطه کما تقرر فی الاصول.

وفی الهندیة: (۱/۲۱۰، طبع رشیدیه)

اذا علق النذر بالصوم بشرط وأداه قبل وجوده لایجوز اجماعا.

وفی البدائع: (۵/۹۲، طبع سعید)

وان کان معلقا بشرط نحو ان یقول ان شفی الله مریضی اوان قدم فلان الغائب فلله علی ان اصوم شهرا۔۔۔ فوقته وقت الشرط فمالم یوجد الشرط لایجب بالاجماع ولو فعل ذلک قبل وجود الشرط یکون نفلا.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: حبیب الرحمٰن سواتی

۲۹ صفر الخیر ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۰۳۷

﴿نذر معلق میں التزام کا لفظ ضروری نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی شخص نے کہا کہ اگر میرا بیٹا اس بیماری سے شفا پائے تو بکری ذبح کر کے صدقہ کرونگا، جبکہ نذر کا لفظ یا کوئی تاکید کے الفاظ استعمال نہ کئے ہوں، پوچھنا یہ ہے کہ صرف اتنا کہنے سے نذر لازم ہوجائے گی یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مطلق نذر کے لزوم کیلئے نذر کا لفظ یا التزام کا کوئی لفظ ضروری ہے، البتہ مذکورہ صورت نذر معلق کی ہے، نذر معلق میں لفظ نذر یا التزام کا لفظ نہ بھی ہو تب بھی استحساناً نذر لازم ہوجاتی ہے کیونکہ نذر معلق میں دلالۃً التزام وتاکید پائی جاتی ہے لیکن یہ اس صورت میں ہے کہ عرفاً نذر کے موقع پر بولے جاتے ہوں مثلاً شفاء امراض، دفع بلیات اور حصول مقاصد کیلئے جو شکرانہ کے طور پر بولے جاتے ہیں بشرطیکہ بولتے وقت نذر کی نفی کی نیت نہ ہو۔

لما فی الشامی:(۲/۷۴۰،طبع سعید)

(قوله لأن الذبح ليس من جنسه فرض الخ)هذا التعليل لصاحب البحر ويخالفه ما في الخانية قال: ان برئت من مرضى هذا ذبحت شاة فبرئ لايلزمه شيئ الاان يقول فلله على ان أذبح شاة اه:وهي عبارة متن الدرر وعللها في شرحه بقوله لان اللزوم لايكون الابالنذر والدال عليه الثاني لاالاول اه.فأفاد أن عدم الصحة لكون الصيغة المذكورة لاتدل على النذر أي لان قوله ذبحت شاة وعد لانذر ويؤيده ما في البزازية لوقال ان سلم ولدى أصوم ماعشت فهذا وعدلكن في البزازية ايضاان عوفيت صمت كذالم يجب مالم يقل لله على وفي الاستحسان يجب ولوقال:ان فعلت كذافاناأحج ففعل يجب عليه الحج اه.فعلم ان تعليل الدرر مبني على القياس والاستحسان خلافه.

ولما في البزازية على هامش العالمگیریۃ:(۲/۲۷۲،طبع رشیدیه)

ان عوفيت صمت كذالم يجب مالم يقل لله على وفي الاستحسان يجب وان لم يكن تعليقا لايجب قياسا واستحسانا كمااذاقال أناأحج فلاشيئ ولوقال ان فعلت كذا فاناأحج ففعل يجب عليه الحج.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:خلیل اللہ دیروی عفی عنہ

۱۳جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۵۶۳

﴿نذر کا پورا کرنا واجب ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے نذر مانی کہ میرا فلاں کام ہو گیا تو فلاں مہینے کے اتنے روزے رکھوں گا مثلاً (رجب کے بیس روزے) مراد پوری ہو جانے کے بعد وہ شخص اس مہینے میں روزے نہیں رکھتا، یا آدھے رکھ لیتا ہے اور آدھے روزوں کا فدیہ ادا کر دیتا ہے تو کیا اس کے لیے ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ حالانکہ وہ صحت مند اور تندرست ہے۔ مستفتی: سیف الرحمٰن صاحب

﴿جواب﴾ نذر کو پورا کرنا واجب ہے قرآن کریم میں ارشاد ہے: ولیوفوا نذورهم الآية چنانچہ مذکورہ صورت میں اس شخص کے لیے متعین دنوں کے روزے رکھنا ضروری ہے بغیر کسی عذر شرعی کے چھوڑنا یا فدیہ ادا کرنا جائز نہیں اگر ایسا کیا ہے تو اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار کرنا چاہیے اور چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا کریں الا یہ کہ کوئی ایسی بیماری لاحق ہو گئی ہو کہ جس میں روزے نہ رکھے جا سکتے ہوں اور تندرستی کی امید بھی نہ ہو تو ایسی صورت میں فدیہ ادا کرنے سے روزے ذمہ سے ساقط ہو جائینگے۔

ولمافی الشامی:(۲/۲۲۷،طبع سعید)

المریض اذاتحقق الیأس من الصحة فعلیه الفدیة لکل یوم من المرض اه وکذامافی البحرلونذرصوم الأبدفضعف عن الصوم لاشتغاله بالمعیشة له أن یطعم ویفطرلأنه استیقن أنه لایقدرعلی القضاء ...(قوله اصلاً بنفسه)کرمضان وقضائه والنذرکما مر فیمن نذرصوم الأبد،وکذالونذر صوماًمعیناًفلم یصم حتیٰ صارفانیاًجازت له الفدیة بحر،وکذافی الشامی:(۳/۴۳۸،طبع سعید)وکذافی التنویرمع الدر:(۲/۲۲۷،طبع سعید)

ولمافی البدائع:(۵/۹۵،طبع سعید)

وکذااذاقال لله علی صوم رجب فلم یصم فیماسبق من الشهورعلی رجب حتیٰ هجم رجب لایجوزله التاخیرمن غیرعذر.

ولمافی البحرالرائق:(۲/۲۸۹،طبع سعید)

ولوقدرعلی الصوم یبطل حکم الفداء لان شرط الخلفیه استمرارالعجزفی الصوم.

ولمافی التاتارخانیة:(۵/۳۲،طبع قدیمی)

واذانذربصوم شهربعینه بأن نذرصوم رجب مثلاً،وجب علیه أن یصوم متتابعاًنص علی التتابع اولم ینص،فان أفطریوماًقضاه ولایلزمه الاستقبال وان وجب علیه متتابعاً.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ والله اعلم بالصواب:محمد کاشف عزیز غفرلہ

۱۱ ذیقعدہ ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر:۲۳۹۶

﴿نذر سے عاجز ہونے کے صورت میں کیا کرے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں۔کہ ایک شخص نے نذر مانی تھی اگر میرا فلاں کام ہوجائے تو جانور ذبح کرکے خیرات کرونگا تو اسکا کام ہوگیا لیکن یہ شخص بالکل غریب ہوگیا ہے اب کیا کرے؟ مستفتی:محمد ریاض

﴿جواب﴾ زندگی میں کسی بھی وقت جانور خرید کر صدقہ کرنے پر اگر قادر ہوا تو نذر پوری کریگا اور جب تک قدرت نہ ہو تو توبہ واستغفار کرتا رہے۔

لمافی التاتارخانیه(۵/۳۲طبع قدیمی)

"وفی المنتقی":اذاقال:((لله علی عتق نسمة))فاعتق رقبة عمیاءلم یجز،ولوقال:((لله علی عتق نسمة))فاعتق عمیاء:برفی یمینه،وهونظیرمالوقال:((لله علی ان اهدی بشاة))فاهدی بشاة عمیاء،وذکرعیسی بن ابان فی نوادره وابن سماعة فی الوصایاعن محمدؒفیمن نذربعتق عبده بعینه فباعه فان علیه ان یشتریه ویعتقه فان فاته ولم یقدرعلی شرائه فلیس شی ویستغفرالله تعالی،ولایجزیه ان یتصدق بقیمته اوثمنه.

ولما فی فتاوی قاضیخان(۱/۵۲۳ طبع قدیمی)

رجل قال ان فعلت کذا فالف درهم من مالی صدقة ثم فعل ولیس له الامائة درهم فتکلموا فیه :قال الفقیه ابوالليث رحمه الله تعالی لایلزمه الصدقة الابما کان عنده وهکذاروی عن محمد رحمه الله تعالی وان کان عنده عروض او خادم یساوی مائة فانه یبیع وان کان یساوی عشرة یتصدق بعشرة وان لم یکن عنده شی فلاشی علیه کمن اوجب علی نفسه الف حجة یلزم بقدرما عاش فی کل سنة حجة.

ولما فی التفسیر المظهری(۶/۲۸۸ طبع رشیدیه)

ولوقال مالی صدقةفی المساکین ولامال له لایلزمه شی

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد داؤد فاروقی تانکوی

۲۹ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر: ۴۰۳۳

﴿نذر کے کھانے سے اپنے گھر والوں کو کھلانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے نذر مانی کہ اگر میرا فلاں کام ہوگیا تو میں فقیروں کو کھانا کھلاؤنگا، پوچھنا یہ ہے کہ نذر کے کھانے سے اپنے گھر والوں کو کھانا کھلا سکتا ہے یا نہیں؟ یا اسطرح نذر مانے لیکن کھانا کھلانے کے بجائے کھانے کی قیمت مدرسہ کو دے تو کیا مدرسہ میں یہ قیمت دے سکتا ہے یا نہیں؟ مستفتی: محمد نواز صوابی

﴿جواب﴾ اس شخص کا فلاں کام اگر ہوگیا ہے تو فقیروں کو کھانا کھلانا واجب ہے فقیر لوگ ہی اسکا مصرف ہیں، غنی لوگوں کو اسی طرح خود یا گھر والوں کو کھلانا جائز نہیں ہے اور مدرسہ کے طلباء بھی عموماً فقیر ہوتے ہیں انکو کھلانے میں زیادہ ثواب ہے کھانے کی قیمت ادا کرنے سے بھی نذر پوری ہوجائیگی۔

لما فی التنویر مع الدر:(۲/۳۴۴ تا ۳۴۶ طبع ایچ ایم سعید)

ویشترط ان یکون الصرف(تملیکا)لااباحة کمامر ۔(لا)الی (من بینهما ولاد)۔ (أو)بینهما(زوجیة)

وفی الشامیة:(قوله ولاالی من بینهما)ای بینه وبین المدفوع الیه لان منافع الاملاک بینهم متصلة فلایتحقق التملیک علی الکمال.....وکذاکل صدقة واجبة کالفطرة والنذروالکفارات اماالتطوع فیجوزبل اولی کما فی البدائع.

ولما فیه أیضا:(۶/۳۲۰ طبع سعید)

(ولوترک التضحیة ومضت ایامها التصدق بهاحیة ناذر)لفاعل تصدق(لمعینة)ولو

فقیرا ولو ذبحها تصدق بلحمها، ولو نقصها تصدق بقیمة النقصان ایضا ولا یأکل الناذر منها فان اکل تصدق بقیمة ما أکل.

ولما فی التاتارخانیة:(۵/۲۲، طبع قدیمی)

عن محمد بن سلمة سئل فیمن نذران یتصدق بماله لا یعطی اباه وولده وهو بمنزلة کفارة الیمین.

ولما فی الهندیة:(۱/۲۲، طبع رشیدیه)

ویجوز دفع القیم فی الزکوٰة عندنا وکذا فی الکفارات وصدقة الفطر والعشر والنذر.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: احمد علی عفی عنہ

۲۱ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ   فتویٰ نمبر: ۲۶۳۳

﴿کتاب الوقف﴾

﴿زمین کو تقسیم سے پہلے مسجد کے لیے وقف کرنا صحیح نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم تین بہن، بھائی ہیں اور میں اپنی زمین قبل التقسیم مسجد کے لئے دینا چاہتی ہوں تو کیا میرا یہ وقف کرنا درست ہوگا یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مشترک زمین میں سے مسجد کے لئے آپ وقف کرنا چاہتی ہیں تو آپ کا اپنا حصہ جب تک الگ اور ممتاز نہیں ہوگا وقف معتبر نہ ہوگا، اس لئے آپ اپنا حصہ پہلے الگ کریں پھر وقف کریں تا کہ بعد میں آپ کے ورثاء وغیرہ کوئی اس کا دعویٰ نہ کر سکے۔

لما فی رد المحتار: ۴/۳۴۸، طبع سعید۔

والخلاف فيما يقبل القسمة، أما ما لا يقبلها كالحمام والبئر والرحى فيجوز اتفاقا الا فی المسجد والمقبرة لان بقاء الشركة يمنع الخلوص لله تعالى۔

ولما فی فتاوی التاتارخانية: ۵/۷۵۶، طبع قديمی۔

واعلم ان الشيوع فيما لا يحتمل القسمة لا يمنع صحة الوقف بلا خلاف، واما الشيوع فيما يحتمل القسمة هل يمنع صحة الوقف؟ فليه خلاف، على قول محمدؒ يمنع، وفی الكبرى وبه يفتى، وعلى قول ابی يوسفؒ لا يمنع، وفی العتابية: والشيوع لا يمنع صحة الوقف عند ابی يوسفؒ فی غير المسجد، وفی الهداية: والمقبرة، وقال محمدؒ يمنع، وفی المسجد يمنع بالاتفاق۔

ولما فی البحر الرائق: ۵/۱۹۷، طبع سعيد۔

فقد علمت انه قول محمدؒ فلا يجوز وقف المشاع وقال ابو يوسفؒ هو جائز، والخلاف فيما يحتمل القسمة اما ما لا يحتمل القسمة فهو جائز اتفاقا اعتبارا عند محمدؒ بالهبة والصدقة المنفذة الا فی المسجد والمقبرة فانه لا يتم مع الشيوع فيما لا يحتمل القسمة عند ابی يوسفؒ ايضا لان بقاء الشركة يمنع الخلوص لله تعالى ولان المهايأة فی هذا فی غاية القبح بان يقبر فيها الموتى سنة وتزرع سنة ويصلى لله فيه فی وقت ويتخذ اصطبلا فی وقت بخلاف الوقف لامكان الاستغلال والحاصل ان وقف المشاع مسجدا او مقبرة غير جائز مطلقا اتفاقا۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ	واللہ اعلم بالصواب: عمر فاروق لاہوری
۵ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ	فتویٰ نمبر: ۳۶۵۰

﴿مسجد کے لئے زبانی زمین وقف کرنا معتبر نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری ایک زمین تھی، میں

نے صرف زبانی مسجد کے لئے وقف کی تھی، اتفاق سے اس جگہ کے قریب میں اب مسجد بن گئی ہے، جو عام لوگوں کے لئے کافی ہے، اب میں چاہتا ہوں کہ اسی زمین پر مدرسہ بناؤں یا اس کو بیچ کر دوسری جگہ جہاں ضرورت ہو مسجد بناؤں، تو کیا میں اس زمین پر مدرسہ یا اسکو بیچ کر دوسری جگہ مسجد بنا سکتا ہوں؟ برائے کرم شریعت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔ مستفتی: سمیع الرحمٰن دیر

﴿جواب﴾ آپ کی اس زمین کے قریب میں اگر مسجد بن گئی ہے، تو بہتر یہی ہے کہ آپ اس پر مدرسہ بنالیں یا بیچ کر دوسری مناسب جگہ مسجد بنالیں۔

لما فی البحر ۲۴۸/۵ طبع سعید

ومن بنی مسجدا لم یزل ملکه عنه حتی یفرزه عن ملکه بطریقه ویأذن بالصلاة فیه واحد زال ملکه.

ولما فی الشامی ۳۵۶/۴ طبع سعید

وانه لو قال وقفته مسجدا ولم یأذن بالصلاة فیه ولم یصل فیه أحد انه لا یصیر مسجدا بلا حکم وهو بعید، کذا فی الفتح ملخصاً." وفی تقریرات الرافعی تحت (قوله وهو بعید الخ) لا بعد فیه مع معرفة وجهه وذالک أنه بالقول لم یحصل التسلیم الذی هو شرط بخلاف الصلاة فیه مع الاذن فانه یحصل التسلیم مع ما یدل علی الخروج تأمل.

ولما فی الهندیة ۴۲۵/۲ طبع قدیمی کتب خانه

من بنی مسجدا لم یزل ملکه عنه حتی یفرزه عن ملکه بطریقه ویأذن بالصلاة فیه اما الافراز فلانه لا یخلص لله تعالی الا به، کذا فی الهدایة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۱۱ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر: ۳۶۱۲

﴿مسجد کے پلاٹ میں مدرسہ بنانا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین اور مفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ (۱) بندہ نے ۲۰۰۳ کو سلطان آباد موضع H ایریا میں ایک پلاٹ خریدا (۲) چونکہ مذکورہ پلاٹ کے قریب کوئی اور مسجد نہیں تھی اور دیگر مساجد کافی دور تھیں اور جماعت میں خصوصا فجر میں شرکت نہیں ہوسکتی تھی، اس لئے اہل محلہ کے اصرار پر بندہ نے مذکورہ پلاٹ میں نمازوں کیلئے باقاعدہ امام کا تقرر کیا، البتہ بندہ کا ارادہ مذکورہ پلاٹ میں مدرسہ بنانے کا تھا۔

(۳) اس کے بعد اہل خیر نے اسکے ساتھ متصل قبلہ کی جانب تین پلاٹ خریدے، مذکورہ

پلاٹوں میں سے قبلہ کی جانب سے پہلا پلاٹ ڈبل سٹوری تھا تو جیسے جیسے نئے پلاٹ خریدتے گئے اس طرح سے نمازی حضرات نماز کیلئے آگے بڑھتے گئے اور جماعت اگلے پلاٹوں میں ہوتی رہی، اس کے بعد جب رمضان آیا تو یہاں پر معتکفین بھی اعتکاف کیلئے بیٹھ گئے، ایک دفعہ مذکورہ اہل خیر رمضان کے آخری عشرے میں مذکورہ پلاٹوں کو دیکھنے کیلئے آیا اور اس نے معتکفین کو دیکھا تو اس نے ڈبل سٹوری والے پلاٹ کی چھت پر کھڑے ہو کر پوچھا کہ یہ اعتکاف والے یہاں کیسے بیٹھے ہیں، اس لئے کہ ہم نے مسجد کی نیت نہیں کی ہے تو کیا یہ اعتکاف ہو جاتا ہے؟

(۴) اس کے بعد اسی اہل خیر نے اگلا پلاٹ خریدا، واضح رہے کہ ابتدا سے بندے کی نیت مدرسہ اور مسجد دونوں بنانے کی تھی البتہ مذکورہ پلاٹوں میں سے کسی پلاٹ کو مسجد یا مدرسہ کیلئے متعین نہیں کیا تھا جب کہ اس جگہ کا نام جامعہ قاسم العلوم و مسجد عائشہ رکھا تھا وجہ اسکی یہ تھی کہ مذکورہ جگہ میں لوگ ابتدا سے نماز پڑھ رہے تھے اور طلبہ دینی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور اُوپر کی چھت پر طلبہ کی رہائش اور مطبخ کا انتظام تھا اور اب بھی ہے.

(۵) مذکورہ پلاٹوں کے خریدے جانے کے بعد بندہ کا ارادہ تھا کہ مذکورہ پلاٹوں کے ساتھ دائیں طرف متصل پوری پٹی جو کہ ان پلاٹوں جتنی ہے کو خرید کر قبلہ کی جانب مسجد بنائیں گے اور پچھلے حصے میں مدرسہ اور اساتذہ کے مکانات بنائیں گے بندہ نے مذکورہ پٹی کے مالکان سے خریدنے کی بات بھی چلائی مگر قیمت زیادہ ہونے کی بنا پر فی الحال بات نہیں بن سکی.

(۶) مذکورہ پلاٹوں (جو کہ ۱۰۲ فٹ لمبائی پر مشتمل ہے) پر بندہ نے تعمیر شروع کی جسکا نقشہ اس طرح بنایا کہ مشرقی حصہ (جو کہ ۴۶ فٹ پر مشتمل ہے) میں زمینی حصہ میں وضوء خانہ اور استنجاء خانے کی تعمیر کی اور اسکے اُوپر پہلی منزل میں مدرسہ کی تعمیر کی ہے جو کہ ابھی زیر تعمیر ہے اور مغربی حصہ کو نقشہ میں مسجد کیلئے متعین کیا گیا ہے اور فی الحال مسجد کیلئے مجوزہ جگہ نیچے نمازوں اور اوپر طلبہ کی رھائش، درس گاہوں اور مطبخ کیلئے حسب سابق استعمال ہو رہی ہے، اور مدرسے کی تعمیر جاری ہے تعمیر مکمل ہونے کے بعد مدرسے کی عمارت میں طلبہ منتقل ہو جائیں گے تو یہ جگہ مسجد کیلئے خاص ہو جائے گی۔

اب پوچھنا یہ ہے کہ مذکورہ جگہ میں ۴۶ فٹ مدرسے کیلئے اور بقیہ حصہ کو مسجد کیلئے استعمال کرنا

درست ہے یا نہیں یا پورے حصے میں مسجد بنانا ضروری ہے؟ جبکہ بندہ نے پورے حصے میں مسجد بنانے کی نیت نہیں کی ہے بلکہ مسجد کے ساتھ ساتھ مدرسے کی بھی نیت کی تھی۔

دوسری بات یہ پوچھنی ہے کہ مسجد کیلئے مجوزہ جگہ میں نیچے پوری مسجد ہو اور اوپر والے آدھے حصے میں مدرسہ اور آدھے حصے میں مسجد ہو تو کیا یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مسجد، مدرسہ کی نیت سے زمین خریدنے والے اہل خیر نے اور بحیثیت منتظم آپ دونوں نے اس جگہ لوگوں کیلئے اگرچہ نماز باجماعت پڑھنے کا انتظام کیا تھا، لیکن پوری جگہ کو مستقل مسجد قرار دینے کا ابھی ارادہ نہیں تھا، تو اس جگہ کو ابھی تک شرعی مسجد کا حکم شامل نہیں ہے۔

آپ لوگ اپنی صوابدید پر جتنے حصہ میں مسجد بنانا چاہتے ہیں اس میں مسجد کی تعمیر کریں اور جتنے حصہ میں مدرسہ بنانا چاہتے ہیں اس میں مدرسہ کی تعمیر کریں،

ایک بار مسجد کیلئے جو حصہ مختص ہو جائے اور آپ لوگوں کی اجازت سے نمازی لوگ اسمیں نماز باجماعت بھی پڑھ لیں تو پھر اس میں تبدیلی کی گنجائش نہیں رہتی اور نہ اسکے ایک حصہ کو مستقل مدرسہ قرار دے سکتے ہو، لہٰذا نیچے مسجد اوپر مستقل مدرسہ نہیں ہوسکتا۔

اور یہ جگہ اب تک چونکہ شرعی مسجد کے حکم میں نہیں تھی لہٰذا اعتکاف کرنے والوں کا اعتکاف صحیح نہیں ہوا، مرد حضرات کا اعتکاف بغیر مسجد کے صحیح نہیں ہوتا۔

لما في الهندية (۲/۴۵۵، طبع رشیدیه)

رجل له ساحة لا بناء فيها أمر قوما ان يصلوا فيها بجماعة فهذا على ثلاثة أوجه: أحدها اما ان أمرهم بالصلاة فيها ابدا نصا بان قال: صلوا فيها ابدا، أو أمرهم بالصلاة مطلقا و نوى الأبد ففي هذين الوجهين صارت الساحة مسجدا لو مات لا يورث عنه، واما ان وقت الأمر باليوم او الشهر أو السنة ففي هذا الوجه لا تصير الساحة مسجدا

ولما في فتاوى قاضيخان (۳/۱۶۵، قديمي)

وان أمرهم بالصلاة شهرا أو سنة ثم مات يكون ميراثا عنه، لأنه لابد من التابيد، والتوقيت ينافي التابيد. قال أيضا: متولي المسجد اذا جعل الموقوف على المسجد مسجدا، وصلى الناس فيه سنين ثم ترك الصلاة وأعيد منزلا مستغلا جاز، لأن المتولي وان جعله مسجدا لا يصير مسجدا.

ولما في التاتارخانية (۵/۸۴۲، قديمي)

وفي "الحاوي" وفي "المنتقى": اذا بنى الرجل مسجدا وبنى فوقه غرفة وهو (المسجد) في

بدہ فلہ ذالک ، وان کان حین بناہ خلی بینہ وبین الناس ثم جاء بعدذالک یبنی لا یترک ،وفی 'جامع الفتاوی ':ولو قال:عنیت ذالک لا یصدق .

ولما فی الهندية:(٢١١/١،رشيديه)

(تفسيره)فهو اللبث فی المسجد مع نية الاعتكاف كذافی النهاية.(وأما شروطه)فمنها النية ....ومنهامسجد الجماعة فيصح فی كل مسجد له أذان واقامة.

ولمافی التاتارخانية:(٢١١/٢،قديمی)

وجوازه يختص بالمساجد ،قال القدوری :ولا يصح الاعتكاف الافی مسجدالجماعات وروی عن أبی حنيفةؒ:أنه لايصح الا فی مسجديصلی فيه الصلوات الخمس .

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سیف اللہ

۸ صفرالخیر ۱۴۳۳ھ — فتوی نمبر:

﴿مشاع زمین کا شریک سے اجازت لئے بغیر مسجد کیلئے وقف کرنا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید اور خالد کی مشترکہ زمین تھی جس میں زید نے خالد کی اجازت سے ایک کنال زمین اہل محلہ والوں پر مسجد کیلئے بیچ دی بعد میں زید نے اہل محلہ والوں کے مطالبہ کرنے پر خالد کی اجازت کے بغیر دو مرلہ زمین وقف کی خالد کو جب معلوم ہوا تو وہ اس کے وقف کرنے پر راضی نہ تھا تو اب پوچھنا یہ ہے کہ زید کا یہ وقف کرنا از روئے شرع صحیح ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ زید کا اہل محلہ کے مطالبہ پر خالد سے اجازت لئے بغیر مشترکہ زمین کو مسجد کیلئے وقف کرنا جائز نہیں ہے ،اس لئے کہ یہ مشاع زمین ہے اور مشاع زمین کا شریک سے اجازت لئے بغیر مسجد کیلئے وقف کرنا جائز نہیں ہے،لہذا دو مرلہ زمین کی اجازت خالد بھی دیدے تو وقف صحیح ہوگا،ورنہ نہیں۔

لمافی التنوير مع الدر والرد:(٢٢٨/٢،طبع سعيد)

(ويفرز)فلا يجوزوقف مشاع يقسم خلافاللثانی ،وقال الشامی تحت(قوله :ويفرز)أی بالقسمة وهذاالشرط وان كان مفرعا علی اشتراط القبض لأن القسمة من تمامه الاأنه نص عليه ايضاحا ،وأبويوسف لمالم يشترط التسليم اجازوقف المشاع والخلاف فيمايقبل القسمة أمامالايقبلها كالحمام والبئر والرحی فيجوز اتفاقا الا فی المسجد والمقبرة لأن بقاء الشركة يمنع الخلوص لله تعالی .

ولمافی الهندية: (٢٦٥/٢،طبع رشيديه)

واتفقاعلی عدم جعل المشاع مسجدا،أومقبرة سواء ممالايحتمل القسمة أويحتملها

ولما فی البحر الرائق: (۱۹۷/۵، طبع:سعید)

والخلاف فیما یحتمل القسمة أما مالا یحتمل القسمة فهو جائز اتفاقا اعتبارا عند محمد بالهبة والصدقة المنفذة، الا فی المسجد والمقبرة فانه لایتم مع الشیوع فیما لایحتمل القسمة عند أبی یوسف لأن بقاء الشرکة یمنع الخلوص لله تعالیٰ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ أعلم بالصواب: برکت اللہ

۳۰ جمادی الثانی ۱۴۳۳ھ   فتویٰ نمبر: ۳۲۷۶

﴿بغیر زمین کے بالائی منزل کے وقف کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان شرع دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ دومنزلہ عمارت میں اوپر والی منزل کو مدرسہ کیلئے وقف کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ نیز اس وقف شدہ عمارت کے نیچے جو عمارت ہے کسی کو میراث میں مل سکتی ہے یا نہیں؟ اگر مل سکتی ہے تو جس کو ملی ہے اس کو گرانے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟   مستفتی: مولانا نعمت اللہ صاحب

﴿جواب﴾ اوپر والی منزل مدرسہ کیلئے وقف کرنا صحیح ہے۔ نیچے کی عمارت اگر وقف نہیں ہے تو اوپر والی وقف شدہ منزل نیچے والی منزل کیلئے وراثت میں منتقل ہونے کیلئے مانع نہیں ہے۔ نچلی منزل کے گرانے سے اوپر والی منزل کا گرنا بھی چونکہ لازمی امر ہے۔ اس لئے کسی معقول عذر کے بغیر نچلی منزل کے مالک کو گرانے کا حق حاصل نہیں ہے۔ البتہ معقول وجہ ہو تو باہمی رضامندی سے یا قاضی کے فیصلہ سے اس کو گرانے کا حق حاصل ہوگا۔

لما فی التنویر مع الدر والرد: (۳۸۹/۴، ۳۹۰، طبع:سعید کراچی)

(بنی علی ارض ثم وقف البناء) قصدا (بدونها ان الارض مملوکة لایصح وقیل صح وعلیه الفتوی) سئل قارئ الهدایة عن وقف البناء والغراس بلا ارض؟ فاجاب: الفتوی علی صحته ذلک، ورجحه شارح الوهبانیة واقره المصنف معللا بانه منقول فیه تعامل فیتعین به الافتاء. قلت: لایخفی علیک ان المفتی به الذی علیه المتون جواز وقف المنقول المتعارف وحیث صار وقف البناء متعارفا کان جوازه موافقا للمنقول ولم یخالف نصوص المذهب علی عدم جوازه لانها مبنیة علی انه لم یکن متعارفا کما دل علیه کلام الذخیرة المار۔۔۔۔

ولما فی حاشیة الطحطاوی: (۵۲۹/۲، طبع: رشیدیة)

والفتوی علی صحة وقف البناء والغرس دون الارض کما فی فتاوی قارئ الهدایة.

ولما فی تنقیح الحامدیۃ:(۱/۱۱۰،طبع:حقانیۃ)

وفی فتاوی شلبی وقف البناء بدون الارض صحیح والحکم به صحیح.

ولما فی التنویر مع الدروالرد(۵/۴۴۷،۴۴۸،۴۴۹،طبع:سعید)

(ولا یمنع الشخص من تصرفه فی ملکه الااذاکان الضرر)بجاره ضرر(ابینا)فیمنع من ذلک وعلیه الفتوی بزازیه؟واختاره فی العمادیة وافتی به قارئ الهدایة،حتی یمنع الجار من فتح الطاقة ،وهذاجواب المشائخ استحسانا.

ولما فی الشامی،ومامر فی تصرفه فیمافیه حق الجار،فان السفل وان کان ملکا لصاحبه الاان لذی العلو حقافیه فلذااطلق المنع فیه ولذالوهدم ذو السفل سفله یؤمر باعادته بخلاف ماهناك هذاماظهرلی فاغتنمه ـــــ والحاصل ان القیاس فی جنس هذه المسائل ان من تصرف فی خالص ملکه لایمنع منه ولواضربغیره لکن ترك القیاس فی محل یضربغیره ضررابینا وقیل بالمنع وبه اخذکثیرمن مشائخناوعلیه الفتوی اه :ـــــ وذکر بعض المشائخ ان المختار تقیید المنع بالمضراو المشکل وماذاك الالکونه تصرفافیماللجار فیه حق وهوصاحب العلوفالاصل فیه عدم جواز التصرف الاباذنه .

لمافی التنویر مع الرد:(۵/۴۴۲،طبع:سعید)

(یمنع صاحب سفل علیه علولآخر من ان یتد فی سفله اوینقب کوة بلارضاالآخر) وفی الشامی:(قوله ولوانهدم السفل الخ)ای بنفسه وامالوهدمه فقد قال فی الفتح ،وعلمت انه لیس لصاحب السفل هدمه فلوهدمه یجبرعلی بنائه لانه تعدی علی صاحب العلو وهو قرارالعلو.

الجواب صحیح:مفتی عبدالرحمٰن عفی اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:عمران الحق سواتی

۲۹جمادی الاولی ۱۴۳۵ھ فتویٰ نمبر:۳۶۶۷

﴿وقف کی زمین کا دوسری زمین کے ساتھ تبادلہ کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چند سال پہلے زید نے اپنی زمین مدرسہ کیلئے وقف کردی تھی جس پر ایک حد تک چاردیواری بھی ہوئی لیکن جب زلزلہ آیا تو یہ چاردیواری گرگئی جو ابھی تک اسی حالت میں ہے،اب عمرو مدرسہ کی انتظامیہ سے کہہ رہا ہے کہ آپ لوگ یہ جگہ مجھے گھر بنانے کیلئے دیدیں اوراس کے بدلے میں میں اپنی زمین میں سے اتنی جگہ دیدونگا لہذا آپ لوگ وہاں مدرسہ بنالیں گے،تو کیا وقف کی زمین کا اسطرح تبادلہ کرنا دوسری زمین کے بدلے صحیح ہوگا یا نہیں؟

مستفتی:عبدالوحید بلگرامی

﴿جواب﴾ مدرسہ کیلئے زمین وقف کرتے وقت زید اگر اسکی اجازت دیتے کہ اس زمین

کے بدلہ میں دوسری جگہ بھی مدرسہ کیلئے انتظامیہ چاہے تو لے سکتی ہے پھر تو یہ تبادلہ جائز ہوتا، لیکن زید نے ایسی اجازت اگر نہیں دی ہے تو انتظامیہ کو اس کا اختیار نہیں ہے۔

البتہ یہ جگہ مدرسہ کیلئے بالکل موزوں نہ ہو تو قاضی کی اجازت سے اس سے بہتر جگہ تبادلہ میں لی جا سکتی ہے۔

لمافی الشامی (۴/۳۸۴،طبع:سعید)

(قوله وجاز شرط الاستبدال به الخ) اعلم أن الاستبدال علی ثلاثة وجوه :الأول:أن یشرطه الواقف لنفسه أولغیره أولنفسه وغیره،فالاستبدال فیه جائز علی الصحیح وقیل اتفاقا.والثانی :أن لایشرطه سواء شرط عدمه أوسکت لکن صار بحیث لاینتفع به بالکلیة بأن لایحصل منه شیء أصلا،أولایفی بمؤنته فهوایضاجائز علی الأصح اذاکان باذن القاضی ورأیه المصلحة فیه،والثالث:أن لایشرطه أیضاولکن فیه نفع فی الجملة وبدله خیر منه ریعا ونفعا،وهذالایجوز استبداله علی الأصح المختار.

ولمافی فتح القدیر (۶/۲۱۲،مکتبة رشیدیة)

أجمعوا أن الواقف اذاشرط الاستبدال لنفسه یصح الشرط والوقف ویملک الاستبدال أمابلاشرط أشار فی السیر الی أنه لایملکه الاباذن القاضی.

ولمافی فتاوی قاضی خان (۳/۱۸۴،طبع:سعید)

وانماتثبت ولایة الاستبدال بالشرط وبدون الشرط لاتثبت.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: صدیق انور

۳۰ رجب المرجب ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر:

﴿وقف شدہ اشیاء کا استعمال واقف کی نیت پر موقوف ہے﴾

﴿سوال﴾ ہمارے علاقے میں لوگ مساجد کے لاؤڈ سپیکر مسجد سے باہر مدارس کیلئے چندہ جمع کرنے اور دینی جلسوں میں استعمال کرتے ہیں کیا یہ جائز ہے؟ سائل: حافظ سمیع اللہ

﴿جواب﴾ مسجد کیلئے وقف شدہ اشیاء کا استعمال مسجد سے باہر درست نہیں ہے، البتہ اگر وقف کرنے والے نے صرف مسجد کے لئے وقف نہ کی ہو بلکہ تمام دینی امور میں استعمال ہونے کی نیت سے وقف کی ہو تو مسجد سے باہر دوسرے دینی امور میں بھی استعمال کرنے کی گنجائش ہے۔

لمافی الهندیة: (۲/۴۵۹،طبع رشیدیه)

ولووقف علیٰ دهن السراج للمسجدلایجوز وضعه جمیع اللیل بل بقدرحاجة المصلین

ویجوز الیٰ ثلث اللیل أو نصفه اذا احتیج الیه للصلاۃ فیه.

ولما فی البحر الرائق:(۲۵۰/۵،طبع ایچ ایم سعید)

ولیس لمتولی المسجد ان یحمل سراج المسجد الیٰ بیته ولا بأس بأن یترک سراج المسجد فیه من المغرب الیٰ وقت العشاء، ولا یجوز ان یترک فیه کل اللیل الا فی موضع جرت العادۃ فیه بذالک کمسجد بیت المقدس ومسجد النبی والمسجد الحرام اوشرط الواقف ترکه فیه کل اللیل کما جرت العادۃ فی زماننا.

ولما فی خلاصۃ الفتاوی:(۲۲۹/۱،طبع رشیدیه)

ولا یحمل الرجل سراج المسجد الیٰ بیته ویحمل من بیته الی المسجد.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:اسلام بادشاہ ہمیلی

۵ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر:۲۱۱۰

﴿مدرسہ کی ضرورت سے زائد رقم کسی کو بطور قرض دینا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مہتمم مدرسہ مدرسے کے چندہ کی رقم کسی شخص کو بطور قرض دے سکتا ہے یا نہیں؟ نیز کیا وہ از خود بطور قرض لے سکتا ہے یا نہیں؟ اگر اپنی تنخواہ ایڈوانس لے لے تو اس کی گنجائش ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مدرسہ کے چندہ کی رقم کو بطور قرض کسی شخص کو دینا چند شرائط کے ساتھ جائز ہے، ان شرائط کا لحاظ کئے بغیر کسی کو مدرسہ کے چندہ کی رقم بطور قرض دینا ناجائز ہے، نیز مہتمم مدرسہ خود بھی بطور قرض چندہ کی رقم لے سکتا ہے۔

اور اگر اپنی تنخواہ ایڈوانس لے لے تو اسکی بھی گنجائش ہے کیونکہ یہ بھی قرض کی صورت ہے مگر مہتمم مدرسہ کے لیے بھی ان شرائط کی رعایت ضروری ہے، بہتر تو یہ ہے کہ اس کے لیے علیحدہ فنڈ ہو جس سے قرض مانگنے والے کو قرض دیا جائے اور چندہ دینے والے لوگ اسی غرض سے اس مد میں چندہ دیا کریں۔

شرائط:(۱) جو رقم بطور قرض دی جا رہی ہے وہ واقعی فی الحال مدرسہ کی ضروریات سے زائد ہو اور اگر مدرسہ کو اس کی ضرورت ہو تو پھر کسی کو قرض دینا جائز نہیں ہے اور نہ ہی خود مہتمم صاحب بطور قرض لے سکتے ہیں۔

(۲) قرض کے ڈوبنے کا خطرہ نہ ہو بلکہ وصول ہونے کی قوی امید ہو بلکہ یقین ہو۔

(٣) جس کو قرض دیا جارہا ہے اس سے معتبر ضامن لیا جائے کہ مقررہ تاریخ پر اگر آپ نے ادا نہ کیا تو ضامن یہ رقم ادا کرے گا۔

(٤) قرض کو کسی استاد کی تنخواہ کے ساتھ منسلک کیا جائے بایں طور کہ فلاں استاد کی چار ماہ کی تنخواہ آپکو بطور قرض دی جارہی ہے۔

(٥) مدرسہ کی منتظمہ کمیٹی کی اجازت بھی ہو تو پھر کسی کو قرض دیا جاسکتا ہے ورنہ نہیں۔

(٦) جس کو قرض دیا جائے اس کے پاس رقم کی حفاظت کا انتظام زیادہ ہو اگر مدرسہ میں رقم کی حفاظت کا انتظام زیادہ ہو تو پھر آسانی سے وہ رقم کسی کو نہ دی جائے اس لئے کہ ایسی رقم کو بطور قرض دینے کی اصل وجہ اس کی حفاظت ہے نہ کہ اس سے کاروبار وغیرہ۔

لمافی جامع الفصولین:(١٢/٢ مطبع اسلامی کتب خانہ)

لیس للمتولی ایداع مال الوقف والمسجد الامن فی عیالہ ولا اقراضہ فلو اقرض ضمن وکذا المستقرض وذکر ان القیم لو اقرض مال المسجد لیاخذہ عند الحاجۃ وھو احرز من امساکہ فلا باس بہ (عدہ) یسع المتولی اقراض مافضل من غلۃ الوقف لو احرز.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ولی اللہ ڈیروی

٢٥ ربیع الاول ١٤٢٨ھ — فتویٰ نمبر: ٦٩٨

﴿وقف کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے مدرسے کو کمپیوٹر وقف کیا جبکہ مدرسے کو کمپیوٹر کی ضرورت نہ تھی کچھ عرصہ کمپیوٹر مدرسے میں بے کار پڑا رہا، اب وہ شخص متولی کی اجازت سے کمپیوٹر واپس گھر اٹھا لایا اور کہا کہ جب مدرسہ کو ضرورت ہوئی تو دوبارہ دے دوں گا، اس شخص کا مدرسے کے کمپیوٹر کو ذاتی طور پر استعمال کرنا کیسا ہے؟

﴿جواب﴾ وقف کرنے کے بعد اس چیز کو واپس لینا خواہ متولی کی اجازت سے ہو جائز نہیں ہے، مدرسہ کو کمپیوٹر کی ضرورت نہیں تو اسکو بیچ کر رقم کی ضرورت تو ہوگی، البتہ مشروط طور پر دیا ہو کہ مدرسہ کو ضرورت ہوئی تو مدرسے کیلئے وقف ہے نہیں ہوئی تو واپس لے لوں گا تو ایسی صورت میں چونکہ وقف صحیح نہیں ہوا اسلئے واپس لینا جائز ہے۔

لما فی التنویر مع الرد:(۴/۳۵۲،مطلب فی شرط واقف الکتب ان لا تعار الا برھن،طبع سعید)

فاذا تم ولزم لا یملک ولا یملک ولا یعار ولا یرھن.

وفی الشامیۃ:(قولہ لا یملک)ای لا یکون مملوکا لصاحبہ ولا یملک ای لا یقبل التملیک لغیرہ بالبیع ونحوہ لاستحالۃ تملیک الخارج عن ملکہ ولا یعار ولا یرھن لاقتضائھما الملک درر.

ولما فی التاتارخانیۃ:(۵/۸۸۴،المسائل التی تعود الی قیم المسجد،طبع قدیمی)

الفاضل من وقف المسجد ھل یصرف الی الفقراء؟قیل لا یصرف وانہ صحیح ولکنہ یشتری بہ مستغلا للمسجد.

ولما فی المحیط:(۹/۱۳۱،فی المسائل التی تعود الی بانی المسجد،طبع ادارۃ القرآن)

فی فتاوی ابی اللیث:سئل الفقیہ ابوبکر عن حشیش المسجد یخرج عن المسجد أیام الربیع—قال فی فتاوی اھل سمرقند حشیش المسجد اذا کان لہ قیمۃ فلا بأس لاھل المسجدان یبیعوا وان رفعوا الی الحاکم فھو احب الی.

ولما فی التنویر مع الدر:(۴/۳۴۰-۳۴۱،مطلب قد یثبت الوقف بالضرورۃ،طبع سعید)

(وشرطہ شرط سائر التبرعات)کحریۃ وتکلیف(وان یکون)قربۃ فی ذاتہ معلوما (منجزا)لا معلقا الا بکائن.

وفی الشامیۃ:(قولہ لا معلقا)کقولہ اذا جاء غدا و اذا جاء رأس الشھر او اذا کلمت فلانا فارضی ھذہ صدقۃ موقوفۃ،وان شئت او احببت یکون الوقف باطلا،لان الوقف لا یحتمل التعلیق بالخطر.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: ناجد محمود کھوٹہ

۶ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ | فتویٰ نمبر:۲۹۷۳

﴿مدرسہ کی ضرورت سے زائد رقم تجارت میں لگانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ایک مہتمم مدرسہ مدرسے کی رقم بینک میں رکھواتا ہے اور ظاہر بات ہے کہ بینک میں سودی کاروبار ہوتا ہے تو وہ مدرسہ کی وقتی ضروریات سے زائد رقم اگر تجارت میں لگادے تو اس سے جو نفع حاصل ہو تو وہ خود استعمال کرسکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ مدرسہ کے لیے منافع حاصل کرنے کی غرض سے مدرسہ کی رقم جو کہ فی الحال ضرورت سے واقعی زائد ہو تجارت میں لگانا زیادہ بہتر ہے بنسبت بینک میں رکھنے کے لیکن مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ:

(۱) تجارت میں لگانے والی رقم کی مدرسہ کو واقعی فی الحال ضرورت نہ ہو۔ (۲) جس شخص کو تجارت کے لئے رقم دی جائے اسکا متقی پرہیزگار ہونا، فاسق وفاجر کو تجارت کے لئے یہ رقم دینا جائز نہیں (۳) تجارت سے نفع کی قوی امید ہو اگر تجارت سے نقصان کا اندیشہ ہو تو پھر یہ رقم دینا جائز نہیں (۴) مدز کوۃ سے تجارت کے لئے رقم زیادہ مدت کے لیے نہ دی جائے۔

(۵) رقم منتظمہ کمیٹی کی صریح اجازت سے تجارت کے لئے دی جائے اگر منتظمہ کمیٹی کی اجازت نہیں تو پھر دینا جائز نہیں۔

(۶) تجارت کا نفع مدرسہ کی ضروریات پر خرچ کیا جائے کیونکہ یہ نفع مدرسہ کے مال سے حاصل ہوا ہے، مہتمم خود اس نفع کو استعمال نہیں کر سکتا۔

(۷) نقصان کی صورت میں لگانے والے کو اپنی جیب سے نقصان بھرنا ہوگا۔ (ماخوذ از تبویب دار العلوم کراچی)

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ولی اللہ ڈیروی

۲۵ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۴۹۹

﴿مدرسہ کے کھانے سے مہمان نوازی کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مدرسہ کے کھانے سے مہمانوں کو کھلایا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اور اس میں مدرسہ، مہتمم مدرسہ، اساتذہ کرام اور طلباء کے مہمانوں میں کوئی فرق ہے یا سب کا ایک حکم ہے؟ نیز اگر مہتمم مدرسہ کبھی کبھار معاونین مدرسہ کی مدرسہ کے خرچہ سے دعوت وغیرہ کرے تو اسکا کیا حکم ہے؟ مستفتی: عبدالسبحان صاحب

﴿جواب﴾ مہتمم مدرسہ چندہ دینے والوں کا وکیل ہوتا ہے اور وکیل کو مدرسہ کے مفاد کے لئے چندہ خرچ کرنے کی اجازت ہوتی ہے، کبھی کبھار آنے والے طلباء یا مدرسہ کے مہمانوں کو کھلانا مدرسہ کے مفاد میں ہے اور یہاں کے مدارس میں عرف بھی یہی ہے تو گویا چندہ دینے والوں کی طرف سے دلالۃ اسکی اجازت ہے۔

البتہ مہتمم مدرسہ اور اساتذہ کرام اپنے ذاتی مہمانوں کو اپنے خرچہ سے کھلائیں اور صاحب استطاعت طلباء کرام کے لئے بھی یہی حکم ہے، زیادہ احتیاط تو اس میں ہے کہ اس قسم کے

اخراجات کے لئے ایک مستقل مد ہو اور چندہ دینے والوں کے علم میں ہو، اسی مد سے اس قسم کے اخراجات کیے جائیں۔

لما فی العالمگیریۃ:(۵۱۰/۲،طبع رشیدیہ)

اما معناها شرعا فهو اقامة الانسان غيره مقام نفسه فی تصرف معلوم حتی ان التصرف ان لم يكن معلوما يثبت به ادنی تصرفات الوكيل وهو الحفظ.

ولما فی التنویر مع الدر:(۵۱۰/۵،طبع سعید)

(وهو اقامة الغير مقام نفسه) ترفها او عجزا (فی تصرف جائز معلوم، فلو جهل ثبت الادنی وهو الحفظ ممن يملكه) ای التصرف نظرا الی اصل التصرف.

ولما فی در المختار:(۵۲۱/۵،طبع سعید)

الوكيل اذا خالف، ان خلافا الی خير فی الجنس كبيع بالف درهم فباعه بالف ومائة نفذ ولو بمائة دينار لا، ولو خيرا خلاصة ودرر.

ولما فی الشامی:(۳۶۲/۴،طبع ایچ ایم سعید)

وفی شرح البيری عن المبسوط ان الثابت بالعرف كالثابت بالنص اه فالظاهر اعتبار العرف فی الموضع او زمان الذی اشتهر فيه دون غيره.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد ولی اللہ

۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۹۰۶

﴿ایک مسجد کی رقم دوسری مسجد کی تعمیر میں لگانا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دبئی کے ایک شیخ نے ہمارے محلے کی جامع مسجد کی تعمیر کیلئے بیس لاکھ روپے بطور وقف دیئے ہیں، لیکن ہمارے علاقے کے کچھ لوگ ان پیسوں کو دوسری مسجد میں جو ان کے گھروں کے قریب تعمیر ہو رہی ہے لگانا چاہتے ہیں جبکہ جامع مسجد کی پرانی تعمیر کافی کمزور ہو چکی ہے نئی تعمیر کی شدید ضرورت ہے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا ان کیلئے اس طرح کرنا جائز ہے یا نہیں؟ برائے کرم وضاحت فرمائیں۔

﴿جواب﴾ شیخ نے جس مسجد کی تعمیر کیلئے پیسے دیئے ہیں ان پیسوں کو اسی مسجد کی تعمیر میں خرچ کرنا ضروری ہے دوسری مسجد کی تعمیر میں ان پیسوں کو خرچ کرنا جائز نہیں ہے اور جو لوگ چاہتے ہیں کہ ان پیسوں کو دوسری مسجد کی تعمیر میں خرچ کیا جائے ان کا اس طرح

سوچنا قطعاً غلط ہے اور اگر خرچ کئے ہیں تو پوری رقم واپس کرنا انکے ذمہ ہے اور امانت میں خیانت کی وجہ سے بڑا گناہ بھی کیا ہے۔

لما فی الشامی (۲/۳۵۹،سعید)

(قوله تفریع علی قولهما)ای قوله فیصرف الخ مفرع علی قول الامام وابی یوسف ان المسجد اذا خرب یبقی مسجدا ابدالکن علمت ان المفتی به قول ابی یوسف انه لایجوز نقله ونقل ماله الی مسجد آخر کمامر عن الحاوی،

(ولما فی الهندیة(۲/۴۷۸،رشیدیة)

سئل شمس الائمة الحلوانی عن مسجداوحوض...... استغنی الحوض عن العمارة وهناك مسجد محتاج الی العمارة او علی العکس هل یجوزللقاضی صرف وقف مااستغنی عن العمارة الی عمارة ماهومحتاج الی العمارة قال لا.

وکذافی التتارخانیة(۵/۵۹۵،قدیمی)

الجواب صحیح:مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:دوست محمد روغانی

۱۴ جمادی الاولی ۱۴۳۵ھ — فتوی نمبر ۳۱۳۶

﴿ایسا مدرسہ جو ختم ہو گیا ہو اس کے سامان وغیرہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام کہ میرے پاس ایک خالی پلاٹ تھا میں نے اس کی چاردیواری اپنے خرچے سے بنوائی پھر اس جگہ کو مدرسہ بنانے کا ارادہ ہوا تو مدرسہ کیلئے چندہ کی رقم سے چھت ڈلوائی اور رنگ کروایا اور مدرسے کی ضرورت کیلئے کچھ سامان مثلاً: پائپ چادر وغیرہ خریدیں، کچھ عرصہ وہاں مدرسہ چلتا رہا لیکن اب مدرسہ ختم ہو گیا ہے اور جو سامان مدرسے کا بچ گیا ہے اگر اسے فروخت کیا جائے تو کوئی خاطر خواہ رقم نہیں ملے گی۔

ایسی صورت میں اگر وہ کمرہ اور اس کا سامان کرائے پر استعمال کیلئے دے دوں اور کرائے کی رقم کسی مدرسے میں جمع کرادوں تو کیا میں عہدہ برآ ہو جاؤنگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ مدرسہ کے دوبارہ آباد ہونے اور سلسلہ درس وتدریس کا انتظام اگر معقول طریقے سے ہوسکتا ہے تو اسی مدرسہ کو بطریقۂ احسن آباد کیا جائے لیکن اگر اس مدرسے کے آباد ہونے کی بظاہر کوئی صورت نہ ہو اور مدرسہ کا سامان ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو یہ سامان اور کمرہ وغیرہ کو کرایہ پر دیکر اس سے حاصل شدہ کرایہ کسی ایسے قریبی مدرسے میں دینا جائز ہے، جس میں

چندہ وغیرہ صحیح مصارف میں صرف ہوتا ہو تو امید ہے کہ آپ عہدہ برآ ہو جائینگے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲/۳۵۹،طبع سعید)

(ومثله)۔۔۔(حشیش المسجد وحصره مع الاستغناء عنهما و) كذا (الرباط والبئر اذالم ينتفع بهمافيصرف وقف المسجد والرباط والبئر) والحوض (الى اقرب مسجداورباط اوبئر) أوحوض (اليه)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد ضیاء الدین

۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ　　　فتوی نمبر: ۹۰۵

﴿ایک مسجد کے قرآن پاک دوسری مسجد میں لے جانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض مساجد میں قرآن پاک اتنے کثرت سے دئے جاتے ہیں جو مسجد کی ضرورت سے زائد ہوتے ہیں اور پڑھنے کیلئے استعمال بھی نہیں ہوتے اور ان کے ضائع ہونے کا اندیشہ بھی ہوتا ہے، کیا ایسی صورت میں یہ قرآن کسی دوسری مسجد یا مدرسہ میں جہاں ان کی ضرورت ہو دیے جاسکتے ہیں یا نہیں؟

﴿جواب﴾ آج کل مساجد میں واقعی قرآن پاک بہت کثرت سے رکھے جاتے ہیں جو مسجد کی ضرورت سے بھی زائد ہوتے ہیں، لوگ یہ قرآن ثواب کی غرض سے مسجد میں دیتے ہیں جبکہ ان کا یہ مقصد پورا نہیں ہوتا، اس لئے کہ سالہا سال یہ قرآن پاک اسی طرح پڑے رہتے ہیں اور کسی کے پڑھنے میں استعمال نہیں ہوتے، چنانچہ مفتی بہ قول کے مطابق اگرچہ قرآن پاک ایک مسجد سے دوسری مسجد میں منتقل نہیں کر سکتے، جیسا کہ علامہ شامیؒ نے صراحت کی ہے لیکن عصر حاضر کے بعض علماء کرام نے ضرورت کی وجہ سے الدر المختار کے قول پر فتوی دیا ہے کہ ان حالات میں ان مساجد سے دوسری مساجد میں قرآن پاک کی منتقلی میں کوئی حرج اور مضائقہ نہیں اور ہماری رائے بھی یہی ہے کہ جن مساجد میں قرآن پاک اس کثرت سے رکھے ہوں کہ ان کی تلاوت کی نوبت بھی نہیں آتی تو اس طرح کے قرآن پاک جن مساجد میں ان کی ضرورت ہو منتقل کرنے کی گنجائش معلوم ہو رہی ہے۔

لمافی الدر المختار:(۲/۳۶۵،طبع ایچ ایم سعید)

وان وقف على المسجد جاز ويقرافيه ولا يكون محصوراعلى هذاالمسجد وبه عرف

حکم نقل کتب الاوقاف من محالها للانتفاع بها.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد حسین

۷ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ — فتوی نمبر: ۷۴۰

﴿کسی کی مملوکہ یا وقف کردہ زمین کو مسجد میں شامل کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں مسجد کے قریب چند بوسیدہ قبریں ہیں، اہل محلہ ان قبروں کو ہموار کر کے مسجد کے صحن میں شامل کرنا چاہتے ہیں، کیا شرعاً کسی کی مملوکہ یا قبرستان کیلئے وقف کردہ زمین کو مسجد میں شامل کرنا اور قبروں کو ہموار کرنا جائز ہے؟ اس میں قبروں کی توہین تو نہیں ہوگی؟ مستفتی: حبیب الرحمٰن شورکوٹی

﴿جواب﴾ بوسیدہ قبریں اگر کسی کی مملوکہ زمین میں ہوں اور اتنا طویل زمانہ ان پر گذرا ہو جس میں اہل قبور کے مٹی ہو جانے کا یقین ہو تو پھر مالک کی اجازت سے زمین کو مسجد میں شامل کرنا جائز ہے، اس سے قبروں کی کوئی توہین نہیں ہوتی۔

اور اگر قبریں وقف کی زمین پر بنائی گئی ہوں تو پھر اہل قبور کے مٹی ہو جانے کیساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آبادی کے لوگوں نے اس جگہ پر مردوں کا دفن کرنا چھوڑ دیا ہو، نیز مسجد میں توسیع کرنے کی اشد ضرورت ہو تو پھر قبروں کو ہموار کر کے مسجد میں شامل کرنا شرعاً جائز ہوگا، اس صورت میں قبروں کی توہین نہیں ہوگی اور اس مسجد میں نماز پڑھنے سے ثواب پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

لما فی الشامی:(۲/۲۴۵، طبع ایچ ایم سعید)

قلت:وتقدم انه اذابلی المیت وصار ترابا یجوز زرعه والبناء علیه.

ولما فی عمدة القاری:(۲/۲۶۵، طبع رشیدیه)

فان قلتَ هل یجوز ان تبنی علی قبور المسلمین قلت: قال ابن القاسم لو ان مقبرة من مقابر المسلمین علت فبنی قوم علیها مسجدا لم ار بذلک بأسا ـــ لان المسجد ایضا وقف من اوقاف المسلمین.اه.

ولما فی الشامی:(۴/۳۷۹، طبع ایچ ایم سعید)

(قوله وتوخذ ارض)......لکن جواز أخذ المملوکة کرها یفید الجواز بالاولی لان المسجد لله تعالی والوقف کذلک اه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: رشید عالم مروت

۵ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ — فتوی نمبر: ۹۵۲

﴿جو جگہ مسجد کی نیت سے خریدی ہو لیکن وقف تام نہ کیا ہو بیچ سکتا ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کسی شخص نے زمین خریدی اس ارادے سے کہ اس جگہ مسجد بناؤں گا یا اس کو فروخت کر کے دوسری جگہ مسجد بناؤں گا، اب کچھ لوگوں نے رکاوٹیں ڈالنا شروع کر دیں اور یہ بھی اندیشہ ہے کہ اگر وہاں مسجد بن جائے تو بدعتی حضرات اس پر قبضہ کر لیں گے، مسجد صحیح لوگوں کے ہاتھ سے نکل جائی گی، اب وہیں مسجد بنانی چاہیے یا اس جگہ کو فروخت کر کے کسی اور جگہ مسجد تعمیر کر سکتے ہیں؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: فیصل صاحب ابوبکر صدیق مسجد

﴿جواب﴾ صرف ارادہ کرنے سے وہ جگہ شرعی مسجد کا حکم نہیں رکھتی بلکہ مسجد کیلئے باقاعدہ وقف کرے اور اس کے علاوہ وہاں پر متولی کی اجازت سے اذان واقامت کیساتھ نماز باجماعت پڑھی جائے تو وہ مسجد شرعی کے حکم میں ہوگی چونکہ یہاں پر متولی کی اجازت سے نماز باجماعت نہیں پڑھی گئی اور نہ ہی وقف تام ہوا ہے، اس کی جگہ دوسری مقام پر مسجد بنانا جائز ہے اور اس جگہ کو اپنے ذاتی استعمال میں لے سکتا ہے۔

لمافی الهداية:(۲/۲۲۱ طبع رحمانيه)

وانبنى مسجدالم يزل ملكه عنه حتى يفرزه عن ملكه بطريقه وياذن للناس بالصلاة فيه فاذاصلى فيه واحد زال عندابى حنيفةؒ عن ملكه وقال ابويوسفؒ يزول ملكه بقوله جعلته مسجدا

ولمافى البحرالرائق:(۵/۲۴۸ طبع ايچ ايم سعيد)

من بنى مسجدالم يزل ملكه عنه حتى يفرزه عن ملكه بطريقه وياذن بالصلاة فيه واذاصلى فيه واحد زال ملكه.

ولمافى فتح القدير:(۶/۲۱۷ طبع رشيديه)

ولهذا يشترط كونها باذان واقامة عندهما ولوجعل له واحدمؤذنا واماما فاذن واقام وصلى وحده صار مسجدا بالاتفاق لأن اداء الصلاة على هذا الوجه كالجماعة. ومثله فى الشامية (۲/۳۵۷، طبع ايچ ايم سعيد)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالستار

۱۴۲۸ھ — فتوی نمبر: ۹۴۴

﴿وقف کی زمین میں تصرف کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ اگر مسجد یا مدرسے کے لئے کوئی زمین وقف کی گئی ہو تو اس کا تبادلہ دوسری زمین سے کر کے اس میں مسجد یا مدرسہ بنانا جائز ہے یا

نہیں؟ نیز اگر کوئی شخص زمین وقف کرنے کے بعد واپس لینا چاہے تو شرعاً لے سکتا ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ (۱) مذکورہ صورت میں اگر دوسری زمین وقف کی زمین سے زیادہ کارآمد ہو یا اس میں وقف کا زیادہ فائدہ ہو تو تبادلہ کی گنجائش ہے۔ (۲) جب کوئی شخص کسی چیز کو وقف کرتے وقت یوں کہے کہ میں نے اس چیز کو وقف کیا ہے یا اس جیسے دوسرے الفاظ استعمال کرے تو وقف تام ہو جاتا ہے، اب یہ چیز اس کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اور واقف اس میں کسی قسم کا تصرف نہیں کر سکتا، لہٰذا وقف کرنے کے بعد اسے رجوع کا حق بھی حاصل نہ ہوگا۔

لما فی الشامی: (۵۸۶/۶، طبع امدادیه)

وفی القنية مبادلة دار الوقف بدار اخرى انما يجوز اذا كانتا فی محلة واحدة او محلة الاخرى خيرا و بالعكس لا يجوز.

ولما فی الدر المختار: (۵۳۹/۶ طبع امدادیه)

فاذاتم ولزم لايملك ولايعار ولايرهن وقال الشامی: لايملك ای لايكون مملوكا لصاحبه ولايملك ای لايقبل التمليك لغيره بالبيع ونحوه لاستحالة تمليك الخارج عن ملكه.

ولما فی الفقه الاسلامی: (۷۶۰۴/۸، طبع رشیدیه)

ورأى ابويوسف ان الوقف اسقاط ملك كالطلاق والاعتاق فانه اسقاط للملك عن الزوجة والعبد، فيتم بمجرد التلفظ ولايشترط فيه التسليم، ويصح وقف المشاع القابل للقسمة من غير افراز وهذا هو المفتى به عند الحنفية لانه احوط واسهل.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: عبدالحکیم کشمیری

۱۳ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۱۵۴۰

﴿وقف عیدگاہ صرف اتصال صفوف کے حکم میں مسجد کی طرح ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں وقف عیدگاہ ہے، اس کو صرف عیدین اور کسی دینی تقریب کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، اسکے متصل سڑک بھی ہے لیکن کبھی کبھار راہ گزر بھی اس سے گزرتے ہیں اور بسا اوقات بچے وہاں کھیلتے بھی ہیں، پوچھنا یہ ہے کہ عیدگاہ کو دوسرے امور کے لئے استعمال کرنا جائز ہے؟

﴿جواب﴾ صرف اتصال صفوف کے حکم میں عیدگاہ مسجد کیطرح ہے یعنی جسطرح مسجد میں اتصال صفوف کے بغیر بھی کراہت کے ساتھ نماز ہو جاتی ہے، اسی طرح عیدگاہ میں بھی بغیر

اتصال کے نماز ہو جاتی ہے، باقی احکام میں مسجد کی طرح نہیں ہے، تاہم اسکی حفاظت اور احترام ضروری ہے، اسلئے مستقل گذرگاہ بنانے یا کھیل کے طور پر استعمال کی اجازت نہیں ہے۔

نیز مذکورہ امور اسلئے بھی درست نہیں، کہ واقف نے اس زمین کو اس قسم کے کاموں کے لئے وقف نہیں کیا ہے جبکہ وقف کرنے والے کی نیت کا لحاظ رکھنا شرعاً ضروری ہوتا ہے، لہذا عیدگاہ کو عیدین کی نماز یا دیگر دینی تقریبات کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ سوال میں مذکور ہے، اس کے علاوہ امور کے لئے استعمال کرنا منع ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۱/۶۵۷،طبع ایچ ایم سعید)

(واما المتخذ لصلاة الجنازة أو عيد)فهو(مسجد في حق جواز الاقتداء)،وان انفصل الصفوف رفقا بالناس(لا في غيره)،به يفتى نهاية(فحل دخوله لجنب وحائض)كفناء مسجد.

وفي الشامية:والمختار للفتوى انه مسجد في حق جواز الاقتداء الخ لكن قال في البحر ظاهره انه يجوز الوطء والبول والتخلي فيه ولا يخفى ما فيه فان الباني لم يعده لذلك فينبغي ان لا يجوز وان حكمنا بكونه غير مسجد وانما تظهر فائدته في حق بقية الاحكام وحل دخوله للجنب والحائض.

ولما في البحر الرائق:(۵/۲۴۸،طبع سعید)

وفي الخانية:مسجد اتخذ لصلاة الجنازة او لصلاة العيد هل يكون له حكم المسجد......
وما اتخذ لصلاة العيد لا يكون مسجداً مطلقا وانما يعطى له حكم المسجد في صحة الاقتداء بالامام وان كان منفصلا عن الصفوف واما فيما سوى ذلك فليس له حكم المسجد وقال بعضهم له حكم المسجد حال اداء الصلاة لا غير وهو والجبانة سواء ويجنب هذا المكان كما يجنب المسجد احتياطا.

ولما في الدر المختار:(۴/۴۳۳،طبع سعید)

قولهم شرط الواقف كنص الشارع اى في المفهوم والدلالة ووجوب العمل به.

الجواب صحیح:عبدالرحمن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم:محمد اسلم چترالی

۱۵ جمادی الاولی ۱۴۲۹ھ　　　فتوی نمبر:۱۴۸۰

﴿وقف دکان کو مارکیٹ ویلیو سے کم کرایہ پر دینا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد کی دکان کا کرایہ چار ہزار روپے ہے لیکن محلّہ کا ایک بااثر شخص تین ہزار روپے پر لینا چاہتا ہے، سوال یہ ہے

کہ اس شخص کو تین ہزار روپے پر دینا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: محمد شعیب

﴿جواب﴾ مسجد کی دکان مال وقف ہے اور مال وقف کو مارکیٹ ویلیو سے کم کرایہ پر دینا جائز نہیں ہے، لہٰذا مذکورہ شخص اگر چار ہزار پر راضی ہو تو ٹھیک ہے ورنہ کسی اور شخص کو جو چار ہزار روپے ادا کرے دکان کرایہ پر دینی چاہیے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۶۰۲/۲ طبع ایچ ایم سعید)(ویوجر)بأجر(المثل)ف(لا)یجوز(بالاقل)

ولمافی خلاصة الفتاوی:(۱۱۲/۲ طبع رشیدیه)

المتولی اذا رعن الوقف لایصح ولوأجر یصح ان کان بأجر المثل.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ والله اعلم بالصواب: عبدالرزاق عفا اللہ عنہ

۵ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ فتوی نمبر:۱۶۷۶

﴿مشروط وقف کیا ہو تو وقف صحیح نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ زید نے عمرو کو دس لاکھ روپے دیکر وکیل بنایا کہ اس سے کوئی زمین خرید کر آباد کر دو جب اسکی آمدنی شروع ہو جائے سب سے پہلے آمدنی سے میرے دس لاکھ روپے مجھے واپس کر دینا اسکے بعد اسکی آمدنی مدرسے پر خرچ کرتے رہنا، اسکے بعد عمرو نے اپنے طور پر اس لئے قرض لیا کہ زمین کی آمدنی سے سب سے پہلے اپنا قرض اتارونگا، زمین آباد کرنا شروع کر دی، پوچھنا یہ ہے کہ مذکورہ زمین وقف کے حکم میں ہے یا نہیں؟ جبکہ زید عمرو دونوں نے مذکورہ زمین کے منافع کو مدرسے کیلئے مشروط وقف کر دیا۔ مستفتی: نصیر صاحب

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں زمین وقف کے حکم میں نہیں ہے کیونکہ زید اور عمرو دونوں نے زمین کے منافع کو زمین کی لاگت کی وصول یابی کے ساتھ مشروط کیا ہے جبکہ وقف میں تنجیز (غیر مشروط) ضروری ہے۔

لمافی الشامی:(۵۲۲/۶)(وأن یکون)قربة فی ذاته معلوما(منجزا)لامعلقاالا بکائن ولامضافا.

ولمافی الهندیة:(۳۵۵/۲)(ومنها)أن یکون منجزاغیر معلق فلوقال ان قدم ولدی...... لاتصیر وقفا.

ولمافی البحر:(۱۸۸/۵)وشرائطه ......أن یکون منجزا غیر معلق فانه ممالایصلح تعلیقه بالشرط

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ والله اعلم بالصواب: محمد احمد عفا اللہ عنہ

۲۶ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ فتوی نمبر:۱۶۹۹

﴿مسئلہ وقف﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہم نے دینی سرگرمیاں شروع کرنے کے لئے بارہ (۱۲) لاکھ روپے چندہ جمع کر کے ایک عمارت خریدی، عمارت کی قیمت چونکہ بیس (۲۰) لاکھ روپے تھی اور چندہ بارہ (۱۲) لاکھ روپے ہوا تھا، اسلئے ایک آدمی نے آٹھ (۸) لاکھ روپے دیئے، ہم نے وہ عمارت خرید لی اور وہ آدمی آٹھ (۸) لاکھ روپے کے حساب سے عمارت کے ایک حصہ کا مالک بن گیا اور وہ حصہ ہم کو کرایہ پر دے دیا، ہم نے اس عمارت کو وقف کر دیا اور اس میں دینی و دنیاوی علوم کے امتزاج پر مبنی ایک ادارہ ''اقراء'' کھول لیا جس کی آمدنی سے اس آدمی کا کرایہ بھی ادا کیا جاتا ہے، آپ حضرات سے تین باتوں کے جوابات مطلوب ہیں:

(۱) جس آدمی کا عمارت میں آٹھ لاکھ روپے کے بقدر حصہ ہے اس شخص کو وقف یعنی ''اقرء'' کی آمدنی سے کرایہ ادا کیا جا سکتا ہے؟ (۲) چونکہ اس عمارت میں بارہ (۱۲) لاکھ کے بقدر حصہ وقف اور آٹھ (۸) لاکھ کے بقدر حصہ ملکیت ہے تو درس و تدریس کا کام صرف ''وقف شدہ'' حصہ میں کیا جائے یا پوری عمارت میں کہیں بھی کیا جا سکتا ہے؟ (۳) اگر وقف کی زمین کم پڑ رہی ہو تو ضرورت کے لیے متصل جگہ کرایہ پر لینا کیسا ہے؟ جبکہ کرایہ وقف کی آمدنی سے ادا کیا جا رہا ہو۔

﴿جواب﴾ (۱) وقف کی آمدنی اور عام عطیہ کے رقوم سے شخص مذکور کے مملوک مکان کے حصہ کا عرف کے مطابق جو کرایہ ہو اداء کیا جا سکتا ہے لیکن زکوۃ اور صدقات واجبہ کی رقم سے کرایہ وغیرہ ادا کرنا جائز نہیں ہے۔

لما فی الدر المختار: (۲/ ۳۵۱، طبع ایچ ایم سعید)

(وجازت التطوعات من الصدقات و) ... (الأوقاف لهم) أی لبنی هاشم سواء سماهم الواقف أولا.
وفی الشامية: (قوله وجازت التطوعات الخ) قيد بها ليخرج بقية الواجبات كالنذر والعشر والكفارات... قلت: وذكر فی الفتح أن الحق إجراء الوقف مجری النافلة لأن الواقف متبرع.

(۲) اگر شخص مذکور کا مملوک حصہ ''اقرء'' کی ضروریات کے لئے کرایہ پر لیا ہوا ہے تو وہ حصہ وقف حصہ کی طرح اقرء کے مصالح کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے خواہ یہ استعمال درس و تدریس وغیرہ کی صورت میں ہو یا دیگر متعلقہ امور کے لئے۔

لما فی الهندية: (۲/ ۴۷۰، طبع رشیدیه)

اذا استأجر دارا أو بيتا ولم يسم الذی يريد ماله حتی جازت الاجارة استحسانا كان له أن

یسکنها وأن یسکنها وله أن یضع متاعه فیها وله أن یعمل فیه مابداله من العمل.

ولما فی الهندیة:(۲/۳۶۵،طبع رشیدیه)

وقف المشاع المحتمل للقسمة لایجوز عند محمد..... والمتأخرون أفتوبقول ابی یوسف رحمه الله أنه یجوز وهوالمختار.

(۳) اگر واقعۃ "اقرء" کی موجودہ عمارت سے اقرء کی حقیقی ضروریات پوری نہیں ہورہی ہیں تو ضرورت کی بناء پر دوسری عمارت کرایہ پر لینا جائز ہے اور اس کا کرایہ وقف کی آمدنی اور عام عطیہ سے ادا کیا جاسکتا ہے کیونکہ زکوۃ اور صدقات واجبہ کی رقوم کو ان مصارف میں خرچ کرنا جائز نہیں۔

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: مزمل شاہ لکی مروت

۱۷ رجب ۱۴۳۰ھ   فتویٰ نمبر: ۲۳۸۰

﴿مرہونہ زمین کو وقف کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک آدمی کو قرض دیا اور اسکے بدلے میں اسکی زمین رہن رکھی، کچھ عرصے کے بعد اس آدمی نے وہ مرہونہ زمین مسجد کے لئے وقف کردی کیونکہ اسکا ارادہ تھا کہ وہ جلد ہی قرض ادا کردے گا لیکن قرض ادا کرنے سے پہلے ہی اسکا انتقال ہوگیا، اب اسکے ترکے میں اتنا مال نہیں کہ جس سے میرا قرض ادا کیا جاسکے، پوچھنا یہ ہے کہ کیا اسکی زمین کو جو کہ میرے پاس رہن رکھی ہوئی تھی اسکے ورثاء بیچ کر میرا قرض ادا کرسکتے ہیں یا وہ وقف ہی رہے گی؟   مستفتی عابد دیر دی

﴿جواب﴾ اگر واقعی مقروض کے ترکے میں اتنا مال نہیں جس سے آپکا قرض ادا کیا جاسکے اور نہ ہی کوئی اور زمین، جائیداد وغیرہ ہے جسکو بیچ کر قرض ادا کیا جاسکے تو مرحوم کا وقف باطل ہوگیا اور اسکے ورثاء اس زمین کو بیچ کر قرض ادا کرسکتے ہیں لیکن اگر اسکا کوئی اور ایسا مال ہو جس سے قرض ادا کیا جاسکتا ہو تو اس زمین کو بیچنا جائز نہ ہوگا اور یہ وقف ہی رہے گی۔

لمافی العالمگیریة:(۲/۳۵۳،طبع رشیدیه)

واماعدم تعلق حق الغیر کالرهن والاجارة فلیس بشرط ثم قال بعدسطور: لورهن ارضه ثم وقفهاقبل ان یفتکهالزم الوقف ولاتخرج عن الرهن بذالک ولواقامت سنین فی یدالمرتهن ثم افتکهاتعودالی الجهة ولومات قبل الافتکاک وترک قدرماتفتک افتکت ولزم الوقف وان لم یترک وفاء بیعت وبطل الوقف.

ولما فی الفقه الاسلامی وادلته:(ج۱۰ص۷۶۱۵،طبع رشیدیه)

قال الحنفية يصح للراهن وقف المرهون لانه يملكه لكن يبقى حق المرتهن متعلقاً بالمرهون فان ولی الدين تطهرت وخلصت العين المرهونة من تعلق حق المرتهن بها والافله ان يطلب ابطال الوقف وبيع المرهون وبناء عليه يجبر القاضی الراهن علی دفع ما عليه ان كان موسراً وان كان معسراً فيبطل الوقف ويبيع العين المرهونة فيما عليه من الدين وكذالو مات فان كان له ما يوفی الدين ظل الشئ موقوفاً والابيع وبطل الوقف.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: فیاض احمد

۲۵ محرم ۱۴۳۰ھ　　فتویٰ نمبر:۱۹۰۲

قبرستان کی وقف زمین پر مسجد بنانا جائز نہیں

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ جو زمین قبرستان کے لئے وقف ہو اس پر مسجد بنانا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ ہمارے گاؤں میں وقف شدہ قبرستان کی قبروں کے نشانات کو مٹا کر مردوں کی ہڈیاں نکال کر دوسری جگہ دفن کی گئی ہیں اور مسجد بنائی گئی ہے، کیا یہ مسجد دیگر مساجد کی طرح مسجد کے حکم میں ہے یا نہیں؟　　مستفتی سلیم اللہ بونیری

جواب: وقف کرنے والے کی طرف سے اگر مصرف کی تعین ہو مثلاً قبرستان یا مسجد کیلئے وقف کیا ہے تو اسکا لحاظ رکھنا ضروری ہے، اسکے علاوہ مصرف میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے، لہٰذا یہ زمین اگر قبرستان کے لئے ہی وقف کی گئی ہے تو اس میں مسجد بنانا جائز نہیں ہے اور نہ ہی یہ بنی ہوئی جگہ مسجد کی حکم میں آسکتی ہے۔

لما فی الشامی:(۴۳۳/۴،طبع سعید)(۱)فان شرائط الواقف معتبرة اذا لم تخالف المشرع.

لما فی الشامی:(۴۹۵/۴،طبع سعید)(۲)شرط الواقف كنص الشارع فيجب اتباعه.

ولما فی الهندية:(۴۷۰/۲،طبع رشيديه)

وسئل هو ايضاً عن المقبرة فی القرى اذا اندرست ولم يبق فيها اثر الموتى لا العظم ولا غيره هل يجوز زرعها واستغلالها قال لا ولها حكم المقبرة كذا فی المحيط ..... لان المانع هنا كون المحل موقوفاً علی الدفن فلا يجوز استعماله فی غيره فليتأمل.

اور وقف کرنے والے نے صرف قبرستان کیلئے وقف نہ کی ہو بلکہ رفاہ عام کیلئے وقف کی ہو تو اس میں مسجد بنانا جائز ہے اور یہ جگہ اب شرعی مسجد کہلائیگی لیکن مردوں کی ہڈیاں اور دیگر اعضاء جب تک باقی ہوں انکو نکالنا جائز نہیں ہے، البتہ اندازہ ہو کہ یہ قبریں اتنی پرانی ہوگئی ہیں کہ اب

مردوں کے اعضاء وغیرہ بوسیدہ ہوکر مٹی میں تبدیل ہو گئے ہیں تو قبروں کو مٹانا، وہاں مسجد وغیرہ بنانا جائز ہے پھر اس دوران خلاف اندازہ کوئی ایک دو قبروں سے مردوں کی ہڈیاں اگر ثابت نظر آئیں تو اسی جگہ انکو دفنا دیں نکالنا نہیں چاہیے اور مسجد اوپر بنالیں۔

لما فی الهندية:(١٦٧/١،طبع رشيديه)

ولو بلى الميت وصار ترابا جاز دفن غيره فی قبره وزرعه والبناء عليه كذا فی التبيين.

ولما فی فقه الاسلامی وادلته:(٦٢٩/٢،طبع دار الفكر بيروت)

يحرم نبش القبر مادام يظن فيه شيئ من عظام الميت فيه فلا تنبش عظام الموتى عند حفر القبور ولا تزال عن موضعها ويتقى كسر عظامها لقوله ﷺ كسر عظام الميت ككسر عظم الحی فی الاثم او كسر عظم الميت ككسره حيا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: حبیب الرحمٰن

۳ محرم ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۸۲۹

﴿قبرستان کے درختوں کو کاٹنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام قبرستان کے درختوں کے بارے میں کہ اس کا کاٹنا جائز ہے یا نہیں؟

مستفتی: ایک سائل فون پر

﴿جواب﴾ قبرستان کے درختوں سے متعلق بعض علاقوں میں ایک غلط تصور کیا جاتا ہے کہ قبرستان کے درختوں کو کاٹنے سے جنات نقصان پہنچاتے ہیں. یا وہاں کے مردوں میں بعض برگزیدہ اشخاص ہوتے ہیں وہ نقصان پہنچاتے ہیں یہ تصور تو بالکل غلط ہے۔ اس طرح کا عقیدہ رکھنا اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ البتہ قبرستان میں خودرو درختوں اور گھاس وغیرہ کا حکم عام بنجر زمین کی طرح نہیں ہے کچھ فرق ہے۔ چنانچہ سرسبز گھاس اور چھوٹے پودوں کے کاٹنے کو فقہاء نے منع کیا ہے۔ اس لئے کہ سبز پودوں سے متعلق احادیث میں آیا ہے کہ یہ ذکر وتسبیح کرتے ہیں اور مردوں کیلئے باعث برکت وراحت ہوتے ہیں۔ ہاں خشک گھاس کاٹنا اور خشک لکڑیاں وہاں سے حاصل کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ بڑے بڑے درخت سرسبز ہو تو وہ بھی گھاس کی طرح ذکر وتسبیح کرتے ہیں لیکن یہ چونکہ بڑی آمدنی کا بھی ذریعہ ہے۔ اور چھوڑنے کی صورت میں قبرستان کی زمین کو گھیرنے اور خراب کرنے کے بھی باعث ہونگے اس لئے ضرورت کے پیش نظر کاٹنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ قبرستان اگر کسی کی مملوکہ

زمین میں نہیں ہیں تو علاقہ کے ذمہ دار حضرات کے مشورہ سے ایسے درخت کاٹے جا سکتے ہیں۔ اور لکڑیاں فروخت کر کے آمد قبرستان کے مصارف پر خرچ کرنا ضروری ہوگا۔ کسی کو اپنی ذات کیلئے کاٹنا یا فروخت کر کے روپیہ اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں ہے۔

لما فی الهندية:(۲/۴۷۳، طبع رشیدیه)

(والمسائل التی تعود الی الأشجار التی فی المقبرة وآراضی الوقف وغیر ذلک) مقبرة علیها أشجار عظیمة فهذا علی وجهین اما أن کانت الأشجار نامیة قبل اتخاذ الأرض مقبرة أو نبتت بعد اتخاذ الأرض مقبرة ففی الوجه الأول المسئلة علی قسمین اما أن کانت الأرض مملوکة لها مالک أو کانت مواتا لا مالک لها واتخذ أهل القریة مقبرة ففی القسم الأول الأشجار بأصلها علی مالک الأرض یصنع بالأشجار وأصلها ماشاء، وفی القسم الثانی الأشجار بأصلها علی حالها القدیم. وفی الوجه الثانی المسئلة علی قسمین' اما أن علم لها غارس أو لم یعلم ففی القسم الأول کانت للغارس وفی القسم الثانی الحکم فی ذلک الی القاضی ان رای بیعها وصرف ثمنها الی عمارة المقبرة فله ذلک' کذا فی الواقعات الحسامیة. کذافی فتاوی قاضی خان:(۳/۱۸۹، طبع قدیمی)

ولما فی الشامی:(۴/۳۶۶، طبع سعید کراچی)

فلو کان الوقف شجرا یخاف هلاکه کان له ان یشتری من غلته فصیلا فیغرزه لان الشجر یفسد علی امتداد الزمان.

ولما فی الفتاوی التاتار خانية:(۲/۱۳۱، طبع قدیمی)

. وفی "تجنیس الناصری" حطب نبت فی المقبرة ثمنه یصرف فی مصالح المقبرة. وفی "الکبری" شوکة أو حشیش نبت علی القبور فان کان رطب یکره قلعه' وان کان یابسا لا' واذا کان فی المقبرة حطب یجوز للرجل أن یحتطب فیها.

ولما فی البحر الرائق(۲/۱۹۶، طبع سعید)

ویکره قطع الحطب والحشیش من المقبرة الا اذا کان یابسا ولا یستحب قطع الحشیش الرطب اھ

واللہ اعلم بالصواب: عمران الحق سواتی	الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ
فتویٰ نمبر: ۳۸۷۹	۲۳ ذیقعدہ ۱۴۳۲ھ

﴿فنڈ بنام سیلاب زدگان کا مستحقین وغیر مستحقین کے درمیان تقسیم کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ضلع لکی مروت کے لئے حکومت نے فنڈ بنام سیلاب زدگان منظور کیا ہے لیکن متعین کردہ تقسیم کرنے

والے افراد متعلقینِ سیلاب زدگان کے ساتھ ساتھ اپنے متعلقین کو بھی اس فنڈ سے رقم دیتے ہیں جبکہ وہ غیر مستحق ہیں، ان افراد نے مجھے بھی اس فنڈ سے بیس ہزار روپے دینے کا کہا حالانکہ میں سیلاب زدگان میں سے نہیں ہوں، البتہ سیلاب کے دنوں میں بارش کی وجہ سے میرا صرف بھوسہ خراب ہوگیا ہے جبکہ اسکی قیمت بیس ہزار روپے تک نہیں پہنچتی۔

پوچھنا یہ ہے کہ مذکورہ تقسیم کرنے والے افراد کا ایسا معاملہ کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اور میرے لئے اس فنڈ سے بیس ہزار روپے لینا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ میں سیلاب زدہ مستحق نہیں ہوں اگرچہ زکوٰۃ کا مستحق ہوں اگر یہ رقم میں نہ لوں تو غیر مستحق کو مل جائے گی۔

﴿جواب﴾ بارش کی وجہ سے آپ کے بھوسہ کو اگر نقصان پہنچا ہے تو آپ بھی متاثرین میں شمار ہوتے ہیں، لہٰذا جتنا نقصان آپ کا ہوگیا ہے، اتنا لینا آپ کے لئے جائز ہے، اس سے زیادہ وصول نہ کریں یا آپ کے علم میں اگر ایسے متاثرین ہوں جن کو حق وصول نہ ہوا ہو تو ان کو پہنچانے کی نیت سے وصول کرلیں اور پھر ان تک پہنچادیں، یہ آپ کے لئے باعثِ اجر وثواب ہے۔

تقسیم کرنے والے افراد ہدایات کے خلاف صرف تعلق کی بنیاد پر غیر متاثرین کو یہ مال اگر دیتے ہیں تو یہ خیانت ہے، روزِ قیامت ان کو اس کا حساب دینا ہوگا۔

لمافی الدر مع الرد:(۲/۲۳۲،کتاب الوقف،طبع سعید)

قولهم:شرط الواقف كنص الشارع اى فى المفهوم والدلالة.

وفي الشامية:فاذاقال:وقفت على أولادي الذكور يصرف الى الذكور منهم بحكم المنطوق وأماالأناث فلايعطى لهن لعدم مايدل على الاعطاء الااذادل فى كلامه دليل على اعطائهن فيكون مثبتاًلاعطائهن ابتداء لابحكم المعارضة لكن نقل البيرى فى محل آخرعن المصفى وخزانة الروايات والسراجية أن تخصيص الشيء بالذكر يدل على نفي ماعداه فى متفاهم الناس وفى المعقولات وفى الروايات.

ولمافى الدر:(۲/۲۲۷،طبع سعيد)

ونقل عن المبسوط أن السلطان يجوزله مخالفة الشرط اذاكان غالب جهات الوقف قرى ومزارع فيعمل بأمره وان غاير شرط الواقف لأن أصلهالبيت المال.

وفي الشامية:قلت:والمرادمن عدم مراعاة شرطهاأن للامام أونائبه أن يزيدفيها وينقص ونحوذلك وليس المرادأنه يصرفهاعن جهة المعينةبأن يقطع وظائف العلماء،ويصرفهاالى غيرهم الخ.

ولما فی الهندیة:(۱/۱۹۱ مطبع رشیدیه)

والواجب علی الأئمة أن یوصلوا الحقوق الی أربابها ولا یحبسونها عنهم ولا یحل للامام وأعوانه من هذه الأموال قسم بین المسلمین، فان قصر الأئمة فی ذلک فوباله علیهم.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: صادق محمد سواتی غفرلہ ولوالدیہ

۱۵صفرالخیر۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر:۲۸۶۰

﴿مدرسہ کے فنڈ سے بغیر اجازت کے تعلیمی امور کے علاوہ میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں جس مدرسہ میں پڑھتا ہوں اس کے دفتر میں روزانہ تین قسم کے اخبارات آتے ہیں جنکا مہتمم صاحب اور دیگر اساتذہ کرام مطالعہ کرتے ہیں۔لیکن جب مہینہ کے آخر میں پیسے ادا کرنے ہوتے ہیں تو مدرسہ کے فنڈ سے ادا کئے جاتے ہیں۔اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا ان اخبارات کے پیسے مدرسہ کے فنڈ سے اداء کرنا جائز ہے یا نہیں؟ برائے کرم وضاحت فرمائیں۔ مستفتی: ایک متعلم

﴿جواب﴾ مہتمم صاحب چونکہ پیسہ دینے والوں کا اور طلباء کا وکیل ہوتا ہے اور انکی طرف سے مہتمم صاحب کو تعلیمی سرگرمیوں میں پیسہ خرچ کرنے کی اجازت ہوتی ہے نہ کہ غیر تعلیمی سرگرمیوں میں، لھذا مہتمم صاحب کیلئے جائز نہیں ہے کہ وہ طلباء کی اجازت کے بغیر ان پیسوں کو غیر تعلیمی امور میں لگائے جیسا کہ سوال میں ذکر ہے، اور جتنے پیسے اب تک انہوں نے اسطرح خرچ کیئے ہیں انکا لوٹانا ان کے ذمہ ضروری ہے۔البتہ تعاون کرنے والوں میں سے کوئی اس غرض سے بھی پیسہ دیتا ہو کہ تعلیمی خرچوں کے علاوہ بھی مہتمم صاحب جہاں مناسب سمجھیں اساتذہ وغیرہ کی سہولت کیلئے خرچ کرسکتے ہیں تو ایسی صورت میں اخبار لینے کی بھی گنجائش ہے لیکن اخبارات عموماً فحش قسم کی تصاویر پر مشتمل ہوتے ہیں اس لئے مدرسہ کے ماحول کیلئے سودمند نہیں ہیں، ہاں اسلام اخبار یا اس جیسا کوئی اخبار و رسالہ جس میں تصاویر نہ ہوں اور اس کیلئے خاص پیسہ بھی ہو تو لینے کی گنجائش ہے۔

لمافی الاشباہ والنظائر(۲۷۱ قدیمی)

لا یجوز للمتصرف فی مال غیرہ بغیر اذنه ولا ولایة الا فی مسألة فی السراجیة

وکذا فی الدر(۲/۲۰۰ سعید)

وکذا فی شرح المجلۃ (۲۶۲/۱ رشیدیہ المادۃ ۹۶)

الجواب صحیح: مفتی عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: دوست محمد روغانی

۱۶ جمادی الثانیہ ۱۴۳۵ھ　　　　فتویٰ نمبر ۴۱۷

﴿وقف کو شرط پر معلق کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے مسجد کے لئے زمین کا کچھ حصہ اس شرط پر وقف کیا کہ اگر مسجد کے لئے دوسری جانب سے راستہ نہ ملے تو یہ حصہ مسجد کا ہوگا، اب مسجد کے لئے دوسری جانب سے راستہ مل گیا لیکن مسجد کے بانی (بنانے والے) اور اہل محلہ واقف سے مطالبہ کرتے ہیں کہ زمین آپ نے وقف کردی تھی جبکہ واقف کا کہنا ہے کہ زمین جس شرط پر دی تھی وہ نہیں پائی گئی، لہٰذا میں نہیں دوں گا، پوچھنا یہ ہے کہ واقف کا اس طرح انکار کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ اور اہل محلہ کو مطالبہ کا حق ہے یا نہیں؟　　　　مستفتی: برکت اللہ ناکوی

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ وقف شرط کے ساتھ معلق کرنے سے باطل ہوجاتا ہے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں زید نے وقف کو جب شرط پر معلق کردیا تو وقف باطل ہوگیا اور زمین بدستور اس کی ملکیت میں ہے وہ جیسے چاہے اسمیں مالکانہ تصرف کرسکتا ہے، اہل محلہ کو اس سے مطالبہ کا حق حاصل نہیں خاص طور پر جبکہ راستہ کی ضرورت دوسری طرف سے پوری ہورہی ہے۔

لما فی الدر مع الرد: (۲۲۰/۴-۲۲۱ طبع سعید)

(وشرطہ شرط سائر التبرعات) کحریۃ وتکلیف (وان یکون) قربۃ فی ذاتہ معلوما (منجزا) لا معلقا الا بکائن.

وفی الشامیۃ: (قولہ لا معلقا) کقولہ: اذا جاء غدا واذا جاء راس الشہر او اذا کلمت فلانا فارضی ہذہ صدقۃ موقوفۃ او ان شئت او احببت یکون الوقف باطلا، لان الوقف لا یحتمل التعلیق بالخطر لکونہ مما لا یحلف بہ کما لا یصح تعلیق الہبۃ بخلاف النذر لانہ یحتملہ ویحلف بہ.

ولما فی البحر: (۱۸۸/۵ طبع سعید)

وشرائطہ اہلیۃ الواقف للتبرع من کونہ حرأ عاقلاً بالغاً وان یکون منجزاً غیر معلق فانہ مما لا یصلح تعلیقہ بالشرط...... وفی البزازیۃ: وتعلیق الوقف بالشرط باطل، وفی الخانیۃ: ولو قال: اذا جاء غد فارضی صدقۃ موقوفۃ او قال اذا ملکت ہذہ الارض فہی صدقۃ موقوفۃ لا یجوز لانہ تعلیق والوقف لا یحتمل التعلیق بالخطر لانہ لا یحلف بہ فلا یصح تعلیقہ کما لا یصح تعلیق الہبۃ بخلاف النذر لانہ یحلف بہ ویحتمل التعلیق.

ولما في التاتارخانية:(٥/٢٨٢،طبع قديمي)
هذا فاجعلوا ارضي هذه وقفا والفرق انه في
فرق بين هذا وبين ما اذا قال ان مت من مرضي
الفصل الاول علق الوقف بالشرط وتعليق الوقف بالشرط باطل وفي الفصل الثاني علق
التوكيل بالشرط وتعليق التوكيل بالشرط صحيح وفي الخانية: (٢/١٩٢،طبع قديمي)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: طاہر زمان کھوٹہ، راولپنڈی

٢٥ محرم الحرام ١٤٣٢ھ — فتویٰ نمبر: ٢٨١٥

﴿اپنا بیٹا وقف کرنے کا شرعی حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین کہ (١) اگر کوئی آدمی اپنا بیٹا کسی دینی یا دنیوی کام کے لئے وقف کرنا چاہے تو ایسا کرنا اس کے لیے جائز ہے؟

(٢) اولاد کی پیدائش یا کسی کام کے ہونے نہ ہونے پر اللہ کے راستے میں یا دین سکھانے، قرآن حفظ کرانے کے لئے اپنے بیٹے کی نذر ماننے کا شرعی حکم کیا ہے؟

(٣) اگر کوئی کہے کہ میں نے اپنا بیٹا اللہ کے راستے میں وقف کر دیا لیکن اس کی مراد نذر ہے تو اس صورت میں نذر منعقد ہو جائیگی؟

مستفتی: محمد مصطفیٰ بونیری

﴿جواب﴾ (١) انسان وقف نہیں ہوسکتا اس لئے کہ وقف صحیح ہونے کے لئے مال کا اپنی ملکیت میں ہونا ضروری ہے، انسان خواہ اپنا بیٹا ہو وہ مال مملوکہ نہیں ہے۔ (٢) البتہ مذکورہ تمام صورتوں میں نذر ماننا صحیح ہے۔ (٣) اور وقف بول کر نذر مراد لینا بھی صحیح ہے، سو اس شخص نے اپنے اس جملہ سے کہ میں اپنا بیٹا اللہ کے راستے میں وقف کرتا ہوں اور اس کا مقصد یہ تھا کہ میں اپنے بیٹے کو دینی تعلیم حاصل کرنے میں لگاؤں گا وغیرہ تو یہ درست ہے اور اس شخص پر حسب استطاعت ضروری ہے کہ اپنے بچے کو دینی تعلیم حاصل کرنے پر لگائے۔

لما في الهندية:(٢/٣٥٢،شرائط الوقف طبع رشيديه)الملك وقت الوقف.

ولما في الفقه الاسلامي وادلته:(١٠/٢٢٠،طبع دارالفكر بيروت)
اتفق الفقهاء على اشتراط كون الموقوف مالا متقوما معلوما مملوكا للواقف ملكا تاما اي لاخيار فيه.

ولما في احكام القرآن للعثماني:(٢/١٧،طبع ادارة القرآن كراچي)
ويصح النذر بانشاء ولده على عبادة الله وطاعته والنذر في مثل ذلك صحيح في شريعتنا ايضا ان ينذر الانسان ان ينشئ ابنه الصغير على عبادة الله تعالى وطاعته

وان لا یشغلہ بغیر ھما وان یعلمہ القرآن والفقہ وعلوم الدین وجمیع ذلک نذور صحیحۃ لأن فی ذلک قربۃ الی اللہ تعالٰی.

وھکذا فی الشامی:(۴/۴۲۵،طبع سعید)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:مزمل شاہ گل سروت

۷صفر ۱۴۲۸ھ　　　　فتوی نمبر:۱۹۱۴

﴿موقوفہ زمین میں مالکانہ تصرف کرنا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہمارے محلہ والوں نے مسجد اور مدرسہ کیلئے ۳۰x۶۰ متعین حصہ زمین کا وقف کر دیا اور اسکے انتظامات مولوی رشید صاحب کے سپرد کئے،اس کیلئے اہل محلہ نے تیس تولہ سونا جمع کر دیا اور بقول مولوی رشید صاحب کہ انہوں نے بھی اپنی طرف سے ۹ تولہ سونا اور کافی رقم اس میں ملائی اور مدرسہ کیلئے تین کمرے بھی بنائے لیکن اب مولوی رشید صاحب کا ارادہ بدل گیا وہ کہہ رہے ہیں کہ میں اس وقف شدہ زمین کو بیچ کر کہیں جا رہا ہوں اور اس کا مجھے اختیار ہے کیونکہ میں نے اسمیں کافی رقم اور ۹ تولہ سونا لگایا ہے،پوچھنا یہ ہے کہ آیا مولوی رشید صاحب کو مذکورہ موقوفہ زمین بیچنے کا اختیار ہے یا نہیں؟　　مستفتی:مولوی شاکر اللہ سواتی

﴿جواب﴾ جو زمین مسجد یا مدرسہ کیلئے وقف ہو جاتی ہے تو وقف تام ہونے کے بعد وہ ہمیشہ کیلئے وقف ہوگی،اس میں کسی کو مالکانہ قسم کے تصرف کرنے کا اختیار نہیں ہے،نہ کوئی اسکو بیچ سکتا ہے اور نہ ہی واقف اسمیں رجوع کر سکتا ہے کیونکہ وہ زمین واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اور اگر کوئی شخص بزور بازو اس کو بیچے گا بھی تو وہ بیع باطل شمار ہوگی،لینے والے کیلئے ہرگز جائز نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ملکیت ثابت ہو سکتی ہے،مولوی رشید صاحب نے اگرچہ اپنا سونا اور رقم بھی اس مدرسہ کی تعمیر میں خرچ کر دی ہے،واپس لینے کا حق نہیں رکھتا،البتہ بطور قرض ذاتی رقم اور سونا خرچ کر دیا ہو اور اس پر دیانتدار لوگوں کو خرچ کرتے وقت گواہ بنا دیا ہو کہ بطور قرض خرچ کر رہا ہوں تو زیادہ سے زیادہ اسی رقم کا مطالبہ کرنے کا حق دار ہوگا۔

لما فی صحیح البخاری:(۹/۳۲۹،طبع بیروت)

عن أنس رضی اللہ عنہ لما قدم رسول اللہ ﷺ المدینۃ أمر ببناء المسجد وقال:یا بنی النجار اثامنونی بحائطکم ھذا قالوا لا واللہ لا نطلب ثمنہ الا الی اللہ.

ولما فی صحیح البخاری:(۲۲۲/۱۱،طبع بیروت)

ان عمر بن الخطاب استشار رسول اللہ ﷺ ان یتصدق بماله بثمغ فقال رسول الله ﷺ تصدق به تقسم ثمره وتحبس أصله لایباع ولا یوهب.

ولما فی الهداية:(۲/۶۲۲،طبع رحمانیه)

من اتخذ أرضه مسجدا لم یکن له ان یرجع فیه ولا یبیعه ولا یورث عنه.

ولما فی الدر مع الرد:(۴/۳۵۱-۳۵۲،طبع سعید)

فاذاتم ولزم لایملک ولا یملک ولا یعار ولا یرهن.

وفی الشامية:(قوله ولا یملک)۔۔۔ای لایقبل التملیک لغیره بالبیع ونحوه لاستحالة تملیک الخارج عن ملکه.

ولما فی حاشية البحر الرائق:(۵/۲۱۲،طبع سعید)

أن الناظر اذا انفق من مال نفسه علی عمارة الوقف لیرجع فی غلته له الرجوع دیانة لکن لوادعی ذلک لایقبل منه بل لابد من ان یشهد انه أنفق لیرجع.

ولما فی جامع الفصولین:(۲/۱۲۱،طبع اسلامی)

قیم الوقف لو أنفق شیئا من ماله فی عمارة الوقف فلو أشهد انه أنفق لیرجع فله الرجوع والافلا.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب:عبدالباری پشتی

۲۲ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ　　　فتویٰ نمبر:۳۰۷۰

﴿مسجد کی موقوفہ زمین پر مقبرہ بنانا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے متعلق کہ ایک جگہ گاؤں والوں نے گاؤں سے باہر مسجد بنائی تھی، اس کے بعد گاؤں کے اندر مسجد بنالی اور پرانی مسجد (جو کہ گاؤں سے باہر تھی) کو منہدم کر کے اس کی جگہ قبرستان بنالیا، اب گاؤں والے چاہتے ہیں کہ قبروں کی جگہ دوبارہ اس مسجد کی تعمیر کرلیں، شریعت کا کیا حکم ہے؟　　　سائل:رضوان اللہ حقانی

﴿جواب﴾ جاننا چاہیے کہ جس جگہ ایک مرتبہ مسجد بنالی وہ جگہ تا قیامت مسجد ہی رہے گی، کسی بھی مسجد کو نمازیوں کے نہ ہونے یا گاؤں سے باہر ہونے کی وجہ سے کسی اور مصرف میں لانا یا منہدم کر کے اس پر مقبرہ بنانا جہاں شرعاً ناجائز ہے، وہاں وقف کرنے والوں کے مقصد کے بھی خلاف ہے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں گاؤں والوں کا مسجد کو منہدم کر کے قبرستان بنانا جائز نہ تھا، انہیں اس فعل پر توبہ واستغفار کرنا چاہیے، اب جن قبروں کے متعلق ان کو یقین ہے کہ ان کی میتیں بوسیدہ

اور مٹی ہو چکیں ہیں تو ان کو زمین کے ساتھ ہموار کر دیا جائے اور جو قبریں تازہ ہیں اور انکی وہاں سے نکالنے میں بے احترامی کا اندیشہ بھی نہ ہو تو انہیں وہاں سے نکال کر دوسری جگہ دفن کر دیں پھر اس جگہ پر دوبارہ مسجد کی تعمیر کر لیں۔

لمافی التنویر مع الدر:(۳۵۸/۴،طبع سعید)

(ولو خرب ما حوله واستغنی عنه بقی مسجدا عند الامام والثانی)ابدا الی قیام الساعة (وبه یفتی)حاوی القدسی

ولمافی البحر الرائق:(۲۵۵/۵،طبع سعید)استغنی عن مسجد لا یجوز اتخاذه مقبرة.

ولمافی الهندیة:(۴۶۳/۲،طبع رشیدیه)

اهل المسجد لو باعوا غلة المسجد او نقض المسجد بغیر اذن القاضی الاصح انه لا یجوز کذا فی السراجیة.

ولمافی التاتار خانیة:(۵۹۰/۵،طبع قدیمی)

سئل القاضی الامام محمود الائمة الاوزجندی عن مسجد لم یبق له جماعة وخرب ما حوله واستغنی الناس عنه هل یجوز جعله مقبرة قال لا.

ولمافی الشامی:(۱۹۹/۱-۲۰۰،طبع سعید)

(فله نبشه)ای نبشه لاخراج المیت(قوله وله تسویته)ای بالارض والزراعة فوقه(قوله وان وقفا فکذلک)ای له قیمة حفره--- وفی حاشیة ابی السعود عن حاشیة المقدسی وهذا لو وقفت للدفن فلو علی مسجد للزرع والغلة فکالمملوکة.

ولمافی الشامی:(۴۴۵/۴،طبع سعید)علی انهم صرحوا بان مراعاة غرض الواقفین واجبة.

ولمافی الشامی:(۲۳۳/۲،طبع سعید)

قال الزیلعی:ولو بلی المیت وصار ترابا جاز دفن غیره فی قبره وزرعه والبناء علیه اه.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم:عبدالوہاب لغمانی عفا اللہ عنہ

۸صفرالخیر۱۴۳۱ھ فتویٰ نمبر:۲۳۱۵

﴿پرانے قبرستان کو دوبارہ قبرستان کے طور پر استعمال کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک گاؤں میں پرانا قبرستان ہے جس میں قبریں بوسیدہ ہو گئی ہیں، اب گاؤں میں کوئی اور جگہ قبرستان کیلئے نہیں ملتی تو آیا اسی قبرستان کو دوبارہ میت دفنانے کیلئے استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی:محمد یاسر صوابی

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں اگر قبرستان میں قبریں زیادہ وقت گزرنے کی وجہ سے

بوسیدہ ہوگئی ہوں اور ان میں موجود میتوں کے جسم گل کر مٹی ہوگئے ہوں تو اسکو دوبارہ قبرستان کے طور پر استعمال کرنا جائز ہے۔

لما فی الشامی:(۲/۲۲۵ طبع ایچ ایم سعید)

قلت:وتقدم اذا بلی المیت وصار ترابا یجوز زرعه والبناء علیه.

ولما فی الھندیة:(۱/۱۶۷ طبع رشیدیه)

ولو بلی المیت وصار ترابا جاز دفن غیره فی قبره وزرعه والبناء علیه کذا فی التبیین.

الجواب صحیح:عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:احمد علی عفی عنہ

۸ صفر ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر:۲۶۴

﴿مرتد کے وقف کا حکم﴾

﴿سوال﴾ مرتد کے وقف کا شرعا کیا حکم ہے؟ یعنی ایک شخص نے مسجد کے لئے زمین وقف کی اس وقت وہ مسلمان تھا بعد میں قادیانی بن گیا، اب اس وقف شدہ زمین کا کیا حکم ہے؟ واضح رہے کہ اس زمین پر ابھی تک مسجد بنی نہیں ہے؟ مستفتی:فضل کریم

﴿جواب﴾ مسلمان جب مرتد ہو جائے أعاذنا اللہ منہ تو شرعا اس کا وقف باطل ہو جاتا ہے اور وہ میراث بن جاتا ہے، صورت مذکورہ میں اس کا وقف باطل ہے الا یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو دوبارہ اسلام کی دولت سے نوازے اور وہ پھر سے اس وقف کا اعادہ کرے تو وقف درست رہے گا۔

لما فی الدر مع المرد:(۲/۵۲۵ طبع امدادیه)ولو وقف المرتدفقتل أو مات أولو ارتدالمسلم بطل وقفه.

وفی الشامیة:ویصیر میراثا سواء قتل علی ردته أومات أو عاد الی الاسلام الاان اعاد الوقف بعد عوده الی الاسلام.

الجواب صحیح:عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم:محمد عزیز چترالی

۲۱ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر:۴۳۶

﴿فصل فی احکام المساجد وآدابه﴾

﴿مسجد بننے سے پہلے زمین کا حکم مسجد کا نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے مسجد کی غرض سے زمین خریدی لیکن وہ روڈ سے دور تھی، اور وہاں لوگوں کا رجحان کم ہے بعد میں

لوگوں نے مشورہ دیا کہ روڈ کے کنارے پر مسجد بناؤ وہاں پر لوگوں کیلئے زیادہ مفید ہوگا، اب پوچھنا یہ ہے کہ اس نیت سے زمین بیچ کر کہ دوسری جگہ مسجد کیلئے زمین خرید لونگا جبکہ دوسری جگہ زمین خریدنے میں لوگوں کو فائدہ بھی زیادہ ہے اسطرح کرنا شرعاً ہمارے لئے جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ اس شخص نے مسجد کے ارادہ سے جو زمین خریدی ہے یہاں مسجد کی زیادہ ضرورت اگر نہیں ہے اور اس کے مقابلے میں روڈ کے قریب میں زیادہ ضرورت ہے تو یہ زمین بیچ کر روڈ کے قریب مسجد کیلئے دوسری زمین لینے کی گنجائش ہے بشرطیکہ موجودہ زمین میں باقاعدہ اذان اقامت کیساتھ نماز باجماعت شروع نہ ہوئی ہو اس جگہ میں باقاعدہ نماز باجماعت اگر شروع ہوگئی ہے تو اس کو بیچنے کی گنجائش نہیں ہے۔

لمافی الدرمع رد:ج ۲/۳۵٦سعید

(وشرط محمد)والامام(الصلاة فيه)بجماعة ومقتضىٰ هذاانه لايحتاج الى قوله وقلت ونحوه وهو كذلك وانه لوقال وقفته مسجداً،ولم ياذن بالصلاة فيه ولم يصل فيه احدانه لايصير مسجداًالخ .

لمافی الشامی:ج ۴/۳۸٦مطلب فی شروط الاستبدال

وفى القنية مبادلة دار الوقف بدار اخرى انمايجوزاذاكانتا فى محلةواحدةاومحلةالاخرى خيراًوبالعكس لايجوزوايضاً(قوله وفى فتاوى قارى ،الهداية الخ)حيث قال سئل عن وقف انهدم ولم يكن له شئى يعمرمنه ،ولاامكن اجارته ولاتعميره،هل تباع انقاضه من حجروطوب وخشب ؟اجاب اذاكان الامر كذلك صح بيعه بامر الحاكم ويشترى بثمنه وقف مكانه فاذالم يمكن رده الى ورثة الوقف ان وجدوا ولايصرف للفقراء اه.

لمافی البحر:ج ۵/۲۴۸سعید

(قوله ومن بنى مسجدا لم يزل ملكه عنه حتى يفرزه عن ملكه بطريقه وياذن بالصلاة فيه واذصلى فيه واحدزال ملكه) اما الافرازفانه لايخلص لله تعالى الابه واماالصلاة فيه فلانه لابدمن التسليم عندابى حنيفه ومحمدفيشرط تسليم نوعه وذالك فى المسجد بالصلاة فيه ...الخ

لمافی الهندية:ج ۲/۵۴۲رشيديه

(الفصل الاول فيمايصيربه مسجدا وفى احكامه احكام مافيه)من بنىٰ مسجدلم يزل ملكه عنه حتى يفرزعن ملكه بطريقه وياذن بالصلاة فيه امالافراز فلانه لايخلص لله الابه كذافى الهدايه

لمافی الشامی:ج ۴/۳۵٦مطلب فی احكام المسجد

قلت :وفى الذخيرة وبالصلاة بجماعة يقع التسليم بلاخلاف حتى انه اذابنى مسجداً

او اذن للناس بالصلاة فيه جماعة فانه يصير مسجدا اه ويصح ان يراد بالفعل الافراز ويكون بيانا للشرط المتفق عليه عند الكل كما قدمناه من ان المسجد لو كان مشاعا لا يصح اجماعا الخ.

لما في البحر:۵/۲۴۸(طبع سعید)

فلانه لابد من التسليم عند ابي حنيفة ومحمد فيشرط تسليم نوعه وذلك في المسجد بالصلاة فيه وقال ابويوسف يزول ملكه بقوله جعلته مسجدا لان التسليم عنده ليس بشرط لانه اسقاط طلب العبد فيصير خالصا لله تعالى بسقوط حق العبد وصار كالاعتاق الخ.

ولما في الهندیه :(۲/۴۵۵مطبع رشیدیه،کوئٹه)

اما الصلاة فلانه لابد من التسليم عند ابي حنيفة رحمه الله ومحمدؒ كذا في البحر والتسليم في المسجد ان تصلي فيه الجماعة باذنه وعن ابي حنيفةؒ فيه روايتان في رواية الحسن عنه يشترط اداء الصلاة فيه بالجماعة باذنه اثنان فصاعدا كما قال محمدؒ والصحيح رواية الحسن كذا في فتاوى قاضي خان ويشترط مع ذالك ان تكون الصلاة باذان واقامة جهرا لا سرا حتى لو صلى جماعة بغير اذان واقامة سرا لا جهرا لا يصير مسجدا عندهما كذا في محيط والكفاية.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: صفی اللہ محسن خیلوی

۲ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ　　　　فتویٰ نمبر:۳۹۱۶

﴿بانی مسجد کی وفات کے بعد مسجد کے اختیارات کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری جامع مسجد تاج کے بانی ومتولی انتقال کر گئے، ان کی حیات میں مسجد کے تمام اختیارات ان کو حاصل تھے تو اب ان کے انتقال کے بعد یہ اختیارات کس کو منتقل ہونگے؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ مسجد کے بانی ومتولی کو تمام اختیارات شرعاً حاصل ہوتے ہیں، لہٰذا ان کے انتقال کے بعد تمام اختیارات ان کی اولاد میں نسل در نسل منتقل ہونگے اور وہی مسجد کے امور میں جائز اور مناسب تصرفات کرنے کی مجاز ہونگے۔

لما في البحر الرائق:(۵/۲۴۹-۲۵۰مطبع ایچ ایم سعید)

والباني احق بالامامة والاذان وولده من بعده وعشيرته اولى بذلك من غيرهم وفي المجرد عن ابي حنيفة رضي الله عنه ان الباني اولى بجميع مصالح المسجد ونصب الامام والمؤذن اذا تأهل للامامة.

ولما في حلبي كبير:(ص ۵۴۰مطبع نعمانیه)

رجل بنى مسجدا وجعله لله فهو أحق بمرمته وعمارته وبسط البواري والحصير

والتنادیل والاذان والاقامة والامامة فیه ان کان اهلا لذلک وان لم یکن فالرأی فی ذلک الیه وکذا ولد الباني وعشیرته من بعده اولیٰ من غیرهم.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد ضیاء الدین

۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ — فتوی نمبر: ۹۱۶

﴿مسجد سے روکنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے اسلام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقہ میں ایک حافظ صاحب نے اپنی زمین مسجد کیلئے وقف کردی اور پھر کچھ عرصہ کے بعد وہاں قائم کردہ مسجد سے اہل محلہ کو منع کرنا شروع کردیا اور انکا کہنا ہے کہ اہل محلہ مجھے تنخواہ نہیں دے رہے ہیں، یاد رہے کہ اس مسجد پر بطور امام انکا تقرر ہوا تھا۔ اب استفسار طلب مسئلہ یہ ہے حافظ صاحب کا اہل محلہ کو مسجد سے روکنا کہاں تک درست ہے؟ مستفتی: عبدالصمد صاحب

﴿جواب﴾ حافظ صاحب نے زمین مسجد کیلئے وقف کردی تھی اور اس پر باقاعدہ مسجد کی تعمیر ہوئی اور باجماعت نماز بھی اس میں پڑھی گئی ہے تو یہ زمین اب تا قیامت مسجد ہی رہیگی، اب یہ جگہ چونکہ حافظ صاحب کی ملکیت سے نکل گئی اس لئے اسکو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ کسی نمازی کو روکے، اہل محلہ اسکی اقتداء میں نماز پڑھنا چاہتے ہیں تو اس کو مناسب تنخواہ دیا کریں اور اس کی امامت اگر پسند نہیں تو دوسرے امام کا بندوبست کریں۔ اور چند بااثر نمازی لوگوں پر مشتمل کمیٹی تشکیل دیں۔ اور اس حافظ صاحب سے جھگڑے، فساد کا اگر اندیشہ ہے تو عدالت میں درخواست دائر کریں۔ حافظ صاحب کو چاہئے کہ قرآن کی آیت: "فمن اظلم ممن منع مساجد الله ان يذكر فيها اسمه وسعىٰ في خرابها" کے مطلب کو سمجھیں۔ اور اس وعید کا مصداق نہ بنیں۔

لما في صفوة التفاسير: (۸۹/۱ طبع مدنیه لاهور)

(ومن اظلم ممن منع مساجدالله ان يذكر فيها اسمه) استنكار واستبعاد لأن يكون أحد أظلم ممن فعل ذالك أي لا اظلم احد ممن منع الناس مع عبادة الله تعالىٰ في بيوت الله، وعمل لخرابها بالهدم كما فعل الرومان ببيت المقدس، أو بتعطيلها من العبادة كما فعل كفار قريش (أولئك ما كان لهم ان يدخلوها الا خائفين) أي ما ينبغي لأولئك ان يدخلوها الا وهم في خشية وخضوع فضلا عن التجرؤ علىٰ تخريبها او تعطيلها (لهم في الدنيا خزي) اى اولئك المذكورين هوان وذلة في الدنيا (ولهم في الآخرة عذاب عظيم) وهو عذاب النار.

ولما فی تفسیر المظہری: ۱۱۵/۱ طبع رشیدیہ کوئٹہ

من اظلم والمعنی لا احد اظلم ممن منع مساجد اللہ انما ورد لفظ الجمع وان کان المنع واقعا علی مسجد لان الحکم عام وان کان المورد خاصا ۔ وسعی فی خرابہا بالتعطیل عن ذکر اللہ فانہم لما منعو من یعمرہ بالذکر فقد سعوا الی خرابہا.

ولما فی تفسیر القرطبی:۲/۷۷ طبع بیروت

وقیل المراد من منع من کل مسجد الی یوم القیامۃ وھو الصحیح لان اللفظ عام ورد بصیغۃ الجمع فتخصیصہا ببعض المساجد وببعض الاشخاص ضعیف واللہ تعالی اعلم خراب المساجد قد یکون حقیقتا کتخریب بخت نصر والنصاری بیت المقدس وقد یکون مجاز کمنع المشرکین المسلمین حین صدورسول اللہ عن المسجد الحرام وعلی الجملۃ فتعطیل المساجد عن الصلوۃ واظہار شعائر الاسلام فیہا خراب لہا ۔ ولذالک قلنا لا یجوز نقض المسجد ولا بیعہ ولا تعطیلہ وان خربت المحلہ.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری غفرلہ ولوالدیہ

اا ربیع الاول ۱۴۳۵ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۳۹۸۸

﴿مسجد سے درخت اکھاڑنے کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ ہماری مسجد میں ایک جانب کھجور کا پرانا درخت کھڑا ہے مسجد کے بعض منتظمین اکھاڑنے پر آمادہ ہیں جب کہ بعض منع کرتے ہیں شرعی مسئلہ بتا کر ہماری الجھن کو دور کیجئے۔

﴿جواب﴾ واضح رہے مسجد خانہ خدا مسلمانوں کی عبادت گاہ اور دین اسلام کا امتیازی شعار ہے، اس کا صاف ستھرا رکھنا، آداب کا لحاظ کرنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے، اسلئے مسجد میں درخت لگانا اور درخت کو برقرار رکھنا ضرورت کے وقت جائز ہے، بلا ضرورت جائز نہیں ہے۔

مذکورہ صورت میں درخت اگر مسجد کی ضرورت یا کسی خاص فائدے کیلئے لگایا تھا اور اب بھی وہ ضرورت یا فائدہ اس کی وجود پر منحصر ہے تو برقرار رکھنا چاہیے اور اگر اس کے وجود سے کوئی فائدہ نہیں لیا جاسکتا بلکہ نمازی اس کی وجہ سے تنگی محسوس کرتے ہیں، صفیں بھی ٹیڑھی رہتی ہیں وغیرہ تو ایسی صورت میں مسجد کا متولی اور انتظامیہ کسی مصلحت سے اس درخت کو اکھاڑ سکتے ہیں۔

لما فی الشامی:(۱/۶۶۱ طبع ایچ ایم سعید)

قال فی الخلاصۃ: غرس الاشجار فی المسجد لا باس بہ اذا کان فیہ نفع للمسجد بان کان المسجد ذانز والاسطوانات لا تستقر بدونہا وبدون ھذا لا یجوز اہ ۔ لان فیہ شغل ما اعد للصلاۃ ونحوھا، وان کان المسجد واسعا او کان فی الغرس نفع بثمرتہ والا لزم ایجار

قطعة منه ولا يجوز ابقاءه ايضا لقوله عليه الصلاة والسلام "ليس لعرق ظالم حق" لان الظلم وضع الشئ في غير محله وهذا كذلك.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: رشید عالم مروت

۱۸ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ　　　فتوی نمبر: ۱۰۰۲

﴿مسجد کے اوپر مدرسہ بنانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے متعلق کہ ایک جگہ مسجد کی چھت کے اوپر بچوں کی تعلیم کیلئے درسگاہ بنائی گئی ہے جس میں غیر رہائشی بچے پڑھتے ہیں کیا اس درسگاہ کو مستقل مدرسہ قرار دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟　　　مستفتی: محمد جعفر صاحب بلدیہ ٹاون کراچی

﴿جواب﴾ مسجد کی چھت کے اوپر تعمیر کی گئی درسگاہ مسجد کے تابع اور حکم میں ہے، مسجد کے تمام آداب اس میں ملحوظ ہونگے، اس کو مستقل مدرسہ قرار نہیں دیا جاسکتا، جہاں تک مسجد میں تعلیم کا مسئلہ ہے تو اس میں گنجائش ہے، تاہم مسجد میں مار پیٹ اور آداب مسجد کے منافی عمل سے بچنا ضروری ہے۔

لما في التنوير مع الدر: (۴/ ۳۵۸، طبع سعيد)

لو بنىٰ فوقه بيتا للامام لا يضر لانه من المصالح، اما لو تمت المسجدية ثم اراد البناء منع.

ولما في الدر مع الرد: (۱/ ۶۶۳، طبع ايچ ايم، سعيد)

(و) كره تحريما (الوطء فوقه والبول والتغوط) لانه مسجد الى عنان السماء.

وفي الشامية: وكذا الىٰ تحت الثرى.

ولما في الدر مع الرد: (۱/ ۶۶۳، طبع سعيد)

وجعل المسجدين واحدا وعكسه لصلاة لا لدرس.

وفي الشامية: (قوله لا لدرس اوذكر) لانه ما بنى لذلك وان جاز فيه.

ولما في اعلاء السنن: (۵/ ۱۷۹-۱۸۰، طبع دار الكتب العلمية بيروت)

عن عثمان مرفوعا اجنبوا صبيانكم مساجدكم (رواه الديلمي) واعلم ان المتعلمين ولو لم يكونوا اطفالا اصغارا بل كانوا بالغين يغلب منهم عدم اداء حقوق المسجد في حال جلوسهم فيه فيكره جلوسهم في المسجد للتعليم الا لضرورة شديدة او باداء حقوق المسجد.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: عبدالوہاب لقمانی عفا اللہ عنہ

۱۷ صفر الخیر ۱۴۳۱ھ　　　فتوی نمبر: ۲۳۴۰

﴿ایک مسجد کو دو حصوں میں تقسیم کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہمارے محلے کے لوگوں میں تنازعہ ہوا اب

فریقین مسجد کو دو حصوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو کیا مسجد کو دو حصوں میں تقسیم کرنا جائز ہے؟ اور دونوں میں ایک وقت کی نماز الگ الگ جماعت کیساتھ صحیح ہوگی؟ مستفتی: رضوان اللہ حقانی

﴿جواب﴾ کسی مصلحت سے مسجد کو دو حصوں میں تقسیم کرنا اور ہر ایک حصہ میں الگ الگ جماعت کا اہتمام کرنا جائز ہے لیکن ایک ہی محلے کے نمازیوں میں یہاں تک اختلاف ہونا کہ مسجد کو تقسیم کرنے کی بھی نوبت آرہی ہے، انتہائی افسوس ناک ہے چاہیے کہ دونوں فریق علماء کرام کے سامنے اختلاف کی وجہ بیان کریں اور شرعی حل تلاش کریں۔

اختلاف کی بنیاد پر مسجد اگر تقسیم ہوئی تو ایک ہی محلے کے لوگوں میں نسلوں تک بغض وعناد رہے گا جو کہ بے شمار گناہ اور بڑے فساد کا باعث رہے گا، اسلئے ایمان اور سمجھداری کا تقاضہ ہے کہ کسی طرح اختلاف کو ختم کریں۔

لما فی الهندية:(۵/۳۲۰،طبع رشيديه)

اهل محلة قسموا المسجد وضربوا فيه حائطا ولكل منهم امام على حدة ومؤذنهم واحد لا باس به والاولى ان يكون لكل طائفة مؤذن.

ولما فی الدر المختار:(۱/۶۶۲-۶۶۳،طبع سعيد)

ولهم نصب متول وجعل المسجدين واحدا و عكسه لصلاة لا لدرس.

ولما فی الاشباه والنظائر:(ص۳۲۰،طبع قديمى)

ولاهل المحلة جعل المسجد الواحد مسجدين والاولى ان يكون لكل طائفة مؤذن.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم: حبیب الرحمٰن سواتی

۲۸ ذی الحجہ ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر: ۱۸۰۰

﴿مسجد میں چندہ کی رقم خرچ کرنے کے بعد اسکی واپسی کا مطالبہ کرنا درست نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے اپنی زمین مسجد کے لئے وقف کی اور ایک قاری صاحب کو کہا کہ وہ اس پر مسجد بنائیں اور خود ہی اس کے امام، متولی اور منتظم بن جائیں، قاری صاحب نے مسجد کا کچھ حصہ چندے وغیرہ کی رقم سے تعمیر کیا اور پھر مزید تعمیر سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں کہیں اور مسجد بنانا چاہتا ہوں اور جو رقم اس نے مسجد کی تعمیر پر خرچ کی تھی اس کی واپسی کا مطالبہ کر دیا۔

پوچھنا یہ ہے کہ کیا قاری صاحب کو اس رقم کا جو کہ تقریباً ساڑھے چار لاکھ روپے بنتی ہے،

مطالبہ کرنا درست ہے؟ اور اگر وہ رقم ان کو اس نیت سے دے دوں کہ جب کوئی اور تعمیر کرنا چاہے گا تو اس سے میں وہ رقم واپس لے لوں گا تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ واضح رہے کہ مسجد میں ابھی تک نماز نہیں پڑھی گئی ہے۔

﴿جواب﴾ مسجد کی تعمیر کے لئے لوگوں نے قاری صاحب کو چندہ دیا اور قاری صاحب نے وہ چندہ مسجد میں خرچ بھی کر دیا، اب قاری صاحب اور ان کے علاوہ کسی چندہ دینے والے کے لئے بھی جائز نہیں کہ اس کا مطالبہ کرے، قاری صاحب کا کوئی حق نہیں ہے جس کا وہ آپ سے یا کسی اور سے مطالبہ کرے، بالفرض آپ یا کوئی بھی قاری صاحب کو اس غرض سے یہ رقم دیدے کہ بعد میں مسجد کی آمد یا انتظام سنبھالنے والوں سے وصول کرلے گا، یہ جائز نہیں اور نہ ہی اس طرح آپ کو مسجد یا انتظامیہ سے اس کے مطالبے کا حق حاصل ہوگا۔

لمافی البحر:(۲۱۲/۵،طبع سعید)

قیم المسجد اشتری شیئا لمرمة المسجد بلا اذن الحاكم بماله لا يرجع على الوقف، وظاهره انه لارجوع له مطلقاً الا باذن القاضي سواء كان انفق ليرجع اولا سواء رفع الى القاضي اولا سواء برهن على ذالك اولا.

ولمافی البحر:(۲۵۱/۵،طبع سعید)

قال ابويوسف هو مسجد ابداً الىٰ قيام الساعة لايعود ميراثاً ولايجوز نقله ونقل ماله الىٰ مسجد آخر سواء كانوا يصلون فيه اولا وهو الفتوى كذ الى الحاوى القدسى وفى المجتبىٰ واكثر المشايخ علىٰ قول ابى يوسف ورجح فى فتح القدير قول ابى يوسف بانه الاوجه.

ولمافی الهداية:(۶۲۲/۲،طبع رحمانيه)

ومن اتخذ ارضه مسجداً لم يكن له ان يرجع فيه ولا يبيع ولا يورث عنه لانه يحرز عن حق العباد وصار خالصاً لله تعالى وهذا لان الاشياء كلها لله تعالىٰ واذا اسقط العبد ماثبت من الحق رجع الىٰ اصله فانقطع تصرفه عنه كمافى العتاق.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: فیاض احمد

۱۲ صفر ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۱۸۹۶

﴿مسجد کے فنڈ سے مستری اور مزدور کو چائے پلانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم چند ساتھی مسجد کی کمیٹی کے رکن ہیں، مسجد سرکاری زمین پر" جو حکومت نے مسجد کے لئے مختص کی تھی" بنی ہے اور بنائی کسی

ٹرسٹ نے ہے، اب مسجد کا کچھ سامان خراب اور کچھ پرانا ہو گیا ہے اور ہم نیا لگوانا چاہتے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ ہم وہ پرانا سامان جو کچھ خراب اور کچھ پرانا ہے اسکو مسجد کے لئے بیچ سکتے ہیں جس کے بارے میں غالب گمان ہے کہ وہ دوبارہ مسجد کے کام میں نہیں آئے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ بعض اوقات ہم مسجد میں مستری سے کام کراتے ہیں تو کیا اس مستری کو مسجد کے فنڈ سے چائے وغیرہ پلا سکتے ہیں؟ اور کیا کمیٹی کے ارکان اور محلے کے دوسرے آدمی جو رضا کارانہ طور پر مستری کیساتھ کام میں لگے ہوں تو ان کو مسجد کے فنڈ سے چائے پلا سکتے ہیں؟

﴿جواب﴾ مسجد میں نیا سامان لگانے کے لئے مسجد کا خراب سامان اور پرانا سامان مسجد کی انتظامیہ کے مشورے سے فروخت کیا جا سکتا ہے اور مسجد میں کام کرنے والے مستری کو مناسب اجرت دینا جائز ہے اور اجرت کے علاوہ عرف میں چائے، کھانا وغیرہ بھی اگر رائج ہے تو دینے میں کوئی حرج نہیں ہے اور رضا کارانہ طور پر کام کرنے والوں کو بھی دینا چاہیے، اس لئے کہ ان چیزوں کی حیثیت اجرت اور مزدوری کی نہیں ہوتی بلکہ یہ چیزیں اکرام کے طور پر دیجاتی ہیں، اس لئے رضا کارانہ طور پر کام کرنے والوں کو نہ دینا مروت کے خلاف ہے اور ایسے لوگوں کو دینے میں مسجد کا فائدہ بھی مضمر ہے۔

لما فی الدر مع الرد: (۲/۳۵۷، طبع سعید کراچی)

اراد أهل المحلة نقض المسجد وبناء ه أحكم من الأول أن الباني من أهل المحلة لهم ذلك والا لا بزازية وأما أهلها فلهم أن يهدموه ويجددوا بناء ه ويفرشوا الحصير ويعلقوا القناديل لكن من مالهم لا من مال المسجد الا بأمر القاضي.

ولما فی التنویر مع الدر: (۲/۳۷۷، طبع سعید)

(وصرف) الحاكم او المتولي حاوي (نقضه) أو ثمنه ان تعذر اعادة عينه (الى عمارته ان احتاج والا حفظه ليحتاج) الا اذا خاف ضياعه فيبيعه ويمسك ثمنه ليحتاج.

وفی الشامية: (قوله فيبيعه) فعلى هذا يباع النقض في موضعين: عند تعذر عوده وعند خوف هلاكه بحر.

ولما فی البحر الرائق: (۵/۲۵۱، طبع سعید کراچی)

أما الحصر والقناديل فالصحيح من مذهب أبي يوسف أنه لا يعود الى ملك متخذه بل يحول الى مسجد آخر أو يبيعه قيم المسجد للمسجد.

ولما فی الشامی: (۲/۳۶۹، طبع سعید)

فعلى هذا اذا عمل المباشر والشاد من العمارة يعطيان بقدر أجرة عملهما فقط، وأما

مالیس فی قطعه ضرر بین فانه لا یعطی شیئا أصلا من العمارة اھ.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ذیشان احمد طارق

۸ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۲۹۸۰

﴿مسجد کے ملبہ کو نامناسب جگہ استعمال کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے کہ ہمارے ہاں ایک مسجد کی پرانی تعمیر کو شہید کر کے نئی تعمیر بنائی اور پرانی تعمیر کا ملبہ کسی کو بیچ دیا، پوچھنا یہ ہے کہ خریدنے والے کے لئے مسجد کی اینٹیں وغیرہ گھر کے باتھ روم میں استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مسجد کا ملبہ انتظامیہ کے فیصلہ سے باقاعدہ خریدا ہو تو یہ چیزیں آپ کی ملکیت ہو گئی ہیں، گھر کی تعمیر وغیرہ میں استعمال کرنا جائز ہے لیکن باتھ روم یا دیگر نامناسب جگہوں میں اس کا استعمال کرنا مساجد کے احترام کے منافی ہے، اس لئے اس کا خیال رکھیں۔

لما فی الدر مع الرد: (۳۵۹/۴-۳۶۰، طبع)

(و مثله حشیش المسجد و حصره مع الاستغناء عنهما)

وفی الشامیة: وبه علم ان الفتوی علی قول محمد فی آلات المسجد--- سئل شیخ الاسلام عن اهل قریة رحلوا و تداعی مسجدها الی الخراب--- ان یبیع الخشب بامر القاضی و یمسک الثمن لیصرفه الی بعض المساجد او الی هذا المسجد؟ قال: نعم.

ولما فی البحر: (۲۵۱/۵، طبع سعید)

واذا رای حشیش المسجد فرفعه انسان جاز ان لم یکن له قیمة فان کان له ادنی قیمة لا یأخذه الا بعد الشراء من المتولی او القاضی او اهل المسجد او الامام.

ولما فی الدر المختار: (۱۷۸/۱، طبع سعید)

ولا ترمی براية القلم المستعمل لاحترامه کحشیش المسجد و کناسته لا یلقی فی موضع یخل بالتعظیم.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ذیشان احمد طارق

۳۰ محرم الحرام ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۲۸۳۳

﴿مسجد کی زمین کو بیچنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک پرانی مسجد ہے جہاں کوئی نماز پڑھنے کے لئے نہیں آتا، علاقے والوں کا ارادہ ہے کہ اس غیر آباد مسجد کی زمین کو

فروخت کر کے آبادی میں مسجد بنائیں تو کیا مسجد کی زمین کو فروخت کر کے اسکا معاوضہ اور سامان ملبہ وغیرہ دوسری نئی مسجد میں لگانا درست ہے؟ مستفتی: ذبیح اللہ، مکی مسجد

﴿جواب﴾ جب ایک مرتبہ شرعی مسجد بن جائے تو تا قیامت وہ مسجد ہی رہے گی چاہے بعد میں کوئی اسمیں نمازیں پڑھے یا نہ پڑھے، لہٰذا اسکی زمین کو بیچنا جائز نہیں ہے، البتہ اسکے سامان اور ملبہ کے ضائع ہونے کا قوی اندیشہ ہو تو نئی مسجد میں منتقل کرنے کی گنجائش ہے۔

لمافی التنویر مع الدر: (۳۵۸/۴ طبع سعید)

(ولوخرب ماحوله واستغنى عنه يبقى مسجداعندالامام والثانى) ابداالى قيام الساعة (وبه يفتى) حاوى القدسى.

وفى الشامية: (قوله ولوخرب ماحوله) اى ولومع بقائه عامرا — (قوله عندالامام والثانى) فلايعودميراثاولايجوزنقله ونقل ماله الى مسجدآخرسواء كانوايصلون فيه أولا وهوالفتوى حاوى القدسى وأكثرالمشايخ عليه وهوالاوجه فتح اه بحر..... (قوله وعن الثانى) جزم به فى الاسعاف حيث قال ولوخرب المسجدوماحوله وتفرق الناس عنه لايعودالى ملك الواقف عندابى يوسف فيباع نقضه باذن القاضى وبه علم ان الفتوى على قول محمدفى آلات المسجدوعلى قول ابى يوسف فى تابيد المسجداه.

ولمافى الشامى: (۳۶۰/۴ طبع سعيد)

قلت لكن الفرق غيرظاهرفليتأمل والذى ينبغى متابعة المشايخ المذكورين فى جواز النقل بلافرق بين مسجدأوحوض كماأفتى به الامام ابوشجاع والامام الحلوانى وكفى بهماقدوة ولاسيمافى زماننافان المسجدأوغيره من رباط أوحوض اذالم ينقل ياخذ انقاضه اللصوص والمتغلبون كماهومشاهدوكذلك أوقافه ياكلهاالنظارأوغيرهم ويلزم من عدم النقل خراب المسجد الاخرالمحتاج الى النقل اليه وقدوقعت حادثة سألت عنهافى اميرأرادان ينقل بعض احجارمسجدخراب فى سفح قاسيون بدمشق ليبلط بهاصحن الجامع الاموى فأفتيت بعدم الجوازمتابعة للشرنبلالى ثم بلغنى ان بعض المتغلبين أخذتلك الاحجارلنفسه فندمت على ماافتيت به ثم رأيت الان فى الذخيرة قال وفى الفتاوى النسفى — أوفى هذاالمسجدقال نعم.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عزیز الرحمٰن

۲۶ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر: ۱۷۰۸

﴿مسجد کی اشیاء ذاتی استعمال میں لانا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ مسجد کی اشیاء جیسے پنکھا، بتی وغیرہ یا جو سامان نمازیوں کے لئے رکھا جاتا ہے،

امام یا مؤذن اپنے مصرف میں لاسکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ متولی مسجد اسکی اجازت نہ دے۔

﴿جواب﴾ مسجد کی اشیاء جیسے پنکھا، بتی وغیرہ یا جو سامان نمازیوں کے لئے رکھا جاتا ہے وہ سب مال وقف ہے امام یا مؤذن کے لئے اپنے ذاتی استعمال میں لانا جائز نہیں۔

لمافی الشامی:(۴/۴۳۳،طبع سعید)

فان شرائط الواقف معتبرة اذالم تخالف الشرع وهومالک فله ان يجعل ماله حيث شاء.

ولمافی خلاصة الفتاوی:(۴/۴۲۳،طبع رشیدیه)

متولی المسجدليس له ان يحمل سراج المسجدالی بيته وله ان يحمل من البيت الی المسجد. وكذافی البحر الرائق:(۵/۲۵۰،طبع سعید)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ظہور احمد شمس

۵ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۶۵۷

﴿حرام پیسہ مسجد میں لگانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی سرکاری ملازم ہے اور وہ ڈیوٹی انجام دیئے بغیر گھر میں بیٹھ کر گورنمنٹ سے تنخواہ وصول کرتا ہے، اسکے لئے یہ تنخواہ جائز ہے؟ اور اس تنخواہ کے پیسے کو مسجد میں لگا سکتے ہیں یا نہیں؟ مستفتی: اعجاز صاحب

﴿جواب﴾ ایسا آدمی جو سرکاری ملازم ہو اور ڈیوٹی انجام دیئے بغیر گورنمنٹ سے تنخواہ وصول کرتا ہو، اسکے لئے یہ تنخواہ حرام ہے اور حرام پیسہ مسجد کی تعمیر میں لگانا جائز نہیں۔

لمافی فتح القدير:(۸/۱۲۲،طبع رشیدیه)

(قوله والاجيرالخاص الذی يستحق الاجربتسليم نفسه فی المدة وان لم يعمل) ای سلم نفسه ولم يعمل مع التمكن امااذاامتنع من العمل ومضت المدة اولم يتمكن من العمل ومضت المدة لم يستحق الاجرلانه لم يوجدتسليم النفس.

ولمافی الشامی:(۱/۶۵۸،طبع ایچ ایم سعید)

(قوله لوبماله الحلال)قال تاج الشريعة:امالوانفق فی ذلک مالاخبيثاومالاسببه الخبيث والطيب فيكره لان الله تعالی لايقبل الاالطيب فيكره تلويث بيته بمالايقبله اه شرنبلالية.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: اسرار عزیز

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۷۷۸

﴿مسجدوں کو صاف رکھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام کہ موسم بہار میں ہمارے علاقے کی اکثر مسجدوں میں پرندے گھونسلے بنالیتے ہیں، اس سے مسجد میں گندگی پھیلتی ہے اور نمازیوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے تو کیا مسجد کو گندگی سے بچانے کے لئے ان گھونسلوں کو ہٹایا جاسکتا ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مسجد اللہ کا گھر ہے، اس کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھنا ہر مسلمان کیلئے ضروری ہے، اول تو پرندوں کو گھونسلے بنانے کا موقع نہیں دینا چاہیے، انتظامیہ یا اہل محلہ کی غفلت اور سستی سے پرندوں نے گھونسلے بنالئے اور ان کی وجہ سے مسجد میں گندگی پھیلتی ہے اور نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے تو گھونسلوں کو ہٹانے میں کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ پرندوں نے بچے نہ دیئے ہوں اور اگر بچے دے دیئے تو ایسا انتظام کرنا چاہیے کہ بچے بھی ضائع نہ ہوں اور مسجد بھی صاف رہے۔

لما في الدر المختار:(۶۲۷/۲ طبع امدادیه) ولا بأس برمي عش خفاش وحمام للتنقية.

وفي الشامية:قوله:(للتنقية) جواب سوال حاصله انه صلى الله عليه وسلم قال:"اقروا الطير على مكانتها" فازالة العش مخالفة للأمر، فاجاب بانه للتنقية وهي مطلوبة فالحديث مخصوص بغير المساجد.

ولما في الهندية:(۳۲۱/۵ طبع رشيديه)

ولو كان في المسجد عش خطاف أو خفاش يقذر المسجد لا بأس برميه بما فيه من الفراخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۱۹ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۱۰۵

﴿مسجد کے اوپر بیت الخلاء بنانا درست نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسجد کے اوپر بیت الخلاء بنانا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

مستفتی محمد اکرم کوہاٹی

﴿جواب﴾ مسجد کے اوپر بیت الخلاء بنانا جائز نہیں ہے۔ ایک جگہ جب شرعی مسجد قرار پا گئی ہے تو زمین کا یہ حصہ اونچائی کی انتہاء تک اسی طرح نیچے گہرائی کی انتہاء تک مسجد ہی ہے، اس جگہ مسجد کے منافی کوئی بھی تعمیر وغیرہ جائز نہیں۔

لما في قوله تعالى (سورة الجن آية ۱۸ پاره ۲۹)﴿وان المسجد لله فلا تدعوا مع الله احدا﴾

ولما فی الدر المختار، (۱/۶۵۶ مطبع سعید)

و کرہ تحریما (الوطء فوقه، والبول والتغوط) لأنه مسجد الی عنان السماء.

ولما فی الھدایة (۱/۲۴۶ مطبع رحمانیه)

ویکرہ المجامعة فوق المسجد والبول والتخلی لأن سطح المسجد له حکم المسجد، حتی یصح الاقتداء منه بمن تحته ولا یبطل الاعتکاف بالصعود الیه ولا یحل للجنب الوقوف علیه

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عزیز اللہ آغا عفی عنہ

۲۵ جمادی الاولی ۱۴۳۳ھ — فتوی نمبر: ۳۲۲۵

﴿مسجد میں ٹوپی رکھنے کا حکم ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے کہ مسجد کی ٹوپی پہن کر نماز پڑھنا کیسا ہے اور مسجد میں ٹوپی رکھنے کا کیا حکم ہے؟ بعض لوگ منع کرتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ ننگے سر نماز پڑھنے سے تو بہتر ہے اس لیے ٹوپیاں رکھنی چاہیے۔ مستفتی: حاجی نصیر احمد

﴿جواب﴾ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ننگے سر نماز پڑھنا مکروہ ہے، عمامہ یا ٹوپی پہن کر نماز پڑھنی چاہیے لیکن ٹوپی یا عمامہ وغیرہ کا انتظام کرنا مسجد والوں کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے یہ تو نمازی کی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ نماز جیسی بڑی عبادت کو اہمیت دیتے ہوئے ایسی تمام چیزوں کا خود ہی انتظام کرتا رہے۔ سر پر عمامہ سجانا یا کم از کم ٹوپی رکھنا یہ مسلمان کا عام لباس ہے نماز کے علاوہ اوقات میں بھی ننگے سر گھومنا مسلمانوں کی تہذیب نہیں ہے یہ تو غیروں کو دیکھ کر یہاں رائج ہوا ہے، کل کو خدا نہ کرے، نیکر، شرٹ (shirt) اور ٹی شرٹ پہننا بھی عام ہو جائے تو ایسے نمازیوں کے لیے شلوار قمیص کا مساجد میں انتظام کرنا پڑے گا۔ دین اسلام محترم ہے اور اس کے احکامات واجب الاحترام ہیں اور جو احترام نہیں کرتا ایسے رسمی مسلمانوں سے دین اسلام اور اس کے صحیح معنوں میں پیروکار بھی مستغنی ہیں ایسے لوگوں کی ہدایت کی فکر ہونی چاہیے کہ یہ بھٹکے ہوئے کس طرح اپنے بھولے ہوئے راستے پر واپس لوٹ آئیں مساجد میں ٹوپیاں اور شلواروں قمیصوں کا انتظام کرنا سراسر حکمت کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ مساجد کی ٹوپیوں کا استعمال جس طرح ہوتا ہے صرف ایک سر پر نہیں روزانہ کئی سروں پر رکھی جاتی ہے، اور نماز پڑھ لی تو جہاں ڈال دیا، رکھ دیا پوری مسجد اسکی جگہ ہے، اور عموما اسکی خاص کوئی علامت بھی ہوتی ہے تاکہ کوئی چرا کر نہ

لے جائے، اور ایسی ٹوپی پہن کر کوئی سمجھدار شرفاء اور پروقار مجلس میں نہیں جاسکتا اسکو خلاف عزت واحترام جانتا ہے تو خالق کائنات، بادشاہوں کے بادشاہ کے سامنے ایسے لباس میں کھڑے ہونے کو ایماندار آدمی کیسے گوارہ کریگا؟ اس لیے فقہاء کرام نے ایسے لباس میں نماز کو مکروہ قرار دیا ہے لہذا مساجد میں ٹوپیاں رکھنا اور ان میں نماز پڑھنا کوئی اچھا عمل نہیں ہے اس سے گریز کرنا چاہیے۔

لما فی قوله تعالیٰ:(سورة الاعراف، آیت نمبر:۳۱) ﴿یا بنی آدم خذوا زینتکم عند کل مسجد﴾

ولما فی احکام القرآن لجصاص:(۱۴/۳طبع:قدیمی)

وقوله تعالیٰ:(خذوا زینتکم عند کل مسجد)يدل على انه مندوب فی حضور المسجد الى اخذ الثوب نظيف مما يتزين به وقد روى عن النبی ﷺ انه قال: "ندب الى ذالك فى الجمع والاعياد".

ولما فی مراقی الفلاح:(ص۱۳۰،طبع:قدیمی)

وتكره (الصلاة فى ثياب بذلة) ثوب لا يصان عن الدنس ممتهن وقيل ما لا يذهب به الى الكبراء "ورأى عمرؓ رجلاً فعل ذالك فقال أرأيت لو كنت لرسلتك الى بعض الناس أكنت تمر فى ثيابك هذه فقال: لا فقال عمرؓ: الله أحق ان تتزين له" وتكره وهو (مكشوف الرأس) تكاسلاً لترك الوقار.

ولما فی حلبی کبیر:(ص۳۴۱طبع:سہیل اکیڈمی)

(وكذا يكره ان يصلى فى ثياب بذلة) وهو ما لا يصان ولا يحفظ من الدنس ونحوه (او) فى ثياب (المهنة) وهى الخدمة والعمل تكميلا لرعاية الادب فى الوقوف بين يديه تعالىٰ بما امكن من تجميل الظاهر والباطن.

ولما فی الشامی:(۴۰۷/۲طبع:امدادیہ)

(وصلاته فى ثياب بذله) الخدمة والابتذال ــــــ قال فى البحر وفسرها فى شرح الوقاية بما يلبسه فى بيته ولا يذهب به الى الأكابر والظاهر ان الكراهة تنزيهية اهـ.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: تنویر الرحمٰن غفرلہ ولوالدیہ

۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۷۴۱

﴿درس ووعظ کی وجہ سے محلّہ کی مسجد کو چھوڑ کر دوسری مسجد میں جانا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اپنے گھر کے پاس والی مسجد کو چھوڑ کر دوسری مسجد میں جانا اس لئے کہ وہاں درس ووعظ ہوتا ہے اور جمعہ کی تقریر اچھی

ہوتی ہے کیا ایسا کرنے سے اپنی نزدیک والی مسجد کو آباد نہ رکھنا لازم آتا ہے گا یا نہیں؟ جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اپنی نزدیک والی مسجد آباد رکھو ورنہ گناہ ہوگا۔ مستفتی: ایک متعلم

﴿جواب﴾ بلاشبہ حق تو قریب والی مسجد ہی کا زیادہ ہے، لیکن قریب والی مسجد میں اگر درس وعظ نہیں ہوتا اور دوسری مسجد میں یہ سہولت ہو تو اس اضافی فائدہ کیلئے دور کی مسجد میں جانا جائز ہے اس میں کوئی کراہت نہیں ہے۔

لما فی حلبی کبیر: ۶۱۲، طبع سہیل)

وذکر قاضی خان وصاحب منیة المصلی وغیرهما ان الاقدم افضل فان استویا فی القدم فالاقرب افضل.......والافضل ان یختار الذی امامه اصلح وافقه فان الصلوة مع الافضل افضل......ومسجد استاذه لدرسه او لسماع الاخبار افضل بالاتفاق.

ولما فی حاشیة الطحطاوی: ۲۸۷، طبع: قدیمی)

واختلفوا هل الافضل مسجد حیه ام جماعة المسجد الجامع وان استوی المسجدان فاقدمهما افضل فان استویا فاقربهما فان استویا خیر العامی والفقیه یذهب الی اقلهما جماعة لیکثروا والتلمیذ یذهب الی مجلس استاذه.

ولما فی الدر مع الرد: ۱/ ۶۵۹، طبع سعید)

(ومسجد استاذه لدرسه اولسماع الاخبار افضل اتفاقا)وذکر فی الخانیة ومنیة المصلی وغیرهما ان الاقدم افضل فان استویا فی القدم فالاقرب ولو استویا فیهما وقوم احدهما اکثر فان کان فقیها یقتدی به یذهب للاقل جماعة تکثیرا لها بسببه والا تخیر والافضل اختیار الذی امامه افقه واصلح ومسجد حیه وان قل جمعه افضل من الجامع وان کثر جمعه (قوله افضل اتفاقا) ای من الاقدم وما بعده لاحرازه فضیلتی الصلاة والسماع.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عمر فاروق لاہوری

۷ جمادی الثانی ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۷۷۳

﴿ہیرونچی اور پاگل لوگوں کو مسجد سے روکنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد میں کچھ ایسے لوگ آجاتے ہیں جو پوری طرح ہوش وحواس میں نہیں ہوتے (یعنی نشہ کی حالت میں ہوتے ہیں) اگر وہ لوگ جماعت کی نماز میں شامل ہو جائیں، قیام کی حالت میں ہیں تو قیام میں ہی رہتے ہیں یہاں تک کہ جماعت کی نماز ختم ہو جاتی ہے، سجدے میں جاتے ہیں تو سجدے میں ہی سوتے رہتے ہیں۔ کپڑے ان کے نہایت ہی گندے اور تعفن والے ہوتے ہیں اور نہ جانے پاکی

کی حالت میں ہوتے ہیں یا ناپاکی کی۔ بہت سے لوگ ان سے گھن محسوس کرتے ہیں، ان ہی لوگوں کی وجہ سے ہمیں مسجد کا ایک دروازہ مستقل بند کرنا پڑا ہے۔ پوچھنا یہ ہے کہ ان لوگوں کو مسجد میں آنے سے روکا جاسکتا ہے یا نہیں اور ان پر کتنی سختی کر سکتے ہیں۔ جبکہ ہماری مسجد کے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان کو مسجد میں داخل ہونے کی بالکل اجازت نہیں دینی چاہئے، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان کو روکا نہ جائے بلکہ آنے دیا جائے۔ مستفتی: مولوی عبدالکریم صاحب، امام سنہری مسجد کراچی

﴿جواب﴾ مساجد شعائر اسلام میں سے ہیں ان کا احترام ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ مساجد کو گندگی، ناپاکی، بدبو اور اذیت دینے والی تمام چیزوں سے پاک رکھنے کا حکم ہے۔ اس لئے ایسے بچوں کو مسجد میں لانا سخت منع ہے، جن سے مسجد میں پیشاب وغیرہ کرنے کا اندیشہ ہو، اسی طرح پاگل لوگوں کو بھی مسجد سے دور رکھنے کا مستقل حکم ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے "جنبوا مساجدکم صبیانکم و مجانینکم" کہ تم اپنی مساجد سے (ناسمجھ) بچے اور پاگل لوگوں کو دور رکھو۔ نشہ کی حالت میں آدمی پاگل سے کچھ کم نہیں ہوتا اس لئے نشئی لوگوں کو خصوصاً جب وہ نشہ کی حالت میں ہوں، مساجد میں داخل ہونے سے ایسے افراد کو روکنا انتظامیہ کی ذمہ داری ہے، مزید یہ کہ نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے کو قرآن کریم نے منع فرمایا ہے، اس حالت میں نماز ہوتی نہیں ہے، لھذا ایسی حالت میں ان کا نماز پڑھنا اور جماعت میں شامل ہونا نماز ادا کرنے کے لئے نہیں ہے، بلکہ دیگر نمازیوں کے لئے پریشانی کا باعث بنتے ہیں۔ اس لئے منع کرنا ضروری ہے۔ البتہ ایسی حکمت عملی اختیار کریں کہ جھگڑے یا شور شرابے کی نوبت نہ آئے۔

لما فی سورۃ النساء آیت ۴۳

﴿یاایھا الذین امنوا لا تقربوا الصلاۃ و انتم سکاری حتی تعلموا ما تقولون ولا جنبا الا عابری سبیل حتی تغتسلوا ـــــ﴾

ولما فی الدر المختار مع رد المحتار: (۲/۵۱۸، طبع رشیدیہ)

ویحرم ادخال صبیان و مجانین حیث غلب تنجیسھم و الا فیکرہ ـــــ واختلف فیہ السلف، فقیل لا باس، وقیل یخرج اذا احتاج الیہ، وھو الاصح، حموی عن شرح الجامع الصغیر للتمرتاشی، قولہ: (ویحرم ـــــ الخ) لما اخرجہ المنذری مرفوعا (جنبوا مساجدکم صبیانکم ومجانینکم ـــــ)

ولما فی حلبی کبیر: (ص، ۶۱۰ طبع سہیل اکیڈمی)

قال اللہ تعالی انما یعمر مساجد اللہ من امن باللہ والیوم الاخر ـــــ وتتناول ما استرم

منها وكنسها و تنظيفها و تنويرها بالمصابيح وتعظيمها و اعتيادها للعبادة و الذكر و صيانتها عما لم تبن له من احاديث الدنيا واشغالها ـــــ يجب ان تصان عن ادخال الرائحة الكريهة لقوله عليه السلام "من اكل الثوم و البصل والنكرات فلا يقربن مسجدنا فان الملائكة تتاذى مما يتاذى منه بنو آدم متفق عليه ـــــ و رفع الصوت و ادخال المجانين والصبيان لغير الصلاة و نحوها.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد حامد یاسین، بھکر

۴ رجب المرجب ۱۴۳۴ھ فتویٰ نمبر: ۳۸۲۵

﴿مسجد کی زمین یا دیوار وغیرہ مسجد کے علاوہ مقصد کے لئے استعمال منع ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسجد کے ساتھ متصل زمین میں مسجد کے مصالح کے لیے ایک مکان تعمیر کرنا ہے تو آیا اسکی چھت (لینٹر) مسجد کی دیوار پر رکھنا جائز ہے کہ نہیں؟ یا اس کے لیے الگ دیوار یا پلر کھڑا کریں۔

﴿جواب﴾ مسجد کی دیوار پر کسی مکان، یا دکان وغیرہ کا لینٹر یا گاڈر وغیرہ رکھنا جائز نہیں ہے اگرچہ وہ مکان مسجد کے مصالح کے لیے ہی کیوں نہ ہو لہذا اس مکان کی چھت کے لیے الگ پلر یا دیوار کھڑی کریں مسجد کی دیوار یا زمین اس کے لیے استعمال نہ کریں۔

لما في الدر المختار: ۳۵۸/۴ كتاب الوقف مطلب في احكام المسجد طبع سعيد

ولا يوضع الجذع على جدار المسجد وان كان من اوقافه اھ.

وفيه ايضاً۔

قلت: وبه علم حكم ما يضعه بعض جيرانه المسجد من وضع جذوع على جداره فانه لا يحل ولو دفع الاجرة.

ولما في البحر الرائق ج۵/۲۵۰ فصل في احكام المسجد طبع سعيد

ولا يوضع الجذع على جدار المسجد وان كان من اوقافه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد تنویر غفرلہ ولوالدیہ

۱۱ صفر الخیر ۱۴۳۴ھ فتویٰ نمبر: ۳۵۴۲

﴿شیطان مسجد میں داخل ہوسکتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہے علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ شیطان مسجد میں آسکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ آسکتا ہے اور بعض کہتے ہیں نہیں آسکتا۔

﴿جواب﴾ شیطان کا مسجد میں داخل ہونا احادیث مبارکہ سے ثابت ہے، بلکہ احادیث

سے تو یہ بھی ثابت ہے کہ جب اقامت ختم ہو جاتی ہے تو شیطان نمازی کے پاس آتا ہے اور اسکی نماز میں خلل ڈالنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کو مختلف وسوسے ڈالتا رہتا ہے، لہذا اس کے مسجد میں داخل ہونے کی تردید کی کوئی وجہ نہیں۔

لما فی الصحیح المسلم(۱/۱۶۸ باب فی فضل الاذان طبع قدیمی).

عن ابی هریرة ان النبی صلی الله علیه وسلم قال اذا نودی للصلوة ادبر الشیطان وله ضراط حتی لا یسمع التاذین فاذا قضی التاذین اقبل حتی اذا ثوب بالصلوة ادبر حتی اذا قضی التثویب اقبل حتی یخطر بین المرء ونفسه یقول له اذکر کذا واذکر کذا لم یکن من قبل حتی یظل الرجل ما یدری کم صلی.

ولما فیه ایضاً(۱/۲۰۵ باب فی جواز لعن الشیطان فی اثناء الصلوة).

عن ابی الدرداءؓ قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم فسمعناه یقول اعوذ بالله منک ثم العنک بلعنة الله ثلاثاً وبسط یده کانه یتناول شیأ. فلما فرغ من الصلوة قلنا یا رسول الله قد سمعناک تقول شیئا لم نسمعک تقوله قبل ذالک ورأینا بسطت یدک قال ان عدو الله ابلیس جاء بشهاب من نار لیجعله فی وجهی فقلت اعوذ بالله منک ثلاث مرات ثم قلت العنک بلعنة الله التامة فلم یستاخر ثلاث مرات ثم اردت اخذه والله لولا دعوة اخینا سلیمان علیه السلام لا صبح موثقا یلعب به ولدان اهل المدینه.

ولما فی مشکوة المصابیح:(۹۸ باب تسویة الصفوف: طبع سعید).

وقال رسول الله صلی الله علیه وسلم سووا صفوفکم وحاذوا بین مناکبکم ولینوا وسدوا الخلل فان الشیطان یدخل فی ما بینکم بمنزلة الخذف یعنی اولاد الضان الصغار رواه احمد

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: شاہد خان سواتی

۲۵ ربیع الاول ۱۴۳۶ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۳۰۸۱

﴿مسجد کے اندر وضو خانہ بنانا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کہ بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں ایک آدمی نے مسجد کیلئے زمین وقف کی، اور اسکے اردگرد اکثر حصہ دیواروں کا بنایا گیا، اور باقاعدہ طور پر وہاں باجماعت نماز پڑھانا شروع ہوگیا، ابھی وہ واقف کہہ رہا ہے کہ اس مسجد کے اندر وضو خانہ بھی بنائیں گے، حالانکہ شروع میں یہ نیت نہیں تھی، تو کیا اس مسجد کے اندر وضو خانہ بنانا درست ہے؟ برائے کرم شریعت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔　　　　مستفتی: عبداللہ

﴿جواب﴾ مسجد کے اندر وضو خانہ بنانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، متولی چاہے تو وضو خانہ

کے لئے الگ مزید زمین لیکر اس میں تعمیر کرے، یہ جگہ اب پوری مسجد بن گئی، اب کوئی ایک ٹکڑا بھی مسجد سے الگ کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

لما فی البحر: ۲۴۸/۵ طبع سعید

ومن بنی مسجدا لم یزل ملکہ عنہ حتی یفرزہ عن ملکہ بطریقہ ویأذن بالصلاۃ فیہ واحد زال ملکہ۔

ولما فی التنویر مع الدر: ۳۵۸/۴ طبع سعید

لو بنی فوقہ بیتا للإمام لا یضر لانہ من المصالح أما لو تمت المسجدیۃ ثم أراد البناء منع ولو قال عنیت ذالک لم یصدق تاتاخانیۃ، فاذا کان ھذا فی الواقف فکیف بغیرہ فیجب ھدمہ ولو علی جدار المسجد

ولما فی البحر: ۳۲/۲ طبع سعید

ویکرہ الوضوء والمضمضۃ فی المسجد الا أن یکون موضع فیہ اتخذ للوضوء ولا یصلی فیہ ومثلہ فی الھندیۃ: ۱۲۱/۱ طبع قدیمی کتب خانہ

ولما فی التنویر مع الدر: ۶۶۱،۶۶۰/۱ طبع سعید

ویکرہ الاعضاء مطلقا ـــ الوضوء الا فیما أعد لذالک ،وفی الشامیۃ تحت (قولہ والوضوء) لأن ماءہ مستقذر طبعا فیجب تنزیہ المسجد عنہ ،کما یجب تنزیہہ عن المخاط والبلغم ،بدائع (قولہ الا فیما أعد لذالک) أنظر ھل یشترط اعداد ذالک من الواقف أم لا ؛وفی حاشیۃ المدنی عن الفتاوی العفیفیۃ: ولا یظن أن ما حول بئر زمزم یجوز الوضوء أو الغسل من الجنابۃ فیہ ،لأن حریم زمزم یجری علیہ حکم المساجد فیتعامل معاملتہا من تحریم البصاق والمکث مع الجنابۃ.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۷ جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر: ۳۷۵۰

﴿مسجد کے آداب ملحوظ ہوں تو طلبہ کی رہائش کی گنجائش ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں، کہ ہمارے گاؤں تارشیر خان میں مسجد کیلئے وقف زمین پر ایک حافظ صاحب نے طلباء کی رہائش کے لئے تہہ خانہ بنایا، پھر بعد میں ایک عالم نے اسکے اوپر مسجد بنالی، اب مسئلہ یہ ہے کہ علاقے کے ایک اور عالم کہہ رہے ہیں کہ یہ تہہ خانہ مسجد کے حکم میں ہے، اس لئے آپ کو چاہئے کہ طلباء کو یہاں نہ ٹھہرائیں، اور اگر آپ ٹھہرانا چاہتے ہو تو آپ پر لازمی ہے کہ مدرسہ کے پیسوں سے ماہانہ کرایہ مسجد کے فنڈ میں جمع کریں، اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا اس عالم کی بات صحیح ہے، حالانکہ حافظ صاحب کہہ رہے ہیں کہ

میں نے پہلے سے تہہ خانہ طلباء کی رہائش کی نیت سے بنایا تھا؟ برائے کرم شریعت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں نوازش ہوگی۔ مستفتی: مولوی برکت اللہ مروت

﴿جواب﴾ مسجد کا تہہ خانہ بھی مسجد ہی ہے، ادب واحترام کا لحاظ رکھتے ہوئے اس میں قرآن کریم کی تعلیم دینا بلا کراہت جائز ہے، اور دوسری جگہ رہائش کا انتظام اگر مشکل ہو تو بغیر کرایہ کے طلباء کی رہائش رکھنا بھی جائز ہے، البتہ طلباء کو وقتاً فوقتاً سمجھایا کریں کہ وہ ہر بار مسجد میں داخل ہوتے ہوئے نفلی اعتکاف کی نیت کیا کریں، اور لیٹنے سے پہلے نیچے بچھائونے وغیرہ کا انتظام کریں۔

لما فی التنویر مع الدر:۱/۱۵۶طبع سعید

وکره تحريما الوطء فوقه والبول والتغوط،لأنه مسجد الى عنان السماء.وفى الشامية تحته:وكذا الى تحت الثرى.

ولما فى البحر:۲۵۱/۵ طبع سعيد

وحاصله ان شرط كونه مسجدا ان يكون سفله وعلوه مسجدا لينقطع حق العبد عنه لقوله تعالى وان المساجد لله بخلاف ماإذا كان السرداب أو العلو موقوفا لمصالح المسجد فانه يجوز اذلا ملك فيه لأحد بل هو من تتميم مصالح المسجد فهو كسرداب بيت المقدس هذا هو ظاهر المذهب.

ولما فى أوجز المسالك ۲۲۹/۳، ۲۲۰ طبع دار الكتب العلمية بيروت

وقد ورد مرفوعا نصاً عن سهل بن سعد فقال:من دخل مسجدى هذا ليتعلم خيرا أو يعلمه كان كأجر حاج تاماً حجته.قال الشيخ تحته:(أو يعلمه)أى يعلم الخير احدا قال القارى:فيه دلالة ظاهرة على جواز التدريس فى المسجد ـــ وأجاز ابو حنيفة ومحمد بن مسلمة من اصحاب مالك:رفع الصوت فيه بالعلم والخصومة وغير ذالك مما يحتاج اليه الناس،لأنه مجمعهم ولا بد لهم منه وكره بعض المالكية تعليم الصبيان فى المسجد وقال انه من باب البيع،وهذا اذا كان بأجرة فان كان بغير أجرة منع ايضا من وجه آخر وهو ان الصبيان لا يحترزون من القذر والوسخ فيؤدى ذالك الى عدم تنظيف المساجد وقد أمر رسول الله صلى الله عليه وسلم بتنظيفها وتطييبها وقال "جنبوا مساجدكم صبيانكم" وفى البحر:ويجوز الجلوس فى المسجد لغير الصلاة،ولا بأس به للقضاء كالتدريس والفتوى.

ولما فى اعلاء السنن:۱۷۷/۳، ۱۷۸ طبع دار الكتب العلمية بيروت

قلت رأيت كثيرا من العلماء يدرسون فى المسجد على الأجرة فلينتبهوا وليجتنبوا او الحيلة فى ذلك ان يجلسوا بنية الاعتكاف فيزول المحذور ـــ واعلم ان المتعلمين ولو لم يكونو

أطفالا صغاراً بل كانوا بالغين يغلب منهم عدم اداء حقوق المسجد فى حال جلوسهم فيه يكره جلوسهم فى المسجد للتعليم الا لضرورة شديدة أو باداء حقوق المسجد.

ولما فى البحر: ۲۵۰/۵ طبع سعيد

يجوز لاهل المحلة ان يجعلوا المسجد الواحد مسجدين فلهم ان يجعلوا المسجدين واحدا لاقامة الجماعة،أما للتذكير أو للتدريس فلا ،لانه ما بنى له وان جاز فيه ــــ ويجوز الدرس فى المسجد وان كان فيه استعمال اللبود والبوارى المسبلة لاجل المسجد لو علم الصبيان القرآن فى المسجد لا يجوز ويأثم وكذاالتأديب فيه أى لا يجوز التأديب فيه اذا كان بأجر وينبغى أن يجوز بغير أجر ــــ وكذا لايجوز التعليم فى دكان فى فناء المسجد هذا عند أبى حنيفة وعندهما يجوز اذالم يضر بالعامة ــــ ولا بأس بأن يترك سراج المسجد فيه من المغرب الى وقت العشاء ولا يجوز ان يترك فيه كل الليل الا فى موضع جرت العادة فيه بذالک کمسجد بیت المقدس ومسجد النبى صلى الله عليه وسلم والمسجد الحرام أو شرط الواقف تركه فيه كلّ الليل كما جرت العادة به فى زماننا ويجوز الدرس بسراج المسجد ان كان موضوعا فيه لا للصلاة بأن فرغ القوم من الصلوة وذهبوا الى بيوتهم وبقى السراج فيه قالوا لا بأس بان يدرّس بنوره الى ثلث الليل لانهم لو أخّروا الصلاة الى ثلث الليل لا بأس به فلا يبطل حقه بتعجيلهم وفيما زاد على الثلث ليس لهم تأخيرها فلا يكون لهم حق الدرس .

ولما فى الشامى: ۴۴۵/۴ طبع سعيد

والحاصل:ان الواقف اذا أطلق أو عيّن الاستغلال ،وان قيد بالسكنى تقيد بها،وان صرح بهما كان لهما جريان على كون شرط الواقف كنص الشارع.

ولما فى الهندية :۴۲۱/۲ طبع قديمى كتب خانه

واذا أراد ان يصرف شيئاً من ذالک الى امام المسجد أو الى مؤذن المسجدفليس له ذالک الا اذا كان الواقف شرط ذالک فى الوقف كذا فى الذخيرة.

ولما فى الشامى: ۳۶۰/۴ طبع سعيد

(قوله اتحد الواقف والجهة)بأن وقف وقفين على المسجد أحدهما على العمارة والآخر الى امامه أو مؤذنه والامام والمؤذن لا يستقر لقلة المرسوم للحاكم الدين أن يصرف من فاضل وقف المصالح والعمارة الى الامام والمؤذن باستصواب أهل الصلاح من أهل المحلة.

ولما فى الشامى: ۶۶۲/۱ طبع سعيد

قال فى المصفى:الجلوس فى المسجد للحديث مأذون شرعا،لأن اهل الصفة كانوا يلازمون المسجد وكانوا ينامون ويتحدثون،ولهذا لا يحل لأحد منعه،كذا فى الجامع البرهانى،أقول:يؤخذ من هذاأن الامر الممنوع منه اذا وجد بعد الدخول بقصدالعبادة لا يتناوله.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب :محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۱۰صفر الخیر ۱۴۳۳ھ

فتویٰ نمبر:

﴿ایک مسجد کی کارآمد چیز دوسری مسجد کو نقل کرنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ میرے والد صاحب مسجد کے متولی ہیں، میرے بڑے بھائی نے مسجد کیلئے لاؤڈ اسپیکر خریدا ہے، اب ہم دوسری جگہ منتقل ہو گئے ہیں، محلے والے اسکی بیٹری وغیرہ کا خیال نہیں رکھتے اور چوری ہونے کا بھی خطرہ ہے، لہذا یہ لاؤڈ اسپیکر ہم اپنی دوسری مسجد میں منتقل کر سکتے ہیں یا نہیں؟

﴿جواب﴾ ایک مسجد کو وقف کی ہوئی چیز جب تک کارآمد ہے، دوسری مسجد کو دینا جائز نہیں ہے، البتہ اس مسجد کی ضرورت نہ رہے تو انتظامیہ کے فیصلے سے دوسری مسجد میں منتقل کرنا جائز ہے مذکورہ مسجد کے متولی آپکے والد ہیں، انکی ذمہ داری ہے کہ لاؤڈ اسپیکر، بیٹری وغیرہ کی نگہداشت کریں خود نہیں کر سکتے تو کسی دوسرے کو یہ ذمہ داری سونپ دیں جو بخوشی قبول کرے اگر ایسی کوئی صورت نہیں بن سکتی تو لاؤڈ اسپیکر، بیٹری وغیرہ بیچ کر اسکے پیسوں سے مسجد کی دوسری ضرورت پوری کرے جسکے ضائع ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔

لما فی التنویر مع الدر:(۳۵۸/۴،طبع سعید)

لوخرب ماحوله واستغنى عنه يبقى مسجداعندالامام والثانى)ابدالى قيام الساعة(وبه يفتى)

وفى الشامية:(قوله لوخرب ماحوله)اى ولومع بقائه عامراوكذالوخرب وليس له مايعمربه وقداستغنى الناس عنه لبناء مسجدآخر(قوله عندالامام والثانى) فلايعود ميراثاولايجوزنقله ونقل ماله الى مسجد آخرسواء كانوايصلون فيه اولاوهوالفتوى حاوى القدسى.

ولما فى البحرالرائق:(۲۵۱/۵،طبع سعيد)

وقال ابويوسفؒ هومسجدابداالى قيام الساعة لايعودميراثاولايجوزنقله ونقل ماله الى مسجدآخرسواء كانوايصلون فيه اولاوهوالفتوى كذافى حاوى القدسى وفى المجتبى واكثرالمشايخ على قول ابى يوسفؒ ورجح فى فتح القديرقول ابى يوسفؒ بانه الاوجه قال واماالحصروالقناديل فالصحيح من مذهب ابى يوسفؒ انه لايعودالى ملك متخذه بل يحول الى مسجدآخراويبيعه قيم المسجدللمسجد.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: اسلام بادشاہ ہمیشی

۲۳ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ | فتوی نمبر ۲۱۱۰

﴿مسجد کے فرش یا دیوار سے تیمم کرنا مکروہ ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسجد کے فرش یا دیوار کے ساتھ تیمم کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: عبدالواجد صاحب رائیونڈ

﴿جواب﴾ تیمم ہر اس چیز کے ساتھ کرنا جائز ہے جو زمین کی جنس میں سے ہو اور پاک ہو،

البتہ وہ مٹی جو مسجد کی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی ہو یا فرش پر ہو تو اس سے بھی تیمم ہو جاتا ہے لیکن مکروہ ہے کیونکہ تیمم نجاست حکمی کے زائل کرنے کا سبب ہے اور مسجد کی مٹی کی طرف ازالۂ حدث کی نسبت کرنا مسجد کے آداب کے خلاف ہے، اسلئے مسجد کے فرش یا دیوار سے تیمم کرنے کو فقہاء کرام نے مکروہ لکھا ہے لیکن اگر مسجد کی مٹی کسی کونے میں جمع کر دی گئی ہو تو اس سے تیمم کرنے میں کوئی کراہت نہیں ہے۔

لمافی قاضیخان:(۶۵/۱،طبع قدیمی)

ویکره مسح الرجل من طين والردغة باسطوانة المسجد او بحائطه وان مسح بتراب في المسجد ان كان ذلك التراب مجموعا في ناحية غير منبسط لا بأس به وان كان منبسطا مفروشا يكره لانه بمنزلة ارض المسجد. وفي خلاصة الفتاوى:(۲۲۱/۱،طبع رشيديه)

ولمافي الولوالجية:(۵۳/۱،طبع فاروقيه پشاور)

ويكره مسح الرجل من الطين والردغة باسطوانة المسجد وحائط من حيطانه لان حكمه حكم المسجد وان مسح ببرى المسجد اوبقطعة حصير ملقاة فيه لا بأس به لان حكمه ليس حكم المسجد ولا له حكم حرمة المسجد كذا قالوا والاولى ان لا يفعل وان مسح بتراب في المسجد فان كان مجموعا لا بأس به وان كان منبسطا يكره هو المختار واليه ذهب ابو القاسم الصفار لان له حكم الارض فكان من المسجد وان مسح بخشبة موضوعة في المسجد لا بأس به لانه ليس لهذا الخشبة حكم المسجد فلا يكون لها حرمة المسجد.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد سجاد

۱۹/۱۲/۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۷۹۳

﴿مسجد کی بجلی اپنی دکان میں قیمتاً استعمال کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہمارے گاؤں میں ایک شخص نے مسجد کے میٹر سے اپنی دکان کے لئے بجلی لگائی ہے اور ہر ماہ آدھا بل ادا کرتا ہے، کیا اس شخص کے لئے ایسا کرنا جائز ہے۔ براہ کرم شرعاً اس مسئلہ کا حکم بیان فرما کر ممنون فرمائیں۔ مستفتی: محمد حنیف کرک

﴿جواب﴾ انتظامیہ نے مسجد کے مفاد میں دکاندار کو مسجد کے میٹر سے بجلی لینے کی اجازت اگر دی ہے اور دکاندار کی بجلی کا خرچہ کم اور مسجد کا زیادہ ہے، اس کے باوجود دکاندار آدھا بل برداشت کر رہا ہے تو اسمیں کوئی قباحت نہیں ہے۔

لمافي الخانية بهامش الهندية:(۳۳۲/۳،طبع رشيديه)

قال الفقيه ابو جعفر رحمه الله تعالى اذا لم يذكر الواقف في صك الوقف اجارة الوقف

فرای القیم ان یوجرھا ویرفعھا مزارعۃ فماکان آدر علی الوقف وانفع للفقراء فعل۔

ولمافی البحر:(۲۲۹/۵،طبع سعید)

قیم یبیع فناء المسجدلیتجرفیہ القوم اویضع فیہ سرر الجرھالیتجرفیھا الناس فلا باس اذاکان لصلاح المسجد۔

ولمافی التنویرمع الدر:(۴۰۲/۴،طبع سعید)(ویوجر)باجر(المثل)(فلا)یجوز(بالاقل)

ولمافی الشامی:(۴۰۷/۴،طبع سعید)

فقدعلم صحۃ ایجار الموقوف علیہ اذاکان معینابھذہ الشروط ویشترط ایضاان یوجرباجرۃ المثل والالم یصح کمامرعن قاری الھدایۃ۔

واللہ اعلم بالصواب: نثارمحمود کوہائی عفااللہ عنہ

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ

فتوی نمبر: ۱۹۴۵

۲۷صفر۱۴۳۰ھ

﴿مسجد میں سلام کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کے ہمارے گاؤں میں اکثر لوگ مسجد میں آکرزور سے سلام کرتے ہیں اور مسجد میں لوگ ذکرواذکار، تلاوت، نوافل اور دعاؤں میں مشغول ہوتے ہیں، پوچھنا یہ ہے کہ اس صورت میں سلام کا جواب دیناواجب ہے؟ جبکہ بعض اوقات ہمیں سلام کرنے والے کے سلام کیطرف توجہ بھی نہیں ہوتی جسکی وجہ سے سلام کا جواب رہ جاتا ہے۔

مستفتی: صابرگل کوہائی شکردرہ

﴿جواب﴾ عام حالات میں جواب دینااگرچہ واجب اور باعث اجروثواب ہے، تاہم بعض جگہوں پر جواب دیناواجب نہیں رہتا مثلاً تلاوت کرنے والے کو، اسی طرح ذکروفکر، دعا اور تسبیحات میں مشغول لوگوں کو کوئی سلام کرے تو ان پر جواب دیناواجب نہیں ہے، مسجد میں چونکہ انسان عموماً ذکرہی میں مشغول رہتا ہے، اس لئے جواب دیناکوئی ضروری نہیں ہے اور بہتر یہ ہے کہ مسجد میں عام لوگوں کو سلام نہ کریں، البتہ کوئی آپکی طرف متوجہ ہے تو صرف اسی کو سلام کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

لمافی الشامی:(۶۱۸/۱،طبع سعید)

وفی شرح الشرعۃ:صرح الفقہاء بعدم وجوب الردفی بعض المواضع :القاضی اذاسلم علیہ الخصمان والأستاذالفقیہ اذاسلم علیہ تلمیذہ أوغیرہ أوان الدرس وسلام السائل والمشتغل بقرأۃ القرآن والدعاء حال شغلہ والجالسین فی المسجدلتسبیح او قرأۃ اوذکرحال التذکیراہ وفی البزازیۃ لایجب الردعلی الامام والمؤذن والخطیب عند

الثاني، وهو الصحيح اه. وينبغي وجوب الرد على الفاسق، لأن كراهة السلام عليه للزجر فلا تنافي الوجوب عليه تأمل.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: نثار محمود کوہاٹی عفا اللہ عنہ

۲۷ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۳۳۳

﴿مسجد تنگ ہونے کی وجہ سے دوسرے محلے کے لوگوں کو اس مسجد سے منع کرنا﴾

﴿سوال﴾ ہمارے محلے میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے جسکے اندرونی ہال میں تین صفیں ہیں اور باہر برآمدے میں دو صفیں ہیں عام دنوں میں نمازیوں کی تعداد کم ہوتی ہے لیکن رمضان المبارک میں مسجد بالکل بھر جاتی ہے، خاص طور پر نماز تراویح میں اور چند لوگ دوسرے محلے کے بھی اپنی مسجد چھوڑ کر یہاں نماز تراویح پڑھنے آجاتے ہیں جنکی وجہ سے پریشانی زیادہ ہوتی ہے۔

اگر یہ لوگ نہ آئیں تو محلے والوں کیلئے مسجد کافی ہے، اب کچھ لوگوں نے ان دوسرے محلے والوں کو اس مسجد میں آنے سے منع کر دیا کہ جگہ تنگ ہو جاتی ہے، کیا ان لوگوں کا یہ فعل درست ہے؟ کسی کو مذکورہ وجہ کی بنا پر مسجد میں آنے سے منع کیا جا سکتا ہے؟

﴿جواب﴾ دوسرے لوگوں کی وجہ سے اگر اہل محلہ کیلئے مسجد میں جگہ تنگ پڑ رہی ہو تو اہل محلہ کو چاہیے کہ وہ ایسے طریقے سے ان لوگوں سے معذرت کر لیں جس سے انکی ایسی دل آزاری نہ ہو کہ جسکی وجہ سے وہ نماز ہی چھوڑ دیں۔

اور بہتر صورت یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو مسجد میں توسیع کر دی جائے تا کہ نہ تو منع کرنے کی نوبت آئے اور نہ کسی کی دل آزاری ہو۔

لما في الدر مع الرد: (۶۶۲/۱ ط سعید)

بل ولأهل المحلة منع من ليس منهم عن الصلاة فيه۔ (قوله بل ولأهل المحلة الخ) قال في القنية: وكذا الأهل المحلة أن يمنعوا من ليس منهم عن الصلاة فيه اذا ضاق بهم المسجد.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

۵ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۲۷۳

﴿مسجد میں دنیاوی باتیں کرنا کیسا ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ مسجد میں دنیاوی باتیں

کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ مسجد میں دنیاوی باتوں کی غرض سے بیٹھنا اور باتیں کرنا درست نہیں کیونکہ مسجد دنیاوی امور کیلئے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کیلئے بنائی گئی ہے، البتہ اگر کوئی آدمی عبادت کی غرض سے مسجد میں داخل ہوا تو اسے بھی حتی الوسع کوشش کرنی چاہیے کہ دنیاوی باتوں سے بچے لیکن اگر باتیں کرنے کی نوبت آجائے تو ایسی باتوں سے اجتناب کرے جن میں منکرات "غیبت، جھوٹ، فحش باتیں وغیرہ" شامل ہوں، اتفاق سے دنیاوی جائز باتیں ہوجائیں تو اس کی گنجائش ہے۔

لما في الدرمع الرد:(۲/۴۳۶ طبع امدادیه)

والكلام المباح وقيده في الظهيرية بأن يجلس لأجله لكن في النهر الاطلاق أوجه. وفي الشامية: قوله (بأن يجلس لأجله) فانه حينئذ لا يباح بالاتفاق لأن المسجد ما بني لأمور الدنيا وفي صلاة الجلابي: الكلام المباح من حديث الدنيا يجوز في المساجد وان كان الاولى أن يشتغل بذكر الله تعالىٰ، كذا في التمرتاشي هندية. وقال البيري ما نصه: وفي المدارك ومن الناس من يشتري لهو الحديث المراد بالحديث الحديث المنكر لما جاء "الحديث في المسجد يأكل الحسنات كما تأكل البهيمة الحشيش" انتهى فقد أفاد أن المنع خاص بالمنكر من القول أما المباح فلا. قال في المصفى: الجلوس في المسجد للحديث مأذون شرعا لأن أهل الصفة كانوا يلازمون المسجد وكانوا ينامون ويتحدثون ولهذا لا يحل لأحد منعه كذا في الجامع البرهاني أقول: يؤخذ من هذا أن الأمر الممنوع منه اذا وجد بعد الدخول بقصد العبادة لا يتناوله. (الاطلاق أوجه) بحث مخالف للمنقول مع ما فيه من شدة الحرج.

ولما في اعلاء السنن:(۵/۱۸۶ طبع دار الكتب العلمية بيروت)

قوله: عن أنس الخ وعن عبدالله الخ قال المؤلف: دلالتهما على كراهة كلام الدنيا في المسجد ظاهرة وفي "البحر الرائق" وصرح في "الظهيرية" بكراهة الحديث أي كلام الناس في المسجد لكن قيده بأن يجلس لأجله وفي "فتح القدير": الكلام المباح فيه مكروه يأكل الحسنات (قلت: قوله يأكل الحسنات جزء من الحديث الذي لا أصل له وسنذكره عن قريب) وينبغي تقييده بما في "الظهيرية" أما ان جلس للعبادة ثم بعدها تكلم فلا (۲:۴۹) قلت: ينبغي أن يتقي منه حق الاتقاء ثم بعد ذلك ان تكلم فيه لا بأس به فان في الحذر كل الحذر منه حرج عظيم وما جعل الله في الدين من حرج، وفي "تنقيح المفتي والسائل" وأما حديث: "من تكلم في المسجد بكلام الدنيا أحبط الله أعماله" قال الصغاني: إنه موضوع وكذا "الحديث في المسجد يأكل الحسنات كما تأكل البهيمة الحشيش" قال الفيروزآبادي: لم يوجد كذا في "موضوعات الشوكاني".

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

۱۲ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتوی نمبر: ۳۰۲

﴿مسجد کے احاطہ میں لگے ہوئے درخت کے پھلوں کا حکم﴾

﴿سوال﴾ اکثر مساجد کے احاطہ میں پھل دار درخت لگے ہوتے ہیں اور ان درختوں پر پھل بھی آتا ہے تو کیا نمازیوں کیلئے یا دوسرے لوگوں کیلئے ان درختوں سے پھل کھانا جائز ہے؟

﴿جواب﴾ مسجد کے احاطہ میں اگر درخت اسی لئے لگائے گئے ہیں کہ سب لوگ ان سے پھل کھائیں تو نمازیوں اور غیر نمازیوں سب کیلئے کھانا درست ہے اور اگر مسجد کیلئے لگائے گئے ہیں یا کچھ حال معلوم نہیں تو ان کو فروخت کر کے رقم مسجد کے کاموں میں صرف کرنی چاہیے۔

لما في الدر المختار:(۴/۴۳۲،طبع سعید)

غرس في المسجد اشجاراً تثمران غرس للسبيل فلكل مسلم الأكل والاقتباع لمصالح المسجد الخ.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۳۲۷

﴿مسجد نبوی ﷺ کی موجودہ توسیع کا حکم﴾

﴿سوال﴾ حدیث پاک میں جو مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نماز پڑھنے کی فضیلت بیان ہوئی ہے "صلاة في مسجدي هذا خير من الف صلاة فيما سواه الا المسجد الحرام" (بخاری شریف: ۱/۱۵۹، طبع قدیمی) کیا یہ فضیلت صرف اسی حصہ کیلئے ہوگی جو نبی ﷺ کے زمانے میں مسجد میں شامل تھا یا بعد میں جو توسیع ہوئی اسکے لئے بھی یہ فضیلت ہوگی؟

﴿جواب﴾ یہ فضیلت صرف اسی حصہ کے ساتھ خاص نہیں جو حصہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے زمانہ میں مسجد نبوی شمار ہوتا تھا بلکہ بعد میں جو توسیع کی گئی یہ فضیلت اسکے لئے بھی ہے۔

لما في التنوير مع الدر:(۱/۶۲۶،طبع سعید)

فائدة: لما كان الاعتبار للتسمية عندنا لم يختص ثواب الصلاة في مسجده عليه الصلوة والسلام بما كان في زمنه فليحفظ. وفي الشامية: قوله (فائدة لما كان الخ) استنبط هذه الفائدة من مسألة الاقتداء شيخ الاسلام العيني في شرح البخاري كما في أحكام الاشارة من الاشباه. وأصل ذلك قوله صلى الله عليه وسلم في الحديث الصحيح "صلاة في مسجدي هذا خير من الف صلاة فيما سواه الا المسجد الحرام" ومعلوم أنه قد زيد في المسجد النبوي، فقد زاد فيه عمر ثم عثمان ثم الوليد ثم المهدي والاشارة بهذا الى المسجد المضاف المنسوب اليه صلى الله عليه وسلم ولا شك ان جميع

المسجد الموجود الان يسمى مسجده صلى الله عليه وسلم فقد اتفقت الاشارة والتسمية على شئ واحد فلم تلغ التسمية فتحصل المضاعفة المذكورة في الحديث فيما زيد فيه وخصها الامام النووي بما كان في زمنه صلى الله عليه وسلم عملا بالاشارة واما حديث "لو مد مسجدي هذا الى صنعاء كان مسجدي" فقد اشتد ضعف طرقه فلا يعمل به في فضائل الاعمال كما ذكره السخاوي في المقاصد الحسنة وكان وجهه أنه جعل الاشارة لخصوص البقعة الموجودة يومئذ فلم تدخل فيها الزيادة ولا بد في دخولها من دليل قلت ويؤيده ما سيأتي في الأيمان من باب اليمين بالدخول عن البدائع لو قال لا ادخل هذا المسجد فزيد فيه حصة فدخلها لم يحنث مالم يقل مسجد بني فلان فيحنث وكذا الدار لانه عقد يمينه على الاضافة وذلك موجود في الزيادة وقد يجاب بأن ما نحن فيه من قبيل الثاني ويؤيده أن في بعض طرق الحديث بدون اسم الاشارة وعلى ذكرها فهي لا لتخصيص البقعة بل لدفع أن يتوهم دخول غير المسجد المدني من بقية المساجد التي تنسب اليه صلى الله عليه وسلم التي ذكرها اصحاب السير.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

۲۸ محرم الحرام ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر: ۲۶

﴿غیر مسلم کا مسجد میں آنا کیسا ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس کے اندر ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جس میں ایک عالم دین کی رہائش ہے کچھ دنوں پہلے موصوف عالم بیمار ہوئے تو ان کی ایک سکھ معالج نے تشخیص کی، اس پر مذکورہ عالم کو تردد تھا کہ ایک غیر مسلم کا مسجد میں آنا درست ہے یا نہیں؟ جبکہ مسجد کے ساتھ یا باہر کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں یہ ان کو ٹھہراتے، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟ کیا اس کا مسجد سے گزر کر جانا درست تھا یا نہیں؟ مستفتی: حسین

﴿جواب﴾ مصالح مسجد یا دوسرے اہم اور ضروری کام کی بناء پر کافر، ذمی کے مسجد میں داخل ہونے میں کوئی حرج نہیں، مذکورہ عالم کو تردد نہیں ہونا چاہیے۔

لما في الشامي: (۶/۵۷۵ طبع امدادیہ)

ولا بأس أن يدخل الكافر وأهل الذمة المسجد الحرام وبيت المقدس وسائر المساجد لمصالح المسجد وغيرها من المهمات اه ومفهومه أن في دخوله لغير مهمة بأسا وبه يتجه ما هنا، فافهم.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی

۲۲ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر: ۳۵۳

﴿مسجد کے مصالح میں شامل کمرے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ گاؤں دیہات میں چونکہ سردی کے موسم میں انتہائی ٹھنڈ ہوتی ہے جس سے بچاؤ کے لئے مسجد کے ساتھ ایک اور کمرہ بھی بعض علاقوں میں بنایا جاتا ہے، نمازی حضرات وضو کرنے کے بعد اُسمیں سلگنے والی آگ سے حرارت حاصل کرتے ہیں اور پھر نماز کیلئے چلے جاتے ہیں، اُس میں اکثر و بیشتر یہ ہوتا ہے کہ لوگ دنیاوی باتیں کرتے ہیں، بعض لوگ غیبت بھی کرتے ہیں، کیا ایسا کمرہ جو مسجد کے ساتھ ملا ہوا ہو یا الگ ہو (مقصد سردی میں آگ کی تپش سے استفادہ ہوتا ہے) اس میں دنیوی باتیں کرنا ممنوع تو نہیں ہے؟ یعنی کیا مسجد کا حکم رکھتا ہے؟ جبکہ بعض لوگ سنتیں بھی وہیں پڑھنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

﴿جواب﴾ ایسے کمرے پر مسجد کا حکم لاگو نہیں ہوگا کیونکہ اس کے بنانے کا مقصد اس میں آگ وغیرہ جلانے کے ذریعے سردی سے بچاؤ کا سامان کرنا ہوتا ہے اور مسجد کے بنانے کا مقصد نمازوں کی ادائیگی ہوتا ہے۔

لہٰذا مسئولہ صورت میں مذکورہ کمرہ مسجد کے مصالح میں تو ضرور شامل ہے، تاہم مسجد کے احکام جیسے آداب وغیرہ اس پر مرتب نہیں ہونگے۔

جہاں تک غیبت اور فضول گوئی کا تعلق ہے وہ تو شریعت میں ہے ہی ناپسندیدہ اور غیبت تو حرام ہے جس سے قرآنِ کریم نے شدّ و مد سے منع فرمادیا ہے، نیز دنیوی گفتگو سے بھی احادیثِ مبارکہ میں متعدد بار بچنے کی ترغیب وارد ہوئی ہے۔

لمافی التنویر مع الدر: (۳/۳۵۷-۳۵۸، طبع سعید)

واذا جعل تحته سردابا لمصالحه جاز ولو جعل لغيرها او جعل فوقه بيتا وجعل باب المسجد الى طريق وعزله عن ملكه لا) يكون مسجدا (وله بيعه ويورث عنه)

وفي الشامية: قال في البحر: وحاصله ان شرط كونه مسجدا ان يكون سفله وعلوه مسجدا لينقطع حق العبد عنه لقوله تعالىٰ "وان المساجد لله" بخلاف ما اذا كان السرداب والعلو موقوفا لمصالح المسجد فهو كسرداب بيت المقدس هذا هو ظاهر الرواية.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد شریف حسین عفا اللہ عنہ

۲۸ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتوی نمبر: ۲۲۴

﴿ویران مسجد کو مدرسہ میں تبدیل کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک پرانی اور ویران مسجد ہے جس میں کوئی نماز نہیں پڑھتا جس کا اکثر حصہ منہدم ہو چکا ہے تو کیا اس کو مدرسہ بنانے کی شریعت میں گنجائش ہے یا نہیں؟ مستفتی: عزیز اللہ

﴿جواب﴾ جس جگہ ایک مرتبہ مسجد بنائی گئی وہ قیامت تک مسجد ہی کے حکم میں رہے گی، اس کو مسجد کے علاوہ کسی اور مقصد کے لئے استعمال کرنا ہرگز درست نہیں، لہٰذا پرانی مسجد کو مدرسہ میں تبدیل کرنا ناجائز ہے، یہ جگہ مسجد ہی رہے گی اور مسجد کے تمام آداب کا خیال رکھنا ضروری ہے البتہ مدرسہ بنانے سے مراد اس جگہ پڑھائی اگر ہے تو اس میں پڑھائی جائز ہے لیکن یہ مسجد ہی رہے گی۔

لما فی الدر المختار: (۵۴۸/۶ طبع امدادیہ)

ولو خرب ما حوله واستغنیٰ عنه یبقی مسجداً عند الامام والثانی أبداً الی قیام الساعة وبه یفتی.

ولما فی البحر الرائق: (۲۵۱/۵ طبع سعید)

حکم المسجد بعد خرابه وقد اختلف فیه الشیخان فقال محمد اذا خرب ولیس له ما یعمر به وقد استغنی الناس عنه لبناء مسجد آخر أو لخراب القریة أو لم یخرب لکن خربت القریة بنقل أهلها واستغنوا عنه فانه یعود الی ملک الواقف أو ورثته وقال أبو یوسف هو مسجد أبداً الی قیام الساعة لا یعود میراثاً ولا یجوز نقله ونقل ماله الی مسجد آخر سواء کانوا یصلون فیه أو لا وهو الفتویٰ.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۱۶ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر: ۱۴۳

﴿مسجد میں اخبارات لانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ مسجد میں اخبارات لانا اور لگوانا کیسا ہے؟

﴿جواب﴾ مسجد میں اخبارات لانا، لگوانا دونوں جائز نہیں کیونکہ اخبارات میں عموماً تصاویر اور دنیاوی باتیں ہوتی ہیں اور احادیث میں ہے کہ جہاں پر تصاویر ہوں وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے، اسی طرح جو شخص مسجد کے اندر دنیاوی باتوں میں مشغول ہو تو اللہ تعالیٰ اسکے اعمال کو ضائع کر دیتے ہے اور وہ اخبارات جن میں تصاویر نہ ہوں تو کم از کم وہ دنیاوی باتوں پر مشتمل ہوتے ہیں، اسلئے ایسے اخبارات کو بھی مسجد میں لانا مناسب نہیں ہے۔

لما فی اعلاء السنن:(۱۸۶/۵ طبع دار الکتب العلمیۃ)

من تکلم فی المسجد بکلام الدنیا فاحبط اللہ اعمالہ.

ولما فی الکبیری:(ص ۵۲۸ طبع سہیل اکیڈمی)

والکلام المباح فیہ مکروہ ویاکل الحسنات کما تاکل البھیمۃ الحشیش کذا ذکرہ حدیثا صاحب الکشاف.

ولما فی الشامی:(۶۶۲/۱ طبع سعید) لان المسجد ما بنی لامور الدنیا.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب :اسرار عزیز دیروی

۲۸ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ — فتوی نمبر :۷۱۳

﴿وضاحت از مستفتی مسئلہ در بارہ مسجد میں اخبارات لانا﴾

﴿سوال﴾ آپ کا فتوی مورخہ ۲۸ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ کو ملا پڑھ کر خوشی ہوئی محترم مولانا صاحب فتوی میں اصل جس بات کی ضرورت ہے وہ یہ کہ منتظم مسجد یا مدرسہ خود اخبار منگواتے ہیں جو کہ مدرسہ میں یا مسجد میں آتے ہیں اس مسئلہ پر کچھ پوچھنے کی جسارت اسلئے ہوئی کہ کچھ عرصہ پہلے مسجد میں فجر کی نماز کیلئے داخل ہوئے تو اخبار پہلے آیا پڑا تھا (ابھی جماعت کا وقت نہیں ہوا تھا) بے ساختہ منہ سے نکلا کہ نمازیوں سے پہلے روپے دیکر شیطان کو مسجد میں داخل کر رہے ہیں۔

اخبار بھی وہ تھا جس میں مختلف عورتوں کی نیم عریاں تصاویر ہوتی ہیں، عرض یہ ہے کہ یہ ناجائز ہے، حرام ہے اور قابل سزا اور جرم ہے، آپ نے جو فتوی دیا تھا اس میں ایسا لگتا ہے کہ کوئی شخص اگر لے کر آتا ہے مگر یہاں تو امام صاحب اور منتظمہ کمیٹی خود منگواتے ہیں، کیا آپ کے خیال میں یہ وفاق المدارس کی توجہ طلب بات نہیں اور علماء دین کا کیا حق ہے۔

میرے خیال میں امام حضرات، علماء حضرات اپنے گھروں میں اس کی پابندی کریں کیونکہ بچوں اور مہمانوں پر بھی اثر لازمی ہوتا ہے لیکن آج کل سب سے بڑے دو بنیادی ظلم عام ہیں جس کو کچھ حضرات ضرورت کے تحت اجازت دے رہے ہیں۔

(۱) T.V ساری دنیا کے channal خرافات ننگی تصاویر اور اس کے علاوہ بچوں کے پروگرام میں چھوٹے بچوں کو یعنی لڑکے لڑکی کو شراب پیتا دکھا کر بوس وکنار دکھا رہے ہیں۔

(۲) inter net بیوپار کی ضرورت مگر معاشقے اور پھر رشتے، میل ملاپ اگر شادی ہوئی اختلافات میں کوئی بزرگ بیچ بچاؤ نہیں کرسکتا! نتیجہ...... اور دیگر ممالک امریکہ یورپ میں

اتنی طلاقیں اور بدمعاشی ان سے پھیلی ہوئی ہے جس کا اندازہ نہیں لگا سکتے، اب سنا ہے کہ امریکہ کے تھنک ٹینک نے اپنی نئی نسل کی پستی کا سبب ہی بدمعاشی اور عورت مرد کے ملاپ کو بتایا ہے، امریکہ میں اب سنا ہے کہ نئی یونیورسٹیاں لڑکیوں کی علیحدہ شہر میں اور لڑکوں کی علیحدہ شہر میں بن رہی ہیں کیونکہ مخلوط تعلیم بھی تعلیم کے معیار کو تباہ و برباد کر رہی ہیں۔

﴿جواب﴾ (۱) اگر کوئی شخص اپنے آپکو حالات سے باخبر رکھنے کیلئے تصاویر سے نظروں کو بچاتے ہوئے اخبار دیکھے تو یہ ناجائز نہیں ہے، بات صرف مسجد میں اخبار لانے کی ہے اور وہ اس لئے ناجائز ہے کہ اس میں تصاویر اور دنیاوی باتیں ہوتی ہیں، اب چاہے منتظمین مسجد میں سے کوئی لائے یا منتظمین مدرسہ میں سے کوئی لائے ہر صورت میں ناجائز ہے، اس لئے کہ کوئی ناجائز کام کسی خاص آدمی کے کرنے سے جائز نہیں ہو جاتا۔

رہی بات وفاق المدارس کی تو وفاق المدارس علماء حق کا ایک تعلیمی بورڈ ہے جو تعلیمی نگرانی کیلئے بنایا گیا ہے، مسجد یا مدرسہ کے علماء کی نگرانی اس کے ذمہ نہیں ہے یہ تو ہر ادارے کے منتظمین کی ذمہ داری ہے کہ وہ حضرات اس کا نوٹس لیں۔

(۲) ٹی وی کے بارے میں جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ ٹی وی دیکھنا ناجائز اور حرام ہے کیونکہ اس کی وضع ہی معاشرے کو بگاڑنے کیلئے کی گئی ہے اگر چہ اس کے کچھ فائدے بھی ہیں لیکن فائدوں کا پہلو مغلوب اور شر کا پہلو غالب ہے۔

(۳) انٹرنیٹ جہاں بہت سارے خرافات اور مفاسد پر مشتمل ہے تو دوسری طرف اس کے کچھ فوائد اور ضروریات بھی ہیں اگر کوئی شخص خرافات سے بچتے ہوئے ان ضروریات کیلئے اس کو استعمال کرتا ہے تو اس کی گنجائش ہے، لہٰذا بالکل اس کو ناجائز اور حرام کہنا مشکل ہے۔

لما فی قوله تعالیٰ: (سورة لقمان پ ۲۱ آیت ۶)

﴿ومن الناس من یشتری لهو الحدیث لیضل عن سبیل الله بغیر علم ویتخذها هزوا﴾

ولما فی الصحیح لمسلم: (۱۲۲/۲ طبع قدیمی) الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته.

ولما فی الهندیة: (۷۷/۵ طبع رشیدیه)

السؤال عن الاخبار المحدثة فی البلدة وغیر ذلک المختار انه لا باس بالاستخبار والاخبار کذا فی الخلاصة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: اسرار عزیز دیروی

۲۳ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۸۱۱

﴿مسجد میں آرام کی غرض سے بیٹھ کر ذکر کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسجد میں آدمی آرام کی غرض سے بیٹھا رہے ساتھ ذکر بھی کرتا رہے تو کیا اسکو ذکر کا ثواب ملے گا؟ مستفتی: محمد دین

﴿جواب﴾ مذکورہ بالا صورت میں اسکو ذکر کا ثواب ضرور ملے گا اور اعتکاف کی نیت بھی کرلے تو زیادہ بہتر ہے۔

لمافی روح المعانی:(ج۲۲ص۳۰۰،سورۃالاحزاب،آیت۴۱،طبع رشیدیہ)

یاایھاالذین امنوااذکرواالله ذکراکثیرا...... الآیۃ.

وکذافی جامع الترمذی:(۱۷۳/۲،طبع فاروقی کتب خانہ ملتان)

ولمافی قاضیخان ھامش الھندیۃ:(۶۶/۱،طبع رشیدیہ)

ولاباس للجلوس فی المسجدلغیرالصلاۃ لکن لوتلف بہ شیء یضمن.

ولمافی الھندیۃ:(۳۲۱/۵،طبع رشیدیہ کوئٹہ)

ومن حرمۃ المسجد...... الخامس عشران یکثرفیہ ذکرالله تعالی کذافی الغرائب.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: بلال احمد غفراللہ لہ

۲۰ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ فتویٰ نمبر: ۸۰۲

﴿مسجد کے برآمدہ سے باہر متصل صحن کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں مسجد کے برآمدہ سے باہر والے حصے کو مسجد کی حدود سے خارج سمجھا جاتا ہے، عموما لوگ اس جگہ کو جوتیاں اتارنے اور مسجد کے دوسرے کاموں میں استعمال کرتے ہیں ہمارے گاؤں کی مسجد کے مذکورہ حصہ پر اہل مسجد ایک باغیچہ بنانے کے خواہشمند ہیں چونکہ گھاس وغیرہ لگانے کے لئے گوبر کا استعمال کرنا ناگزیر ہوتا ہے، اسلئے پوچھنا یہ ہے کہ یہ حصہ مسجد کے حکم میں داخل ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ کے مطابق مسجد بناتے وقت واقف (وقف کرنے والا) نے اگر اس حصہ کو بھی مسجد میں شامل کرنے کی نیت کی ہو تو یہ بھی مسجد کے حکم میں ہوگا، البتہ اس حصہ کو نیت کرتے وقت شامل نہ کیا ہو اور بظاہر ایسا ہی ہوگا، جیسا کہ سوال میں علاقہ کی ترتیب بتائی گئی ہے تو اس صورت میں مسجد کا حکم نہیں ہوگا اور اس میں گھاس وغیرہ لگانے کے لئے گوبر کا استعمال کرنا بھی درست ہوگا۔

لما فی الهندية:(۴۵۹/۲،طبع رشيديه)

ولـوارادان يـقف ارضـه على المسجد وعمارة المسجد...... يقول وقفت ارضى هذه و يبين حدودها بحقوقها، مرافقها وقفاموبدافى حياتى وبعدوفاتى الخ.

ولما فی الشامی:(۶۵۶/۱-۶۵۷،طبع سعيد)

(قوله ولاتطينه بنجس)فى الفتاوى الهندية يكره ان يطين المسجد بطين قدبل بماء نجس بخلاف السرقين اذاجعل فيه الطين لان فى ذلك ضرورة وهوتحصيل غرض لا يحصل الا به كذافى السراجيةاه.....(قوله كفناء مسجد)هوالمكان المتصل به ليس بينه و بينه طريق فهوالمتخذ لصلاة الجنازة أوعيد فيماذكرمن جوازالاقتداء رحل دخوله لجنب ونحوه.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ والله اعلم: محمد اسلم چترالی غفرلہ

۱۷ربیع الثانی۱۴۲۹ھ فتوی نمبر:۱۳۲۳

﴿کچی پیاز اور لہسن کھا کر مسجد جانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کچی پیاز اور لہسن کھانے کا کیا حکم ہے؟ کھانے کے بعد بدون کلی کئے مسجد جانے کا کیا حکم ہے؟ نیز سگریٹ نوشی کے بعد بدبودار منہ کے ساتھ مسجد جانا کیسا ہے؟ مدلل جواب مطلوب ہے۔ مستفتی:محمد ناصر

﴿جواب﴾ کچی پیاز اور لہسن کھانا بلا کراہت جائز ہے،البتہ کھانے کے بعد اگر منہ سے بدبو آئے،اسی طرح سگریٹ نوشی کے بعد بدبودار منہ کے ساتھ مسجد جانا مکروہ ہے جس سے بچنا چاہیے،مسجد میں نمازیوں کے علاوہ فرشتوں کو بھی بدبو سے تکلیف ہوتی ہے،ویسے تو فقہاء کرام نے ایسی حالت میں عام مجالس میں بھی جانے کو مکروہ لکھا ہے،لہٰذا مسواک یا منجن وغیرہ سے بدبو کو زائل کرنے کے بعد جانا چاہیے۔

لما فی الصحیح لمسلم:(۱۸۳/۲،طبع قديمى)

عـن ابى ايوب الانصارى قال كان رسول الله ﷺ اذااتى بطعام اكل منه وبعث بفضلة الى وانه بعث الى يوما بفضلة لم ياكل منهالان فيهاثومافسالته احرام هوقال لا و لكنى اكرهه من اجل ريحه.

ولما فی الشامی:(۶۶۱/۱،طبع ايچ ايم سعيد)

(قوله واكل نحوثوم)اى كبصل ونحوه مماله رائحة كريهة،للحديث الصحيح فى النهى عن قربان آكل الثوم والبصل لمسجد.

قال الامام العينى:فى شرحه على صحيح البخارى،قلت علة النهى اذى الملئكة و

اذی المسلمین ولا یختص بمسجده علیه السلام بل الکل سواء لروایة مساجدنا بالجمع..... وانما خص الثوم هنا بالذکر وفی غیره ایضا بالبصل والکراث لکثرة اکلهم لها وکذلک الحق بعضهم بذلک من بفیه بخر او به جرح له رائحة وکذلک القصاب والسماك والمجذوم والابرص اولی بالالحاق.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد اسلم چترالی غفرلہ

۲۰ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۳۳۶

﴿مسجد میں کرسی پر بیٹھ کر وعظ کرنا درست ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل اکثر علماء مساجد میں کرسی پر بیٹھ کر وعظ وخطاب فرماتے ہیں، کیا مسجد میں کرسی رکھ کر وعظ کرنا درست ہے؟

﴿جواب﴾ جی ہاں! جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسجد میں کرسی پر تشریف فرما کر وعظ فرمانا حدیث سے ثابت ہے۔

لما فی فتح الملهم:(۵/۲۸۶-۲۸۷،طبع دار العلوم کراچی)

عن ابی رفاعةؓ قال انتهیت الی النبی صلی الله علیه وسلم وهو یخطب، قال: فقلت: یارسول الله رجل غریب جاء یسئل عن دینه لایدری مادینه؟قال:فأقبل علی رسول الله صلی الله علیه وسلم وترك خطبته حتٰی انتهی الی فأتی بکرسی قوائمه حدیدا، قال فقعدعلیه رسول الله صلی الله علیه وسلم وجعل یعلمنی مما علمه الله ثم اتی خطبته فأتم آخرها.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد اسلم چترالی غفرلہ

۲۶ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۶۹۷

﴿مسجد ایک دفعہ بن جانے کے بعد کسی بھی غرض سے اسکا گرانا ناجائز اور سخت گناہ ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مسجد جو کہ کافی عرصہ ہوگیا بنائی گئی ہے کسی کی ملکیت پر قبضہ کر کے نہیں بلکہ باقاعدہ اس کیلئے زمین وقف کی گئی تھی اور آج تک اسمیں پانچوں نمازیں باجماعت ادا کیجاتی ہیں اب ایک کمپنی والے کہتے ہیں کہ ہم یہاں ایک ٹاور بنانا چاہتے ہیں اور اس مسجد کو گرا کر دوسری جگہ اس سے بہتر مسجد بنانا چاہتے ہیں، تو کیا اس مسجد کو گرا کر اسکے بدلے دوسری مسجد بنانا جائز ہے یا نہیں؟ شریعت میں اسکی گنجائش ہے؟ اگر نہیں ہے تو یہاں آباد اور آس پاس کے لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کمپنی والوں

کو اس طرح کرنے سے روکیں؟ براہ کرم قرآن، حدیث اور فقہ اسلامی کی روشنی میں جواب دیکر ممنون فرمائیں۔

مستفتی: ایک سائل

﴿جواب﴾ دنیا کے چاروں مذاہب کا متفقہ فیصلہ ہے یعنی اس بات پر پوری امت مسلمہ کا اتفاق ہے کہ زمین کے کسی بھی خطہ پر جب ایک بار مسجد بن جاتی ہے اور اسمیں باقاعدہ نماز بھی شروع ہوجاتی ہے تو زمین کے اس حصہ کی نسبت اب صرف اللہ تعالیٰ ہی کیطرف ہوگی اور قیامت تک یہ جگہ اب مسجد ہی رہیگی چاہے مسجد کی تعمیر بھی باقی نہ رہے یا وہاں کے لوگوں کیلئے اس سے بہتر اور بڑی مسجد کا دوسری جگہ انتظام بھی کرلیا جائے۔ وہ جگہ اب مسجد ہی کے استعمال میں آسکتی ہے کسی دوسرے مقصد کیلئے اسکا استعمال ہرگز جائز نہیں۔

مساجد دین اسلام کے شعائر ہیں انکا احترام ایمان کا حصہ ہے، لہذا کسی فرد یا کمپنی کیلئے اسکی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ مسجد کو اس غرض سے شہید کرے کہ یہاں ٹاور بنے گا یا کوئی دوسرا مفید عام کام ہوگا۔ یہ خالص شرعی حق ہے اس لئے اہل محلہ کو بھی کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ اس کمپنی کے ساتھ اتفاق کریں اور کمپنی کے اس پیشکش کو قبول کرلیں۔ تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے خصوصا آس پاس کے لوگوں کی کہ وہ اس کمپنی کو اس بڑے ظلم سے روکیں۔ قرآن کریم میں اس شخص کو سب سے بڑا ظالم ٹھہرایا گیا ہے جو مسجد کو نقصان پہنچائے، اس میں عبادت کرنے سے لوگوں کیلئے رکاوٹ بنے خصوصا اس کو گرا کر وہ جگہ دوسرے مقاصد کیلئے اگر استعمال کرے۔ کمپنی والوں کو بھی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈریں۔ مسجد کی جگہ ٹاور بنا کر دنیاوی جس فائدہ یا عزت کا یہ لوگ جو خواب دیکھ رہے ہیں اسکی حیثیت محض ایک وہم وخیال سے زیادہ نہیں ہے یہ شیطانی وسوسہ ہے جسکا نتیجہ دنیا وآخرت میں بڑا خطرناک ظاہر ہوگا۔

شرعی حکم بتانے کے ساتھ ساتھ ہم کمپنی والوں کو خیر خواہانہ مشورہ بھی دیتے ہیں کہ یہ لوگ اس ارادہ کو ترک کرلیں، دنیاوی اغراض ومقاصد کو پورا کرنے کیلئے اور بہت سے مواقع ہیں۔

لمافی قوله تعالی سورة البقرة الآية ۱۱۴: ﴿ومن اظلم ممن منع مساجدالله ان يذكر فيها اسمه وسعى فى خرابها اولئك ماكان لهم ان يدخلوها الا خائفين لهم فى الدنيا خزى ولهم فى الآخرة عذاب عظيم﴾

ولمافى احكام القرآن للجصاص (۱/۸۷ قديمى)

قال الجصاص فى تفسير الآية المباركة: ومن اظلم ممن منع مساجدالله ....الخ

مـمـا يـدل عـلـى انه عـام فـي سـائـر الـمـساجدانه غير مقصور على بيت المقدس خاصة او المسجد الحرام خاصة اطلاقه ذلك في المساجد فلا يخص شئي منه الا بدلالة ۔

ولما في فقه السنة (۳/۳۸۰ طبع دار الكتب بشاور)

ومتى فعل الواقف ما يدل على الوقف اونطق بالصيغة لزم الوقف بشرط ان يكون الواقف ممن يصح بان كان كامل الاهلية من العقل والبلوغ والحرية والاختيار ولا يحتاج في انعقاده الى قبول الموقوف عليه واذا لزم الوقف فانه لا يجوز بيعه ولا هبته ولا التصرف فيه باى شئى يزيل وقفيته واذا مات الواقف لا يورث عنه لان هذا هو مقتضى الوقف .ولقول الرسول ﷺ :...."لا يباع ولا يوهب ولا يورث".

ولما في البخاري (۱/۳۸۸،۳۸۹ قديمي)

عن ابن عمر قال :اصاب عمر بخيبر ارضا فاتى النبي ﷺ فقال اصبت ارضا لم اصب مالا قط انفس عنه فكيف تأمرني به قال ان شئت حبست اصلها وتصدقت بها فتصدق عمر انه لا يباع اصلها ولا يوهب ولا يورث ۔

ولما في الفقه الاسلامي وادلته (۱۰/۷٦٦۳ طبع رشيدية

قال الحنفية المسجد بمجرد القول (اى الوقف) على المفتى به صفة الابدية فلا تنسلخ عنه صفة المسجدية ولو استغني عنه فلو خرب المسجد وليس له ما يعمر به وقد استغنى الناس عنه لبناء مسجد آخر يبقى مسجدا عند ابى حنيفة وابى يوسف ابدا الى قيام الساعة وبرأيهما يفتى فلا يعود الى ملك الباني ولا يجوز نقله ونقله ماله الى مسجد آخر سواء كانوا يصلون فيه ام لا وعلى صفحة ٧٦٦٤ قال :ذكر المالكية ان الاوقاف بالنسبة لبيعها ثلاثة اقسام :احدها المساجد لا يحل بيعها بالاجماع وعلى الصفحة بعدها قال :قال الشافعية اذا انهدم مسجد او خرب وانقطعت الصلوة فيه وتعذرت اعادته اوتعطل بخراب البلد مثلا لم يعد الى ملك احد ولم يجز التصرف فيه بحال ببيع اوغيره لان ما زال الملك فيه لحق الله تعالى لا يعود الى الملك بالاختلال ....ومذهب الحنابلة ......لا يجوز نقل المسجد وابداله وبيع ساحته وجعلها سقاية وحوانيت الا عند تعذر الانتفاع به ۔

ولما في الدر مع الرد (۴/۳۵۸ طبع سعيد)

ولو خرب ما حوله واستغنى عنه يبقى مسجدا عند الامام والثاني ابدا الى قيام الساعة وبه يفتى (قوله ولو خرب ما حوله) اى ولو مع بقائه وكذا لو خرب وليس له ما يعمر به وقد استغنى الناس عنه لبناء مسجد آخر (قوله عند الامام والثاني) فلا يعود ميراثا ولا يجوز نقله ونقل ماله الى مسجد آخر سواء كانوا يصلون فيه اولا وهو الفتوى ۔

ولما في العالمكيرية (۲/۴۵٦،۴۵۸ طبع رشيدية)

ولو كان مسجد في محلة ضاق على اهله ولا يسعهم ان يزيدوا فيه فسألهم بعض الجيران ان يجعلوا ذلك المسجد له ليدخله في داره ويعطيهم مكانه

عوضا ماهو خير له فيسع فيه اهل المحلة قال محمد رحمه الله تعالى لايسعهم ذلك وعلى صفحة بعدها:فى فتاوى الحجة لو صار احد المسجدين قديما وتداعى الى الخراب فاراد اهل السكة ببيع القديم وصرفه فى المسجد فانه لايجوز.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: عاقل شاہ

۲۹ جمادی الاولی ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر:

﴿ایک مرتبہ مسجد بن جائے تو تا قیامت مسجد کے حکم میں یہ جگہ ہوگی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ہم نے ایک جگہ مسجد بنائی تھی پھر کسی وجہ سے اسکو شہید کر کے اسکے متبادل دوسری جگہ مسجد بنائی، پوچھنا یہ ہے کہ سابقہ مسجد کی جگہ مسجد کے حکم میں ہوگی یا نہیں؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو پھر اس پر کیا تعمیر کرائی جائے کہ اسکی حرمت برقرار رہے؟ آیا اس جگہ پر رفاہی ٹیوب ویل وغیرہ بنایا جا سکتا ہے؟

﴿جواب﴾ صورت مذکورہ میں سابقہ مسجد کی جگہ تا قیامت مسجد کے حکم میں رہی گی، اس پر کوئی دوسری چیز مثلاً رفاہی ٹیوب ویل وغیرہ تعمیر کرانا جائز نہیں، البتہ اس کے اردگرد علامتی دیوار بنائی جائے تاکہ اسکی حرمت کی حفاظت ہو سکے۔

لما فى الهندية:(۲/۴۵۷-۴۵۸،طبع رشيديه كوئٹه)

ان أرادوا أن يجعلوا شيئا من المسجد طريقا للمسلمين فقد قيل ليس لهم ذالك وانه صحيح كذا فى المحيط....واذا خرب المسجد واستغنى أهله وصار بحيث لا يصلى فيه عاد ملكا للواقف أو لورثته حتى جاز لهم أن يبيعوها أو يبنوه دارا و قيل هو مسجد أبدا وهو الاصح كذا فى خزانة المفتين.

لما فى البحر الرائق:(۵/۲۵۱،طبع سعيد)

وقال أبو يوسف هو مسجد أبدا الى قيام الساعة لا يعود ميراثا ولا يجوز نقله ونقل ماله الى مسجد آخر سواء كانوا يصلون فيها أولا وهو الفتوى كذا فى الحاوى.

لما فى الشامى:(۴/۳۵۸،طبع سعيد)

(قوله ولو خرب ما حوله)أى ولو مع بقائه عامرا وكذا لو خرب وليس له ما يعمر به وقد استغنى الناس عنه لبناء مسجد آخر قوله(عند الامام والثانى)فلا يعود ميراثا، ولا يجوز نقله ونقل ماله الى مسجد آخر،سواء كانوا يصلون فيه أولا ،وهو الفتوى الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد احمد عفا اللہ عنہ

۳۰ ذی الحجہ ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۱۰۶۸

﴿وقف کے قرآن مجید استعمال کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ میں نے جامعہ دارالعلوم کراچی میں دوران تعلیم ایک قرآن مجید جامعہ کی مسجد سے اٹھا کر اپنے ذاتی استعمال کے لئے مختص کر دیا اور کمرے میں لا کر رکھ دیا فراغت کے بعد وہ قرآن مجید میں اپنے ساتھ گاؤں لے آیا۔

شریعت میں اس کا کیا حکم ہے کہ اگر یہ قرآن مجید میں اپنے گاؤں کی مسجد میں رکھ دوں تو ایسا کرنا جائز ہے؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: محمد جاوید صاحب

﴿جواب﴾ بظاہر یہ قرآن مجید اسی مسجد کے لئے وقف ہوا ہے، اس لئے واپس اسی مسجد میں رکھنا ضروری ہے۔

لمافی الدرمع الرد:(۶/۵۵۸تا۵۵۹،کتاب الوقف،طبع امدادیه)

فان وقفها علی مستحقی وقفه لم یجز نقلها وان علی طلبة العلم وجعل مقرها فی خزانته التی فی مکان کذافغی جواز النقل تردد.

وفی الشامية:سبل مصحفافی مسجد بعینه للقراءة لیس له بعد أن یدفعه الی أخرمن غیر أهل تلک المحلة للقراءة.....الذی تحصل من کلامه أنه اذا وقف کتباوعین موضعهافان وقفها علی أهل ذالک الموضع لم یجز نقلهامنه لا لهم ولا لغیرهم وظاهره أنه لایحل لغیرهم الانتفاع بهاوان وقفها علی طلبة العلم فلکل طالب الانتفاع بهافی محلها.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سید مزمل شاہ

۱۱ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ — فتوی نمبر: ۲۲۶۱

﴿مسجد کے چندہ سے کاروبار کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلہ کی مسجد کے لئے جو چندہ جمع ہوتا ہے، اس چندہ سے ایک نرسری لگائی گئی ہے، پودوں اور پھولوں کو بیچ کر حاصل ہونے والے نفع سے مسجد کی ضروریات پوری کی جاتی ہیں جبکہ اس نرسری میں کام کرنے والے دو مزدوروں کی تنخواہیں بھی اسی منافع سے ادا کی جاتی ہیں۔

قرآن وسنت کی روشنی میں بتلائیں کہ مسجد کے چندہ سے مسجد کے لئے کاروبار کرنا جائز ہے؟

﴿جواب﴾ مسجد کے چندہ سے کاروبار کرنا اور منافع کو مسجد پر ہی خرچ کرنے کا اگر اہتمام

ہوتو یہ جائز ہے بشرطیکہ یہ کاروبار مسجد کی کمیٹی کے اراکین اور چندہ دہندگان کے مشورہ سے ہو اور اس کام کے لئے رکھے گئے مزدوروں کی اجرت دینا بھی صحیح ہے۔

لمافی الهندية:(۲/۲۱۷-۲۱۸،طبع رشیدیه)

متولي المسجد اذا اشترى بمال المسجد حانوتا أو دارا ثم باعها جاز اذا كانت له ولاية الشراء هذه المسئلة بناء على مسئلة أخرى أن متولي المسجد اذا اشترى من غلة المسجد دارا أو حانوتا فهذا الدار أو الحانوت هل تلتحق بالحوانيت الموقوفة على المسجد ومعناه أنه هل تصير وقفا؟ اختلف المشائخ قال الصدر الشهيد المختار أنه لا تلتحق ولكن تصير مستغلا للمسجد كذا في المضمرات.

ولمافي التاتارخانية:(۵/۵۸۴،طبع قدیمی)

الفاضل من وقف المسجد هل يصرف الى الفقراء؟ قيل لايصرف وانه صحيح ولكنه يشترى به مستغلا للمسجد.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: مزمل شاہ

۱۴ جمادی الاول ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر: ۲۲۵۰

﴿مسجد کا پانی گھر میں استعمال نہیں کرنا چاہیے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ہمارے علاقہ میں اکثر پانی کی کمی رہتی ہے، جب عام کنوؤں میں پانی ختم ہو جاتا ہے تو مسجد کے کنویں سے پانی لینے کے لئے قطاریں لگ جاتی ہیں تو کیا اس صورت میں مسجد کا پانی استعمال کرنا جائز ہے؟

﴿جواب﴾ مسجد کا پانی صرف مسجد کی ضروریات میں ہی استعمال کیا جا سکتا ہے، البتہ مسجد کی ضروریات سے پانی زائد ہو اور چندہ دہندگان بھی راضی ہوں تو مسجد کا پانی استعمال کرنے کی گنجائش ہے۔

لمافی البحر الرائق:(۵/۲۵۵،طبع سعید)

وفي التوضؤ من السقاية: اذا اتخذ عاللشرب اختلاف المشائخ فيه ولو اتخذها للتوضؤ لايجوز الشرب منه بالاجماع.

ولمافي الهندية:(۲/۲۶۵،طبع رشیدیه)

والجمل السقاية للشرب فأراد أن يتوضأ منها اختلف المشائخ فيه واذا وقف للوضوء لا يجوز الشرب منه وكل ما أعد للشرب حتى الحياض لايجوز منها التوضوء كذا في خزانة المفتيين.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: مزمل شاہ تترخیل

۲۹ جمادی الاول ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر: ۲۲۴۴

﴿مسجد میں سوال کرنے کے احکامات﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل میں کہ ایک آدمی اپنی ذات کے لئے مسجد میں بھیک مانگتا ہے، کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ نیز کوئی شخص اگر اللہ تعالیٰ کے نام پر سوال کرے تو اسکو دینا واجب ہے یا نہیں؟

مستفتی: ولی الرحمٰن لکی مروت

﴿جواب﴾ (۱) مسجد میں سوال کرنا جائز نہیں، البتہ اگر کوئی شخص انتہائی مجبور ہو اور ایسی چیز کا سوال کرے جسکے بغیر زندگی گذارنا مشکل ہو تو اس کے لئے مسجد کے اندر سوال کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے لیکن چند شرائط کے ساتھ:

(۱) سائل نمازیوں کے آگے سے نہ گذرتا ہو (۲) لوگوں کی گردنیں نہ پھلانگتا ہو (۳) لپٹ کر سوال نہ کرے اگر سائل مذکورہ شرائط کی پابندی کرے تو اسکو دینا بھی جائز ہے اور اگر پابندی نہ کرے تو اسکا مسجد میں سوال کرنا اور اسکو دینا دونوں ناجائز ہیں۔

لمافی الشامی: (۴۲/۲، طبع امدادیہ)

قوله: (ويكره التخطي للسوال الخ) قال في النهر: والمختار ان السائل ان كان لايمر بين يدي المصلي ولايتخطى الرقاب ولايسأل الحافا بل لامر لابدمنه فلابأس بالسؤال والاعطاء ومثله في البزازية وفيها: ولا يجوز الاعطاء اذا لم يكونوا على تلك الصفة المذكورة.

(۲) اللہ تعالیٰ کے نام پر بھیک مانگنا جائز نہیں ہے کیونکہ اللہ جل جلالہ کے نام کی بلندئ شان کا تقاضا یہ ہے کہ اسکے ذریعے کوئی بہت ہی بڑی چیز مثلاً جنت مانگی جائے، لہٰذا بھیک مانگنے کے لئے اس مقدس نام کو استعمال کرنا خلاف ادب ہے۔

البتہ ایمان اور اللہ تعالیٰ کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اس حقیقی محسن کے نام کا واسطہ اگر کوئی دے تو اس کو خالی واپس نہیں کرنا چاہیے کچھ دے دینا چاہیے، تاہم دینا واجب نہیں۔

لمافی الفقه الاسلامی: (۹۲۲/۲، طبع دار الفکر بیروت)

ويكره للانسان ان يسال بوجه الله تعالىٰ غير الجنة وان يمنع من سأل بالله وتشفع به "لخبر" لايسال بوجه الله الا الجنة" وخبر" من استعاذ بالله فاعيذوه ومن سألكم بالله فاعطوه" الخ

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: محمد کاشف عزیز

۱۳ صفر الخیر ۱۴۳۰ھ

فتویٰ نمبر: ۱۸۹۲

﴿بلا ضرورت مسجد میں سونا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بغیر کسی عذر کے مسجد میں سونا جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگ گرمیوں کے موسم میں مسجد میں نماز پڑھنے آتے ہیں اور روزانہ کا معمول بنا رکھا ہے کہ نماز پڑھنے کے بعد مسجد کے پنکھے چلا کر وہیں سو جاتے ہیں، مسجد کی انتظامیہ کے روکنے پر وہ لوگ ان سے کہتے ہیں کہ مسجد اللہ کا گھر ہے اس سے ہمیں نہیں روک سکتے گویا مسجد میں سونا اپنا حق واجبی سمجھتے ہیں، شریعت میں اسکا کیا حکم ہے؟ نیز تبلیغی جماعت والوں کا مسجد میں سونا کیسا ہے؟ بینوا تو جروا۔　　مستفتی: صہیب احمد

﴿جواب﴾ مسجد بے شک اللہ تعالیٰ کا گھر ہے اور عبادت کیلئے مخصوص ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص عبادت کی غرض سے مسجد میں آتا ہے تو بلا شبہ اسکو روکنا جائز نہیں ہے لیکن اگر سونے کی غرض سے ہی کوئی مسجد میں آتا ہے تو انتظامیہ کو روکنے کا حق حاصل ہے، مسجد کوئی سرائے نہیں ہے کہ لوگ اس میں سوتے رہیں، البتہ معتکف اور مسافر وغیرہ کیلئے مسجد میں سونے کی گنجائش ہے اور بہتر یہ ہے کہ کچھ دیر تک عبادت اور ذکر کر کے اعتکاف کی نیت سے مسجد میں آرام کریں۔

تبلیغی جماعت والے گھر بار چھوڑ کر دین کی اشاعت کے لئے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں نکلتے ہیں اشاعت دین کی خاطر مسجد میں آتے ہیں اور قیام بھی کرتے ہیں صرف سونے کے لئے مسجد میں نہیں آتے، اس کے علاوہ جماعت کے ساتھی اعتکاف کا بھی اہتمام کرتے ہیں، لہٰذا ان کے لئے مسجد میں سونا جائز ہے۔

لمافی الدرمع الرد:(۱/ ۶۶۱ طبع سعید) وأكل ونوم الا لمعتكف وغريب.

وفی الشامية:(قوله أكل ونوم) واذا اراد ذلك ينبغي أن ينوي الاعتكاف فيدخل ويذكر الله تعالى بقدر مانوى، أو يصلي ثم يفعل ماشاء. وكذافی الهندية:(۵/ ۳۲۱، باب آداب المساجد، طبع دارالفكر بيروت) وكذافی فتاوٰی سراجية:(ص ۷۱-۷۲، طبع سعيد)

ولمافی حلبی کبیر:(ص ۶۱۲ طبع سهيل اكيڈمی)

والنوم فيه لغير المعتكف مكروه وقيل لا بأس للغريب أن ينام فيه والأولى ان ينوي الاعتكاف ليخرج من الخلاف.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: محمد سجاد

۲۳ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ　　فتویٰ نمبر: ۲۰۵۷

﴿مسجد میں دنیاوی باتیں کرنا، گمشدہ چیز کا اعلان اور مجنون کا آنا﴾

﴿سوال﴾ مسجد میں دنیاوی باتیں کرنا اور گم شدہ چیز کے اعلان کرنے کا شریعت میں کیا حکم ہے؟ نیز مسجد میں مجنون آسکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ مساجد صرف نماز تلاوت وعظ اور ذکر اللہ کیلئے ہیں، دنیاوی امور کیلئے نہیں، مساجد میں گم شدہ چیز کے اعلان اور دنیاوی باتوں پر سخت وعید احادیث میں آئی ہے، حضرت عمرؓ نے مسجد کے کنارے پر ایک چبوترہ تعمیر کروادیا تھا کہ جسکو اشعار پڑھنا ہو یا بلند آواز سے بولنا ہو وغیرہ تو وہ چبوترہ پر چلا جائے، اسی طرح مجنون چونکہ مسجد کے آداب سے واقف نہیں ہوتا، اسلئے اسے مسجد سے دور رکھنا چاہیے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ مسجد میں گندگی پھیلادے۔

لما فی مشکوٰۃ المصابیح:(ص ۷۱، طبع سعید)

قال رسول اللہ ﷺ یاتی علی الناس زمان یکون حدیثھم فی مساجدھم فی امردنیا ھم فلاتجالسوھم فلیس للہ فیھم حاجۃ.

ولما فی مشکوٰۃ المصابیح:(ص ۶۸ طبع سعید)

عن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ ﷺ من سمع رجلا ینشد ضالۃ فی المسجد فلیقل لاردھا اللہ علیک فان المساجد لم تبن لھذا.

ولما فی الشامی:(۱/۶۵۶ طبع سعید)

ویحرم ادخال صبیان ومجانین حیث غلب تنجیسھم والافیکرہ.

وفی الشامیۃ:(قولہ ویحرم الخ)لما اخرجہ المنذری "مرفوعا جنبوا مساجدکم صبیانکم ومجانینکم وبیعکم وشرائکم ورفع أصواتکم وسل سیوفکم......الخ

ھکذا فی الشامی:(۱/۶۶۰ طبع سعید)وفی المرقاۃ:(۲/۳۸۴ طبع رشیدیہ)

ولما فی مشکوٰۃ المصابیح:(ص ۷۱ طبع سعید)

عن مالک قال بنی عمر رحبۃ فی ناحیۃ المسجد تسمی البطیحاء وقال من کان یرید ان یلغط او ینشد شعرا او یرفع صوتہ فلیخرج الی ھذہ الرحبۃ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: حبیب الوہاب سواتی عفا اللہ عنہ

۱۲ صفر الخیر ۱۴۲۹ھ　　فتویٰ نمبر: ۱۱۸۸

﴿مسجد کو ذاتی ملکیت سمجھنا غلط ہے﴾

﴿سوال﴾ جولوگ مسجد کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ مسجد ہماری ہے

اوراس میں غریب لوگوں کا کوئی اختیار نہیں ہے، اس لئے کہ ہم نے اس مسجد کو اپنی جائیداد سے خود بنایا ہے تو اس مسجد میں نماز ہوتی ہے یا نہیں؟

مستفتی: عبدالسلام صاحب سواتی

﴿جواب﴾ ایسی مسجد میں نماز بلا شبہ ہو جاتی ہے، ان لوگوں نے مسجد کی نیت سے اپنی ذاتی زمین میں ذاتی خرچے سے مسجد کی تعمیر کروائی ہے اور اذن عام کیساتھ جماعت کا بھی اس میں اہتمام کیا ہے تو اب یہ شرعی مسجد ہے، کسی کی ذاتی ملکیت نہیں رہی لیکن انتظامی امور میں اختیار انہی کا ہے کسی اور کو انتظامی امور میں دخل اندازی سے روکنے کا حق انکو حاصل ہے، البتہ نماز وعبادت سے کسی کو روکیں تو بڑا ظلم ہے۔

لمافی قوله تعالى:(سورة البقرة،آیت ۱۱۴)

ومن اظلم ممن منع مساجدالله ان يذكر فيها اسمه......الأية.

ولمافي التنوير مع الدر:(۴/۳۴۸،طبع سعيد)

(ولا يتم)الوقف(حتى يقبض)لم يقل للمتولي لان تسليم كل شئ بمايليق به ففي المسجدبالافرازوفي غيره بنصب المتولي وبتسليمه اياه ابن كمال.

وفي الشامية:(قوله ففي المسجد بالافراز)اى والصلاة فيه.

ولمافي التنوير مع الدر:(۴/-۳۵۵-۳۵۶-۳۵۷،طبع سعيد)

(ويزول ملكه عن المسجدو المصلى)بالفعل و(بقوله جعلته مسجدا)عندالثاني(وشرط محمد)والامام(الصلاة فيه)بجماعة وقيل:يكفي واحدوجعله في الخانية ظاهرالرواية.

وفي الشامية:وفي القهستاني ولابدمن افرازه اى تميزه عن ملكه من جميع الوجوه فلوكان العلومسجداوالسفل حوانيت اوبالعكس لايزول ملكه لتعلق حق العبدبه كمافي الكافي.....(قوله وشرط محمدوالامام الصلاة فيه)اى مع الافرازكماعلمته واعلم ان الوقف انمااحتيج في لزومه الى القضاء عندالامام لان لفظه لاينبئ عن الاخراج عن الملك بل عن الابقاء فيه لتحصل الغلة على ملكه فيتصدق بهابخلاف قوله جعلته مسجدافانه لاينبئ عن ذالك ليحتاج الى القضاء بزواله فاذااذن بالصلاة فيه قضى العرف بزواله عن ملكه ومقتضى هذاانه لايحتاج الى قوله وقفت ونحوه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: حبیب الوہاب سواتی

۱۴۲۹/۳/۲۸ھ فتویٰ نمبر: ۱۲۶۶

﴿مغصوبہ زمین پر مسجد بنا کر نماز پڑھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے زمین

غصب کی اور اسکا کچھ حصہ مسجد کیلئے وقف کر کے مسجد بنائی آیا یہ شرعی مسجد ہے یا نہیں؟ اور اسمیں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: اکبر محمد بازخیلہ سواتی

﴿جواب﴾ زمین واقعی اگر غصب کی ہے اور اصل مالک کو اس کا عوض وغیرہ بھی کچھ نہ دیا ہو تو ایسی زمین میں مسجد بنانا فضول ہے یہ شرعی مسجد نہیں کہلائیگی، اس میں نماز اگر چہ ہو جائیگی لیکن مکروہ ہوگی۔

لمافی الدرمع الرد:(۱/۳۷۹-۳۸۰-۳۸۱طبع سعید)

وکذاتکره فی اماکن کفوق الکعبة .....وارض مغصوبة اوللغیر......الخ.

وفی الشامیة:وفی الشرح المنیة للحلبی:بنی مسجدافی ارض غصب لاباس بالصلوة فیه.وفی الواقعات بنی مسجداعلی سور المدینة لاینبغی أن یصلی فیه لأنه حق العامة فلم یخلص لله تعالی کالمبنی فی أرض مغصوبة اھ.

ولمافی الهندیة:(۲/۳۵۳،طبع رشیدیه)

ومنها الملک وقت الوقف حتی لو غصب أرضافوقفهاثم اشتراهامن مالکهاودفع الثمن الیه أوصالح علی مال دفعه الیه لاتکون وقفا.هکذافی البحر:(۵/۱۸۸،سعید)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: حبیب الوہاب سواتی عفااللہ عنہ

۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر:۱۵۱۴

﴿مسجد کی نا قابل استعمال اور بے قیمت اشیاء کو ذاتی استعمال میں لانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ مسجد کی پرانی اشیاء یعنی دریاں اور ٹوپیاں وغیرہ جو مسجد میں وقف کی گئی ہوں، جب وہ پرانی ہو جائیں اور قابل استعمال نہ رہیں اور کباڑ وغیرہ میں بھی انکی کوئی قیمت نہ لگ سکے تو کیا کوئی شخص ایسی اشیاء کو اپنے کسی کام میں لائے تو یہ جائز ہے؟ مستفتی: واجد شاہ

﴿جواب﴾ مسجد کی ایسی اشیاء جو بالکل پرانی ہوگئی ہوں اور انکی کوئی قیمت نہیں لگتی ہو جن کو عام طور پر پھینک دیا جاتا ہے اگر کوئی شخص اپنے کام میں لائے تو یہ جائز ہے بشرطیکہ انتظامیہ کی اجازت سے ہو یا مسجد والوں نے باہر پھینک دی ہوں۔

لمافی البحر:(۵/۲۵۱،طبع سعید)

واذارأی حشیش المسجدفرفعه انسان جازان لم یکن له قیمةفان کان له ادنی قیمة لایأخذه الابعدالشراء من المتولی اوالقاضی اواهل المسجداوالامام وکذاالجنائزالمتق اوالحصرالمتقطعةوالمنابروالقنادیل المکسرة.

ولما فی الهندیة:(۲/۲۵۹،طبع رشیدیه)

حشیش المسجد اذا اخرج ایام الربیع ان لم یکن له قیمة لا بأس بطرحه خارج المسجد ولمن رفعه ان ینتفع کذا فی الواقعات الحسامی.

ولما فی التاتارخانیة:(۵/۵۷۷،طبع قدیمی)

بواری المسجد اذا خلقت فصارت لا ینتفع بها فاراد الذی بسطها ان یاخذها ویتصدق بها ویشتری مکانها فله ذالک وان کان هو غائبا فاراد اهل المحلة ان یاخذوا البواری فتصدقوا بها بعد ما خلقت لم یکن لهم ذالک ان کان لها قیمة وان لم یکن لها قیمة فلا بأس بذلک

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم: افتخار احمد کلکتی

۱۲/۲/۱۴۳۰ھ　　　فتویٰ نمبر: ۱۹۳۷

﴿مساجد میں فوتگی کا اعلان کرنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام دریں مسئلہ کہ ہمارے علاقے میں جب کسی کی فوتگی ہوجاتی ہے تو مساجد میں اعلانات کئے جاتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ نماز جنازہ میں شریک ہوں، پوچھنا یہ ہے کہ شرعاً اس طرح کرنا کیسا ہے؟　　　مستفتی: اُویس لانڈھی

﴿جواب﴾ اعلان وغیرہ سے میت کی شہرت یا دکھلاوا مقصود نہ ہو تو شرعاً اعلان میں کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ صرف اس مقصد کے لئے اعلان کرنا کہ نماز جنازہ میں زیادہ سے زیادہ لوگ شریک ہوں جائز بلکہ مستحسن بھی ہے، حدیث شریف میں وارد ہے کہ میت پر نماز جنازہ پڑھنے والوں کی شفاعت قبول کی جاتی ہے اور میت کو نفع پہنچتا ہے۔

لما فی حلبی کبیر:(ص۵۱۹-۵۲۰،طبع نعمانیه)

ولا بأس بالاذن فی صلوٰة الجنازة وفی بعض النسخ لا بأس بالأذان ای الاعلام وهو ان یعلم بعضهم بعضا لیقضوا حقه کذا فی الهدایة

قال ابن الهمام سیما اذا کانت الجنازة یتبرك بها ولینتفع المیت بکثرتهم ففی صحیح مسلم وسنن الترمذی والنسائی عن عائشةؓ انه علیه الصلوٰة والسلام قال: ما من میت یصلی علیه امة من الناس یبلغون ماة کلهم یشفعون فیه الا شفعوا فیه وکره بعضهم ان ینادی علیه فی الأزقة والاسواق لانه یشبه نعی الجاهلیة والاصح انه لا یکره اذا لم یکن مع تنویه بذکره وتفخیم بل یقول العبد الفقیر الی الله تعالیٰ فلان بن

فلان الفلاني فان نعى الجاهلية ما كان فيه الدوران مع الضجيج وهكذا في الشامي:(۲/۲۳۹،طبع ایچ ایم سعید)

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ظہور احمد شمس

۱۰ رجب ۱۴۲۹ھ — فتوی نمبر: ۱۶۵۰

﴿مسجد میں اگر بتی جلانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ مسجد میں اگر بتی جلانا کیسا ہے؟

﴿جواب﴾ مسجد اللہ کا گھر ہے، اسکو پاک وصاف اور معطر رکھنے کا حکم متعدد احادیث میں آیا ہے، لہٰذا مسجد میں لوبان یا عود کی دھونی دینا مستحب ہے اور شرعاً یہ مطلوب بھی ہے، اس مقصد کیلئے اگر بتی اگر جلائی جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ وہ پاک چیز سے بنائی گئی ہو، ہاں یہ اہتمام کیا جائے کہ اس کی راکھ مسجد کے فرش پر گرنے نہ پائے۔

لما في المرقاة شرح المشكوٰة:(۲/۲۹۳،طبع رشیدیہ)

عن عائشةؓ قالت:أمر رسول الله ﷺ ببناء المسجد في الدور،وأن ينظف ويطيب.قال ابن حجر وبه يعلم انه يستحب تجمير المسجد بالبخور خلافا لمالك حيث كرهه فقد كان عبدالله يجمر المسجد اذا قعد عمر على المنبر واستحب بعض السلف تخليق المسجد بالزعفران والطيب وروى عنه عليه السلام فعله.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالرزاق عفا اللہ عنہ

۱۳ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتوی نمبر: ۱۶۸۰

﴿مسجد میں بھیک مانگنا اور مانگنے والوں کو صدقات دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ بعض لوگ مسجد میں بھیک مانگتے ہیں، کیا مسجد میں سوال کرنے کی گنجائش ہے؟ نیز ان بھکاریوں کو صدقات وغیرہ دینا شرعاً کیسا ہے؟

﴿جواب﴾ جس شخص کے پاس ایک دن کیلئے اتنی خوراک موجود ہو جس سے اسکی جان بچ سکے، اسی طرح تندرست جوان آدمی جو کمانے پر قدرت رکھتا ہو اور کمانے کا موقع بھی اسکو ملے تو ایسے آدمی کیلئے سوال کرنا جائز نہیں ہے اور معلوم ہو تو اسکو دینا بھی مناسب نہیں ہے بعض روایات

میں ایسے شخص کو دینا گناہ قرار دیا ہے لیکن حقیقی ضرورت منداور اپنے کو محتاج ظاہر کرنے والے پیشہ ور بھیک مانگنے والوں میں فرق کرنا بڑا مشکل ہو گیا ہے۔

اسلئے مفتی بہ قول کے مطابق کسی بھی مانگنے والے کو دینا ثواب سے خالی نہیں ہے توفیق ہو تو دے دینا چاہیے اور نہ دینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

رہی بات مسجد کے اندر سوال کرنے کی تو واقعی محتاج کیلئے مسجد کے اندر بھی سوال کرنے کی گنجائش ہے بشرطیکہ نمازیوں کی عبادت میں خلل کا باعث نہ ہو۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲/۲۰۵-۲۰۶،طبع امدادیه)

(ولا)يحل ان(يسأل)شيئامن القوت(من له قوت يومه)بالفعل اوبالقوة كالصحيح المكتسب ويأثم معطيه ان علم بحاله لاعانته على المحرم.....(جاز)ولومحتاجا.

وفي الشامية:قوله:(ولايحل ان يسأل الخ)قيدبالسوال.....وقال:هواوسع وبه يفتي.قوله:(كالصحيح المكتسب)لانه قادربصحته واكتسابه على قوت اليوم،بحر.قوله:(ويأثم معطيه الخ)قال الأكمل في شرح المشارق:.....وأنت خبيربان الظاهران مرادهم ان الدفع الى مثل هذايدعواالى السوال على الوجه المذكورو بالمنع ربمايتوب عن مثل ذلك فليتامل اه.

ولمافي الدرالمختار:(۲/۴۳۳،طبع امدادیه)

ويحرم فيه السوال،ويكره الاعطاء مطلقا،وقيل:ان تخطى.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:عزیز الرحمٰن چارسدوی عفا اللہ عنہ

۲۳ محرم الحرام ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۱۳۱

﴿پاگل کو مسجد میں آنے سے روکنا چاہیے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ:ہمارے گاؤں میں ایک پاگل (مجنون) لڑکا ہے اور وہ کبھی کبھار نماز پڑھنے مسجد آجاتا ہے، کپڑے میلے کچیلے اور گندے ہوتے ہیں، وضو کرنے کے بعد اسکے میلے کچیلے کپڑوں سے پانی مسجد کے فرش پر ٹپکتا رہتا ہے جس سے مسجد کی پاکی کے تلویث ہونے کا قوی اندیشہ ہے۔

پوچھنا یہ ہے کہ کیا ہم اس لڑکے کو مسجد آنے سے روک دیں؟ روکنے کی صورت میں گناہ تو نہیں ہوگا؟ برائے مہربانی شریعت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔ مستفتی:ایاز چارسدوی

﴿جواب﴾ حدیث مبارکہ میں مجنون اور بچوں کو مسجد سے روکنے کا حکم آیا ہے کیونکہ چھوٹے

بچے اور مجنون مسجد کے آداب کی رعایت نہیں کرسکتے بلکہ ان سے گندگی پھیلانے کا اندیشہ رہتا ہے جبکہ مسجد کو صاف ستھرا اور پاک رکھنے کا حکم ہے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں اسکو مسجد سے روک دینا ضروری ہے اور منع کرنے میں کسی قسم کا کوئی گناہ نہیں ہے، البتہ کوشش یہ کریں کہ اس کے گھر والے خود اس کو روک لیں، اس میں آسانی ہے اور گھر والوں کی دلجوئی بھی۔

لمافی الدر مع الرد:(۲/۴۲۹،طبع امدادیہ)

ویحرم ادخال صبیان ومجانین حیث غلب تنجیسهم،والافیکره.

وفی الشامیة:قوله:(ویحرم الخ)لما اخرجه المنذری مرفوعاً"جنبوامساجدکم صبیانکم ومجانینکم،وبیعکم وشراء کم،ورفع اصواتکم،وسل سیوفکم،واقامة حدودکم،وجمروها فی الجمع،واجعلوا علیٰ ابوابها المطاهر"بحر...."والافیکره"أی تنزیها،تأمل.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب:عزیز الرحمٰن چارسدوی عفا اللہ عنہ

۱۵ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ　　فتویٰ نمبر:۱۳۱۰

﴿مسجد کے چندہ سے قرض لینا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسجد کی اشیاء کو عاریۃً استعمال کرنے کا کیا حکم ہے؟ اگر کوئی شخص مسجد کے چندے کو بطور قرض استعمال کرے تو شرعاً یہ جائز ہے یا ناجائز؟　　مستفتی:محمد خورشید آزاد کشمیر

﴿جواب﴾ مسجد کی وہ تمام اشیاء جو مسجد پر وقف ہوں کسی اور مصرف پر خرچ کرنا تو جائز نہیں ہے، اسی طرح مسجد کے چندے کو بطور قرض ذاتی استعمال میں لانا بھی جائز نہیں ہے، البتہ چندہ دینے والے سے اجازت لیکر قرض لے سکتا ہے، لہٰذا اگر کسی شخص نے مسجد کے چندے کو ذاتی مصرف پر خرچ کیا ہو اور چندہ دینے والا بھی معلوم ہو تو اسکو وہ رقم واپس کرے یا اس سے دوبارہ اجازت لیکر مسجد پر خرچ کرے اور اگر چندہ دینے والا معلوم نہ ہو تو اپنی طرف سے اتنی رقم مسجد پر خرچ کر کے استغفار کرتا رہے۔

لمافی البحر:(۵/۲۵۰،طبع سعید)ولیس للمتولی أن یحمل سراج المسجدالی بیته.

ولمافی البزازیة علی هامش الهندیة:(۲/۸۲،طبع رشیدیه)

جمع مالالنفقة المسجدمن الناس وصرفه فی حاجة نفسه ثم أنفق مثلهالایسعه ذلک

فان عرف صاحبه بعينه رده عليه أوجدالاذن منه وان لم يعرف صاحبه بعينه استامر الحاكم مرة لرفع الاثم اما الضمان فواجب على كل حال وان بعذر يرجى فى الاستحسان أن ينجو باتفاق مثله.

ولما فى البحر:(۵/۲۵۱ طبع سعيد)

ولوجمع مالالينفقه فى بناء المسجد فأنفق بعضه فى حاجته ثم رد بدله فى نفقة المسجد لايسعه أن يفعل ذلك فاذا فعله وكان يعرف صاحبه ضمن له بدله أواستاذنه فى صرف عوضه فى المسجد.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالحکیم کشمیری عفا اللہ عنہ

۱۷صفر المظفر ۱۴۲۹ — فتویٰ نمبر: ۱۱۹۱

﴿مسجد میں دینی مجلس کے بعد کھانے کا اہتمام کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسجد میں اگر کوئی شخص اس نیت سے دعوت کا اہتمام کرے کہ احباب کو جمع کر کے ان سے دین کی بات بھی ہو جائے اور اس کے بعد سب کی ضیافت بھی مسجد میں ہو جائے تو اس قسم کی دعوت مسجد میں کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ مسجد کے آداب کی بھی پوری رعایت رکھی جاتی ہو اور اس ضیافت میں بچے بھی نہ ہوں۔

نیز دعوت میں اگر کچھ احباب ایسے بھی ہوں جو زمین پر نہ بیٹھ سکتے ہوں تو ان کیلئے مسجد میں رکھی ہوئی کرسی اور ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا کیسا ہے؟ اگر یہ سب ناجائز ہے تو رمضان المبارک میں جو افطاری کا اہتمام کیا جاتا ہے یا اس کے علاوہ کسی بھی دینی مجلس کے بعد دعوت کا اہتمام ہوتا ہے اور نکاح کے بعد جو چھوہارے تقسیم کئے جاتے ہیں انکا کیا حکم ہے؟ مستفتی: ڈاکٹر حازم

﴿جواب﴾ مساجد شعائر اسلام میں سے ہیں عبادت، ذکر اور دیگر اجتماعی دینی امور انجام دینے کیلئے ہوتی ہیں جن کا احترام ہر مسلمان پر واجب ہے۔

مذکورہ بالا اصل مقصودی اعمال کیلئے مسجد میں کوئی فرد یا جماعت آئی ہو اور کھانے کا وقت ہو تو بلا کراہت اس میں کھانا جائز ہے، محض کھانے کیلئے مسجد کو استعمال کرنا مسجد کے اصلی مقصد کے خلاف ہے، اس لئے اس سے گریز کیا جائے، ایسی صورت میں اہتمام کیساتھ اگر اعتکاف کی نیت کی جائے تو کوئی کراہت نہ ہوگی۔

البتہ مسجد کے آداب کا خیال رکھنا ہر دونوں صورتوں میں ضروری ہے ضرورت کیلئے کرسی

وغیرہ کو استعمال کرنا بھی کوئی منع نہیں ہے لیکن دعوت اگر شادی حال کا منظر پیش کرے تو اسکی ہرگز اجازت نہیں ہے اور مسجد میں نکاح کے جو چھوہارے تقسیم کئے جاتے ہیں یہ حضور ﷺ کے عمل سے ثابت ہے، نیز اس سے مسجد کی تلویث کا بھی کوئی خطرہ نہیں ہوتا، مزید یہ کہ مسجد میں نکاح کا مقصد اعلان ہوتا ہے اور یہ مقصد مسجد میں ہی اچھی طرح حاصل ہوتا ہے، اس لئے جائز ہے۔

لما في الشامي: (۲/ ۴۴۸، طبع سعید کمپنی)

واعلم: أنه كما لا يكره الأكل ونحوه في الاعتكاف الواجب فكذلك في التطوع كما في كراهية جامع الفتاوى ونصه يكره النوم والأكل في المسجد لغير المعتكف وإذا أراد ذلك ينبغي أن ينوي الاعتكاف فيدخل ويذكر الله تعالى بقدر مانوى أو يصلي ثم يفعل ماشاء. اه.

ولما في الهندية: (۵/ ۳۲۱، كتاب الكراهية، الباب الخامس في آداب المسجد، طبع)

ويكره النوم والأكل فيه لغير المعتكف وإذا أراد أن يفعل ذلك ينبغي أن ينوي الاعتكاف فيدخل ويذكر الله تعالى بقدر مانوى أو يصلي ثم يفعل ماشاء.

ولما في كنز الدقائق: (ص ۷۱، طبع قديمي) سن لبث في مسجد بصوم ونية واقله نفلاً ساعة

ولما في بدائع الصنائع: (۲/ ۱۱۷، طبع سعيد)

وقد روى ان النبي ﷺ كان يفعل ذلك في حال اعتكافه في المسجد مع ماان الأكل والشرب والنوم في المسجد في حال الاعتكاف لو منع منه لمنع من الاعتكاف ان ذلك أمر لا بد منه.

ولما في الشامي: (۱/ ۶۶۱، طبع سعيد)

(قوله وأكل ونوم الخ) وإذا أراد ذلك ينبغي أن ينوي الاعتكاف، فيدخل ويذكر الله تعالى بقدر مانوى، أو يصلي ثم يفعل ماشاء، فتاوى هندية.

ولما في الحلبي الكبيري: (ص ۶۱۲، فصل في احكام المسجد، طبع سهيل اكيڈمي)

وقيل لا باس للغريب أن ينام فيه والاولى أن ينوي الاعتكاف ليخرج من الخلاف.

ولما في المشكوة: (ص ۲۷۲، باب اعلان النكاح، طبع سعيد)

عن عائشة رضي الله عنها قالت قال رسول الله ﷺ اعلنوا هذا النكاح، واجعلوه في المساجد واضربوا عليه بالدف، رواه الترمذي.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: علی خان

۷ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۵۰۳

﴿سود کے پیسوں سے خریدی ہوئی چیز کو مسجد میں استعمال کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی جو کہ سودی

کاروبار کرتا ہے، اس نے مسجد کیلئے بیٹری اور لائٹ کا بندوبست کیا، اب اس آدمی کی دی ہوئی بیٹری کو مسجد میں استعمال کیا جاسکتا ہے کہ نہیں؟ مستفتی: شیر خان

﴿جواب﴾ مسجد کا خرچہ حلال اور طیب مال سے کرنا چاہئے حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ پاک وطیب مال ہی قبول فرماتے ہیں، البتہ بندہ اگر خود اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ میں نے حلال مال میں سے مسجد کو بیٹری دی ہے تو بلا تردد اسکی بیٹری مسجد کے استعمال میں لانا درست اور جائز ہے۔

لمافی صحیح البخاری: (۱/۱۸۹، کتاب الزکاۃ، باب الصدقۃ من کسب طیب، طبع قدیمی)

عن ابی هريرة رضی الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ من تصدق بعدل تمرة من كسب طيب ولا يقبل الله الا الطيب فان الله يتقبلها بيمينه ثم يربيها لصاحبها كما يربی احدكم فلوّه حتى تكون مثل الجبل.

ولمافی الشامی: (۱/۶۵۸، طبع سعید کمپنی)

(قوله لو بماله الحلال) قال تاج الشريعة اما لو انفق في ذلك مالا خبيثا ومالا سببه الخبيث والطيب فيكره، لأن الله تعالى لا يقبل الا الطيب فيكره تلويث بيته بما لا يقبله اه شرنبلالية.

ولمافی الأشباه والنظائر: (ص ۱۱۳ طبع قدیمی)

الثامنة: اذا كان غالب مال المهدى حلالا فلا بأس بقبول هديته وأكل ماله مالم يتبين أنه من حرام وان كان غالب ماله الحرام لا يقبلها ولا يأكل الا اذا قال: انه حلال ورثه أو استقرضه. هكذا في الهندية: (۵/۳۴۰، طبع قدیمی) وفی البزازية على هامش الهندية: (۶/۳۶۰، طبع رشیدیہ)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: علی خان

یکم صفر الخیر ۱۴۳۱ھ | فتویٰ نمبر: ۲۴۵۵

﴿مسجد کے ملبہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلّہ کی مسجد کا فرش سیمنٹ کا بنا ہوا ہے اب ارادہ ہے کہ اسکو اکھاڑ کر ماربل لگائیں تو آیا جو ملبہ فرش کا ہوگا اسکو مسجد میں دفن کردیں یا پھر باہر کسی بھی جگہ اسکو دفن کردیں؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: محمد شعبان کورنگی

﴿جواب﴾ اگر ملبہ مسجد کے کسی کام میں استعمال نہیں ہو رہا ہے تو اسکو فروخت کرکے اس رقم کو مسجد کی تعمیر وغیرہ یا دوسرے مصرف میں لاسکتے ہیں، فروخت نہ ہو تو کسی پاک جگہ ڈال دینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

لما فی الھندیۃ:(۲/۴۶۱،طبع رشیدیہ)

مسجد لہ مستغلات واوقاف اراد المتولی ان یشتری من غلۃ الوقف للمسجد دھنا او حصیرا او حشیشا او آجرا وجصا لفرش المسجد او حصی.

ولما فی قاضیخان:(ص ۱۲۸،طبع قدیمی)

وکذا لو اشتری حشیشا او قندیلا للمسجد فوقع الاستغناء عنہ..... یباع ویصرف ثمنہ الی حوائج المسجد فان استغنی عنہ ھذا المسجد یحول الی المسجد الاخر والفتوی علی قول محمدؒ.وکذا فی التنویر مع الدر:(۴/۳۵۹،طبع ایچ ایم سعید)وکذا فی التاتارخانیۃ:(۵/۵۷۷،طبع قدیمی)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:محمد زبیر اکرام

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر:۲۶۱۵

﴿ایسی تعمیر جسکے لئے مسجد کی نیت نہ کی ہو، کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ زید نے اپنی زمین پر اپنے ملازمین کے لئے ایک کمرہ بنایا تاکہ ملازمین وہاں باجماعت نماز پڑھ سکیں مگر زید نے مسجد کی نیت نہیں کی تھی، عرصہ دراز کے بعد زید اس کمرہ کو گرا کر وہاں دو کانیں تعمیر کرنا چاہتا ہے تو اسکا یہ عمل شرعاً جائز ہے؟

واضح رہے کہ مذکورہ کمرہ کافی عرصہ سے بیکار اور سنسان ہے، اسمیں اب کوئی نماز نہیں پڑھی جاتی۔

﴿جواب﴾ اگر واقعۃً مسجد کی نیت نہیں کی تھی تو اس کمرہ کا حکم مسجد کا نہیں ہے، اس جگہ کو ذاتی استعمال میں لانا جائز ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۴/۳۵۸،طبع سعید)

(کما لو جعل وسط دارہ مسجدا واذن للصلاۃ فیہ)حیث لا یکن مسجدا الا اذا شرط الطریق زیلعی.

ولما فی التاتارخانیۃ:(۵/۸۷۰،طبع قدیمی)

(وفی الملتقط الناصری)واذا بنی مسجدا لا یصیر مسجدا حتی یقر بلسانہ انہ مسجد.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:نعمان اقبال عفا اللہ عنہ

۲۵ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر:۲۶۶۶

﴿نابالغ بچوں کو مسجد میں لانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ بعض حضرات مسجدوں میں آتے وقت اپنے بچوں کو

بھی ساتھ لے آتے ہیں اور بعض اوقات یہ بچے دوسرے نمازیوں کی نماز میں خلل کا سبب بن جاتے ہیں، پوچھنا یہ ہے کہ آیا چھوٹے بچوں کو مسجدوں میں لانے کی شرعاً اجازت ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ اگر بچہ سمجھدار ہو، نماز پڑھتا ہو اور مسجد کی پاکی اور اس کے آداب کا لحاظ رکھتا ہو تو ایسے بچوں کو مسجدوں میں لانا پسندیدہ ہے، البتہ بچہ اگر نا سمجھ ہو اور دوسروں کی نماز میں خلل کا باعث ہو تو ایسے بچوں کو مسجدوں میں لانا مکروہ ہے، اس کے علاوہ ایسی عمر کے بچے کو مسجد میں لانا حرام ہے جس سے پیشاب وغیرہ کا اندیشہ ہو۔

لمافی سنن ابن ماجة:(ص ۵۴ طبع قدیمی)

قال النبی ﷺ جنبوا مساجدکم صبیانکم ومجانینکم وشرائکم وبیعکم وخصوماتکم ورفع اصواتکم واقامة حدودکم وسل سیوفکم واتخذوا علی ابوابها المطاهر وجمروها فی الجمع.

ولمافی الدرمع الرد:(۱/ ۶۵۶ طبع سعید)

ویحرم ادخال صبیان ومجانین حیث غلب تنجیسهم والا فیکره.

وفی الشامیة:(قوله ویحرم الخ) لما اخرجه المنذری "مرفوعاً جنبوا مساجدکم صبیانکم ..... الخ

ولمافی الاشباه والنظائر:(ص ۳۶۰ بحث احکام المساجد، طبع قدیمی)

ومنها حرمة ادخال الصبیان والمجانین حیث غلب تنجیسهم والافیکره.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: نعیم اقبال عفا اللہ عنہ

۲ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۶۱۱

﴿امام کیلئے مسجد کی چیز باہر استعمال کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ ایک آدمی نے مسجد کے نام پر جائے نماز وقف کر دی تو آیا اس جائے نماز کو امام صاحب اپنے کمرے میں ذاتی طور پر استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟ مستفتی: محمد عارف کراچی

﴿جواب﴾ مسجد کی چیز کو مسجد سے باہر استعمال کرنا جائز نہیں ہے، لہٰذا امام صاحب کا کمرہ اگر مسجد کا حصہ نہیں ہے تو مسجد کی جائے نماز وغیرہ اسمیں استعمال کرنا جائز نہیں ہے، البتہ وقف کرنے والے نے وقف کرتے وقت اسکی اجازت دی ہو تو اسکی گنجائش ہے۔

لمافی الهندیة:(۲/ ۴۶۲ طبع رشیدیه)

متولی المسجد لیس له ان یحمل سراج المسجد الی بیته وله ان یحمله من البیت الی المسجد

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: احمد علی عفی عنہ

۲۶ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۵۵۴

﴿کتاب الشرکۃ والمضاربۃ﴾

﴿کسی شریک کو بطور ہبہ ملنے والی چیز میں دوسرے شرکاء کا حق نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دو بھائی خالد اور حامد بمع اپنے اہل وعیال کے ایک ساتھ رہتے ہیں جنکی اولاد بھی ہیں جو کہ کما بھی رہے ہیں اور ان سب کا کھانا پینا اور ہر قسم کے اخراجات سب مشترک ہیں، اب خالد کی بیوی کو اسکے والد نے ایک گائے ہدیہ میں دی اور گائے سے فائدہ سب مشترک طور پر حاصل کرتے ہیں اور گائے کو چارہ وغیرہ بھی سب کھلاتے ہیں۔

پوچھنا یہ ہے کہ اس گائے پر خالد کی بیوی کی ملکیت ہوگی یا اور دوسرے معاملات کی طرح گائے بھی سب کی مشترک ملکیت ہوگی؟ اور اسی طرح اس گائے سے پیدا ہونے والے بچھڑے کا کیا حکم ہے؟ وہ کس کی ملکیت ہے؟

مستفتی: قاری محمد فیاض دہلی کالونی

﴿جواب﴾ خالد کی بیوی کو اس کے والد نے بطور ھبہ گائے دی ہے تو یہ اسی کی ذاتی ملکیت ہے اور اس گائے کے بچھڑے کی مالک بھی صرف خالد کی بیوی ہے، خالد سمیت گھر کا کوئی دوسرا فرد گائے اور اسکے بچھڑے میں حصہ دار نہیں ہے، خالد کی بیوی کی اجازت سے گائے سے فائدہ مشترک طور پر حاصل کرنے سے یا مشترک طور پر اسکے چارہ کا خرچہ برداشت کرنے سے دیگر افراد گائے یا اسکے بچھڑے میں شریک قرار نہیں پاتے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۱۸۸/۵، طبع سعید)

(و)شرائط صحتها(فی الموهوب ان یکون مقبوضا غیر مشاع غیر مشغول)----حکمها ثبوت الملک للموهوب له غیر لازم)

ولمافی قاضیخان:(۱۵۰/۲، فصل فی هبة الوالد لولده، طبع قدیمی)

رجل اتخذ ثیابا لولده الصغیر ثم اراد ان یدفع الی ولد له آخر لم یکن له ذلک لانه لما اتخذ ثوبا لولده الاول صار ملکا للاول بحکم العرف فلا یملک الدفع الی غیره.

ولمافی الشامی:(۶۸۹/۵، طبع سعید کمپنی)

اتخذ لولده الصغیر ثوبا ملکه وکذا الکبیر بالتسلیم بزازیة..... اتخذ لولده ثیابا لیس له ان یدفعها الی غیره

ولمافی الشامی:(۲۷۰/۴، طبع سعید)

[تنبیه] افاد انه لو انفق الملتقط من ماله فهو متبرع الا اذا أذن له القاضی بشرط الرجوع.

ولما فی التنویر مع الدر:(۲/۲۸۱،طبع سعید)

(ولو)کان الالتقاط(فی الصحراء)ان ظن انها ضالة حاوی(وهوفی الانفاق علی اللقیط واللقطة متبرع)لقصورولایته(الااذاقال له قاض انفق لترجع)فلولم یذکرالرجوع لم یکن دینافی الأصح.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب :علی خان

۲۰ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ فتوی نمبر:۲۶۳۵

﴿باپ اور بیٹوں کے درمیان مشترکہ تجارت کی ایک صورت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام کہ ہم سات بھائی ہیں والد صاحب سے ہمیں میراث میں کچھ ملا نہیں بلکہ ہم ساتوں نے ملکر ایک تجارت شروع کی ان میں سے بعض بھائیوں کے بیٹے نہ صرف یہ کہ اپنے اپنے والد کا ہاتھ بٹھاتے رہے بلکہ دیگر چچاؤں کیطرح کام کرتے رہے شرع متین کی رو سے بھائیوں کے ساتھ انکے بیٹوں کو بھی حصہ ملیگا یا نہیں؟ سائل: مطیع اللہ

﴿جواب﴾ ساتوں بھائیوں نے ملکر اپنے ذاتی مشترکہ سرمایہ سے یہ تجارت اگر شروع کی تھی اور بھتیجوں کا ذاتی سرمایہ شامل نہیں تھا تو یہ پورا کاروبار صرف بھائیوں کا مشترک ہے بھتیجوں کا مستقل حصہ اس میں نہیں ہے اگر چہ چچاؤں کیطرح وہ کام کررہے تھے، البتہ چچاؤں کو چاہیے کہ اپنے بھتیجوں کو بھی محنت کا کچھ صلہ دیں تاکہ انکی حوصلہ افزائی ہو اور چچاؤں کیلئے باعث اجر ہو۔

لمافی الفتاوی الخیریة التی بهامش الفتاوی الحامدية:(۲/۹۲،طبع حقانیه)

سُئل فی رجل مات عن ابن کبیروابنین صغیرین لاعن ترکة فرباهماالکبیرونشا فی خدمته ومن جملة عائلته مع ابنه المقارب لهمافی السن وحصلوا جمیعابالکسب والعمل مالاولم یکن لهم مال واختلفوافیه فالکبیریدعیه کله لنفسه وانهم کانوا معینین له بالعمل وابنه یدعی رُبعه بعمله واخواه یدعیان ثُلُثیه بعملهماوان ابنه لا حصة له معهمالکونه معیناوالده فماالحکم فی ذلک(اجاب)ان ثبت کون ابنه واخویه عائلة علیه وامرهم فی کل مایفعلونه الیه وهم معینون له فالمال کله له والقول قوله فیمالدیه بیمینه ولیتق الله فالجزاء امامه وبین یدیه وان لم یکونوابهذا الوصف بل کان کل مستقلابنفسه واشترکوافی الاعمال فهوبین الاربعة سویة بلا اشکال وان کان ابنه فقط هوالمعین والاخوة الثلاثة بانفسهم مستقلون فهوبینهم الثلاثابیقین والحکم دائرمع علته باجماع اهل الدین الحاملین لحکمته.

ولمافی الفتاوی الخیریة التی بهامش الفتاوی الحامدية:(۲/۹۲،طبع حقانیه)

واماقول علمائناأب وابن یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لهماشئ ثم اجتمع لهما

مال يكون كله للاب اذاكان الابن فى عياله فهومشروط كمايعلم من عباراتهم بشروط منهااتحادالصنعة وعدم مال سابق لهماوكون الابن فى عيال ابيه فاذاعدم واحد منها لايكون كسب الابن للاب وانظرالى ماعللوابه المسئلة من قولهم لان الابن اذاكان فى عيال الاب يكون معيناله فيمايصنع فمدارالحكم على ثبوت كونه معينا له فيه.

ولمافى تنقيح الحامدية:(۱/۹۵،طبع حقانيه)

ذكرشيخ الاسلام جلال الدينؒ فى اب وابن اكتسباولم يكن لهمامال فاجتمع لهمامن الكسب اموال الكل للاب لان الابن اذاكان فى عياله فهومعين له الاترى انه لو غرس شجرة فهى للاب وكذاالحكم فى الزوجين.ومثله فى الشامية:(۴/۳۲۵،طبع سعيد)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: عبیداللہ عابد غفرلہ ولوالدیہ

یکم ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۱۲۱

﴿ گاڑی، جائیداداور سامان وغیرہ سے شرکت کرنا جائز ہے یا نہیں ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل جب کوئی کمپنی وغیرہ قائم ہوتی ہے تو اس پر کروڑوں اور اربوں روپے لگتے ہیں، بعض اوقات کمپنی کے قیام میں شرکت کرنے والے نقد مال کے علاوہ اپنی گاڑی، جائیداد وغیرہ بھی شرکت کے لئے دیتے ہیں۔

پوچھنا یہ ہے کہ نقد مال کے علاوہ سامان، گاڑی یا جائیداد وغیرہ سے بھی شرکت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ گاڑی، جائیداد اسی طرح دیگر متعین اشیاء کے مالکان ''اگر الگ الگ ہیں'' تو ایسی اشیاء میں شرکت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک ان چیزوں کو مالکانہ طور پر مشترک نہ قرار دیا جائے، جس کی صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جن مالکان کے پاس ایسی اشیاء ہوں اور دوسروں کے پاس نقد روپے تو ایسی اشیاء کی قیمت لگا کر نقد شمار کیا جائے اور اسی نسبت سے کمپنی میں شریک قرار دیا جائے یا ہر ایک شریک اپنے سامان کا ایک حصہ مثلاً آدھا یا تہائی اپنے دیگر شرکاء کے سامان کے عوض فروخت کرے تاکہ تمام شرکاء سامان میں حصہ دار بن جائیں، اس طرح یہ اشیاء کمپنی کا حصہ ہو جائے گا اور تمام شرکاء ان کے مالک ہو جائیں گے۔

لما فى الهنديه :۲/۳۰۷،طبع رشيديه

والحيلة فى جواز الشركة فى العروض وكل ما يتعين بالتعيين ان يبيع كل واحد منهما نصف ماله بنصف مال صاحبه حتى يصير مال كل واحد منهما نصفين وتحصل شركة ملك بينهما ثم يعقدان بعد ذلك عقد الشركة فيجوز بلا خلاف كذا فى البدائع

......وکذالک اذاکان لاحدهما دراهم وللاخر عروض ينبغي ان يبيع صاحب العروض نصف عروضه بنصف دراهم صاحبه ويتقابضان ثم يشتركان ان شاء مفاوضة وان شاء عنانا كذا في المحيط.

ولما في البدائع :٦/٥٩،كتاب الشركة مطبع سعيد

(منها)ان يكون رأس المال من الأثمان المطلقة وهي التي لا تتعين بالتعيين في المفاوضات على كل حال وهي الدراهم والدنانير عنانا كانت الشركة اؤ مفاوضة عند عامة العلماء فلا تصح الشركة في العروض وقال مالك" هذا ليس بشرط وتصح الشركة في العروض والصحيح قول العامة ،لان معنى الوكالة من لوازم الشركة والوكالة التي يتضمنها الشركة لا تصح في العروض وتصح في الدراهم والدنانير ......ولو كان من احدهما دراهم ومن الاخر عروض بينهما ثم يعقدان عليهما عقد الشركة فيجوز والامر موكول الى تعامل الناس.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب :صادق محمد سواتی

۲۲ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ　　　　فتویٰ نمبر :۳۰۷۳

﴿مشترکہ کاروبار میں بیٹے باپ کے معاون ہوتے ہیں شریک نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حاجی عقیل محمد اور ان کے چچازاد بھائی حاجی محمد مشترک تھے جائیداد میں ،ہمارے والد صاحب حاجی عقیل محمد نے اپنے بھائی کے ساتھ جائیداد کی تقسیم کرلی ،کچھ عرصہ کے بعد حاجی محمد انتقال فرما گئے ،ان کا ایک بیٹا حاجی محمد علی رہ گئے ،حاجی عقیل محمد نے حاجی محمد علی کی والدہ یعنی حاجی محمد کے بیوہ کے ساتھ نکاح کرلیا تو انہوں نے حاجی محمد علی کو چونکہ وہ چھوٹا تھا اپنے ساتھ شریک کرلیا یعنی کام کاج میں شریک کرلیا اور خرچ وخوراک میں بھی اپنے ساتھ رکھا۔

1987ء میں مشترک طور پر کراچی میں کام شروع کیا،کام ایک ساتھ شروع کرنے والے حاجی محمد علی ،محمد اشرف ،محمد قاسم ،محمد اکبر ،محمد حسن ،کل پانچ افراد تھے ،ایک دو سال کے بعد حاجی محمد علی ہم چاروں کے مشورے سے افغانستان گئے اور وہاں گھر اور جائیداد کی ذمہ داری سنبھال لی اور ہم چار بھائی میں سے دو بھائی کبھی افغانستان میں اور کبھی کراچی میں ساتھ کام کرتے تھے اور دو بھائی کم از کم یہاں کراچی میں کام کرتے تھے۔

تقریباً 1996ء میں افغانستان میں ایک زمین خریدلی ،پھر ایک دو سال بعد اور زمین

خرید لی، اس طرح چند بار زمین خرید لی، یہ تمام زمین کراچی کے کاروبار میں کمائی سے خرید لی ،اس وقت تک صرف یہی پانچ افراد مشترک کام کرتے تھے،تقریباً1999ء میں حاجی محمد علی کا بیٹا نادر اور پھر ایک سال بعد تقریباً2000ء میں دوسرا بیٹا عبدالقادر بھی کراچی میں کام کا ساتھ دے رہے تھے ،2004ء میں ایک مکان کراچی کے کام کی آمدن سے خریدا، پھر 2005ء میں ایک دوکان خریدی۔

2007ء حاجی محمد علی کے دو بیٹے رسول خان، محمد حضرت اور محمد اشرف کا بیٹا محمد اصغر بھی کام کرتے تھے،2009ء میں مزید ایک دوکان خرید لی، پھر 2012ء میں ایک دوکان مزید اس مشترکہ کام سے خرید لیا، براہ کرم مذکورہ بالا جائیداد اگر تقسیم کرنا چاہیں تو تقسیم کیسے ہوگی ،شریعت مطہرہ کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

وضاحت:

(۱) سب بھائیوں کی رہائش، رہن سہن، کھانا پینا سب کچھ مشترک ہے

(۲) کام شروع کرتے وقت کوئی راس المال نہیں تھا بلکہ محنت مزدوری کر کے کمایا ہے

(۳) اسی مشترکہ کمائی سے بعض بھائیوں کی شادی بھی کی ہے

(۴) جو بیٹے بعد میں شریک ہوئے ہیں انہوں نے بھی محنت مزدوری کی ہے۔

﴿جواب﴾ کراچی میں اس کام کو شروع کرنے والے آپ پانچوں افراد اس کے مالکان ہیں ،اس مشترکہ محنت سے آپ پانچوں افراد نے افغانستان میں زمین خرید لی یا کراچی میں جائیداد بنائی ،آپ پانچوں افراد اس میں برابر کے حصہ دار ہیں، تقسیم کی صورت میں ان تمام چیزوں کے پانچ برابر حصے بنا کر ہر ایک کو اس کا حق دینا واجب ہے، بعد میں حاجی محمد علی صاحب کے بیٹوں نے بھی اس محنت میں حصہ لیا ہے لیکن باپ کے ساتھ معاون شمار ہوتے ہیں، ان کا مستقل الگ کوئی حصہ نہیں بنتا، البتہ بعد میں اگر باقاعدہ متفقہ اس طرح کا کوئی معاہدہ کیا ہو کہ حاجی محمد علی صاحب یا کسی اور شریک کے بیٹے بھی اگر باقاعدہ محنت کریں گے تو ان کو بھی مستقل شریک کی حیثیت دیں گے تو ایسی صورت میں بیٹوں کی بھی شریک کی حیثیت ہوگی ،ورنہ نہیں، ہاں تمام شرکاء بخوشی ان کا بھی کچھ حصہ کرلیں تو بہتر ہے، احسان شمار ہوگا۔

لما فی رد المحتار، کتاب الشرکۃ، باب: الشرکۃ الفاسدۃ، ۳۲۵/۴، طبع: سعید

"تنبیہ: یؤخذ من ھذا ما افتی بہ فی الخیریۃ فی زوج امرأۃ وابنھا اجتمعا فی دار واحدۃ واخذ کل منھما یکتسب علی حدۃ ویجمعان کسبھما ولا یعلم التفاوت بینھما ولا التساوی ولا التمییز فاجاب بینھما سویۃ وکذا لو اجتمع اخوۃ یعملون فی ترکۃ ابیھم ونما المال فھو بینھم سویۃ ولو اختلفوا فی العمل والرأی".

ولما فی تنقیح الحامدیۃ، ۹۵/۱، طبع: المکتبۃ الحقانیۃ

"(سئل) فی اخوۃ خمسۃ سعیھم وکسبھم واحد وعائلتھم واحدۃ حصلوا بسعیھم وکسبھم اموالاً فھل تکون الاموال المذکورۃ مشترکۃ بینھم اخماسا (الجواب) نعم اذ کل واحد منھم یعمل لنفسہ واخوتہ علی وجہ الشرکۃ واجاب الخیر الرملی بقولہ: ھو بینھما سویۃ حیث لا یمیز کسب ھذا من کسب ھذا ولا یختص احدھما بہ ولا بزیادۃ علی لآخر اذ للتفاوت ساقط لملتقطی السنابل اذا اختلطا ما التقطا".

ولما فی تنقیح الحامدیۃ، ۱۷/۲

"واما قول علمائنا اب وابن یکتسبان فی صنعۃ واحدۃ ولم یکن لھما شئ ثم اجتمع لھما مال یکون کلہ للاب اذا کان الابن فی عیالہ فھو مشروط کما یعلم من عباراتھم بشروط منھا اتحاد الصنعۃ وعدم مال سابق لھما وکون الابن فی عیال ابیہ فاذا عدم واحد منھا لا یکون کسب الابن للاب وانظر الی ما عللوا بہ المسئلۃ من قولھم لان الابن اذا کان فی عیال الاب ویکون معینا لہ فیما یضع فمدار الحکم علی ثبوت کونہ معینا لہ فیہ فاعلم ذالک".

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: تکمیل الدین گلگتی

۲۸ صفر الخیر ۱۴۳۴ھ — فتوی نمبر: ۳۵۶۰

﴿شرکۃ الوجوہ کی ایک صورت کا بیان﴾

﴿سوال﴾ جناب مفتی صاحب السلام علیکم آپ سے فتوی درکار ہے سوال مندرجہ ذیل ہے:

آج سے تقریباً ۳۳ سال قبل میں اپنے بھائی کی دوکان پر بطور سیلز مین کام کرتا تھا ایک موقع پر انہوں نے خشک دودھ کی بکنگ کرانے پر (جو میں نے کرائی) یہ طے کیا کہ اس میں جتنا نفع ہوگا وہ برابر تقسیم ہوگا مگر انہوں نے ۲۸ ہزار نفع میں میرا حصہ ۱۴ ہزار جو بنتا تھا وہ نہیں دیا اور مختلف حیلے بہانے بنا کر مجھے دوکان سے فارغ کر دیا اور میرے حصے کے پیسوں سے ایک فلیٹ خرید لیا اگلے ہی سال جب میرا پہلا شناختی کارڈ بنا تو میں نے ان کی ناانصافی دیکھتے ہوئے اپنے شناختی کارڈ پر اسی گھر کا پتہ لکھوا دیا جو کہ میری حق تلفی کر کے لیا گیا تھا میں اس گھر میں ایک دن بھی نہیں رہا بلکہ اپنی ماں اور دوسرے بہن بھائیوں کے ساتھ پاکستان چوک پر رہتا رہا،

۱۹۸۸ میں میری شادی کے وقت انہوں نے دریافت کیا کہ کچھ پیسوں کی ضرورت ہے تو مجھ سے لے لو میں نے ان سے کہا کہ میں نوکری کرر ہا ہوں اگر اسوقت آپ مجھے میرا حق دے دیتے تو دکانیں مل جاتیں مگر اب بھی آپ کوئی دکان دلا دیں تو میں اپنا کاروبار شروع کر دوں گا مگر دس سال میں مہنگائی بڑھ چکی تھی انہوں نے ۱۴ ہزار دینے کا کہا مگر میں نے منع کر دیا اسکے بعد انہوں نے ذکر بھی نہیں کیا سال گزرتے گئے ابھی چند سال قبل ان کو دل کا عارضہ ہو گیا تو ہسپتال میں انجیو گرافی کے وقت مجھ سے بولے تمہارا کوئی حساب ہے تو لے لو میں نے کہا کہ اب مہنگائی کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے اب میں آپ سے مکان لوں گا اگلے ہی مہینے میں ان کا دل کا آپریشن ہوا مگر وہ ایک ہفتے تک بے ہوش رہنے کے بعد انتقال کر گئے میں خاندان میں بدنامی کے ڈر سے اپنا حق لینے کیلئے کچھ نہ بولا مگر اب بات کھل چکی ہے، ان کی فیملی ماشاء اللہ بہت صاحب حیثیت ہے انہوں نے کہا اس بارے میں ہمیں کچھ نہیں معلوم ۱۴ ہزار کا کوئی ثبوت ہے تو لے آؤ، تو میں نے ۳۰ سال پرانا شناختی کارڈ ثبوت کے طور پر پیش کر دیا جسمیں میں نے اسی گھر کا پتہ لکھوایا تھا جو میرے حصے کے پیسوں سے خریدا گیا تھا میں نے دوسرے شناختی کارڈ کے فارم میں بھی مستقل پتے کی جگہ اس فلیٹ کا پتہ لکھوایا تھا جب تصدیق کرنے والے شخص نے پوچھا کہ دو پتے کیوں لکھوار ہے ہو تو میں نے کہا کہ میرے اس فلیٹ پر قبضہ ہے تصدیق کرنے والے شخص کے شناختی کارڈ کی کاپی بھی میرے پاس موجود ہے۔

انکے چھوڑے ہوئے ترکے میں سے طارق روڈ پر دو مکانات جائیداد فیکٹری گاڑیاں مال و دولت ہر چیز موجود ہے مگر افسوس کہ میرا حق مجھے نہیں ملا، مجھے اس بات کا فتویٰ لینا ہے کہ

(۱) مجھے اپنی رقم ۱۴۰۰۰ ہزار ہی ملے گی؟

(۲) جو فلیٹ میرے حصے کی رقم سے لیا گیا تھا وہ ملے گا؟

(۳) فلیٹ کی قیمت کے برابر رقم ملے گی؟

(۴) فلیٹ ۳۰ سال رکھنے کا ہرجانہ بھی لاگو ہوگا یا نہیں؟

نوٹ: خشک دودھ پر بڑے بھائی نے کوئی پیسے نہیں لگائے بکنگ کرانے کے بعد دکانداروں سے پیسے لیکر مال اُٹھایا گیا۔

تنقیح: مستفتی نے مذکورہ نوٹ کی یہ وضاحت کی ہے کہ اس وقت ہمارے پاس پیسے نہیں ہوتے تھے لہذا ہم دکانداروں سے دودھ کی بکنگ کر کے دودھ مالکان سے اُدھار دودھ لیتے اور لاکر دکانداروں کو بیچتے اور دکانداروں سے پیسے لیکر اپنا نفع رکھ لیتے اور بقیہ پیسے دودھ مالکان کو دے دیتے۔ مستفتی: سلیم احمد E17/5 چانڈیو ولیج دہلی کالونی

﴿جواب﴾ آپ کے بڑے بھائی کا آپ کے ساتھ ملکر یہ معاملہ کہ ادھار خشک دودھ خرید کر آگے بیچیں گے اور نفع آدھا آدھا تقسیم ہوگا شرکۃ الوجوہ کہلاتا ہے، شرعاً یہ جائز کاروبار ہے اور تقسیم نفع جس طرح طے ہوا تھا اس کے مطابق ضروری ہے اور اب صاحب معاملہ آپ کے بھائی کا چونکہ انتقال ہوگیا ہے ان کی اولاد وغیرہ کو اس بات کا یقین کے درجے میں اگر علم ہے کہ چودہ ہزار کا حق آپ کا باقی ہے تو ان پر واجب ہے کہ مرحوم کے ترکے میں سے صرف چودہ ہزار آپ کو دیں اور ان لوگوں کو اگر اس بات کا علم نہیں ہے اور آپ کی بات پر یقین نہیں آرہا تو آپ اپنا حق عدالت کے سامنے دو دیندار آدمیوں کے ذریعے ثابت کریں تو ان پر واجب ہوگا اس کے بغیر حق ثابت نہ ہوگا شناختی کارڈ پر پتہ لکھوانے سے آپ کا حق (چودہ ہزار) ثابت نہ ہوگا اور نہ آپ اس مکان میں حصہ دار بن سکتے ہیں.

لما في القرآن الكريم پاره ١٥ سورة بني اسرائيل ﴿وأوفوا بالعهد ان العهد كان مسئولا﴾

لما في مشكوة المصابيح (٢٥٥/١)

عن أبي حرة عن عمه قال: قال رسول الله ﷺ ألا لا تظلموا ألا لا يحل مال امرئ الا بطيب نفس منه رواه البيهقي في شعب الايمان

ولما في تنوير الأبصار (٣٢٣/٤ طبع سعيد)

(و) أما (وجوه) هذه رابع وجوه شركة العقد (ان عقداها على ان يشتريا) نوعاً او انواعا (بوجوههما) اى بسبب وجاهتهما (ويبيعا) فما حصل بالبيع يد فعان منه ثمن ما اشتريا (بالنسية) وما بقي بينهما

ولما في الرد المحتار: (٣٢٣/٤)

(قوله اما وجوه) ويقال لها شركة المفاليس قهستاني (قوله نوعا اوانواعا) افاد انها تكون خاصة وعامة كما في النهر ولذا حذف المصنف المفعول (قوله أى بسبب وجاهتهما) أفاد وجه التسمية، لان من لا مال له لا يبيعه الناس نسيئة الا اذا كا ن له جاه ووجاهة وشرف عندهم

ولما فی الفقه الاسلامی:(۳۸۸۵/۵)

هی ان یشترك وجیهان عند الناس من غیر ان یکون لهما رأس المال علی ان یشتریا فی ذممهما بالنسیة (أی بموجل) ویبیعا بنقد بمالهما من وجاهة عند الناس فیقولا :اشترکنا علی ان نشتری بالنسیئة ونبیع بالنقدعلی ان مارزق الله سبحانه من ربح أی (من فرق الأثمان)فهوبیننا علی شرط کذا ، وسمی هذاالنوع شرکة الوجوه ،لانه لایباع بالنسیة الا لوجیه من الناس عادة وهی معرفة بالشرکة علی الذمم من غیر صنعة ولا مال

ولما فی تبیین الحقائق ج۴/ص۲۵۳)

قال (ووجوه ان اشترکا بلامال علی ان یشتریا بوجوههما ویبیعا)أی هذه شرکة الوجوه یعنی شرکة العقد شرکة الوجوه ،

قال الشارح :شرکة الوجوه هو ان یشترك الرجلان ولیس لهما مال ولا عمل علی ان یشتریا بالنسیة ویبیعا ها بالنقد ،فما حصل من الربح فهو بینهما فهو جا ئز اه اتقانی

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق اکنی

۱۷ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ — فتوی نمبر: ۳۱۵۰

﴿شرکت کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ عمر اور خالد دونوں نے بطور شرکت آدھا آدھا سرمایہ ملا کر ایک میڈیکل لیباٹری کھول دی عمر اور خالد دونوں اس لیباٹری میں کام کرتے ہیں خالد چونکہ ماہر فن ہے اور اس نے اپنی مہارت کی وجہ سے نفع میں عمر سے زیادہ حصہ مقرر کیا ہے پوچھنا یہ ہے کیا خالد کیلئے نفع سے زیادہ حصہ مقرر کرنا جائز ہے؟ ۰ الا انکہ دونوں کا سرمایہ برابر برابر ہے۔

مستفتی: گوہر الرحمٰن دیروی

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں کاروبار کے شریک افراد (پاٹنر) باہمی رضامندی سے کسی ایک کیلئے نفع میں حصہ زیادہ مقرر کریں تو شرعاً اس میں کوئی خرابی نہیں ہے جائز ہے

(لما فی البحر الرائق:(۱۷۴/۵) ،طبع سعید)

قوله (وتصح مع التساوی فی المال دون الربح وعکسه)وهو التفاضل فی المال والتساوی فی الربح وقال زفر والشافعی لا یجوز(ثم قال ولنا قوله علیه السلام الربح علی ما شرطا والوضیعة علی قدر المالین ولم یفصل ولان الربح کما یستحق بالمال یستحق بالعمل کما فی المضاربة وقد یکون أحدهما احذق وأهدی او اکثر عملا فلا یرضی بالمساواة فمست الحاجة الی التفاضل

لما فی تنویر الابصار مع رد المحتار:(۳۱۲/۳،طبع سعید)

(ومع التفاضل فی المال وعکسه)

وفی الشامیة قوله (التفاضل فی المال دون الربح)ای بان یکون لا حدهما الف وللآخر الفان مثلا واشترطا التساوی فی الربح وعکسه بان یتساوی المالان ویتفاضلان فی الربح ولکن هذا مقید با یشترط الاکثر للعامل منهما اوللاکثر عملا

ولما فی الهندیة:(۳۲۰/۲،طبع: رشیدیه)

ولو شرطا العمل علیهما جمیعا صحت الشرکة وان قل رأس مال أحدهما وکثر رأس مال الآخرواشرطا الربح بینهما علی السواء او علی التفاضل فا ن الربح بینهما علی الشرط الوضیعة أبدا علی قدرؤس اموالهما کما فی المعراج الوهاج

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سمیع الرحمٰن دیروی

۲صفرالخیر ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۴۴۲

﴿شریکین میں سے ایک مرتد ہوجائے تو شرکت باطل ہوجائے گی﴾

﴿سوال﴾ دو آدمی کاروبار میں شریک تھے ان میں سے ایک (نعوذ باللہ) مرتد ہوگیا تو کیا انکی شرکت باقی رہے گی یا باطل ہوجائے گی؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اگر قاضی نے اس شخص کے مرتد ہونے کا فیصلہ سنادیا تو شرکت باطل ہوجائے گی اوراس شخص کے مرتد ہونے کے بعد قاضی کے فیصلہ سنانے سے قبل شرکت موقوف ہوگی اگر دوبارہ اسلام لے آئے تو باقی رہے گی اوراگر مرگیا یا قتل کردیا گیا تو شرکت منقطع ہوجائے گی۔

لمافی الهندیة:(۳۳۵/۲،طبع رشیدیه)

وتبطل الشرکة بموت أحدهما علم به الشریک أولاولوکان الموت حکمیابان قضی بلحاقه مرتدافان لم یقض به توقف انقطاعهااجماعافان عادقبل الحکم بقیت وان مات أوقتل انقطعت کذافی النهر الفائق.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفااللہ عنہ

۱۹ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۴۳۰

﴿مشترک کاروبار میں ایک بھائی کا منافع پر ذاتی رقم لگانا﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم سب بھائیوں کا

مشترک کاروبار ہے یعنی ہڈی کا کارخانہ ہے، اب کارخانہ کی رقم ختم ہو گئی ہے، خام مال خریدنے کیلئے ایک بھائی ذاتی رقم دینے کیلئے تیار ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ مجھے ہر من پر دس روپے نفع دیا جائے، کیا یہ شریعت میں درست ہے یا نہیں یا اسکی کوئی جائز صورت ہے؟

﴿جواب﴾ مذکورہ معاملہ کیلئے جواز کی ایک صورت ہوسکتی ہے وہ یہ کہ اس معاملہ کو بیع مرابحہ قرار دیا جائے، لہٰذا جو بھائی ذاتی رقم خام مال لینے کیلئے دینا چاہتا ہے اور فی من دس روپیہ منافع کا مطالبہ کرتا ہے، وہ رقم اپنے پاس رکھے یا کسی بھی بھائی کو وکیل بنا کر رقم دیدے پھر وہ خود یا اس کا وکیل اس رقم سے خام مال لیتا رہے اور کمپنی کو دس روپے منافع پر فروخت کرتا رہے، اس طرح اس کیلئے منافع لینا جائز ہے کیونکہ کمپنی کو فرضی شخص قرار دیا گیا ہے۔

جیسا کہ شیخ الاسلام مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ لکھتے ہیں: اور قانون کمپنی کو ایک فرضی شخص قرار دیتا ہے جو بیع وشراء کریگا مدعی اور مدعیٰ علیہ بنے گا دائن اور مدیون ہوگا۔ (جدید معیشت ص ۳۰)

لمافی الهداية: (۳/۷۲، طبع رحمانیه)

المرابحة نقل ماملكه بالعقد الاول بالثمن الاول مع زيادة ربح.

ولمافی الهندية: (۲/۱۶۰، طبع رشیدیه)

ولو باع شيأ مرابحة ان كان الثمن مثلياكالمكيل والموزون جازالبيع اذاكان الربح معلوماسواء كان الربح من جنس الثمن الاول ام لم يكن وان لم يكن مثلياكالعروض ان باعه مرابحة ممن لايملك العرض لايجوزوان باعه ممن يملك ذلك العرض ان باعه بالعرض الذى فى يده وربح عشرة جاز.

ولمافی التنویرمع الدر: (۷/۳۴۹، طبع امدادیه ملتان)

(المرابحة) مصدر رابح وشرعا(بيع ماملكه)من العروض ولوبهبة اوارث أووصية او غصب فانه اذاثمنه(بماقام عليه وبفضل)مؤنة وان لم تكن من جنسه كاجر قصار ونحوه ثم باعه مرابحة على تلك القيمة جاز. مبسوط.

والله اعلم بالصواب: بلال

فتویٰ نمبر: ۹۳۲

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ

﴿دو بھائیوں کے درمیان مشترکہ مال کی تقسیم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ دو بھائیوں کا مال تجارت

میں مشترک تھا ان میں سے چھوٹے بھائی کا انتقال ہوگیا اور بیٹے چھوڑے لیکن وہ کم عمر تھے کسی کام کے نہیں تھے، بڑا بھائی بدستور کاروبار چلاتا رہا اور کاروبار سے جو نفع حاصل ہوتا رہا، اس سے اپنے اور چھوٹے بھائی کے بچوں کے تمام اخراجات پورا کرتا رہا، چھوٹے بھائی کے انتقال کے وقت مال تقسیم نہیں ہوا تھا، چند سالوں کے بعد بڑے بھائی کا بھی انتقال ہوگیا۔

سوال یہ ہے کہ یہ مال اور اس سے جو نفع حاصل ہوا ہے یہ دونوں بھائیوں کے ورثاء میں برابر تقسیم ہوگا یا کسی کو کم زیادہ دیا جائیگا؟ مستفتی: محمد اصغر صاحب کورنگی

﴿جواب﴾ بڑے بھائی نے مال مشترک میں تجارت کر کے جو نفع حاصل کیا ہے اور مال بڑھایا ہے وہ دونوں بھائیوں کے ورثاء پر برابر تقسیم کیا جائیگا صرف ایک بھائی کا ترکہ شمار نہیں کیا جائیگا کیونکہ بڑے بھائی کا اس مال میں تصرف کرنا اور آگے اس سے تجارت کرنا تبرع ہے۔

اسلئے کہ ایک اعتبار سے وہ بعض مال میں شریک ہے اور ایک اعتبار سے اپنے چھوٹے بھائی کے بیٹوں کی طرف سے اسمیں عامل ہے، لہٰذا برابر تقسیم ہوگا۔

لمافی کفایت المفتی:(۱۱۵/۸ طبع امدادیہ)

وعمله وتصرفه تبرعا ووجهه انه شريک فی بعضه وعامل بنت اخيه فی بعضه وهی فی عياله وليس ههنا عقد ولا غصب.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: اسرار عزیز دیروی

۱۳ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ فتوی نمبر: ۷۶۵

﴿کوئی ایک شریک ذاتی طور پر عمارت بنوائے تو اسمیں شرکت ہوگی یا نہیں؟﴾

﴿سوال﴾ دو بھائیوں کا مشترک کاروبار تھا، دونوں نے دو پلاٹ خریدے، اس تصریح کیساتھ کہ ایک پلاٹ ایک بھائی کا ہے اور دوسرا پلاٹ دوسرے بھائی کا پھر ایک بھائی کا انتقال ہوگیا، دوسرا بھائی بدستور کاروبار چلاتا رہا اور ساتھ اپنے مرحوم بھائی کی اولاد کی کفالت بھی کرتا رہا جبکہ مرحوم بھائی کی اولاد کوئی کام بھی نہیں کر رہی تھی، اس بھائی نے اپنے پلاٹ پر تعمیر بنائی اور ساتھ یہ صراحت بھی کی یہ میں نے اپنے لئے بنائی ہے۔

اب چونکہ اس بھائی کا انتقال ہوگیا ہے تو کاروبار کے بارے میں استفتاء کرنے پر معلوم ہوا کہ دونوں کے درمیان برابر تقسیم ہوگا لیکن سوال یہ ہے وہ تعمیر جو دوسرے بھائی نے اپنے پلاٹ پر

ذاتی طور تعمیر کرائی ہے اور ساتھ یہ صراحت بھی کی کہ یہ میں نے اپنے لے بنائی ہے کیا اس میں بھی شراکت ہوگی یا نہیں؟ مستفتی: محمد اصغر صاحب کورنگی

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں دوسرے بھائی نے اپنے پلاٹ پر ذاتی طور سے جو تعمیر بنائی ہے وہ اپنی ضرورت یعنی رہن سہن وغیرہ کیلئے بنائی ہے یہ شراکت سے مستثنیٰ ہے، لہٰذا پہلے بھائی کے بیٹوں کی اسمیں شرکت نہیں ہوگی بلکہ یہ دوسرے بھائی کی ذاتی ملکیت تصور کی جائیگی۔

لمافی البحر الرئق:(۱۷۰/۵،طبع سعید)

(قوله ومايشتريه كل يقع مشتركاالاطعام اهله وكسوتهم)لان مقتضى العقدالمساوة ......الامااستثناه في الكتاب وهواستحسان لانه مستثنى عن المفاوضة للضرورة فان الحاجة الراتبة معلومة الوقوع......ارادبالمستثنى ماكان من حوائجه فشمل شراء بيت للسكنى أوالاستئجارللسكنى اوللركوب لحاجته كالحج وغيره وكذاالادام......فلبس الكل على الشركة.

ولمافي الولوالجية:(۲۱/۳،طبع فاروقيه پشاور)

وما اشترى طعاما لاهله أوكسوة أومالابدمنه يكون له خاصة استحسانالشدة الحاجة اليه.

ولمافي التنويرمع الدر:(۲۰۷/۴-۲۰۸،طبع سعيد)

(فمااشتراه احدهمايقع مشتركاالاطعام أهله وكسوتهم)استحساناً لان المعلوم بدلالة الحال كالمشروط بالمقال وارادبالمستثنى ماكان من حوائجه.

وفي الشامية:(قوله ماكان من حوائجه)شمل شراء بيت للسكنى والاستئجارللسكنى أوللركوب لحاجته كالحج وغيره وكذاالادام بحر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سرار عزیز عفی عنہ

۱۰ رجب ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۱۰۷۳

﴿شرکت عنان کا ایک مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ میرے کاروباری حالات کچھ کمزور ہو گئے تھے میرے ایک بھائی برطانیہ میں ہیں، انہوں نے بڑی مقدار میں میرے پاس رقم بھیجدی اور کچھ واضح نہیں کیا کہ یہ رقم ہبہ ہے یا قرض ہے یا مضاربت کے طور پر ہے، ہاں ایک موقع پر انہوں نے کہا تھا کہ میں انشاء اللہ رقم بھیجوں گا، آپ دونوں بھائیوں کیلئے، آپ کام کریں اور بھائی کو بھی منافع میں سے دیا کریں، اللہ کرے اس رقم میں ہمارے لئے برکت ہو تو منافع کا کیا حکم ہے یعنی دوسرے بھائی کا جو حصہ

ہے وہ کتنا ہے؟ اور اصل سرمایہ کا کیا حکم ہے؟ مستفتی: شاہد بھائی ڈیفنس فیز۲

﴿جواب﴾ مذکورہ رقم کے بارے میں اگر بھائی سے معلوم کیا جائے تو معاملہ صاف ہوجائیگا کیونکہ وہ اصل مالک ہے بھائی سے اگر وضاحت ممکن نہ ہو تو یہ رقم آپ دونوں بھائیوں پر قرض ہے یعنی اصل سرمایہ کا حکم قرض کا ہے، اور مذکورہ رقم سے جو منافع حاصل ہوجائیں تو اس میں دونوں بھائی شریک ہونگے جو ساتھ ساتھ محنت بھی کرے گا اس کو زیادہ حصہ ملے گا مثلاً اگر بھائی نے دس لاکھ روپے بھیجے ہیں تو پانچ لاکھ آپ کا حصہ اور پانچ لاکھ دوسرے بھائی کا حصہ ہے اپنے پانچ لاکھ کا منافع تو آپ ہی کو ملیگا اور بھائی کے پانچ لاکھ کے منافع سے بھی آپکو محنت وعمل کا حصہ ملے گا، عرف میں اتنی رقم میں محنت کرنے والے کا منافع میں جو حصہ فیصدی مقرر ہوتا ہے وہی حصہ آپ کو ملے گا لیکن اس بات کی وضاحت دوسرے بھائی سے کرنا ضروری ہے۔

لما فی الھندیۃ:(۳۷۵/۴،طبع رشیدیہ)

رجل عندہ دراھم لغیرہ فقال لہ صاحب الدراھم اصرفھا فی حوائجک کان قرضا.....رجل قال لاخر خذ ھذا المال واغز فی سبیل اللّٰہ عزوعلا فھو قرض.

ولما فی تنقیح الحامدیۃ:(۱۸/۲،طبع حقانیہ)

دفع الی ابنہ مالا فاراد اخذہ صدق انہ دفعہ قرضا لانہ مملک دفع الیہ دراھم فقال لہ انفقھا ففعل فھو قرض کما لو قال اصرفھا الی حوائجک ولو دفع الیہ ثوبا وقال اکتس بہ ففعل یکون ھبۃ.

ولما فی الھندیۃ:(۳۲۰/۲،طبع رشیدیہ)

لو کان المال منھما فی شرکۃ العنان والعمل علی احدھما ان شرطا الربح علی قدر رؤس اموالھما جاز ویکون ربحہ لہ وضیعتہ علیہ وان شرطا الربح للعامل اکثر من رأس مالہ جاز علی الشرط ویکون مال الدافع عند العامل مضاربۃ.

ولما فی الشامی:(۳۱۲/۴،طبع سعید)

وقولہ وعکسہ :ای بان یتساوی المالان ویتفاضلان فی الربح لکن ھذا مقید بان یشترط الاکثر للعامل منھما او لاکثرھما عملا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: فرمان اللہ غفرہ اللہ

۲۱ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر:۹۱۹

﴿شرکت ومضاربت کیلئے نقدی ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید وبکر آپس میں

کولڈرنگ کا کاروبار کرنا چاہتے ہیں، اس طریقے پر کہ زید کا فریزر ہوگا اور بکر کے پیسے ہونگے اور عمل بھی بکر کریگا، نیز بجلی کا خرچہ بھی بکر ہی برداشت کریگا، اسمیں زید نے یہ شرط بھی لگائی کہ خدا نخواستہ اگر فریزر خراب ہو جائے تو اسکی مرمت کا خرچہ دونوں آدھا آدھا برداشت کرینگے بخلاف اسکے کہ اگر بکر کے پیسے ہلاک ہو جائیں تو اسکا نقصان بکر اکیلا برداشت کریگا، پوچھنا یہ ہے کہ شرعاً اس کاروبار کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ اس طریقہ سے کولڈرنگ کا مشترکہ کاروبار شرعاً صحیح نہیں ہے، یہ مضاربت کی باطل صورت ہے مضاربت صحیح ہونے کیلئے ضروری ہے کہ زید نقدی شکل میں مثلاً پیسے وغیرہ دیکر حصہ شامل کرے صرف فریزر یا اس جیسے سامان سے شریک نہیں ہوسکتا، اس کے علاوہ بھی یہ معاملہ فاسد شرائط پر مشتمل ہے، لہٰذا زید و بکر دونوں مضاربت کا صحیح معاملہ کرنا چاہیں تو زید نقد روپے بکر کو دیدے فریزر استعمال میں لانا چاہتے ہیں تو اس کا الگ کرایہ مقرر کرلیں یا باہمی رضامندی سے قیمت طے کریں اور مشترکہ کاروبار کا حصہ بنائیں، اس طرح ہر ایک کا کاروبار میں لگایا ہوا سرمایہ واضح اور معلوم ہونا ضروری ہے اور نفع کا تناسب بھی باہمی رضامندی سے طے کرلیں مگر اس میں یہ شرط ہے کہ جسکا سرمایہ کم ہو اور کاروبار میں اسکے ذمہ کوئی محنت بھی نہ ہو تو اس کے سرمایہ کے تناسب سے زیادہ نفع اس کیلئے مقرر نہ ہو، ورنہ جائز نہ ہوگا اور جو محنت کرتا ہے اسکا سرمایہ اگرچہ کم لگا ہے سرمایہ کے تناسب سے زیادہ نفع بھی لے سکتا ہے۔

مثلاً زید نے بیس فیصد سرمایہ بکر کو دیدیا اور بکر نے اپنی طرف سے مزید اسی فیصد سرمایہ اس میں شامل کردیا تو زید کیلئے بیس فیصد منافع سے زیادہ طے کرنا غلط ہے، اس طرح دونوں نقصان میں بھی شریک ہونگے اور نقصان ہر ایک کو سرمایہ کی نسبت سے برداشت کرنا ہوگا۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲۸۱/۶، طبع امدادیه)

(ولاتصح مفاوضة وعنان بغير النقدين والفلوس النافقة والتبر والنقرة) أى ذهب (ان جرى) ....(التعامل بهما وصحت بعرض ان باع كل منهما نصف عرضه بنصف عرض الآخر ثم عقداها)

ولمافی الشامی:(۲۷۵/۶، طبع امدادیه)

ثم يقول: فما كان من ربح فهو بينهما على قدر رؤس اموالهما وما كان من وضيعة أو تبعة فكذلك، ولا خلاف ان اشتراط الوضيعة بخلاف قدر راس المال باطل واشتراط الربح

متفاوتاً عندنا صحیح.

ولمافی البحر:(۵/۱۶۷،طبع سعید)

وقوله ولا تصح مفاوضة وعنان بغير النقدين والتبر والفلوس وهكذا في التاتارخانية.

ولما في التنوير مع الدر:(۴/۳۱۱-۳۱۲،طبع سعید)

(و)لذا(تصح مع التفاضل في المال دون الربح وعكسه الخ)

وفي الشامية:(قوله:ومع التفاضل في المال دون الربح)أي بأن يكون لأحدهما ألف وللآخر ألفان مثلا واشترطا التساوي في الربح ،قوله:وعكسه،أي بأن يتساوى المالان ويتفاضلا في الربح لكن هذا مقيد بأن يشترط الأكثر للعامل منهما أو أكثرهما عملاً أما لو شرطاه للقاعد أو لأقلهما عملاً فلا يجوز الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد احمد عفی عنہ

۲۲ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۵۰۵

﴿باپ اور بیٹوں کی مشترک کمائی باپ کی ملکیت ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ زید کاروبار کر رہا تھا اور اسکے دو بیٹے باپ کیساتھ کاروبار میں لگ گئے کچھ مدت کے بعد باپ یعنی زید نے اس کاروبار سے کچھ رقم جمع کرلی اور زید کا ایک نابالغ بیٹا بھی تھا جو اب بالغ ہوگیا ہے لیکن اس نے کچھ کمایا نہیں ہے۔

اب اگر باپ جمع کردہ رقم تینوں بیٹوں میں برابر سرابر تقسیم کرنا چاہے تو یہ جائز ہوگا یا نہیں؟ اور تیسرے بیٹے (جس نے کچھ کمایا نہیں ہے) کا اس رقم میں کچھ حق بنتا ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ زید کا کاروبار ہو اور بیٹے اس کیساتھ کاروبار میں لگ گئے ہوں تو اس صورت میں باپ اور بیٹوں کی مشترک کمائی سے جو بھی حاصل ہوجائے وہ سب باپ کی ملکیت شمار ہوگی، لہٰذا باپ اپنے مال میں جس طرح چاہے تصرف کرسکتا ہے، زندگی میں مال تقسیم کرنا ہو تو تمام اولاد کو برابر دینا چاہیے یہاں تک کہ بیٹیوں کو بھی لڑکوں کے برابر حصہ دینا چاہیے تاہم کسی کو کم یا زیادہ دینا چاہے تو اس کا بھی انہیں اختیار ہے لیکن بیٹیوں کو قانون میراث میں مقررہ حصہ سے کم دینا گناہ ہے اور کم یا زیادہ دینے میں کسی کو تکلیف دینا مقصود نہ ہو ورنہ یہ صورت بھی گناہ کی ہے۔

لمافی الشامی:(۴/۳۲۵،طبع ایچ ایم سعید)

الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شئ فالكسب كله للأب ان كان الابن في عياله لكونه معينا له ألا ترى لو غرس شجرة تكون للأب..... وفي الخانية زوج

بنيه الخمسة فى داره وكلهم فى عياله واختلفوا فى المتاع فهو للأب وللبنين الثياب التى عليهم لا غير.

ولما فى الفتاوى الهندية:(۲/۳۲۹،طبع رشيديه كوئٹه)

أب وابن يكتسبان فى صنعة واحدة ولم يكن لهما شئ فالكسب كله للأب اذا كان الابن فى عيال الأب لكونه معيناله ألاترى انه لوغرس شجرة تكون للأب.

ولما فى الفتاوى الهندية:(۴/۳۹۱،طبع رشيديه كوئٹه)

ولووهب رجل شيئا لاولاده فى الصحة واراد تفضيل البعض على البعض فى ذلك ...... وروى المعلى عن ابى يوسف رحمه الله تعالى انه لاباس به اذالم يقصد به الاضرار وان قصد به الاضرار سوى بينهم يعطى الابنة مثل مايعطى للابن وعليه الفتوى هكذا فى فتاوى قاضى خان.

الجواب صحیح :عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب :عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۲۲ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ فتویٰ نمبر:۲۶۴۴

﴿مشترکہ کاروبار میں مارکیٹ کے قوانین کی خلاف ورزی کرنا تعدی ہے ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام مسئلہ ذیل میں کہ میں اور شیرین محمد نے کاروبار کی غرض سے نصف نصف رقم جمع کی اس نے اس رقم سے رکشہ نقدوں میں خریدا اور اسکو قسطوں میں آگے بیچ دیا رکشہ کے کاغذات خریدنے والے کے حوالے کردیے حالانکہ اصول یہ ہے کہ جب تک خریدار پوری رقم ادا نہیں کرتا کاغذات حوالے نہیں کئے جاتے اور نہ ان کے حوالے کرنے میں اس نے مجھ سے پوچھا بلکہ اپنی مرضی سے حوالے کردیے ہیں، اب مجھے شیرین محمد سے اپنے پیسوں کے مطالبے کا حق ہے یا نہیں؟ سائل: محمد ہارون نارتھ ناظم آباد کراچی

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں شیرین محمد کی بلاشبہ غلطی ہے آپ اور شیرین محمد دونوں کو حق حاصل ہے کہ کسی طرح رکشہ والے سے اپنا حق حاصل کریں، البتہ وہ ایسا غائب ہو کہ اس تک یا رکشہ تک پہنچنے کی کوئی صورت نہیں بنتی یا اس سے اپنا حق وصول کرنا کسی وجہ سے ممکن نہ رہے تو ایسی صورت میں شیرین محمد سے آپ اپنا حق وصول کرسکتے ہیں۔

لما فى التنوير مع الدر:(۴/۳۲۰،باب الشركة،طبع سعيد)

(ويضمن بالتعدى) وهذا حكم الامانات... وفى الأشباه نهى احدهما شريكه عن الخروج وعن بيع النسيئة جاز.

ولما في التنوير مع الدر:(۲/۳۱۸،طبع سعيد)

(ولا يجوز لهما) في عنان ومفاوضة(تزويج العبد ولا الاعتاق والهبة والقرض وكذا كل ما كان اتلافا للمال اوتمليكا بغير عوض) لان الشركة وضعت للاسترباح وتوابعه وما ليس كذلك لاينتظمه عقدها.

ولما في الشامي:(۲/۳۱۹،طبع سعيد)

ومايكون اتلافا للمال اوتمليكا من غير عوض فانه لايجوز مالم يصرح به نصاً.

ولما في شرح مجلة الاحكام العدلية:(۲/۲۲۲ طبع رشيديه)

(فعل مالا يرضى به المودع في حق الوديعة تعد من الفاعل) والمتعدي هو الذي يفعل بالوديعة مالا يرضى به المودع.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ والله اعلم: عبيدالله عابد غفرله ولوالديه

۷ ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر: ۲۱۴۲

﴿شراکت میں مال کا دراہم، دنانیر، روپیہ، پیسہ ہونا ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے میڈیکل لیبارٹری کیلئے کرایہ پر جگہ لی اور اس میں لیبارٹری کے متعلق فرنیچرز بنوائے ابھی اور سامان نہیں لایا تھا کہ ایک ساتھی نے کہا کہ لیبارٹری کے متعلق جو سامان ہو۔ وہ میں لے کے آؤنگا اور چلانے والا بھی میرا ہی بندہ ہوگا اور منافع آپس میں آدھا آدھا تقسیم کرینگے، پوچھنا یہ ہے کہ مذکورہ طریقے سے شراکت جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز نہیں تو جائز ہونے کی کونسی صورت ہوسکتی ہے، نیز آپس میں منافع کا آدھا آدھا تقسیم کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ جبکہ فرنیچرز پر تقریباً تیس ہزار ۳۰۰۰۰ روپے لگے ہیں اور سامان پر تقریباً ڈیڑھ لاکھ ۱۵۰۰۰۰ روپے۔ مستفتی: ابوہمام شانگلہ

﴿جواب﴾ عقد شرکت میں دونوں جانب یعنی ہر ایک پارٹی کی طرف سے مالِ مشترکہ کا نقد (دراہم، دنانیر، روپیہ، پیسہ) ہونا ضروری ہے، مذکورہ صورت میں فرنیچرز اور لیبارٹری کے اوزار کو بنیاد بنا کر معاملہ کیا ہے۔ اسلئے صحیح نہیں ہے، البتہ اس معاملہ کو درست کرنے کیلئے فرنیچرز کو چھ حصوں میں تقسیم کر کے پانچ حصوں کو لیبارٹری سامان والے کے چھٹے حصے کے بدلے بیچ دے تو اسطرح آپ دونوں پورے سامان میں شریک ہونگے گویا کہ کل سامان کے چھ حصوں میں سے ایک حصہ آپکا ہوگا اور پانچ حصے شریک کے ہونگے۔

خدانخواستہ اگر نقصان ہوا تو وہ بھی اسی تناسب سے تقسیم ہوگا منافع کا آپس میں آدھا آدھا تقسیم کرنا بھی شرعاً درست ہے بشرطیکہ زیادہ مال والے پر عمل کی شرط نہ لگائی گئی ہو، زیادہ مال والے پر عمل کی شرط لگانے کی صورت میں منافع میں سے بھی اس کا حصہ کچھ زیادہ ہونا ضروری ہے خواہ معمولی سا ہو لیکن آدھا آدھا صحیح نہیں ہے، البتہ احسان وتبرع کے درجہ میں وہ بھی محنت کریں تو کوئی منع نہیں ہے لیکن عقد میں مشروط نہ ہو۔

لمافی الهندية:(۲/۳۰۶-۳۰۷،طبع رشيديه)

"الشركة اذاكانت بالمال لاتجوز عندناكانت اومفاوضة الا اذاكان رأس مالهمامن الاثمان التى لاتتعين فى عقودالمبادلات نحوالدراهم والدنانير فامامايتعين فى عقودالمبادلات نحوالعروض والحيوان فلاتصح الشركة بهماسواء كان ذلك رأس مالهماورأس مال احدهماكذافى المحيط....."والحيلة فى جوازالشركة فى العروض وكل مايتعين بالتعيين...ولوكان بينهماتفاوت بان تكون قيمة عرض احدهمامائة وقيمة عرض صاحبه اربع مائة يبيع صاحب الاقل اربعة اخماس عرضه بخمس عرض الآخرفصارالمتاع كله اخماساًكذافى الكافى.

ولمافى البدائع:(۶/۶۲،طبع سعيد)

والاصل ان الربح انمايستحق عندنااما بالمال وامابالعمل وامابالضمان...بقول النبى ﷺ الخراج بالضمان.

ولمافى التنويرمع الدر:(۴/۳۱۲-۳۱۳،طبع سعيد)

"ولذا(تصح)عاماوخاصاومطلقاومؤقتاو(مع التفاضل فى المال دون الربح وعكسه وببعض المال دون بعض وبخلاف الجنس كدنانير)من احدهماو(دراهم من الآخر)وفى الشامية:"قلت وحاصل ذلك كله انه اذا تفاضلافى الربح فان شرطاالعمل عليهما سوية جازولوتبرع احدهمابالعمل......وقدوقعت حادثة توهم بعض حنفية العصرانهامن هذاالقبيل وليس كذالك هى تفاضلافى المال وشرطاالربح بينهمانصفين ثم تبرع افضلهماماالابالعمل:فاجبت بان الشرط صحيح لعدم اشتراط العمل على اكثرهمامالاوالتبرع ليس من قبيل الشرط والدليل عليه مافى بيوع الذخيرة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد شاکر اللہ

۲۰ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۳۲۷

﴿مشترکہ گاڑی میں اپنا حصہ شریک کو کرایہ پر دینا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دو آدمیوں نے مشترکہ

ایک گاڑی خریدی دونوں میں سے ایک نے کہا کہ میں اس گاڑی کا اپنا حصہ آپکو بطور کرایہ دیتا ہوں، دوسرا اس پر راضی ہوگیا، کیا ایسا معاملہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟ مستفتی: شاہد عرفان صوابی

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں ایک شریک کا گاڑی میں سے اپنا حصہ دوسرے شریک کو بطور کرایہ دینا جائز ہے۔

لمافی درر الحکام:(۱/۶۲۲،طبع ماجدیہ)

(للمالک ان یؤجر حصته الشائعة من الدار المشترکة ان کانت قابلة للقسمة اولم تکن)لوآجرحصته هذه من شریکه سواء کانت قابلة للقسمة أم غیرقابلة وکانت وقفاأم غیروقف ومنقولاأم غیرمنقول فابجاره صحیح.

ولمافی التنویرمع الدر:(۶/۴۸،طبع ایچ ایم سعید)

وتفسدایضابالشیوع الااذاآجرکل نصیبه اوبعضه من شریکه فیجوزوجوازه بکل حال وعلیه الفتوی.(وجوازه بکل حال)ای سواء کان من شریکه اولا فیمایحتمل القسمة او لم یکن بشرط بیان نصیبه وان لم یبین لایجوزفی الصحیح.

ولمافی الهندیة:(۴/۴۴۸،طبع رشیدیه)

واجمعواانه لوآجرمن شریکه یجوزسواء کان مشاعایحتمل القسمة اولایحتمل القسمة وسواء کان آجرکل نصیبه اوبعضه منه اوبعضه کذافی الخلاصة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: احمد علی عفی عنہ

۲۰ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۶۲۸

﴿ادھار مال لیکر مشترکہ کاروبار کرنے کی صورت میں نفع کی تقسیم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ چند افراد مل کر کاروبار کرتے ہیں لیکن ان کے پاس سرمایہ موجود نہیں ہے، وہ کسی کمپنی سے ادھار مال لے کر کاروبار کرتے ہیں اور اپنے درمیان نفع کی شرح کو برابری کے حساب سے تقسیم کرتے ہیں، کیا ان کا اس طرح کاروبار کرنا اور نفع کو تقسیم کرنا درست ہے یا نہیں؟ مستفتی: محمد ارسلان کوٹ غلام محمد

﴿جواب﴾ کاروبار کی مذکورہ صورت ''شرکت وجوہ'' کہلاتی ہے، اس کاروبار میں شریک افراد ایک ساتھ مل کر کسی کمپنی یا شخص سے اگر ادھار مال لیتے ہیں یعنی ہر ایک الگ طور پر ذاتی اثر ورسوخ سے مال نہیں لیتا تو ایسی صورت میں تمام ساتھیوں کو نفع کی تقسیم میں برابر کا حصہ دینا درست ہے، اسلئے کہ ادھار مال میں برابر کے شریک تھے اور اگر ہر ایک ساتھی ذاتی طور پر اپنے

اثرورسوخ سے مال ادھار حاصل کرتا ہے، ظاہر ہے اس صورت میں کسی کے ذمہ زیادہ اور کسی شریک کے ذمہ کم مال ہوگا، تو نفع بھی اسی نسبت سے تقسیم کرنا ضروری ہے، ہر ایک کو برابر کا حصہ دار قرار دینا جائز نہیں ہے۔

لما في التنوير مع الدر: (۴/۳۲۲-۳۲۳، طبع سعيد)

(و) اما (وجوه). (ان عقداها على ان يشتريا) نوعا او انواعا (بوجوههما) بسبب وجاهتهما (ويبيعا) فما حصل بالبيع يدفعان منه ثمن ما اشتريا (بالنسيئة) وما بقي بينهما... (على ماشرطا من مناصفة المشترى) بفتح الراء (او مثالثته) ليكون الربح بقدر الملك لئلا يؤدي الى ربح مالم يضمن.

وفي الشامية: لئلا يؤدي الخ علة لمفهوم ما قبله وهو انه لا يجوز ان يكون الربح مخالفا لقدر الملك وعبارة الكنز وان شرطا مناصفة المشترى او مثالثته فالربح كذلك وبطل شرط الفضل قال في النهر لان استحقاق الربح في شركة الوجوه بالضمان وهو على قدر الملك في المشترى فكان الربح الزائد عليه ربح مالم يضمن.

ولما في بدائع الصنائع: (۶/۶۵، طبع ايچ ايم سعيد)

والربح بينهما على قدر الضمان فان شرطا لاحدهما فضل ربح على حصته من الضمان فالشرط باطل ويكون الربح بينهما على قدر ضمانهما ثمن المشترى لان الربح في هذه الشركة انما يستحق بالضمان فيتقدر بقدر الضمان فاذا شرط لاحدهما اكثر من حصته من الضمان و نصيبه من الملك فهو شرط ملك من غير ربح ولا ضمان فلا يجوز.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عدنان خدا بخش

۶ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۴۹۷

﴿باپ اور بیٹے کے مشترکہ کاروبار کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ باپ اور بیٹا ایک کاروبار میں شریک ہیں اور اچھی طرح کمائی حاصل ہوتی ہے تو یہ حاصل ہونے والے منافع باپ اور بیٹے کے درمیان برابر تقسیم ہونگے یا صرف باپ کی ملکیت شمار ہوگی؟ مستفتی: فدا محمد صوابی

﴿جواب﴾ باپ اور بیٹے کے مشترکہ کاروبار میں اگر دونوں کا سرمایہ الگ الگ ہو تو حاصل ہونے والے منافع بھی آپس میں برابر تقسیم ہونگے لیکن اگر کاروبار صرف باپ کا ہے اور بیٹا معین اور مددگار ہے تو حاصل ہونے والے منافع باپ کی ملکیت ہوگی۔

لما في الشامي: (۴/۳۲۵، طبع سعيد)

الاب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيء، فالكسب كله للاب ان كان

الابن فی عیاله لکونه معیناله الاتری انه لوغرس شجرة تکون للاب.

ولمافی الفتاوی الخیریة علی هامش تنقیح الحامدیة:(۲/ ۹۲مطبع حقانیه)

(سئل)فی ابن کبیرذی زوجة وعیال له کسب مستقل حصل بسببه اموالاهل هی لوالده خاصة ام تقسم بین ورثته علی فرائض الله تعالی حیث کان له کسب مستقل بنفسه. (أجاب)هی للابن تقسم بین ورثته علی فرائض الله تعالی حیث کان له کسب مستقل بنفسه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: احمد علی عفی عنہ

۱۶ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۵۲۵

﴿شرکت کوکسی میعاد کے پابند کرنا اور اثاثوں کی تقسیم کا طریقہ کار﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ کیا شرکت کی کوئی میعاد مقرر کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ یعنی زیادہ سے زیادہ کوئی ایسی مدت مقرر کی جائے کہ جسکے بعد شرکت خود بخود ختم ہوجائے مثلاً زید اور عمر اس طرح شرکت کریں کہ ہم ایک سال کے لئے شرکت کرتے ہیں، اس میں جو نفع ہوگا وہ طے شدہ شرح کے مطابق تقسیم ہوگا (ایک سال کے بعد شرکت ختم ہو جائے گی) کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ نیز شرکت کے ختم ہونے کے بعد اثاثے کیسے تقسیم ہونگے؟

﴿جواب﴾ شرکت کوکسی میعاد کے پابند کرنے کے بارے میں احناف کے مذہب کی دو روایتیں ہیں، پہلی روایت یہ ہے کہ شرکت کوکسی میعاد اور وقت کے ساتھ مشروط اور پابند کیا جاسکتا ہے کیونکہ شرکت درحقیقت دوسرے کو وکیل بنانا ہے اور وکالت میں مدت طے کی جاسکتی ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ شرکت کوکسی میعاد کا پابند نہیں کیا جاسکتا ہے، کیونکہ ایک روایت کے مطابق وکالت میں میعاد کی پابندی صحیح نہیں ہے۔

لیکن اصح قول یہ ہے کہ شرکت کوکسی میعاد کا پابند کیا جاسکتا ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں ایک سال کی مدت مقرر کرنا کہ اسکے بعد شرکت ختم ہوجائے درست ہے، شرکت کے ختم ہونے کے بعد اثاثوں کے تصفیہ کا طریقہ کار یہ ہوگا کہ سب سے پہلے اس کاروبار سے جو نفع حاصل ہوا وہ باہمی طے کردہ تناسب کی بنیاد پر تقسیم کیا جائے گا، اسکے بعد جو اثاثے باقی بچیں تو ان میں یہ تفصیل ہے کہ اگر تمام اثاثے نقد شکل میں ہوں تو وہ تمام باسانی شرکاء کے درمیان انکے حصص کے تناسب سے تقسیم کردیئے جائیں، البتہ اثاثے اگر ایسے ناقابل تقسیم ہوں کہ انکو الگ الگ

اجزاء میں تقسیم نہ کر سکتے ہوں مثلاً مشینری وغیرہ تو انہیں فروخت کر کے نقد رقم شرکاء کو حصص کے تناسب سے دی جائے گی۔

لمافی الهندية:(۳۰۲/۲،طبع رشيديه)

وان وقت اهل يتوقت بالوقت المذكور روى بشر عن ابى يوسف عن ابى حنيفة رحمهما الله تعالىٰ انه يتوقت والطحاوى ضعف هذه الرواية وصححها غيره من المشايخ وهو الصحيح.

ولمافى الشامى:(۳۱۲/۴،طبع سعيد)

ثم اذا وقتها هل تتوقت بالوقت حتى لا تبقى بعد مضيه؟ فيه روايتان كما فى توقيت الوكالة وتمامه فى البحر عن المحيط ولم يذكر ترجيحا وجزم فى الخانية بانها تتوقت حيث قال والتوقيت ليس بشرط لصحة هذه الشركة والمضاربة وان وقتا لذالك وقتا بان قال ما اشتريت اليوم من شىء فهو بيننا صح التوقيت وبينك نصفين فقال الرجل نعم فان اباحنيفة رحمه الله قال هذا جائز وكذلك قال ابو يوسف الخ.

ولمافى شرح المجلة:(۲۰۷/۴،المادة ۱۳۳۳،طبع رشيديه)

كل قسم من شركة العقد يتضمن الوكالة الخ.

ولمافى الاشباه والنظائر:(ص۱۹۲،طبع قديمى)

ما اشتريت اليوم من انواع التجارة فهو بينى وبينك فقال نعم.

ولمافى الشامى:(۲۱۰/۶،طبع سعيد)

(قوله وقسم المال المشترك)اى الذى تجرى فيه القسمة جبرا بان كان من جنس واحد.

ولمافى الشامى:(۲۵۳/۶،طبع سعيد)

وركنها هو الفعل الذى يحصل به الافراز والتميز بين الانصباء.

ولمافى الهداية:(۴۱۱/۴،طبع رحمانيه)

الا انها اذا كانت من جنس واحد اجبر القاضى على القسمة عن طلب احد الشركاء لان فيه معنى الافراز لتقارب المقاصد..... وان كانت اجناسا مختلفة لا يجبر القاضى على قسمتها لتعذر المعادلة باعتبار فحش التفاوت فى المقاصد ولو تراضوا عليها جاز لان الحق لهم.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم: عبدالوہاب لغمانی

۲ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ | فتویٰ نمبر: ۲۶۵۵

﴿منافع میں شرکت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ اگر دو آدمی اس طرح

شرکت کا معاملہ کریں ا ایک کی ریڑھی ہے اور دوسرے کا مال ہے، اور دونوں آپس میں یہ طے کر لیتے ہیں کہ جو کچھ حاصل ہوگا وہ آپس میں نصف نصف تقسیم کر لیں گے مذکورہ معاملہ شرعا درست ہے یا نہیں؟ مستفتی: طاہر حسین صوابی

﴿جواب﴾ عقد شرکت کے لئے ضروری ہے کہ ہر ایک شریک کی جانب سے مال ہو، مذکورہ صورت میں ریڑھی والے آدمی کی طرف سے مال نہیں ہے بلکہ صرف ریڑھی کے منافع ہیں اس لئے اس صورت میں شرکت فاسد ہے ریڑھی جس شخص کی ہے وہ مال میں اپنا حصہ شامل کر دے تو اسی نسبت سے شریک قرار پائے گا اور ریڑھی کے لئے کرایہ متعین کر لیا جائے تو اپنے ساتھی سے اس کے حصہ کے مطابق ریڑھی کا کرایہ الگ وصول کرتا رہے۔

لمافی شرح المجلۃ:(۲/۲۶۵،المادۃ ۱۳۲۲،طبع رشیدیہ)

اذاکان لواحددابۃ ولآخرامتعۃ وتشارکاعلی تحمیل الامتعۃ وبیعھاعلی ان ماحصل من الربح یکون بینھمامشترکافالشرکۃ فاسدۃ والربح الحاصل یکون لصاحب الامتعۃ، وصاحب الدابۃ یاخذاجرمثل دابتہ والدکان ایضامثل الدابۃ .... وکذالوکان لرجل سفینۃ فاشترک مع اربعۃ علی ان یعملوابسفینتہ وآلاتھاوالخمس لصاحب السفینۃ والباقی بینھم بالسویۃ فھی فاسدۃ والحاصل لصاحب السفینۃ وعلیہ اجرمثلھم کمافی رد المحتارعن البحرلان راس مال احدھماعرض وراس مال الآخرمنفعۃ۔ومثلہ فی الشامیۃ:(۴/۳۲۶،طبع سعید)

ولمافی الھندیۃ:(۲/۳۳۴،طبع رشیدیہ)

وکذلک لودفع شبکۃ لیصیدبھاالسمک وبینھماالنصفین فالصیدللصائدولصاحب الشبکۃ اجرمثلھاکذافی محیط السرخسی۔

ولمافی الشامی:(۴/۲۹۹،طبع سعید)

الشرکۃ لغۃ الخلط وشرعاعبارۃ عن عقدبین متشارکین فی الاصل والربح۔

ولمافی الھندیۃ:(۲/۳۵۷،طبع رشیدیہ)

وکل شی لیس یکون منہ العمل استاجرہ احدھمامن صاحبہ فھوجائزمثل الجوالق وغیرہ۔وفیھاایضا:ولوکان لاحدھماسفینۃ فارادنقل الطعام الی بلدفقال احدھماللذی لہ السفینۃ اجرنی نصف سفینتک احمل علیھاحصتی من الطعام وحصتک منہ فی نصف سفینتک ففعل جاز۔

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب:عبدالوہاب لقمانی

۲۹ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ　　　فتوی نمبر:۲۶۵۲

﴿شرکت کی ایک صورت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید اور عمرو ایک لاکھ روپے ملا کر کاروبار شروع کرتے ہیں، زید اس کاروبار میں پورا پورا وقت دیتا ہے جبکہ عمرو اس میں کوئی وقت نہیں دیتا، اس کاروبار میں جو بھی منافع ہوتا ہے، زید عمرو کو آدھا دیتا ہے اور آدھا خود رکھتا ہے جبکہ عمرو کوئی وقت بھی نہیں دیتا اور زید کو کوئی اعتراض نہیں تو مفتی صاحب معلوم یہ کرنا ہے کہ جو منافع عمرو لے رہا ہے یہ شرعی طور پر جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: محمد تابش کورنگی کوسٹ گارڈ

﴿جواب﴾ مسئولہ صورت میں اس طرح شرکت کر کے کاروبار کرنا اور منافع برابر تقسیم کرنا جائز ہے، البتہ نقصان کی صورت میں بھی دونوں کو برابر نقصان برداشت کرنا ہوگا۔

لما فی تنویر الابصار: (۳۱۲/۴، طبع ایم سعید)

مع التفاضل فی المال دون الربح وعکسه.

وفی الشامیة: والربح بینهما علی ما شرطا وان عمل احدهما فقط (وفی صفحة تالیة) ان عدم العمل من احدهما لا فرق ان یکون بعذر او بدونه.

ولما فی بدائع الصنائع: (۶۲/۶، طبع سعید)

اذا شرطا الربح علی قدر المالین متساویا او متفاضلا فلا شک انه یجوز ویکون الربح بینهما علی الشرط سواء شرطا العمل علیهما او علی احدهما والوضیعه علی قدر المالین متساویا او متفاضلا لان الوضیعه اسم لجزء هالک من المال فیتقدر بقدر المال وان کان المالان متساویین فشرطا لاحدهما فضلا علی ربح ینظر ان شرطا العمل علیهما جمیعا جاز والربح بینهما علی الشرط فی قول اصحابنا الثلاثه.

ولما فی شرح المجلة: (۶۲/۱، طبع سعید)

کیفما شرط تقسیم الربح فی الشرکة الصحیحة فذلک الشرط یراعی علی کل حال.

ولما فی شرح المجلة: (۲۹۲/۲، طبع رشیدیه)

ولو شرطا العمل علیهما جمیعا صحت الشرکة وان قل راس مال احدهما وکثر راس المال الاخر واشترطا الربح بینهما علی السواء او علی التفاضل فان الربح بینهما علی الشرط والوضیعة ابدا علی قدر روس اموالهما فالعقد جائز والشرط فی حق الوضیعة باطل فان عملا وربحا فالربح علی ما شرطا وان خسرا فالخسران علی قدر رأس مالهما.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر اکرام

۱۷ صفر ۱۴۳۱ھ　　　فتویٰ نمبر: ۲۴۴۲

﴿شرکت میں نفع کا تعین ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ زید ایک کاروبار بہت بڑے پیمانے پر کرتا ہے اور بہت رقم اسکی کاروبار میں لگی ہوئی ہے، اب عمرو زید کو ایک لاکھ روپے دیتا ہے کہ یہ رقم اپنے کاروبار میں لگالو اور ہر مہینے مثال کے طور پر پانچ ہزار روپے مجھے منافع دو، کیا یہ معاملہ جائز ہے؟ پہلے ہی منافع طے کرنا کیسا ہے؟ مستفتی: محمد تابش کورنگی

﴿جواب﴾ مذکورہ معاملہ بلاشبہ ناجائز اور حرام ہے البتہ معاملہ کی جائز صورت یہ ہوسکتی ہے کہ پہلے زید کے سرمایہ کا اندازہ لگایا جائے بالفرض کل نو لاکھ روپے زید کے لگے ہیں اور ایک لاکھ روپے عمرو دیدے تو اس کاروبار کے کل دس حصے ہوگئے جو بھی منافع آئیں ان میں سے نو حصے تو زید کے اپنے ہوں گے باقی ایک حصہ میں کوئی نسبت باہمی رضامندی سے طے کریں تو یہ مضاربت کہلاتی ہے جو کہ جائز ہے چونکہ کاروبار میں نقصان بھی ہوسکتا ہے تو نقصان بھی دونوں شرکاء کو برداشت کرنا ہوگا، البتہ پہلے حاصل شدہ نفع سے پورا کیا جائیگا اس سے بھی زیادہ نقصان ہوجائے تو سرمایہ کی نسبت سے ہر ایک پاٹنر کو برداشت کرنا ہوگا۔

لما فی العالمگیریۃ:(۲/۳۰۲ط رشیدیہ)

وان یکون الربح معلوم القدر فان کان مجھولا تفسد الشرکۃ وان یکون الربح جزأ شائعا فی الجملہ لا معینا فان عینا عشرۃ او مائۃ او نحو ذلک کانت الشرکہ فاسدۃ.

ولما فی التنویر مع الدر:(۴/۳۰۵ط ایچ ایم سعید)

(وشرطھا) ای شرکۃ العقد...... (وعدم ما یقطعھا کشرط دراھم مسماۃ من الربح لاحدھما) لانہ قد لا یربح غیر المسمی.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر اکرام

۱۹ صفر الخیر ۱۴۳۱ھ   فتوی نمبر: ۲۴۴۳

﴿مشترک کاروبار کے منافع میں باپ کا تصرّف﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک آدمی اور اس کے چار بیٹوں نے ملکر کاروبار شروع کیا چونکہ کاروبار سے پہلے سب ملکر مزدوری کر کے پیسے کماتے تھے، اس لئے کاروبار میں سب کا پیسہ شامل ہے، اس کاروبار سے کافی نفع ہوا اس آدمی کا ایک

نابالغ بیٹا تھا جو کاروبار میں شامل نہیں تھا۔

اب یہ آدمی منافع میں سے اس چھوٹے بیٹے کو حصہ دینا چاہتا ہے جبکہ یہ بیٹا کاروبار میں شامل نہیں تھا، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟ واضح رہے کہ سب بیٹے باپ کے ساتھ رہتے ہیں۔

﴿جواب﴾ باپ اور بیٹوں کی مشترک کمائی باپ کی ملکیت سمجھی جاتی ہے اور باپ اس میں تصرف کرنے کا حق رکھتا ہے، لہٰذا باپ اگر نابالغ بیٹے کو منافع میں سے حصہ دینا چاہے تو دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، ہاں کاروبار شروع کرتے ہوئے ہر ایک کی کمائی الگ الگ معلوم تھی جس سے کاروبار شروع کیا تو ایسی صورت میں حکم تبدیل ہوگا۔

لمافی الشامی:(۵۰۲/۶،طبع امدادیہ)

الأب وابنه يكتسبان فى صنعة واحدة ولم يكن لهما شئ فالكسب كله للاب ان كان الابن فى عياله لكونه معيناًله الاترى لوغرس شجرة تكون للأب.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر:۲۶۲

﴿مشترکہ کاروبار میں غفلت اور لاپروائی تعدی شمار ہوگی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم دو شریکوں نے مارکیٹ اصولوں کے مطابق گاڑیوں کی خرید وفروخت کا کاروبار شروع کیا جسمیں ہم نقد اور قسطوں پر خرید وفروخت کیا کرتے تھے۔

تاہم میرے شریک نے ایک گاڑی قسطوں پر فروخت کر کے اسکے کاغذات ادائیگی سے پہلے اس کے حوالے کر دیئے حالانکہ قانون یہ تھا کہ قسطوں کے کاروبار میں گاڑی کے کاغذات قسطوں کی ادائیگی کے بعد دیئے جاتے ہیں نہ کہ پہلے۔

اب جبکہ کاغذات تو گاڑی کے خریدار کے پاس ہیں جسکی وجہ سے ہم قانوناً اس سے گاڑی واپس نہیں لے سکتے لیکن میں جب شریک سے اپنے حق کا مطالبہ کرتا ہوں تو وہ کہتا ہے کہ جو رقم آپ مجھ سے مانگ رہے ہیں وہ سود ہے، اس لئے کہ وہ رقم تو گاڑی کا خریدار مجھے نہیں دیتا، برائے مہربانی شریعت کی رو سے یہ بتلائیں کہ میرے شریک کی بات درست ہے یا میری؟

جبکہ غلطی میرے شریک کی ہے؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اگر گاڑی کے خریدار تک رسائی ممکن نہیں یا قانوناً اب آپ اس سے اپنا حق نہیں لے سکتے تو پھر آپکے لئے اپنے شریک سے اپنے حق کا مطالبہ شرعاً جائز ہے کیونکہ یہ نقصان آپکے شریک کی غفلت اور لاپروائی کی وجہ سے ہوا ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۳۲۰/۴،باب الشرکۃ،طبع سعید)

(ویضمن بالتعدی)وھذاحکم الامانات.....وفی الأشباہ:نھی احدھماشریکہ عن الخروج وعن بیع النسیئۃ جاز.

ولمافیہ ایضاً:(۳۱۸/۴،طبع سعید)

(ولایجوزلھما)فی عنان ومفاوضۃ(تزویج العبدولاالاعتاق والھبۃ والقرض وکذاکل ما کان اتلافاللمال اوتملیکابغیرعوض)لان الشرکۃ وضعت للاستربا ح وتوابعہ وما لیس کذلک لاینتظمہ عقدھا.

ولمافی الشامی:(۳۱۹/۴،طبع سعید)

ومایکون اتلافاللمال اوتملیکامن غیرعوض فانہ لایجوز مالم یصرح بہ نصاً

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:عبیداللہ عابد غفرلہ ولوالدیہ

۱۹جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر:۲۳۱۴

﴿بیوی کا اپنے زیورات شوہر کو بغرض تجارت دینا﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں اپنے زیورات اپنے شوہر کو خوشی سے بغرض تجارت دینا چاہتی ہوں، میرے لئے کیا حکم ہے؟ مستفتیہ:بیگم زاہد محمد سواتی

﴿جواب﴾ آپ اپنے زیورات کی خود مالک ہیں،شوہر کو بطور ہدیہ دینا چاہتی ہیں تو دے سکتی ہیں بلاشبہ آپکو ثواب ملیگا اور بغرض تجارت دینے سے آپکا مقصد اگر مضاربت ہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔

زیورات بیچ کر جو پیسہ ملے وہ شوہر کو بطور مضاربت دیدیں تاکہ آپکا پیسہ ہو اور انکی محنت،اس سے وہ جو کماتے رہیں تو تقسیم منافع کیلئے باہمی رضامندی سے کوئی شرح مقرر کرلیں مثلاً ہر ایک کو پچاس (50) فیصد،یا شوہر کو دوتہائی اور ایک تہائی منافع آپ کیلئے ہو،الغرض یہ طے کرنا ضروری ہے لیکن شرح کا تعیین باہمی رضامندی سے کریں،مضاربت کے مزید تفصیلی احکام کسی مقامی

عالم سے معلوم کریں یا جو صورت اپنانا چاہیں تو تفصیل لکھ کر بھیج دیں، ہم انشاء اللہ تفصیلی جواب دیدیں گے۔

لما في الدر المختار: (۶۴۵/۵ طبع ایچ ایم سعید)

هي لغة مفاعلة من الضرب في الارض وهو السير فيها وشرعا عقد شركة في الربح بمال من جانب رب المال وعمل من جانب المضارب.

ولما في الهندية: (۳۱۱/۴ طبع قديمي)

أما تفسيرها شرعا: فهي عبارة عن عقد على الشركة في الربح بمال من أحد الجانبين والعمل من الجانب الاخر حتى لو شرط الربح كله لرب المال كان بضاعة ولو شرط كله للمضارب كان قرضا.

ولما في الهداية: (۲۶۲/۳ طبع رحمانيه)

المضاربة عقد يقع على الشركة بمال من احد الجانبين ومراده الشركة في الربح وهو يستحق بالمال من احد الجانبين والعمل من الجانب الآخر.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عباد اللہ

۱۷ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۲۸۷۴

﴿شرکت فاسدہ میں منافع بقدر رأس المال ہوں گے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے کہ ایک آدمی مرگیا اور اولاد میں مثلا ایک بیٹا اور بیٹی ہے اور ترکہ میں نقد رقم چھوڑی، اب بھائی نے ترکہ تقسیم کیے بغیر بہن کی رضامندی سے ان پیسوں سے کاروبار شروع کیا تو کیا منافع میں بہن بھائی کے ساتھ شریک ہوگی یا نہیں؟

﴿جواب﴾ ترکہ میں چونکہ بھائی اور بہن دونوں شریک ہیں اسلئے کاروبار شروع کرنے سے پہلے ضروری تھا کہ ہر ایک وارث کا حصہ الگ کر کے اسکے حوالے کرتے یا کم از کم بھائی اپنی بہن سے اسکے حصے کی رقم کو بطور قرض استعمال کرنے کی اجازت لیتے۔ مذکورہ صورت میں چونکہ ایسی کوئی وضاحت نہیں ہوئی اور بہن کے حصے کی رقم اسکی اجازت سے کاروبار میں لگائی گئی تو یہ شرکت عقد ہوئی، شرکت عقد میں تقسیم منافع کی شرح کو متعین کرنا ضروری ہوتا ہے ورنہ شرکت فاسد ہوتی ہے اور شرکت فاسد میں اگر مال دونوں کا ہے تو منافع کی تقسیم سرمایہ کی نسبت سے ہوتی ہے لہذا منافع میں بھائی کے ساتھ بہن شریک ہوگی، بہن کو منافع میں سے ایک تہائی دینا ضروری ہے۔

لما في درر الحكام شرح مجلة الاحكام: ج ۵۱/۲ تحت المادة (۱۳۳۶)

يشترط بيان الوجه الذى سيقسم فيه الربح بين الشركاء واذا بقي مبهما ومجهولا تكون الشركة فاسدة.

ولما في الفقه الحنفي:(۵۱/۵، طبع:دار القلم، دمشق)

الشركة الفاسدة اما ان تكون بدون مال او بمال من الجانبين او من احدهما فالحكم الاولى ان الربح فيها للعامل، وفي الثانية الربح فيها بقدر المال ... الخ

ولما في درر الحكام ۸۸/۲ تحت المادة (۱۳۶۸ طبع:مكتبه ماجديه)

يقسم الربح والفائدة في الشركة الفاسدة بنسبة مقدار رأس المال.

ولما في شرح المجلة ۵۳/۲ تحت المادة (۱۳۳۱) مكتبة رشيدية

شركة العقد تنقسم الى قسمين فاذا عقد اثنان او اكثر عقد الشركة بينهما او بينهم على المساواة وكان مالهما او مالهم الذى ادخلاه في الشركة فما يصلح ان يكون رأس المال للشركة وكانت حصتهما متساوية من رأس المال والربح تكون الشركة مفاوضة كما لو توفي رجل فاتخذ اولاده مجموع اموال ما انتقل اليهم من ابيهم رأس المال على ان يشتروا ويبيعوا من سائر الانواع ويقسم الربح بينهم على التساوى يكون عقد الشركة مفاوضة لكن وقوع هكذا شركة على المساواة التامة نادر واذا اختل شرط من شروط المساواة التامة تكون شركة عنان، المساواة التامة هى ان يتساويا في مالهما ودينهما وتصرفهما هندية، لان المفاوضة تنبئي عن المساواة.

الجواب صحیح: مفتی عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: شفقت اللہ

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۳۰۸۸

﴿شرکت فاسد کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام مسئلہ ذیل میں کہ ہم دو شریکوں نے آدھی آدھی رقم ملا کر چھبیس لاکھ کا ایک مکان خریدا، ہم نے آپس میں طے کیا تھا کہ ایک شریک کو مکان کا نفع کرایہ کی صورت میں ملے گا اور دوسرے شریک کو مکان فروخت ہونے کی بعد حاصل شدہ نفع ملے گا، مکان خریدنے کے بعد میں نے اس میں رہائش اختیار کرلی اور دوسرے فریق کو اسکا پندرہ ہزار کرایہ دیدیا، اب جبکہ میں نے مکان کو دوسرے شریک سے پوچھے بغیر ستائس لاکھ میں بیچ دیا ہے تو دوسرے شریک کو مزید کرایہ بھی دینا ہوگا یا اس کو اس کی آدھی رقم واپس کرنا ہوگی؟ شریعت کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔　　　　سائل: نسیم صاحب کراچی

﴿جواب﴾ سوال میں دو معاملوں کا ذکر ہے ایک معاملہ مکان کے خریدنے کا ہے جسمیں

دونوں نصف نصف کے شریک ہیں اور دوسرا معاملہ مکان کے کرایہ کا ہے، جہاں تک پہلے معاملے کا تعلق ہے تو وہ شرکت فاسدہ کی صورت ہے اسلئے کہ شرکت صحیحہ میں نفع کی شرح معلوم ہونا ضروری ہے اور یہاں معلوم نہیں ہے، لہٰذا مکان کے فروخت ہونے کیصورت میں جو نفع حاصل ہوا ہے وہ دونوں شریکوں کے درمیان ان کے حصوں کی نسبت سے تقسیم ہوگا سوال میں ذکر کردہ صورت کے مطابق یہ نفع دونوں میں آدھا آدھا تقسیم ہوگا اور دوسرا معاملہ مکان کے کرائے کا ہے تو ان جیسے مکانات کا عموما جو کرایہ بنتا ہو کرایہ دار دوسرے شریک کو اس کے حصے کے بقدر کرایہ دیگا، لہٰذا مذکورہ کرایہ اگر زیادہ ہے تو زیادہ واپس کرنا لینے والے کے ذمہ ہے۔

لمافی البدائع:(۶/۵۹،طبع سعید)

ومنهاان يكون الربح معلوم القدرفان كان مجهولاتفسدالشركة لان الربح هوالمعقود عليه وجهالته توجب فسادالعقدكمافى البيع والاجارة.

ولمافيه ايضا:(۶/۷۷،طبع سعيد)

واماالشركة الفاسدة وهى التى فاتهاشرط من شرائط الصحة...والربح فيهاعلى قدر المالين لانه لايجوزان يكون الاستحقاق فيهابالشرط لان الشرط لم يصح فالحق بالعدم فبقى الاستحقاق بالمال فيتقدربقدرالمال.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم: عبیداللہ عابد غفرلہ ولوالدیہ

۲۷ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر: ۲۰۹۹

﴿ کاروبار میں شرکت سرمایہ کی بنیاد پر ہوتا ہے ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں اور میرے ایک رشتہ دار نے ایک پلاٹ اس ارادے سے خریدا کہ جب اسکی قیمت بڑھ جائے تو فروخت کریں گے، خریدتے وقت میرے پاس نقد رقم کم اور اسکے پاس زیادہ تھی، انھوں نے اپنے آدھے حصے کے ساتھ میرے حصے کی کچھ رقم ادا کی، اسی وقت میں نے اس سے کہا کہ میں بعد میں آپکی یہ رقم لوٹا دوں گا لیکن میں نے ابھی تک وہ رقم ادا نہیں کی تھی کہ پلاٹ فروخت ہوا، اب وہ کہتا ہے کہ چونکہ میں نے تین چوتھائی قیمت ادا کی تھی، اس لئے میں تین چوتھائی کی نسبت سے نفع لوں گا اور آپکو ایک چوتھائی کی نسبت سے نفع دوں گا، پوچھنا یہ ہے کہ اسکا ایسا کرنا شرعا صحیح ہے؟

﴿جواب﴾ شروع میں یہ بات اگر واضح تھی کہ پلاٹ میں دونوں آدھے آدھے کے مالک

ہوں گے یعنی سرمایہ کی بنیاد پر حصہ داری نہیں تھی جیسا کہ آپکے سوال سے بھی واضح ہے کہ آپ نے اپنے ساتھی سے کہہ دیا تھا کہ میرے حصے کی زائد رقم آپ نے جو ادا کی وہ لوٹا دوں گا پھر اس نے اسکا انکار بھی نہیں کیا تھا تو ایسی صورت میں اس پلاٹ میں آپ دونوں برابر کے شریک ہیں، اب نفع بھی برابر تقسیم ہوگا، البتہ قرض وصول کرنے کی غرض سے وہ خاص رقم روکنے کا آپکے دوست کو حق حاصل ہے۔

لمافی البحر الرائق:(۱۶۸/۵،طبع سعید)

(قوله وشركة العقدان يقول احدهماشاركتك في كذاويقبل الاخر)بيان للنوع الثاني ومقصوده بيان ركنهامن الايجاب والقبول الدالين عليهاالاخصوص شاركتك. لانهاعقدمن العقودفينعقدبمايدل عليه.

ولمافي التنويرمع الدر:(۳۰۵/۴-۳۰۸،طبع سعيد)

(حكمهاالشركة في الربح)وقال ايضا:(وللبائع مطالبة ايهماشاء بثمنهما)اى الطعام والكسوة(ويرجع الاخر)بماأدى (على المشترى بقدرحصته)ان أدى من مال الشركة.

ولمافي البحر الرائق :(۱۷۶/۵،طبع سعيد)

(قوله ورجع على شريكه بحصته منه)اى من الثمن اذاأدى من مال نفسه لانه وكيل من جهته في حصته فاذافقدمن مال نفسه رجع عليه.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:نثار محمود کوہاٹی

ا ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر:۲۱۱۸

﴿بيان طريق المضاربة﴾

﴿مضاربۃ کا طریقہ کار﴾

﴿سوال﴾اعطيت صاحبالى مالاوقلت له اتجرفيه اذاربحت فلك شيء منه فلهب يتجروأنااعينه ايضافاذاقل الربح اعطيته شيئاًواذاكثراعطيته اكثر.هل يجوز هذا؟ وماطريقته المشروعة؟بينواتوجروا.

﴿جواب﴾ان كان اعانتك اياه مشروطاً وقت العقدفلايجوزوان كان تبرعاً فلايضر،لأن هذه مضاربة يجب ان يكون العمل من جانب والمال من جانب .وشرط العمل على رب المال يفسدها.وكذاليس الربح مشاعاً معلوماًبينكماوذالك شرط صحةالمضاربة ولم يوجدفلايصح.

لما في الهداية:(۲/۲۶۲،طبع رحمانيه)

المضاربة عقد يقع على الشركة بمال من أحد الجانبين. ومراده الشركة في الربح وهو يستحق بالمال من أحد الجانبين والعمل من الجانب الآخر.وقال بعد صفحة:وشرط العمل على رب المال مفسد للعقد لأنه يمنع خلوص يد المضارب.

ولما في التنوير مع الدر:(۵/۶۴۵-۶۴۶،طبع سعيد)

(هي عقد شركة في الربح بمال من جانب)رب المال(وعمل من جانب)المضارب.
(وركنها الايجاب والقبول الخ)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب:محمد سلمہ

۲صفرالخیر۱۴۳۰ھ   فتویٰ نمبر:۱۹۸۵

﴿مضاربت میں ماہانہ منافع رأس المال میں شامل کرنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ مضاربت کی ایک کمپنی ہر ماہ منافع تقسیم کرتی ہے،کسی رب المال کا نفع راس المال کیساتھ شامل نہیں کرتی مثلاً خالد ایک لاکھ روپیہ بطور مضاربت لگاتا ہے اور اسے ماہانہ 5ہزار روپیہ تقریباً ملتا ہے تو نفع اس کے حوالے کردیا جاتا ہے،ایسا نہیں ہوتا کہ نفع راس المال میں شامل کر کے راس المال ایک لاکھ 5ہزار بن جائے بلکہ اگر وہ نفع کمپنی میں راس المال کے طور پر رکھنا چاہے تو نفع لے کر رکھ لے جب پچاس ہزار بن جائے تو گزشتہ معاہدہ میں ترمیم کر کے راس المال بڑھادے۔گزارش طلب بات یہ ہے کہ کیا مضاربت کا یہ طریقہ کار شریعت کی رو سے صحیح ہے؟

﴿جواب﴾ مذکورہ طریقہ مضاربت میں اگر نفع فیصد کے لحاظ سے متعین کیا گیا ہے تو یہ بالکل صحیح ہے،اور اگر رب المال اور کمپنی کے ذمہ دار لوگ باہمی رضامندی سے ماہانہ نفع راس المال میں جمع کرنا چاہیں تو اس میں بھی کوئی خرابی تو نہیں ہے بشرطیکہ حساب محفوظ ہو۔

لما في تحفة الفقهاء:ص،۲۹۰،۲۹۱طبع مكتبة المعروفية

واما تفسير المضاربة:فهو دفع المال الى غيره ليتصرف فيه ويكون الربح بينهما على ما شرطا،فيكون الربح لرب المال بسبب ماله لانه نماء ماله وللمضارب باعتبار عمله الذي هو سبب وجود الربح ــــ ومن شرط صحتها:ان يكون الربح جزءًا مشاعًا من الجملة.

"وفيه ايضاً:ص،۲۹۳"

ومنها:ان قسمة الربح قبل قبض راس المال لا تصح،حتى انهما لو اقتسما الربح وراس المال في يد المضارب فهلك فما اخذ رب المال من الربح يكون محسوبا من راس

المال ویرجع علی المضارب فیما قبضہ حتی یتم راس المال فان فضل فھو ربح بینھما.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۱۴ جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ فتویٰ نمبر: ۳۷۸۹

﴿مضارب کے لئے بھی مزدوری لینا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ میں نے سود سے بچنے کیلئے کچھ رقم بینک میں رکھنے کے بجائے ایک شخص کو کاروبار کے لئے دی اور یہ طے پایا کہ نفع آدھا آدھا تقسیم ہوگا، اس نے صرف میری دی ہوئی رقم سے سائیکلوں کی خرید وفروخت کا کاروبار شروع کیا کچھ عرصہ تک معاہدہ کے مطابق نفع آپس میں تقسیم ہوتا رہا لیکن اب اسکا کہنا ہے کہ میں نفع کے علاوہ الگ سے مزدوری بھی لوں گا کیونکہ دکان میں بہت سارا کام کرنا پڑتا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ کیا شرعاً یہ صحیح ہے یا یہ شخص محض نفع ہی کا مستحق ہے؟ براہ کرم رہنمائی فرما کر ممنون ہوں۔ مستفتی: ہیبت خان کوہائی شکر درہ

﴿جواب﴾ اگر مذکورہ شخص صرف آپکی دی ہوئی رقم سے کاروبار چلا رہا ہے تو اسکی حیثیت مضارب کی ہے، اب اگر دکان میں صرف اسی قسم کا کام کرتا ہے جو عام طور پر دکاندار اپنے لئے خود کرتے ہیں یعنی مال منگوا کر دکان میں سیٹنگ اور فروخت کرتا ہے تو اس صورت میں یہ صرف طے کئے ہوئے نفع کا مستحق قرار پاتا ہے، البتہ اگر وہ اسکے ساتھ ساتھ وہ کام بھی کرتا ہو جو عموماً تاجر لوگ مزدوروں سے کراتے ہیں تو اس صورت میں وہ الگ طور پر اسکی اجرت کا مطالبہ کر سکتا ہے، چاہے تو اس کیلئے الگ مزدور رکھ لیں یا دکاندار کے لئے الگ سے مزدوری متعین کر لیں۔

لمافی التنویر مع الدر: (۵/ ۶۴۵ طبع سعید)

وشرعا (عقد شرکۃ فی الربح بمال من جانب) رب المال (وعمل من جانب) المضارب.

ولمافی الھندیۃ: (۴/ ۲۸۵، طبع رشیدیہ)

اما تفسیرھا شرعا فھی عبارۃ عن عقد علی الشرکۃ فی الربح بمال من احدالجانبین والعمل من الجانب الاخر.

ولمافی الدرالمختار: (۵/ ۶۴۸ طبع سعید)

ومن شروطھا: کون نصیب المضارب من الربح حتی لو شرط لہ من رأس المال اومنہ ومن الربح فسدت.

ولما فی البحر:(۲۶۴/۷،سعید)

السادس ان یکون المشروط للمضارب مشروطا من الربح.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: نثار محمود کوہائی عفی عنہ

۲ ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ — فتوی نمبر: ۲۱۳۴

﴿مضاربت کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے خالد صاحب کو پچاس ہزار روپے کاروبار کیلئے دیے، اس پر انہوں نے ایک اسکول شروع کیا اور نفع ونقصان نصف طے ہوا، تقریبا ۲ سال کے عرصے میں ادارہ چلانے میں کامیابی نہ ہوسکی، چنانچہ پچاس ہزار تو بالکل ختم ہوگئے اور ادارہ مزید مقروض ہوگیا، مندرجہ ذیل امور مطلوب ہیں:

(۱) اسکول کے بقیہ سامان کا کیا حکم ہے (۲) اور قرض کون ادا کریگا (۳) رأس المال سارا میرا گیا یا خالد صاحب پر بھی کچھ آئیگا؟ — مستفتی: عبدالعظیم صاحب فیڈرل بی ایریا کراچی

﴿جواب﴾ عرصہ دوسال کے دوران اسکول کی آمدن کو دونوں ساتھیوں میں سے کسی ایک نے بھی اگر ذاتی طور پر استعمال کیا ہے، پہلے اس کا حساب کریں اور اسکول کے باقی موجود سامان کی بھی مارکیٹ ویلیو لگا کر دونوں جمع کریں، اب اس پورے سرمایہ سے پہلے قرض ادا کریں اگر قرض سے زائد ہوگیا تو پچاس ہزار روپے کی حدتک تو اصل سرمایہ کا حق ہے، اس سے بھی زائد ہوجائے تو دونوں شریک برابر تقسیم کریں، بالفرض حساب کرنے کے بعد اسکول کی آمد وسامان دونوں سے قرض ادا نہ ہوسکے تو خسارہ شمار کریں گے جو اصل سرمایہ سے پورا کیا جائیگا، خدانخواستہ نقصان اصل سرمایہ سے بھی زیادہ ہوگیا ہے تو اس آخری صورت میں کچھ تفصیل ہے دوبارہ پوری وضاحت کے ساتھ سوال بھیجدیں انشاء اللہ جواب دیں گے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۲۲۵/۸،طبع امدادیہ)

(وما ھلک من مال المضاربۃ یصرف الی الربح) لانہ تبع (فان زاد الھالک علی الربح لم یضمن) ولو فاسدۃ من عملہ لانہ امین.

ولما فی کنز الدقائق:(ص ۳۲۲،طبع قدیمی)

وما ھلک من مال المضاربۃ فمن الربح فان زاد الھالک علی الربح لم یضمن المضارب

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد طیب حسن زکی

۶ محرم ۱۴۳۰ھ — فتوی نمبر: ۸۳۲

﴿نفع ونقصان میں مضارب ورب المال برابر کے شریک ہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس بارے میں کہ میرے ایک رشتہ دار نے مجھے اپنے کاروبار میں شریک کیا اس شرط کے ساتھ کہ دوکان کے کام میں آپ صرف محنت کریں گے جبکہ کاروبار ان کا ہے، میرے ذمے صرف محنت سپرد تھی اور کہا کہ نفع اور نقصان میں تین حصے ہونگے دو حصے میرے (رشتہ دار جسکا کاروبار ہے) اور ایک حصہ آپ کا ہوگا (یعنی میرا) مثلاً اگر مہینے میں ۱۵۰۰۰ ہزار منافع ہو تو ۱۰۰۰۰ روپے ان کے اور ۵۰۰۰ میرے جبکہ کاروبار میں شرکت کے وقت یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ میرے ساتھ دوکان میں وقت دیں گے، واضح رہے کہ مذکورہ دوکان میں ۲ مزدور بھی کام کرتے ہیں، ان کا کھانا بھی میرے رشتے دار کے ذمے تھا لیکن جب میں ان کے ساتھ کاروبار میں شریک ہوا، اس کے کچھ دن بعد مجھے کہا کہ ان کے کھانے میں بھی آپ کا ایک حصہ ہوگا حالانکہ شروع میں اس بات کا ذکر نہ تھا۔

واضح رہے کہ مذکورہ دوکان کیلئے ایک گاڑی بھی ہے جس کے ذریعے سپلائی کی جاتی ہے اور یہ گاڑی شروع وقت سے مالک کی ہے اب جبکہ اس گاڑی کا انجن ڈینٹ پینٹ ہوا ہے اور مالک کا کہنا یہ ہے کہ گاڑی میں جو رقم خرچ ہوئی ہے وہ بھی میں اور آپ مشترکہ دیں گے حالانکہ شروع میں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی اور مالک دوکان میرے ساتھ دوکان میں وقت بھی نہیں دیتے تو کیا ان مزدوروں کے کھانے میں میرے پیسے ادا کرنا ضروری ہیں، کیا اس گاڑی میں میرے پیسے دینا جائز ہیں۔ برائے کرم مسئلے کا جواب دے کر عنداللہ ماجور ہوں؟ مستفتی: عبدالسلام صاحب

تنقیح: گاڑی کاروبار کی ہے یا مالک کی ذاتی؟

جواب تنقیح: گاڑی کاروبار کی ہے لیکن مالک ذاتی طور پر بھی استعمال کرتا ہے۔

﴿جواب﴾ یاد رہے کہ مضاربت کے صحیح ہونے کی لئے یہ ضروری ہے کہ ایک کی طرف سے عمل ہو اور دوسرے کی طرف سے سرمایہ ہو اور اگر عقد مضاربت میں رب المال (سرمایہ والے) کے لئے بھی عمل کی شرط لگائی گئی تو مضاربت فاسد ہو جاتی ہے، لہٰذا رشتہ دار کیساتھ واقعی شرط کے درجہ میں یہ بھی طے تھا کہ وہ دوکان پر وقت بھی دیگا تو یہ مضاربت فاسد ہوگئی، مضاربت فاسد میں آپ کاروبار میں شریک نہیں ہوں گے، کاروبار مکمل رب المال (جسکی رقم ہے) کا ہوگا،

آپ کو صرف کام کے دنوں کی مزدوری ملیگی۔

البتہ شرط کے درجہ میں نہیں تھا اس لئے آپ خود ہی کام چلاتے رہے رشتہ دار سے آج تک دوکان پر وقت دینے کا مطالبہ نہیں کیا تو مضاربت صحیح ہے آپ اس کاروبار میں شریک ہیں اور مزدوروں کے کھانے اور گاڑی کا خرچہ بھی مشترکہ کاروبار سے وصول کیا جائیگا۔

لمافی الفقه الحنفی:(۱۱۹/۲،طبع دار الکلم الطیب)

تحديد راس المال عند العقد ويكون مسلماً الى المضارب لايد لرب المال فيه، ولا يجوز ان يشترط العمل على رب المال.فان شرط عمل رب المال فسدت المضاربة،لانه يمنع خلوص يد المضارب ولا يتمكن من التصرف وبعد سطور والمال في المضاربة الفاسدة غير مضمون بالهلاك.

ولما فيه ايضا:(۱۲۰/۲ طبع دار الكلم الطيب)

واذا فسدت المضاربة فهي اجارة فاسدة لانه عمل له باجر مجهول فيستحق اجر مثله.

ولما في شرح المجلة:(۳۳۰/۴-۳۳۱،المادة ۱۴۱۰،طبع رشيديه)

(تسليم راس المال الى المضارب شرط) فلا بد من تسليم المال الى العامل ليتمكن من العمل وشرط العمل على رب المال ينا في ذالک فلا يجوز.

ولما في الهداية:(۲۷۰/۳،طبع رحمانيه)

وماهلک من مال المضاربة فهو من الربح دون راس المال.

الجواب صحیح :عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب :محمد طیب حسن زئی

۳۰ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ　　　فتویٰ نمبر :۲۲۰۸

﴿مضاربت کے شرائط کی تحقیق﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر مضاربت میں نقصان ہو جائے تو اس کی ذمہ داری کس پر ہوگی؟　　　مستفتی: ڈاکٹر عبد الرحمٰن صاحب

﴿جواب﴾ مضاربت میں نقصان اگر مضارب کی تعدی (کوتاہی) سے ہو تو اس صورت میں مضارب ضامن ہوگا یعنی نقصان اس کو برداشت کرنا پڑیگا اور اگر نقصان مضارب کی کوتاہی (تعدی) سے نہ ہو بلکہ اتفاق سے ہو جس طرح عام تجارت میں بھی ہو جاتا ہے تو وہ ضامن نہیں ہوگا۔

ولما في البحر الرائق: (۲۶۲/۷،طبع سعيد)

ولا ضمان عليه اذا فسدت بالهلاك بغير صنعه......

ولما فی البحر الرائق: (۲۲۵/۷،طبع سعید)

ولم یتعد عما عینه ان کان التعین مقیداً من بلد و سلعة و وقت ومعامل کما فی الشرکة فان تعدی صار ضامناً.

ولما فی الکفایة مع فتح القدیر: (۹۷/۸ رشیدیه)

اذا استهلک المضارب رأس المال أو انفقه أو اعطاه رجلاً فاستهلکه لم یکن له ان یشتری علیه شیئا لانه صار مضمونا علیه بالتعدی.

ولما فی البحر الرائق: (۲۶۸/۷ ،طبع سعید)

(قوله و ما هلک من المال المضاربة فمن الربح فان زاد الهالک علی الربح لم یضمن مضارب لکونه اميناً سواء کان من عمله اولاً.

ولما فی التنویر مع الدر المختار: (۳۲۰/۴ ،طبع سعید) (و یضمن بالتعدی) وهذا حکم الامانات

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد حامد یاسین، بھکر

۲۶ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر: ۳۶۲۸

﴿مضاربت میں کچھ شرائط کی تحقیق﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کے مضاربت میں مندرجہ ذیل شرط لگانا درست ہے یا نہیں؟ شرعی نقطۂ نظر واضح فرمائیں؟

"کمپنی کی مدت مضاربت ۳۱ دسمبر تک ہے اس کے بعد نیا معاہدہ کیا جائے گا، اگر کوئی شخص اس سے پہلے اپنی رقم نکلوانا چاہے تو نکلوا سکتا ہے کمپنی اس بات کی بھر پور کوشش کرے گی کہ رب المال نے جس تاریخ کو مضاربت ختم کرنے کا نوٹس دیا ہے اس کے بعد آنے والے چھ ماہ میں اس کی رقم مع منافع دیدے، لیکن جب تک رب المال کی رقم واپس نہیں ملتی اس کی رقم کاروبار میں استعمال ہوتی رہے گی اور نفع بھی ملتا رہے گا، اور اگر رقم پانچ ملین سے زیادہ ہو تو اس کے ملنے میں چھ سے زیادہ مہینے بھی لگ سکتے ہیں لیکن منافع بھی ملتے رہیں گے" مستفتی: ڈاکٹر عبد الرحمٰن

﴿جواب﴾ مضاربت ایک عقد غیر لازم ہے یعنی مضارب اور رب المال میں سے ہر ایک کو فسخ کرنے کا اختیار ہوتا ہے لیکن دو شرطوں کے ساتھ، ایک یہ کہ عاقدین میں سے جو بھی مضاربت کو فسخ کرنا چاہے تو دوسرے کو اس کا علم ہونا ضروری ہے، دوسری شرط یہ ہے کہ فسخ کرنے کے وقت مال نقدی کی شکل میں ہو سامان نہ ہو، اگر سامان ہو تو اس وقت تک مضاربت فسخ نہیں ہوگی جب تک اس کو بیچ کر نقدی میں تبدیل نہ کر لیا جائے۔

لہذا کمپنی کی طرف سے یہ شرط لگانا کہ رب المال نے جس تاریخ کو مضاربت ختم کرنے کا نوٹس دیا ہے اس کے بعد آنے والے چھ ماہ یا اس سے زیادہ دنوں میں اس کی رقم مع منافع کے واپس کردی جائے گی، اگر اس لئے ہے تا کہ اس مدت میں اس کی رقم سے جو سامان لیا گیا ہو کمپنی اس کو فروخت کرسکے، اور اس کے بعد سرمایہ مع منافع رب المال کے حوالے کرسکے، تو یہ شرط درست ہے شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

لما في بدائع الصنائع:(۱۰۹/۶ ،طبع:سعید)

و أما صفة هذا العقد فهو أنه عقد غير لازم و لكل واحد منهما اعني رب المال والمضارب الفسخ لكن عند وجود شرطه و هو علم صاحبه لما ذكرنا في كتاب الشركة ، ويشترط أيضاً أن يكون رأس المال عيناً وقت الفسخ دراهم او دنانير حتى لو نهى رب المال المضارب عن التصرف و رأس المال عروض وقت النهي لم يصح نهيه و له ان يبيعها لانه يحتاج الى بيعها بالدراهم والدنانير ليظهر الربح فكان النهي والفسخ ابطالاً لحقه في التصرف فلا يملك ذالك .

و لما في الهداية :(۲۶۰/۳ ،طبع:رحمانية)

قال فان عزل رب المال المضارب و لم يعلم بعزله حتى اشترى وباع فتصرفه جائز لانه وكيل من جهته و عزل الوكيل قصداً يتوقف على علمه و ان علم بعزله والمال عروض فله ان يبيعها ولا يمنعه العزل من ذالك لان حقه قد ثبت في الربح وانما يظهر بالقسمة وهي تبتني على رأس المال و انما ينض بالبيع.

و لما فيه أيضاً :(۲۶۵/۳ ،طبع سعید)

قال و كذالك ان وقت للمضاربة وقتاً بعينه يبطل العقد بمضيه لانه توكيل فيتوقت بما وقته والتوقيت مفيد فانه تقييد بالزمان فصار كالتقييد بالنوع والمكان .

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد ابرار غفرلہ ولوالدیہ

۸ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر: ۳۶۶۶

﴿بڑا بھائی اپنے نابالغ بھائیوں کا مال مضاربت پر دے سکتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم تین بھائی ایک ساتھ آباؤ اجداد کے زمانے سے شریک رہتے تھے اور ایک ساتھ کاروبار کر رہے تھے، دو پاکستان میں اور ایک ابوظہبی میں اب ان کا وہی انتقال ہوگیا، سوال یہ ہے کہ میت کے لئے ابوظہبی میں اپنے علاقے والوں کی طرف سے عطیہ کے طور پر جو فنڈ جمع ہوتا ہے وہ تو میت کے اہل وعیال کا ہوگا۔

لیکن اگر میت کے اہل وعیال کے مشورہ سے ہم دو بھائی اور میت کے اہل وعیال ایک ساتھ رہے میراث تقسیم کئے بغیر اور مذکورہ رقم جو عطیہ کے طور پر میت کے اہل وعیال کو ملی ہے) اس رقم سے ہم دو بھائی تجارت کریں کیونکہ وہ بچے تجارت وغیرہ نہیں کر سکتے اور ہم سب ایک ساتھ شریک رہیں جیسا کہ پہلے سے شریک چلے آرہے تھے تو کیا یہ شرعاً جائز ہے یا مذکورہ صورت میں میراث کی تقسیم ضروری ہے۔

(نوٹ) مرحوم کے پسماندہ گان میں ایک بیوی، چار لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں جبکہ مذکورہ اولاد میں سے ایک بچہ اور ایک بچی نابالغ ہے باقی سب اولاد بالغ ہیں، مذکورہ صورت میں اگر میراث کی تقسیم ضروری ہے تو اسکی صورت کیا ہوگی؟ سائل حاجی جمرود

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں تینوں بھائیوں کی جائیداد وغیرہ جو کہ آباء واجداد سے مشترک ہے کو شرکت املاک کہتے ہیں یہ تو حسب سابق قائم ہے اب دونوں بھائی اور تیسرے مرحوم بھائی کی اولاد چاہیں تو اسکو ویسے ہی جاری رکھیں چاہیں تو تقسیم کریں۔

البتہ ابوظہبی میں مرحوم کیلئے جو فنڈ جمع ہوا وہ صرف مرحوم کے ورثاء کا حق ہے بھائیوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں، اس فنڈ کے مالکان یعنی مرحوم کی اولاد وغیرہ چاہیں تو اپنے چچاؤں کو مضاربت کے طور پر دیدیں جسکے منافع حسب معاہدہ تقسیم کرتے رہیں لیکن رأس المال کے مالک صرف میت کے ورثاء ہی ہونگے یعنی عقد مضاربت کو ختم کرنے کے موقع پر یہ خاص رقم واپس انکو ملنا ضروری ہے اور اگر چاہیں تو سابقہ مشترکہ مال میں بلا امتیاز مخلوط کردیں تو یہ ھبہ کی صورت ہوگی جس کیلئے ھبہ کی شرائط کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے، لہٰذا نابالغ افراد کا حصہ ھبہ نہیں ہوسکتا اور بالغ افراد میں سے ہر ایک اپنا حصہ متعین کر کے اپنی ہی مرضی سے ھبہ کردے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

لمافی الهندية:(۲/۳۰۱،طبع رشيديه)

الشركة نوعان شركة ملك وهي ان يتملك رجلان شيئامن غير عقدالشركة بينهما.

ولمافي الشامي:(۶/۱۴۴،طبع امداديه)

قلت ذكروا مثل هذافي وصي اليتيم،وانه لوتصرف في ماله احدمن اهل السكة من بيع،اوشراء جازفي زماننالضرورة.وفي الخانية:انه استحسان وبه يفتى.

ولمافي الفتاوى الولوالجية:(۵/۲۰۷،طبع فاروقيه پشاور)

لوتصرف واحدمن اهل السكة في مال اليتيم من البيع والشراء وليس لليتيم وصي

وھو یعلم انہ لو رفع الامر الی القاضی فانہ یاخذ المال ویفسدہ فان تصرفہ جائز للضرورۃ۔

ولما فی البدائع:(۶/۱۱۸-۱۱۹،طبع سعید)

(واما)مایرجع الی الواھب فھو أن یکون ممن یملک التبرع لان الھبۃ تبرع فلا یملکھا من لا یملک التبرع فلا تجوز ھبۃ الصبی......منھا ان یکون محوزا فلا تجوز ھبۃ المشاع فیما یقسم

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:سلمان احمد

۹ محرم ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر:۱۸۳۶

﴿مضاربت میں مالک کا اپنے لئے کچھ نفع خاص کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ خالد نے بکر کو دس لاکھ روپے تجارت کے لئے دیئے اور یہ شرط لگادی کہ آپ مجھے منافع میں سے ماہانہ ایک ہزار روپے دیتے رہنا سال کے بعد باقی منافع ہم دونوں میں برابر تقسیم ہوگا،سوال یہ ہے کہ خالد کا اپنے لئے ماہانہ منافع خاص کرلینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ یہ معاملہ بظاہر اگرچہ مضاربت کا ہے لیکن خالد کا اپنے لئے ایک ہزار روپے منافع میں سے خاص کرنا شرط فاسد ہے،لہٰذا یہ عقد شرعاً ناجائز ہے۔

لما فی الھدایۃ:(۳/۲۶۳طبع رحمانیہ)

ومن شرطھا أن یکون الربح بینھما مشاعاً لا یستحق أحدھما دراھم مسماۃ من الربح لأن شرط ذالک یقطع الشرکۃ بینھما.

وفی حاشیتہ(۱۰)زیادۃ عشرۃ یعنی اذا قال ان مارزق اللہ فی ذالک من شئ فللمضارب منہ عشرۃ والباقی من الربح بیننا نصفان فھذہ مضاربۃ فاسدۃ لأن ھذا الشرط یوجب قطع الشرکۃ بینھما فی الربح مع حصولہ وربما لا یربح الا مقدار العشرۃ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم:صلاح الدین چترالی

۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر:۲۹۴

﴿مضارب کا مضاربت کا مال اپنے ذات کیلئے خریدنا﴾

﴿سوال﴾ مضاربت کی ایک کمپنی ہر ماہ کی 5 تاریخ تک نفع تقسیم کرتی ہے اور اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ پہلے کمپنی کے بلا واسطہ اخراجات کو منہا کیا جاتا ہے،اس کے بعد اگر مال تجارت موجود ہو تو اس دن مارکیٹ ویلیو کے مطابق اسکی قیمت فروخت لگا کر نفع معلوم کیا جاتا ہے۔کیا یہ طریقہ مضاربت شریعت کی رو سے جائز ہے؟

مستفتی:ایک مسلم

﴿جواب﴾ مستفتی نے بلا واسطہ اخراجات کی کوئی وضاحت نہیں کی ہے تاہم بلا واسطہ

اخراجات سے اگر ایسے اخراجات مراد ہوں جو کہ کاروبار میں خرید وفروخت سے متعلق رابطہ کرنے پر مثلاً موبائل کے استعمال پر خرچ ہوں یا درآمد، برآمد کے خرچے ہوں تو ان کا وصول کرنا مضاربت کے مال سے صحیح اور جائز ہے۔ اس کے علاوہ مذکورہ بالا شرط کے مطابق مال تجارت کا اس دن مارکیٹ ویلیو کے مطابق قیمت فروخت لگا کر اگر مضارب خود اس چیز کو اپنی ذات کیلئے خریدے اور رب المال کو اس قیمت پر اعتراض نہ ہو تو یہ بھی جائز ہے۔

لما فی تحفۃ الفقہاء: ص۲۹۲ طبع المکتبۃ المعروفیۃ کوئٹہ

ومنها: أن المضارب ليس له أن ينفق من مال المضاربة مادام في مصره. وإذا سافر أنفق من مال المضاربة لنفقته وكسوته ومركوبه وعلف دوابه ونفقة أجيره ومؤونته ومالا بد في السفر عنه عادة إلا مؤونة الحجامة والخضاب والنورة فهو من ماله.

ولما فی الھدایۃ: ۲۷۰/۳ طبع رحمانیہ

وإن علم بعزله والمال عروض فله أن يبيعها ولا يمنعه العزل من ذالك لأن حقه قد ثبت في الربح وإنما يظهر بالقسمة وهي تبتني على رأس المال وإنما ينض بالبيع.

ولما فی رد المحتار: ۵۲۲،۵۲۱/۵ طبع سعید

(قوله إلا من نفسه) وفي السراج: لو أمره بالبيع من هؤلاء فإنه يجوز إجماعاً إلا أن يبيعه من نفسه أو ولده الصغير أو عبده ولا دين عليه فلا يجوز قطعاً وإن صرح به الموكل اهـ منح. فالوكيل بالبيع لا يملك شراءه لنفسه لأن الواحد لا يكون مشترياً وبائعاً فيبيعه من غيره ثم يشتريه منه، وإن أمره الموكل أن يبيعه من نفسه وأولاده الصغار أو ممن لا تقبل شهادته فباع منهم جاز بزازيه كذا في البحر، ولا يخفى ما بينهما من المخالفة، وذكر مثل ما في السراج في النهاية عن المبسوط، ومثل ما في البزازيه في الذخيرة عن الطحاوي، وكأن في المسئلة قولين خلافاً لمن ادعى أنه لا مخالفة بينهما.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۲۵ جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ فتویٰ نمبر: ۳۸۱۴

﴿قرضہ سے مضاربت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ زید کا بکر پر بیس ہزار روپے قرض تھا، زید نے بکر سے کہا کہ ان بیس ہزار روپے سے آپ تجارت کریں، جو میرے آپ کے ذمہ قرض ہیں اور اس راس المال (سرمایہ) سے جو منافع آئے گا وہ ہم دونوں کے درمیان برابر تقسیم ہوگا، کیا مضاربت کی یہ صورت شرعاً درست ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مضاربت کی یہ صورت شرعاً درست نہیں ہے کیونکہ عقد مضاربت میں مال کا

نقد دینا ضروری ہے نہ کہ قرض کا مال، البتہ اس طرح عقد کرنا کہ رب المال کا کسی تیسرے آدمی کے ذمے قرض ہو اور وہ مضارب کو اجازت دیدے کہ آپ اُس قرض کو وصول کر کے اس سے تجارت کریں تو یہ صورت درست ہے، تاہم اس سے بچنا بہتر اور اولیٰ ہے۔

لمافی البحر الرائق:(۷/ ۲۶۳،طبع سعید)

وأما المضاربة بدين فان كان على المضارب فلايصح وما اشتراه له والدين في ذمته وان كان على غيره بأن قال اقبض مالي على فلان ثم اعمل به مضاربة فهو جائز وان كان مكروها لانه شرط لنفسه منفعة قبل العقد كما في المبسوط۔

ولما في البدائع:(۶/ ۸۳،طبع سعيد)

(ومنها) ان يكون راس المال عيناً لا ديناً، فان كان ديناً فالمضاربة فاسدة، وعلىٰ هذا يخرج ما اذا كان لرب المال علىٰ رجل دين فقال له اعمل بديني الذي في ذمتك مضاربة. بالنصف ان المضاربة فاسدة بلاخلاف فان اشترى هذا المضارب وباع له ربحه وعليه وضيعته والدين في ذمته عند ابي حنيفةؒ.

ولما في الهندية:(۴/ ۲۸۶،طبع رشيديه)

ومنها ان يكون راس المال عينا لا دينا فالمضاربة بالديون لا تجوز حتى ان من كان له على اخر الف درهم فامره صاحب الدين ان يعمل بها مضاربة لا تجوز المضاربة.

وكذا في شرح المجلة:(ص ۴۳۰،طبع رشيديه) والهداية:(۳/ ۲۶۴،طبع رحمانيه) والدر المختار: (۸/ ۴۳۳،طبع امداديه)

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین

۱۱ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتوی نمبر: ۱۱۴

﴿مضارب طے شدہ عقد کے خلاف اگر کرے تو کیا حکم ہوگا؟﴾

﴿سوال﴾ زید نے عمرو کو کچھ رقم دیکر کہا کہ اس سے تجارت کر کے منافع آپس میں آدھا آدھا تقسیم کریں گے اور عمرو نے زید کو بتائے بغیر یہ رقم آگے تیسرے شخص (بکر) کو دیکر اس کیساتھ آدھے منافع پر بات کر لی اب جو آدھا نفع عمرو کو ملتا ہے اسی سے وہ آدھا زید کو دیتا ہے، کیا یہ معاملہ درست ہے؟ اور اگر عمرو زید (رب المال) کو بتائے اور زید اس پر راضی ہو جائے تو پھر کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں عمرو کا زید (رب المال) کی اجازت کے بغیر کسی کو مضارب بنانا درست نہیں ہے اور نہ ہی مذکورہ طریقہ سے منافع حاصل کرنا جائز ہے، اس لئے کہ رب المال (زید) نے مضارب (عمرو) کیساتھ جس منافع کے نصف پر عقد کر لیا تھا، اسی نصف

پر عمرو نے آگے بکر (مضارب ثانی) کیساتھ عقد کرلیا اور خود اس کے لئے کچھ نہیں بچا کیونکہ منافع کے باقی نصف کا وہ نہ مالک ہے اور نہ مستحق۔

لہٰذا وہ منافع اب رب المال اور مضارب ثانی کے درمیان نصف نصف تقسیم ہوگا بلکہ اجازت ملنے کی صورت میں بھی عمرو کے لئے مذکورہ طریقہ سے منافع لینا جائز نہیں ہے۔

تاہم اگر رب المال (زید) نے منافع کی نسبت مضارب کی طرف کرتے ہوئے اس طرح کہا ہو کہ ''جو کچھ آپکو منافع حاصل ہو یا جو منافع آپ حاصل کریں وہ میرے اور آپ کے درمیان نصف نصف ہوگا تو ایسی صورت میں عمرو کا مذکورہ منافع اپنے لئے لینا جائز ہوگا بشرطیکہ زید کی طرف سے کسی اور کو مضارب بنانے کی اجازت ہو، رہی یہ بات کہ زید (رب المال) کو آگاہ کرنے کے بعد اس معاملہ کا کیا حکم ہے؟ سو اس کے صحیح ہونے میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

لمافی الهداية:(۳/ ۲۷۱،طبع رحمانيه)

ونوع لايملكه بمطلق العقد ويملكه اذاقيل له اعمل برأيك وهومايتحمل ان يلحق به فيلحق عندوجودالدلالة وذلك مثل دفع المال مضاربة اوشركة الى غيره وخلط مال المضاربة بماله اوبمال غيره

.ولمافي الشامي:(۵/ ۶۵۳سعيد)ولوقيل مارزق الله فلي الخ.

ولمافي الهداية:(۳/ ۲۶۹طبع رحمانيه)

ولوكان قال له على أن مارزق الله تعالى فلي نصفه أوقال له فماكان من فضل فبيني وبينك نصفان وقددفع الى أخرمضاربةبالنصف فلرب المال النصف وللمضارب الثاني النصف ولاشئ للمضارب الاول.....الخ.

ولمافي بدائع الصنائع:(۶/ ۹۷،طبع سعيد)

ولودفع الى الثاني مضاربة بالنصف فنصف الربح للثاني ونصفه لرب المال ولاشئ للمضارب الاول لأنه جعل جميع مايستحقه وهونصف الربح للثاني وصح جعله لانه مالك للنصف.....ولوأضافه الى المضارب فدفعه الاول مضاربة الى غيره بالثلث أوبالنصف أوبالثلثين فجميع ماشرط للثاني من الربح يسلم له وماشرط للمضارب الاول من الربح يكون بينه وبين رب المال نصفين بخلاف الفصل الاول.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: عبد الوہاب عفا اللہ عنہ

۱۵ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر:

﴿مضارب اگر معاہدہ کے خلاف کرے تو؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید

نے خالد کو پچاس ہزار روپے عقد مضاربت پر حیدر آبادی چپلوں کی تجارت کے لئے دیئے، خالد نے خلاف معاہدہ کپڑوں کی تجارت شروع کردی اور اس میں خسارہ اٹھانا پڑا، از روئے شریعت نقصان کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ مستفتی: محمد سلیم

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں خالد (مضارب) نے چونکہ معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے، اس لئے نقصان کی تمام ذمہ داری خالد پر آئے گی اور خالد زید کو تمام رأس المال یعنی پچاس ہزار روپے ادا کرے گا۔

ولمافی بدائع الصنائع:(۹۹/۶،طبع سعید)

ولوقال خذهذاالمال مضاربةبالنصف على أن تشترى به الطعام اوقال فاشتر به الطعام أوقال تشترى به الطعام اوقال خذهذاالمال مضاربةبالنصف فى الطعام فذلك كله سواء وليس له أن يشترى سوى الطعام بالاجماع لماذكرنا.وفي الهداية: (۲۶۲/۳،طبع رحمانيه)

ولمافى شرح المجلة:(۳۵۲/۴،المادة:۱۴۲۱،طبع رشيديه)

(اذاخرج المضارب عن مأذونيته وخالف الشرط يكون غاصباًوفى هذه الحالة يعود الربح والخسارفى اخذه واعطآئه عليه واذاتلف مال المضاربة يكون ضامناً).يعنى لوتجاوزبلداعينهارب المال اوشرى سلعة غيرالتى عينهاوفى وقت اومع شخص كذلك،كان غاصباًلانه تصرف فى مال الغيربغيرأمره وكان ذلك الشراء له وله ربحه وعليه خسرانه-غيرانه يتصدق بالربح عندهمالانه نماء مال الغيروعندابى يوسفؒ يطيب له الربح.وكذافى الدرالمختار:(۳۳۷/۸،طبع امداديه)

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ ‏ واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۱۱ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ ‏ فتویٰ نمبر: ۱۱۳

﴿مضارب خلاف شرع کوئی معاملہ کرے گا تو وہی گناہ گار ہوگا﴾

﴿سوال﴾ ہم نے ایک کمپنی کو مضاربت کے طور پر کچھ رقم دی ہے بظاہر لوگ دیندار ہیں امید ہے کہ ناجائز تجارت نہیں کرتے ہونگے اور چونکہ ہمارے لئے تو ہر معاملہ کی نوعیت معلوم کرنا مشکل ہے لہذا اگر کوئی خلاف شرع معاملہ ہوا تو کیا ہم گناہ گار ہونگے؟ کیا یہ طریقہ مضاربت صحیح ہے؟

﴿جواب﴾ مضاربت کا معاملہ اعتماد پر مبنی ہوتا ہے اس وجہ سے ایک شخص دوسرے کو پیسے دیتا ہے تاکہ وہ ان پیسوں سے تجارت کرے جو کہ عین شریعت کے مطابق ہے۔ اور اس کے

پیچھے پڑنا اعتماد کے خلاف ہے جس پر یہ معاملہ مبنی ہے، لہٰذا رب المال کا اس کے پیچھے پڑنا اور اس کے ہر معاملے تک پہنچنا نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی اس کا مکلف ہے۔ اور ویسے بھی دین اسلام ایک دوسرے پر اعتماد و حسن ظن کا حکم دیتا ہے اور یہ کہ مسلمان کے افعال و تصرفات کو صحت و سلامتی پر محمول کیا جائے۔ الا یہ کہ فساد و بطلان پر کوئی واضح دلیل قائم ہو، لہٰذا خلاف شرع کام کرنے پر مضارب ہی گناہگار ہوگا آپ لوگ گناہگار نہیں ہوں گے۔

لمافی الهدایه: ۲۶۲/۳، طبع رحمانیة

وهی مشروعة للحاجة الیهافان الناس بین غنی بالمال غبی عن التصرف فیه وبین مهتد فی التصرف صفر الید عنه فمست الحاجة الی مشروع هذا النوع من التصرف لینتظم مصلحة الغبی والذکی والفقیر والغنی وبعث النبی ﷺ والناس یباشرونه فقررهم علیه وتعاملت به الصحابة ثم المدفوع الی المضارب امانة فی یده لانه قبضه بامر مالکه لاعلی وجه البدل والوثیقة وهو وکیل فیه لانه یتصرف فیه بامر مالکه.

ولمافی البذل المجهود: ۸۴،۸۳/۴ کتاب الضحایاباب اللحم لایدری اذکراسم الله علیه ام لا

حدثناموسی بن اسمعیل ـــ عن عائشةؓ انهم قالوایارسول الله ﷺ ان قوماحدیث عهدبجاهلیة یاتون بلحمان لاندری اذکروااسم الله علیهاام لم یذکرواانأکل منهافقال رسول الله ﷺ سموالله وکلوا. کانه ﷺ ارشدهم بذالک الی حمل حال المؤمن علی الصلاح وحسن الظن به وان کان جاهلا۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ	واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ
۱۳ جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ	فتوی نمبر: ۳۷۹۰

﴿مضاربت میں منافع کی تقسیم کا شرعی طریقہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کہ بارے میں کہ زید اور عمرو نے مضاربت کا معاملہ کیا زید نے پیسہ لگایا اور عمرو کی محنت ہے، دونوں کا یہ کہنا ہے کہ ہمیں مشکل یہ درپیش ہیکہ ہمارے کام میں آئیٹم بہت زیادہ ہیں اور ایک چیز ہم نے ۱۰۰ روپے میں لی ہے تو کبھی ۱۰۵ میں اور کبھی ۲۰۰ میں اسکو فروخت کرتے ہیں، اسوجہ سے مہینہ کے آخر پورے مہینہ کا منافع معلوم کرنا ممکن نہیں، ایسی صورت میں فیصد کے حساب سے منافع کی تقسیم میں اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ ادائیگی مکمل نہ ہو اور حصہ سے کم رقم دی جائے تو ایسی صورت میں زید اور عمرو باہمی رضامندی سے ہر مہینہ کی رقم متعین کرلیں مثلاً ۱۵۰۰۰ روپے ماہانہ زید کو دیئے جائیں یا پھر ہر مہینہ کچھ رقم

بلا تعیین باہمی رضامندی سے زید کو دی جائے۔ مثلاً ہر مہینہ کے آخر میں دونوں جس رقم پر راضی ہوجائیں کبھی ۲۰۰۰۰ اور کبھی ۱۵۰۰۰۔ دونوں میں سے کونسی صورت جائز ہے؟

﴿جواب﴾ سوال میں تجویز کردہ ہر دونوں صورتیں ناجائز ہیں، حاصل ہونے والے منافع کی تقسیم کیلئے باہمی رضامندی سے فیصدی شرح مقرر کرنا ضروری ہے، آپکی تجویز کردہ صورت میں متعین رقم (۱۵۰۰۰ روپے یا ۲۰۰۰۰) اس شرط کے منافی ہے، حساب کرنا کوئی مشکل کام نہیں، ایک ایک چیز کی قیمت فروخت معلوم ہونا کوئی ضروری نہیں ہے، مہینہ کے آخر میں حاصل شدہ منافع کا مجموعہ معلوم ہونا ضروری ہے تاکہ مقرر شدہ شرح کی نسبت سے آپس میں تقسیم کرسکیں۔

لمافی التنویر مع الدر:(۱۲۸/۵، طبع سعید)

(وکون الربح بینهما شائعا) فلو عین قدرا فسدت (وکون نصیب کل منهما معلوما) عند العقد.

ولمافی بدائع الصنائع:(۸۵/۲-۸۶، طبع سعید)

(ومنها) ان یکون المشروط لکل واحد منهما من المضارب ورب المال من الربح جزأ شائعا نصفا أو ثلثا أو ربعا فان شرطا عددا مقدرا بان شرطا ان یکون لاحدهما مائة درهم من الربح او اقل او أکثر والباقی للاخر لا یجوز والمضاربة فاسدة لان المضاربة نوع من الشرکة وهی الشرکة فی الربح وهذا شرط یوجب قطع الشرکة فی الربح لجواز ان لا یربح المضارب الا هذا القدر المذکور فیکون ذلک لاحدهما دون الآخر فلا تتحقق الشرکة فلا یکون التصرف مضاربة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: نعمان اقبال عفااللہ عنہ

۷ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۳۹۵

﴿مضاربت میں نقصان اصل سرمایہ سے پورا کیا جائیگا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ زید نے بکر کو تجارت کرنے کیلئے رقم دی اور تقسیم منافع میں یہ شرط قرار پائی ہے کہ زید یعنی رقم دینے والا صرف ایک حصہ منافع لے گا اور بکر یعنی کام کرنے والا دو حصے، اسی طرح نقصان میں بھی زید ایک حصہ نقصان اٹھائے گا اور بکر دو حصے، کیا اس طریقے سے معاملہ کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: محمد شعیب

﴿جواب﴾ سوال میں ذکر کردہ صورت عقد مضاربت ہے، نفع ونقصان میں شراکت جس نسبت سے طے ہوئی ہے شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں ہے لیکن ایک بات واضح رہے کہ

مضاربت میں خدانخواستہ نقصان ہو جائے تو اسکی تلافی پہلے حاصل شدہ منافع سے کی جائیگی، بالفرض منافع کی تقسیم کئی بار ہوئی ہو تو اسکی تلافی کیلئے ہر ایک شریک پہلے حاصل کرنے والے منافع کی نسبت سے واپس جمع کریگا اور وہ نقصان پورا کیا جائیگا لیکن تمام منافع واپس جمع کرنے کی صورت میں بھی نقصان کی تلافی خدانخواستہ نہ ہوسکے تو اس صورت میں زائد نقصان اصل سرمایہ کو ہوگا کام کرنے والے کے ذمہ واجب نہ ہوگا۔

لمافی الدر مع الرد:(۶۴۸/۵ طبع ایچ ایم سعید)

کل شرط یوجب جهالة فی الربح اویقطع الشرکة فیه یفسدها والا بطل الشرط وصح العقد اعتبارا بالوکالة.

وفی الشامیة:(قوله بطل الشرط)کشرط الخسران علی المضارب.

ولمافی تبیین الحقائق:(۵۲۱/۵، طبع ایچ ایم سعید)

(وکل شرط یوجب جهالة الربح یفسدها والا لا ویبطل الشرط کشرط الوضیعة علی المضارب)ای اذالم یکن مؤدیا الی جهالة الربح لایفسدها بل یبطل الشرط.

ولمافی الفتاوی الهندیة:(۲۸۸/۴ طبع رشیدیه کوئٹه)

قال القدوری فی کتابه کل شرط یوجب جهالة الربح اوقطع الشرکة فی الربح یوجب فساد المضاربة ومالا یوجب شیئامن ذلک لایوجب فسادها نحوان یشترطا ان تکون الوضیعة علیهما کذا فی الذخیرة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۲۲ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۶۴۳

﴿مضاربت میں رعایت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید مضاربت پر چشمے کا دکان چلا رہا ہے، کیا زید کو اس بات کا اختیار ہے کہ علماء اور طلباء کو کم منافع رکھ کر چشمہ دے یا رب المال کی اجازت ضروری ہے؟ مستفتی: محمد اقبال ڈیروی

﴿جواب﴾ رب المال نے زید کو باقاعدہ رعایت دینے سے اگر روکا نہیں ہے یعنی مضاربت کا معاملہ اگر عام رکھا گیا ہے تو ایسی صورت میں زید کے لئے جائز ہے کہ علماء اور طلباء کو اتنی رعایت کیساتھ اشیاء دیں جتنی رعایت کیساتھ دینا عام تاجروں کے ہاں معروف ہو، البتہ معروف رعایت سے زیادہ رعایت کیساتھ اشیاء دینے کا حق زید کو اس وقت حاصل ہوگا، جب

رب المال اسکی صراحت کیساتھ اجازت دے انکی اجازت کے بغیر زید کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔

لمافی التنویرمع الدر:(۶۲۸/۵-۶۲۹ طبع سعید)

(ویملک المضارب فی المطلقة)التی لم تقید بمکان اوزمان اونوع (البیع)ولو فاسدا(بنقدونسیئة متعارفة والشراء والتوکیل بهما والسفربرا وبحرا)

وفی الشامیة:ولیس له ان یعمل بمافیه ضررولامالایعمله التجارولیس لاحد المضاربین ان یبیع اویشتری بغیر اذن صاحبه ولواشتری بمالایتغابن الناس فی مثله یکون مخالفا.

ولمافی الهندیة:(۲۹۱/۴-۲۹۲ طبع رشیدیه)

ألاصل أن مایفعله المضارب ثلاثة أنواع نوع یملکه بمطلق المضاربة وهومایکون من باب المضاربة وتوابعها...... ویملکه اذاقیل له اعمل برأیک وهومایحتمل ان یلحق به فیلحق به عندوجودالدلالة..... یجوزللمضارب ان یبیع بالنقدوالنسیئة کذافی الکافی ..... وان حط عنه شیئابعیب مثل مایحط التجارفی مثل ذلک العیب أویتغابن به الناس فذلک جائزلانه من صنع التجارولوحط عنه شیئافاحشا اوحط بغیرعیب جازذلک علی المضارب خاصة فی قول ابی حنیفة ومحمد رحمهما الله تعالی وهوضامن لذلک لرب المال.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: احمد علی عفی عنہ

۲۸ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۶۵۸

﴿عقد مضاربت کے فاسد ہونے کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے میزان بینک میں اکاؤنٹ کھلوایا ہے اور یہ عزم کیا ہے کہ اس اکاؤنٹ کے منافع غرباء اور محتاج قسم کے لوگوں کو دیا کروں گا، اکاؤنٹ کی تفصیل یہ ہے کہ میں نے مثلاً یکم جنوری کو اگر ایک لاکھ روپے بینک میں جمع کروائے اور دوران ماہ بھی جمع کرتا رہا یہاں تک کہ مہینے کے آخر میں اگر دس لاکھ تک بھی پہنچ جائیں لیکن مجھے منافع صرف ایک ہی لاکھ پر دیئے جائیں گے جبکہ زائد رقم شمار نہیں کی جائے گی اور اگر بالفرض میں نے ۲۶ تاریخ کو پندرہ ہزار روپے کے علاوہ باقی ساری رقم اکاؤنٹ سے نکلوادی اور ۳۱ تاریخ کو اکاؤنٹ میں صرف پندرہ ہزار کی رقم باقی رہ گئی تو مجھے صرف پندرہ ہزار پر منافع ملے گا، ۳۱ تاریخ سے پہلی نکلوائی گئی رقم کے منافع نہیں ملیں گے۔اب پوچھنا یہ ہے کہ شریعت کی روشنی میں اس عقد کی کیا حیثیت ہے؟

مستفتی: ڈاکٹر عبدالرحمٰن ڈی آئی خان

﴿جواب﴾ مذکورہ معاملہ مندرجہ ذیل تین وجوہات کی بناء پر جائز نہیں:

(۱): عقد مضاربت کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ رأس المال (سرمایہ) معلوم ہو اور یہاں رأس المال میں جہالت آ جاتی ہے، یعنی نکالنے اور جمع کرنے کی صورت میں ایک واضح مقدار نہیں رہتی، اس لئے کہ اکاؤنٹ ہولڈر کو اجازت ہوتی ہے کہ جب چاہے رقم نکلوا سکتا ہے، تو مہینے کی آخری تاریخ تک معلوم نہیں، کہ کتنی رقم اکاؤنٹ میں رہے گی،

(۲): اسی طرح ہر وہ شرط جس سے ربح (نفع) میں جہالت آتی ہو اس سے مضاربت فاسد ہو جاتی ہے، اور یہاں بینک والوں کا یہ شرط لگانا کہ ہم آپ کو آخری تاریخ کے اعتبار سے ربح (نفع) دیں گے، یعنی مہینے کی آخری تاریخ کو جتنی رقم اکاؤنٹ میں رہ گئی ہو اس کے اعتبار سے ربح (منافع) دیں گے، چونکہ آخری تاریخ کو معلوم نہیں کہ کتنی رقم اکاؤنٹ میں بچتی ہے، اس لئے کہ اکاونٹ ہولڈر اس بات کا مجاز ہوتا ہے، کہ جب چاہے رقم نکلوا سکتا ہے، تو رأس المال (اصل سرمایہ) میں جہالت آنے کی وجہ سے ربح (منافع) میں بھی جہالت آ جاتی ہے، جو کہ جائز نہیں۔

(۳): اسی طرح ہر وہ شرط جو ربح (نفع) میں شرکت کو ختم کرے، اس سے بھی مضاربت فاسد ہو جاتی ہے، اور یہاں بینک والوں کا یہ شرط لگانا کہ اگر آپ نے ۲۶ یا ۲۷ وغیرہ تاریخ کو رقم نکلوائی تو ان ۲۶ یا ۲۷ دنوں کا آپ کو کوئی نفع نہیں ملے گا، ربح (نفع) میں شرکت کو ختم کر دیتا ہے جس کا اثر اصل عقد پر بھی ہو جاتا ہے اور عقد فاسد ہو جاتا ہے۔

اور یاد رہے کہ عقد فاسد کو برقرار رکھنا حکماً سود کے زمرے میں آتا ہے جو کہ حرام اور بہت بڑا گناہ ہے لہٰذا ایسے معاملات کو فوری طور پر ترک کر دینا ضروری ہے اور اگر ماضی میں کئے ہوں تو ان پر توبہ واستغفار کرنا چاہئے۔

لما فی جامع الترمذی (۱/۲۱ الفاروقی کتب خانه)

والمسلمون على شروطهم الاحرم حلالا اواحل حراما

ولما فی التنویر مع الدر (۵/۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، سعید)

(هي عقد شركة في الربح بمال من جانب وعمل من جانب وركنها الايجاب والقبول۔۔۔(وشرطها أمور سبعة(كون رأس المال من الاثمان)كما مر في الشركة وهو معلوم للعاقدين (وكون رأس المال عينا لادينا وكونه مسلما الى المضارب۔۔۔(وكون الربح بينهما شائعا وكون نصيب كل منهما معلوما)عند العقد و۔۔۔وفي الجلالية كل شرط يوجب جهالة في الربح او يقطع الشركة فيه يفسدها والا بطل الشرط وصح العقد اعتبارا بالوكالة

ولما في درر الحكام(٣/٢٥٤ ماجديه)

(اذاوقت رب المال المضاربة بوقت معين فبمضي ذلك الوقت تنفسخ المضاربة

ولما في بدائع الصنائع (٦/٨٢،٨٦سعيد)

(ومنها)ان يكون معلومافان كان مجهولة لاتصح المضاربة لان جهالة رأس المال تؤدى الى جهالة الربح وكون الربح معلوما شرط صحة المضاربة ....والاصل في الشرط الفاسد اذا دخل في هذا العقد انه ينظر ان كان يؤدى الى جهالة الربح يوجب فساد العقد لان الربح هو المعقود وجهالة المعقود عليه توجب فساد العقد.

ولما في الدر والرد(٥/١٦٨،١٦٩سعيد)

ولو حكما فدخل ربا النسيئة والبيوع الفاسدة: فكلها من الربا

وقال الشاميّ تحت هذه العبارة "تبع فيه البحر عن البناية وفيه نظر فان كثير من البيوع الفاسدة ليس فيه فضل خال عن عوض كبيع ما سكت عن الثمن ،وبيع عرض بخمر او بأم ولد فتجب القيمة ويملك بالقبض وكذا بيع جذع من سقف وذراع من ثوب يضره التبعيض ،وثوب من ثوبين والبيع الى النيروز ونحو ذالك مما سبب الفساد فيه الجهالة اوالضرر او نحو ذالك ،نعم يظهر ذالك في الفساد بسبب شرط فيه نفع لاحد العاقدين مما لا يقتضيه العقد ،ولا يلائمه ويؤيد ذالك مافي الزيلعي قبيل باب الصرف في بحث ما يبطل بالشرط الفاسد حيث قال :والاصل فيه ان كل ما كان مبادلة مال بمال يبطل بالشروط الفاسدة لا ماكان مبادلة مال بغير مال او كان من التبرعات لان الشروط الفاسدة من باب الربا وهو يختص بالمعاوضة المالية دون غيرها من المعاوضات والتبرعات لان الربا هو الفضل الخالي عن العوض وحقيقة الشروط الفاسدة هي زيادة مالا يقتضيه العقد ولا يلائمه فيكون فيه فضل خال عن العوض وهو الربا بعينه .

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: برکت اللہ ثاقب نکوی

۶ شعبان ۱۴۳۳ھ — فتوی نمبر:

﴿كتاب المزارعة﴾

﴿مزارعت کا حکم اور صحت مزارعت کی شرائط﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مزارعت کے لئے زمین دینا جائز ہے کہ نہیں؟ اور مزارعت کے صحیح ہونے کی کیا شرائط ہیں؟

﴿جواب﴾ مزارعت کے لیے زمین دینا جائز ہے، اور مزارعت کے صحیح ہونے کے لئے فقہاء کرام نے آٹھ شرائط بیان فرمائی ہیں:

(۱) زمین زراعت کی صلاحیت رکھتی ہو، شور یا زیر آب ہونے کی وجہ سے نا قابل کاشت نہ ہو۔(۲) زمیندار اور مزارع اہل عقد میں سے ہوں۔(۳) بٹائی کی مدت متعین ہو۔(۴) صاحب تخم کی تعیین ہو یعنی بیج کس کی طرف سے ہوگا اور بیج کسی ایک جانب سے ہونا ضروری ہے اگر بیج دونوں کے درمیان مشترک ہوا تو عقد مزارعت فاسد ہو جائے گا۔(۵) تخم کی جنس کی تعیین ہو۔(٦) مالک زمین اور بٹائی دار دونوں کے لیے تناسب متعین ہو مثلاً نصف یا تہائی وغیرہ۔

(۷) زمین مزارع کے حوالے کر دی جائے اور مزارع کے لئے اس میں کھیتی سے کوئی چیز مانع نہ ہو۔(۸) پیداوار میں دونوں شریک ہوں۔

لما في التنوير مع الدر:(٦/٢٧٥، كتاب المزارعة، طبع سعيد)

(ولا تصح عند الامام وعندهما تصح، وبه يفتى) للحاجة، وقياسا على المضاربة (بشروط) ثمانية (صلاحية الأرض للزرع وأهلية العاقدين، وذكر المدة و) ذكر (رب البذر) ذكر (جنسه و) ذكر (قسط) العامل (الآخر) بشرط (التخلية بين الأرض والعامل و) بشرط (الشركة في الخارج)

ولما في البحر الرائق:(٨/١٥٩، كتاب المزارعة، طبع سعيد)

(وتصح بشرط صلاحية الأرض للزراعة وأهلية العاقدين وبيان المدة ورب البذر وجنسه وحظ الآخر والتخلية بين الأرض والعامل والشركة في الخارج)

ولما في العالمگيرية:(٥/٢٣٨، طبع رشيديه)

فان كانت الأرض لأحدهما وشرطا ان يكون البذر منهما ان شرطا العمل على غير صاحب الأرض وشرطا ان يكون الخارج بينهما نصفين كانت فاسدة لأن صاحب الأرض..... لأن هذه مزارعة بجميع الخارج بشرط اعارة نصف الأرض من العامل.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد شعیب پشاوری

۱۱ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۳۰۰۶

﴿مزارعت کی زمین میں سے کچھ پھل سبزیاں وغیرہ بطور ہدیہ دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے ایک زمین مزارعت پر لی ہے جس میں مختلف قسم کی سبزیاں وغیرہ کاشت کرتا ہے اور فصل کاٹنے سے پہلے کبھی کوئی دوست وغیرہ آ جاتا ہے تو اسکو کوئی سبزی وغیرہ کاٹ کر دے دیتا ہے جبکہ زمین کا مالک بھی اسکو اس طرح کرنے سے نہیں روکتا، اب پوچھنا یہ ہے کہ مالک ارض کی صریح اجازت کے

بغیر اس طرح ہدیہ دینا زید کے لئے جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: برکت اللہ

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں جب مالک کی طرف سے دلالۃً اجازت ہے تو صراحۃً اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے، کچھ سبزی پھل وغیرہ تحفۃً دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

لما فی الدر مع الرد:(۲۰۰/۶ طبع:سعید)

لایجوز التصرف فی مال غیره بلااذنه ولا ولایته الا فی مسائل مذکورة فی الاشباه.

وفی الشامیة:وفی القنیه:أخذ أحدالشرکین حمار صاحبه الخاص،وطحن به فمات لم یضمن للاذن دلالة قال عرف بجوابه..... وان لم یوجد صریحا کما لو فعل بحمار ولده أو بالعکس أو أحدالزوجین أو أرسل جاریة زوجته فی حاجته فأبقت اه.

ولما فی شرح المجلة:(۲۲۶/۱،طبع رشیدیه)

وفی القنیة:أخذ أحدالشرکین حمار صاحبه الخاص الخ وفیه أیضا:ج۳ص۲۱:وأما الاذن دلالةً،فضابطه أن الاستعمال الذی لایختلف باختلاف المستعمل کسکنی الدار وخدمة العبد وتحمیل الدابة،یکون مأذوناً فیه دلالةً.ومایختلف باختلاف المستعمل کرکوب الدابة ولبس الثوب، لایکون مأذوناً فیه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: طاہر زمان راولپنڈی

۲۱ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر: ۲۸۹۶

﴿عقد مزارعت میں شریک دوسرے کی اجازت کے بغیر کچھ استعمال نہیں کرسکتا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عقد مزارعت میں کسان مالک زمین کی اجازت کے بغیر فصل میں سے کچھ حصہ اپنے کام میں لاسکتا ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ عقد مزارعت اپنے مال کے اعتبار سے عقد شرکت ہے مالک زمین کاشتکار کیساتھ شریک ہے اور شراکت میں دوسرے شریک کی اجازت کے بغیر کوئی چیز استعمال کرنا جائز نہیں، اجازت ضروری ہے صراحۃً ہو یا دلالۃً۔

لما فی فتح القدیر:(۴۷۳/۹، طبع رشیدیه)

وقالا : هی جائزة لما روی "ان النبی علیه الصلاة السلام عامل اهل خیبر علی نصف مایخرج من ثمر او زرع" ولانه عقد شرکة بین المال والعمل فیجوز اعتبارا بالمضاربة و الجامع دفع الحاجة.

لما فی الترمذی:(۱۳۵/۲، طبع فاروقی، کتاب خانه ملتان)

عن سلیمان بن عمرو بن الاحوص قال: حدثنی ابی انه شهد حجة الوداع مع رسول

الله ﷺ فحمد الله واثنى عليه وذكر و وعظ .... الا ان المسلم اخو المسلم فليس يحل لمسلم من اخيه شيء الا ما حل من نفسه الخ.

ولما في مشكوة المصابيح (ص۲۵۵، طبع سعيد)

عن ابی حرة الرقاشی عن عمه قال قال رسول الله ﷺ الا لاتظلموا الا لايحل مال امرى الا بطيب نفس منه.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد امیر ملک قائد آبادی

۲۳ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتوی نمبر: ۳۰۷۹

﴿عقد مزارعت کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید وبکر نے عقدِ مزارعت کی اس طور پر کہ شفتالو کا تخم زید کا اور زمین بکر کی ہوگی اور جب درخت پیوند کاری کے قابل ہو جائیں تو پیوند کاری بھی زید کے ذمہ ہوگی البتہ جو حاصل ہوگا وہ نصف نصف ہوگا، کیا عقدِ مزارعت کی یہ صورت صحیح ہے؟ مستفتی: ایک سائل وزیرستان

﴿جواب﴾ مزارعت کا مذکورہ معاملہ شرعاً درست ہے، شفتالو کے درخت اس صورت میں زید کی ملکیت ہیں، اور ان سے حاصل پھل میں سے آدھا حصہ بکر کو، زید گویا زمین کا کرایہ ادا کر رہا ہے۔

لما في صحيح البخاري: ۱۹۶، طبع دار الكتب العربي.

عن عبد الله بن عمرؓ: ان النبي ﷺ عامل خيبر بشطر ما يخرج منها من ثمر او زرع.

ولما في شرح فتح القدير: ۴۷/۹، طبع رشيديه.

(وان كان الارض لواحد والعمل والبقر والبذر لواحد جازت) لانه استئجار الارض ببعض معلوم من الخارج فيجوز كما اذا استأجرها بدراهم معلومة.

ولما في الدر مع الرد: ۲۷۸/۶، طبع سعيد.

(وكذا) صحت (لو كان الارض والبذر لزيد والبقر والعمل للآخر) او الارض له والباقي للآخر (او العمل له والباقي للآخر) فهذه الثلاثة جائزة، (قوله فهذه الثلاثة جائزة) لان من جوزها انما جوزها على انها اجارة، وفي الثانية يكون رب البذر مستأجرا للارض باجر معلوم من الخارج فتجوز كاستئجارها بدراهم في الذمة.

ولما في فتاوى الهندية: ۲۳۸/۵، طبع رشيدية.

فاحدها ان تكون الارض من احدهما والبذر والبقر والعمل من الآخر وشرطا لصاحب الارض شيئا معلوما من الخارج جاز لان صاحب البذر يكون مستأجرا الارض بشيء معلوم من الخارج.

ولما فی بدائع الصنائع:۲۷۱/۸ طبع بیروت.

ومنھا:ان تکون الارض من جانب والباقی کله من جانب وهذا ایضا جائز۔۔۔۔۔لان العامل یصیر مستأجرا للارض .لاغیر.ببعض الخارج، الذی هو نماء ملکه ووهو البذر.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب :عمر فاروق لاہوری

۲۰ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر :۳۶۸۱

﴿اگر مقررہ وقت پر فصل تیار نہ ہو تو کیا حکم ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ سے متعلق کہ ایک آدمی نے دوسرے کو اپنی زمین ایک خاص مدت کے لیے مزارعت پر دی چنانچہ اس نے فصل لگائی لیکن مدت پوری ہونے پر فصل تیار نہ ہوئی بلکہ مزید ایک مہینہ انتظار کرنا پڑا، اب رب الارض اضافی مدت کی اجرت مانگ رہا ہے، کیا شرعاً رب الارض کا یہ مطالبہ درست ہے یا نہیں اور مزارع کے ذمہ اجرت دینا لازم ہے یا نہیں؟ وضاحت فرمائیں۔ مستفتی :سجاول خان

﴿جواب﴾ رب الارض کا مطالبہ درست ہے، مزارع کو چاہیے کہ مدت ختم ہونے سے لیکر فصل تیار ہونے تک کا جو عرصہ ہے اپنے حصہ کی اجرت مثل مالک زمین کو دے جیسا کہ اجارہ میں ہوتا ہے، کیونکہ مزارع نے اپنے حصے کے پکنے اور تیار ہونے کے لیے غیر کی زمین کو مقررہ وقت سے زیادہ مصروف رکھا ہے اس لیے زمین کے مالک کا حق بنتا ہے۔

لما فی التنویر والدر:(۲۸۰/۶ طبع: سعید)

(فان مضت المدة قبل ادراك الزرع فعلى العامل اجر مثلنصيبه من الارض الى ادراكه ،أى الزرع كما فى الاجاره.

ولما فی الرد المحتار:(۲۸۰/۶ طبع: سعید)

(قوله فان مضت المدة الخ)الاولى الاتيان بالواو بدل الفاء. كما فى الملتقى واعلم ان من تتمة الاحكام هذه المسئلة كون نفقة الزرع عليهما بقدر الحصص الى ان يدرك .وعبارة الدر والمغرر :مضت المدة قبل ادراكه فعلى المزارع اجر مثل نصيبه من الارض حتى يدرك الزرع لانه استوفى منفعة بعض الارض لتربية حصته فيها الى وقت الادراك

ولما فی البحر الرائق:(۱۶۳/۸ طبع: سعید)

(فان مضت المدة والزع لم يدرك فعلى المزارع اجر مثل ارضه حتى يدرك يعنى يجب على العامل اجر مثل الارض للأخر حتى يستحصد وظاهر العبارة انه يجب عليه جميع الاجره وليس كذلك فلو قال فى نصيبه لكان اولى واسلم لان العقد قد انتهى

بمضی المدة وفی القلع ضرر فبقینا باجر المثل الی ان یستحصد فیجب علی غیر صاحب الارض بحصته من الاجرة لانه استوفی منفعة الارض بقدره.

ولما فی المبسوط للسرخسی: (۲۳/۳۶، طبع: بیروت)

فان انقضت المدة والزرع بقل بعد فالزرع بین العامل ورب الارض نصفان کما کان الشرط بینهما، والعمل فیما بقی علیهما لان العمل کان علی المزارع فی المدة وقد انتهت المدة والعمل بعد ذلک یکون باعتبار الشرکة فی الزرع وهما شریکان فی الزرع فالعمل والمؤنة علیهما کنفقة العبد المشترک بینهما اذا کان عاجزا عن الکسب وعلی العامل اجر مثل نصف الارض لان المزارعة لما انتهت لم یبق للعامل حق فی منفعة الارض وهو یستوفی منفعة الارض بتربیة نصیبه من الزرع فیما الی وقت الادراک فلا یسلم له ذلک بل علیه اجر مثل نصف الارض لصاحبها.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق انکی

۲۷ جمادی الثانیہ ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر ۳۰۱/۱۰

﴿مزارعت کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا چاول کا کھیت ہے چاول کی کاشتکاری کیلئے میں نے زید کو آدھے حصہ پر عامل بنا کر زمین اس کو حوالہ کر دی علاقے میں پانی کی قلت کی وجہ سے کاشتکاروں کی باریاں مقرر ہیں چنانچہ زید (جو کہ عامل ہے) سستی اور غفلت کی وجہ سے اپنی باری میں نہیں آتا جسکی وجہ سے تقریباً آدھی فصل خراب ہوگئی اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا میں زید سے ہلاک شدہ فصل کا ضمان لے سکتا ہوں یا نہیں؟ مستفتی: زبیر خان

﴿جواب﴾ کھیت کا نقصان واقعی مزارع (عامل) کی سستی اور غفلت کی وجہ سے ہوا ہے تو آپ اپنے حصے کے برابر تاوان عامل سے وصول کر سکتے ہیں نقصان کے اندازہ کا فیصلہ قاضی یا علاقے کے تجربہ کار لوگ کریں گے

لمافی تنویر الابصار مع الدر المختار: (۶/۲۸۳، طبع: سعید)

واذاقصر المزارع فی سقی الارض حتی هلک الزرع (بهذا السبب (لم یضمن) المزارع فی المزارعة (الفاسدة) ویضمن (فی الصحیحة) لوجوب العمل فیها کمامر وهی فی یده امانة فیضمن بالتقصیر فی السراجیة اکار ترک السقی عمدا حتی یبس ضمن وقت ما ترک السقی قیمته نابتا فی الارض وان لم یکن للزرع قیمته قومت الارض مزروعة وغیر مزروعة فیضمن فضل مابینهما ....

ولما في الفتاوى الهندية :(۲۸۳/۲،طبع رشيديه)

لوكان الأكار ترك سقي الارض مع القدرة عليه حتى يبس فانه يضمن قيمة الزرع والمعتبر في التقويم حين صار الزرع بحال يضره ترك السقي فان لم يكن للزرع قيمة حينئذ فانه تقوم الأرض مزروعة فيضمن نصف فضل مابينهما

ولما في خلاصة الفتاوى :(۱۹۸/۱،طبع: رشيديه)

الأكار ترك اسقي حتى فسد الزرع يضمن نصيب رب الا ارض ويعتبر قيمة الزرع يوم ترك السقي فان لم للزرع قيمة في ذالك الوقت يقوم الارض مزروعة ويقوم غير مزروعة فيضمن فضل ما بينهما

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سمیع الرحمٰن ذیروی

۱۷ محرم الحرام ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر:

﴿مالک زمین کا اپنے لئے بھوسے کی شرط لگانا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عقد مزاعت میں اگر مالک زمین اپنے لئے یہ شرط لگالے کہ بھوسہ سارا میرا ہوگا اور باقی فصل کو آدھا آدھا تقسیم کرینگے تو کیا یہ شرط لگانا جائز ہے؟ اور اس سے معاملہ فاسد تو نہیں ہوگا؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ بھوسے کے بارے میں فقہاء کرام نے یہ قاعدہ ذکر کیا ہے کہ یہ صاحب بذر یعنی جس کے ذمہ بیج ہو اس کا حق ہے لیکن اگر عرف میں اس کو بھی تقسیم کرنے کا رواج ہو تو تقسیم کرنا بھی جائز ہے، لہٰذا اگر بیج مالک زمین کی طرف سے ہو، تو اس کا اپنے لئے بھوسے کی شرط لگانا جائز ہے، لیکن اگر بیج کاشتکار کی طرف سے ہو تو ایسی صورت میں مالک زمین اپنے لئے بھوسے کی شرط لگانا جائز نہیں ہے، اس سے عقد فاسد ہو جائے گا۔

لما في التنوير مع الدر:(۲۷۶/۲-۲۷۷،طبع ایچ ایم سعید)

(فتبطل ان شرط لاحدهما قفزان مسماة......أو)شرط(التبن لاحدهما والحب للآخر......وان شرط تنصيف الـ ـب والتبن لصاحب البذر)كماهومقتضى العقد(أولم يتعرض للتبن صحت)وحينئذالتبن لرب البذر وقيل بينهماتبعاللحب كذاقاله المصنف تبعاللصدر وغيره لكن اعتمد صاحب الملتقى الثاني حيث قدمه فقال: والتبن بينهما وقيل لرب البذر.

وفي الشامية:وقال مشائخ بلخ :التبن بينهماأيضااعتبارًاللعرف فيمالم ينص عليه المتعاقدان ......أقول والحاصل أن مبنى كل من المسألتين على اعتبار العرف

کما ھو مذھب البلخیین ،لکن انضم الی الاولیٰ مع العرف موافقتھا لظاھر الروایۃ من کون التبن لرب البذر فصارت وفاقیۃ وبقیت الثانیۃ مبنیۃ علی مذھبھم فقط.

ولما فی الھندیۃ:(۲۹۳/۵،طبع قدیمی)

وأما الشروط المفسدۃ للمزارعۃ فأنواع.....ومنھا شرط التبن لمن لم یکن البذر من قبلہ.

الجواب صحیح:عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب:عباد اللہ غفر لہ ولوالدیہ

۱۸ربیع الاول ۱۴۳۲ھ　　　فتویٰ نمبر:۳۰۶۵

﴿مزارعت کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ زمین کا مالک کاشتکار کیساتھ مزارعت کا معاملہ اس طرح کرے کہ صرف بیج میری طرف سے ہوگا، باقی سب کام آپکے ذمہ تو شرعا یہ معاملہ درست ہوگا یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مزاعت کا مذکورہ معاملہ شرعا درست ہے اور یہ ایسا ہے گویا مالک زمین نے کاشتکار کو اجرت پر لیا لیکن یہ ضروری ہے کہ دونوں کا حصہ متعین ہو مثلا ہر ایک کو پیداوار میں سے آدھا آدھا ملے گا یا ایک کو ایک تہائی اور دوسرے کو دو تہائی وغیرہ۔

لما فی التنویر مع الدر:(۲۷۸/۶،طبع ایچ ایم سعید)

(وکذا)صحت(لو کان الارض والبذر لزید والبقر والعمل للآخر)أو الأرض لہ والباقی للآخر(أو العمل لہ والباقی للآخر)فھذہ الثلاثۃ جائزۃ.

وفی الشامیۃ:(قولہ فھذہ الثلاثۃ جائزۃ)لأن من جوزھا انما جوزھا علی أنھا اجارۃ.ففی الاولی یکون رب البذر والارض مستاجرا للفاعل وبقرہ تبعا لہ لاتحاد المنفعۃ لان البقر آلۃ لہ.

ولما فی الھندیۃ:(۲۹۵/۵،طبع قدیمی)

والثالث:أن تکون الأرض والبذر من احدھما والعمل والبقر من الآخر فذلک جائز لان صاحب الارض یصیر مستاجرا للعامل لیعمل العامل ببقرہ لصاحب الارض والبذر.

الجواب صحیح:عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب:عباد اللہ غفر لہ ولوالدیہ

۱۵ربیع الاول ۱۴۳۲ھ　　　فتویٰ نمبر:۳۰۱۷

﴿فصل کاٹنے کی ذمہ داری عرف کے مطابق ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقہ میں یہ رواج ہے کہ جب فصل تیار ہو جاتی ہے،تو فصل کے کاٹنے کی ذمہ داری بھی کسان پر ہوتی ہے،

شریعت کی رو سے یہ جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: امیر عثمان کوٹے خیل ملٹہ کھوہ

﴿جواب﴾ آپ کے علاقہ میں فصل کاٹنے کی ذمہ داری بھی اگر کسان پر ہوتی ہے اور اس طرح مزارعت پر زمین لینا دینا اگر رائج ہے تو یہ شرعاً منع نہیں ہے اور اس میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے۔

لما فی التنویر مع الدر: (۶/۲۸۲، طبع سعید)

(وصح اشتراط العمل) کحصاد ودیاس ونسف علی العامل (عند الثانی للتعامل وهو الاصح) وعلیه الفتوی.

ولما فی البحر الرائق: (۸/۱۶۳، طبع سعید)

(فان شرطاه علی العامل فسدت) یعنی شرطا العمل الذی یکون بعد انتهاء الزرع کالحصاد..... وهو ظاهر الروایة وعن ابی یوسف انها تصح مع اشتراط ذلک علی العامل ومشایخ بلخ کانوا یفتون بهذه الروایة.

ولما فی خلاصة الفتاوی: (۴/۱۹۲، طبع رشیدیه)

اذا شرط علی المزارع او علی رب الارض الحصاد والدیاس والتذریة ورفعه الی البیدر فسدت المزارعة فی ظاهر الروایة من ایهما البذر وفی النوازل المزارعة جائزة علی قول ابی یوسف رحمه الله وفیه عن ابی یوسف اذا شرط علی المزارع ان یحصده ویجمعه جاز..... قال الفقیه ابو اللیث وبه نأخذ.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد امیر ملک قائد آبادی

۱۳ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر: ۳۰۴۷

﴿مزارعت میں ہر ایک کا حصہ متعین ہونا ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں اپنی زمین کو مزارعت پر اس طرح دیتا ہوں کہ زمین، بیج، پانی اور یوریا وغیرہ کا خرچہ میرے ذمہ ہوگا، باقی کھیت کی حفاظت، پانی سے سیراب کرنا، کاٹنا الغرض فصل تیار ہونے تک کی ذمہ داریاں کاشتکار پر ہوں گی، پھر فصل سے حاصل ہونے والی رقم ہم بعض اوقات تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں دو حصے میرے اور ایک حصہ کاشتکار کا ہوتا ہے اور کبھی چار حصوں میں تقسیم کرکے چوتھائی کا شتکار کا ہوتا ہے۔ از روئے شرع ہمارا یہ معاملہ درست ہے یا نہیں؟ برائے مہربانی راہنمائی فرمائیں۔

﴿جواب﴾ سوال میں ذکر کردہ مزارعت کی صورت درست ہے بشرطیکہ عقد کے شروع میں مالک زمین اور کاشتکار ہر دونوں کا حصہ متعین کرلیا جائے، مثلاً حاصل ہونے والی فصل سے

ایک کو دو تہائی اور دوسرے کو ایک تہائی دینا باہمی رضامندی سے طے کرلیں۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲۷۸/۶،طبع ایچ ایم سعید)

(وکذا)صحت(لوکان الارض والبذرلزیدو البقروالعمل للآخر)أوالأرض له والباقی للآخر(أوالعمل له والباقی للآخر)فهذه الثلاثة جائزة.

وفی الشامیة:(قوله فهذه الثلاثة جائزة)لأن من جوزهاانماجوزهاعلی أنهااجارة ففی الاولی یکون رب البذروالارض مستاجرأللعامل وبقره تبعاله لاتحادالمنفعةلان البقرآلته.

ولمافی الهندیة:(۲۹۵/۵،طبع قدیمی)

والثالث:أن تکون الأرض والبذرمن احدهماوالعمل والبقرمن الآخرفذلک جائزلان صاحب الارض یصیرمستاجرللعامل لیعمل العامل ببقره لصاحب الارض والبذر.

لمافی الهدایة:(۲۵/۴طبع رحمانیه لاهور)

ان کانت الارض والبذر لواحدوالبقروالعمل لواحدجازت المزارعة لان البقرآلة العمل فصارکمن استاجرخیاطالیخیط بابرةالخیاط

الجواب صحیح:مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:عزیزاحمد خضداری غفرلہ ولوالدیہ

۲۹ جمادی الثانی ۱۴۳۵ھ فتویٰ نمبر:۴۲۲۲

﴿بیج زمیندار اور کسان میں مشترک ہوتو مزارعت فاسد ہوگی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہمارے علاقے میں کھیتی باڑی (زراعت) کی یہ صورت ہے کہ زمیندار کسان کو زمین فراہم کرتا ہے جبکہ کسان کے ذمہ عمل (کام کرنا) ہل چلانے کا مکمل خرچہ اور گندم کے سیزن میں تھریشر وغیرہ (گندم کی صفائی کیلئے) کا خرچہ ہوتا ہے، باقی اس کے علاوہ ہر چیز کھاد، بیج اور دوائی وغیرہ میں دونوں برابر کے شریک ہوتے ہیں، کیا شرعاً کھیتی باڑی (زراعت) کی یہ صورت درست ہے یا نہیں؟ مستفتی: خالدکوٹ

﴿جواب﴾ زراعت کی مذکورہ صورت میں بیج دونوں کا مشترک ہے، اس لئے یہ ناجائز اور فاسد معاملہ ہے، بیج کسی ایک کا ہو زمیندار کا ہو خواہ کسان کا تو معاملہ جائز ہوگا، اس کے علاوہ تھریشر وغیرہ کا خرچہ کسان کے ذمہ اور باقی دوائی کھیتی باڑی وغیرہ کا خرچہ نصف نصف باہمی رضامندی سے طے کرنا چاہیں تو کرسکتے ہیں۔

لمافی الهندیة:(۲۳۸/۵،طبع رشیدیه)

فان کانت الارض لاحدهماوشرطاان یکون البذرمنهماان شرطاالعمل علی غیر

صاحب الارض وشرطا ان يكون الخارج بينهما نصفين كانت فاسدة لان صاحب الارض يصير قائلا للعامل ازرع ارضي ببذري على ان يكون الخارج كله لي وازرع ببذرك على ان يكون الخارج كله لك كان فاسدا لان هذه مزارعة بجميع الخارج بشرط اعارة نصف الارض من العامل.

ولما في التنوير مع الدر:(۲۷۸/۶،طبع ایچ ایم سعید)

(وكذا)صحت(لو كان الارض والبذر لزيد والبقر والعمل للآخر)او الارض له والباقي للآخر.

ولما في التنوير مع الدر:(۲۸۲/۶،طبع ایچ ایم سعید)

(وصح اشتراط العمل)كحصاد ودياس ونسف على العامل(عند الثاني للتعامل وهو الاصح)وعليه الفتوى.

ولما في بدائع الصنائع:(۱۸۱/۶-۱۸۲،طبع ایچ ایم سعید)

واما بيان حكم المزارعة الصحيحة .. (ومنها)ان كل ما كان من باب النفقة على الزرع من السرقين وقلع الحشاوة ونحو ذلك فعليهما على قدر حقهما.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: عدنان خدا بخش

۵ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ　　　فتویٰ نمبر: ۲۵۷۲

﴿مساقات میں پانی وغیرہ کے اخراجات کس کے ذمہ ہونگے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان شرع دین متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کی زمین ہے دوسرا شخص شفتالوں کی گٹھلیاں لگا رہا ہے (کہ پودے نکلیں گے تو اسکو بیچیں گے منافع مشترک ہوگا) باقی پانی وغیرہ کے خرچے مشترک ہوں گے. اور نگرانی کیلئے مزدور بھی مشترک ہوگا. پوچھنا یہ ہے کہ اس طرح کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز یہ مساقات کہلائے گا یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ معاملہ بھی حکما مساقات کی صورت ہے۔ اور فی نفسہ جائز ہے مساقات میں درخت کا پھل (حسب وعدہ) دونوں (زمیندار اور عامل) کے درمیان مشترک ہوتا ہے یہاں بھی جو پودے اگ آئے وہ یا انکے منافع دونوں کے درمیان مشترک ہوں گے۔ اور جس طرح مساقات میں عامل (کام کرنے والے) کی محنت وعمل سے پھلوں میں ترقی ہوتی ہے اسی طرح یہاں بھی عامل کے عمل سے پودوں میں ترقی ہوتی ہے۔ دراصل مساقات میں درختوں کا پھل حاصل ہونے تک حفاظت اور دیگر تمام تر نگرانی عامل پر ہوتی ہے اسلئے مذکورہ صورت میں نگرانی کیلئے مزدور کی اجرت عامل کے ذمہ ہونا چاہیے تاہم اگر اس علاقہ میں اس طرح کے

معاملے رائج ہیں اور آپس میں ناراضگی وغیرہ کی نوبت نہیں آتی تو شرعا کوئی ممانعت نہیں ہے ایسا معاملہ کر سکتے ہیں.

لما في التنوير مع الرد:(۲۸۹/۶ ،طبع سعيد)

(دفع أرضا بيضاء مدة معلومة ليغرس وتكون الأرض والشجر بينهما لا تصح)(قوله وتكون الأرض والشجر بينهما)قيد به اذلو شرط أن يكون هذا الشجر بينهما فقط صح:

ولما في البحر(۱۶۵/۸ ،طبع سعيد)

ولو أن رجلا دفع أرضه معاملة على أن يغرس العامل فيها أغراسا والغراس بينها فهذا يجوز

ولما في الهندية(۲۷۹/۵، طبع رشيديه)

واذا دفع الرجل الى آخر أرضا بيضاء ليغرس فيها أغراسا على أن الأغراس والثمار بينهما فهو جائز(وبعد اسطر)واذا دفع الرجل الى غيره أرضا بيضاء سنين مسماة على أن يغرسها نخلا أو شجرا أو كرما على أن ما أخرج الله تعالى من شجر أو نخل أو كرم فهو بينهما نصفان فهذا فاسد

ولما في فتاوى قاضي خان:(۳/ ۵۳، طبع قديمي)

رجل دفع الى رجل أرضا بيضاء سنين معلومة على أن يغرسها نخلا أو شجرا أو كرما على أن ما أخرج الله تعالى من نخل أو شجر أو كرم فهو بينهما نصفين وعلى أن تكون الارض بينهما نصفين فهو فاسد،كذا في البحر۱۶۶/۸ ،طبع سعيد

ولما في الدر:(۱۹۱/۶، طبع سعيد)

[فروع] ما قبل الادراك كسقي وتلقيح وحفظ فعلى العامل، وما بعده كجذاذ وحفظ فعليهما، ولو شرط على العامل فسدت اتفاقا ملتقى:والأصل أن ما كان من عمل قبل الادراك كسقي فعلى العامل وبعده كحصاد ، عليهما كما بعد القسمة فليحفظ: وفي الشامي،عبارة الهداية:ولو شرط الجذاذ على العامل فسدت اتفاقا لأنه لا عرف فيه ا ھ

ولما في الهداية:۴/ ۴۲۹،طبع رحمانيه)

والمعاملة (المساقاة) على قياس هذا ما كان. قبل ادراك الثمر من السقي والتلقيح والحفظ فهو على العامل وما كان بعد الادراك كا الجداد والحفظ فهو عليهما ولو شرط الجداد على العامل لا يجوز بالاتفاق لأنه لا عرف فيه وما كان بعد القسمة فهو عليهما لأنه مال مشترك ولا عقد........ولو اراد فصل القصيل او جد الثمر بسرا والتقاط الرطب فذلك عليهما لانهما انهيا العقد لما عزما على الفصل والجداد بسرا فصار كما بعد الادراك والله اعلم

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: عمران الحق

۹ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۳۰۰۶

﴿باب القسمة﴾

﴿زمین کو اندازہ سے تقسیم کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں عام طور پر لوگ زمینوں کو اسطرح تقسیم کرتے ہیں کہ اندازے سے کسی ایک کونے کیساتھ رسہ پکڑ کر دوسرے کونے تک لے جاتے ہیں اور اسطرح ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ حصہ متعین کر دیتے ہیں تو یہ طریقہ تقسیم صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح نہیں تو صحیح طریقہ کیا ہے؟　　مستفتی: رحیم اللہ کوہائی لاچی سوڈل

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اگر تمام شرکاء اسطرح تقسیم کرنے پر راضی ہیں تو تقسیم صحیح ہے تاہم بہتر یہ ہے کہ شرکاء کے تمام حصے علیحدہ کر کے ہر حصے کو مخصوص نام یا نمبر دیکر قرعہ ڈال دیا جائے جسکے حصے میں جو آئے وہی اسکو دیا جائے۔

لمافی الدر المختار:(۲۶۳/۶،طبع سعید)

القسمة على التفاوت بالتراضي في غير الاموال الربوية جائزة.

ولمافی الهندية:(۲۵۲/۵،طبع قديمى)

واما حكمها:فتعين نصيب كل واحدمنهم من نصيب صاحبه..... كذافي التبيين.

ولمافی التنوير مع الدر:(۲۶۲/۶،طبع سعيد)

(ويصور القاسم مايقسمه على قرطاس)ليرفعه للقاضي(ويعدله على سهام القسمة ويذرعه،ويقوم البناء،ويفرز كل نصيب بطريقه وشربه ،ويلقب الانصباء بالاول والثاني والثالث)وهلم جرا(ويكتب أساميهم ويقرع)لتطييب القلوب.

ولمافی التنوير مع الدر:(۱۶۸/۵-۱۶۹،طبع سعيد)

(هو فضل خال عن عوض بمعيار شرعي)وهوالكيل والوزن فليس الذرع والعدبربا (مشروط)ذلك الفضل (لاحدالمتعاقدين(وعلته القدر)المعهودبكيل أووزن(مع الجنس فان وجداحرم الفضل)

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: نثار محمود کوہائی عفی عنہ

۱۹ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ　　فتویٰ نمبر: ۲۳۶۲

﴿کتاب اللقطة﴾

﴿گری پڑی چیز سے متعلق احکام﴾

﴿پانی میں بہہ کر آنے والی لکڑیوں کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے متعلق کہ گاؤں، دیہات میں جب سیلاب آتا ہے تو دریا بے تحاشا لکڑیاں بہا کر لاتا ہے، لوگ اپنی محنت اور کوشش سے یہ لکڑیاں نکالتے ہیں اور اپنے استعمال میں لاتے ہیں، کیا شریعت کی رو سے یہ درست ہے؟ واضح رہے کہ ان لکڑیوں کا مالک معلوم نہیں ہوتا۔ مستفتی: رضائی خان

﴿جواب﴾ دریا میں بہہ کر آئی ہوئی لکڑی ''لقطہ'' کے حکم میں ہوتی ہے، لقطہ کے متعلق حکم یہ ہے کہ ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو اٹھانا ضروری ہے ورنہ مباح۔

صورت مذکورہ میں لکڑیوں کو اگر نہ نکالا جائے تو ضائع ہونے کا قوی امکان ہے کہ دریا ان کو بہالے جائے گا تاہم لکڑیوں کو نکالا جائے اور حفاظت سے رکھا جائے، مالک مل جائے تو اس کو واپس کر دیا جائے ورنہ صدقہ کر دے خود ضرورت مند ہے تو خود بھی استعمال کر سکتا ہے۔

لما فی البزازیة علی هامش الهندية:(۲۱۹/۶-۲۲۰، طبع رشیدیه)

اللقطه على وجهين ان خاف ضياعها يفترض رفعها والا يباح أجمع العلماء عليه والافضل هو الرفع عند عامة العلماء خصوصاً وقيل يحل والافضل الترك والصحيح قول عامة العلماء وايضاً قال: التفاح والكمثرىٰ ان وجد في الماء ......أو الحطب في الماء ان لم يكن له قيمة يأخذه وأن له قيمة فهو لقطة.

ولما فی التنویر مع الدر:(۲۲۷/۶-۲۲۸، طبع امدادیه)

(فينتفع) الرافع (بها لو فقيرا والا تصدق بها على فقير ولو على أصله وفرعه وعرسه الخ)

الجواب صحیح عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی

۲۱ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر: ۱۵۷

﴿چوری مال کا مالک نہ ملے تو بطور صدقہ سید کو بھی دے سکتے ہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے کسی کا مال چوری کیا پھر بعد میں اپنے اس فعل پر نادم ہوا اب چونکہ یہ مال اس کے مالک

کو پہنچانا ضروری ہے اور اگر وہ نہ ملے تو اس کے ورثاء کو پہنچانا ضروری ہے اگر وہ بھی نہ لیں تو اسکو اصل مالک کی طرف سے صدقہ کرنا لازم ہے اب یہ دریافت کرنا ہے کہ یہ مال سید کو بھی دے سکتے ہیں یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ مال کا حکم لقطہ کی طرح ہے اور لقطے کا حکم یہ ہے کہ جب یقین ہو کہ مالک نہیں ملے گا تو چاہیے کہ فقیر کو دے اور خود اگر فقیر ہے تو خود بھی استعمال کر سکتا ہے اور ارادہ یہی ہو کہ جب اللہ تعالیٰ وسعت دے گا تو اتنا مال صدقہ کروں گا اور سید کو صدقات واجبہ (جن کا دینا فقیر کو لازم ہوتا ہے) جائز نہیں ہوتا جیسے زکوۃ، صدقہ فطر، عشر، کفارہ، نذر البتہ نفلی صدقات دینا جائز ہوتا ہے اور مذکورہ مال چونکہ صدقات واجبہ میں سے نہیں لہذہ سید کو دینا جائز ہے۔

لما في المحيط البرهاني ۱۶۲/۸ طبع ادارة القرآن

ثم اذادفعها الى الامام ،كان للامام الخيار ،ان شاء قبل وان شاء لم يقبل،وفي هذه الصفحة واذا ردها على الملتقط فالملتقط بالخيار ان شاء امسكها وادام الحفظ فيها حتى يظهر لها طالب، وان شاء تصدق بها ،على ان يكون الثواب لصاحبها،وان شاء باعها ان لم يكن دراهم،او دنانير،وامسك ثمنها،فان تصدق،وحضر صاحبها فله الخيار ان شاء نفذ الصدقة ،والثواب له وفي هذه الصفحة وان شاء لم يجز الصدقة وعند عدم الاجازت ان كانت قائمة في يد الفقير .اخذها منه ،وان كانت هالكة، كان له الخيار، ان شاء ضمن الفقير،وان شاء ضمن الملتقط فان قيل كيف ضمن الملتقط ،وقد تصدق باذن الشرع؟ قلنا:الشرع ما الزمه التصدق. وانما اذن له بذلك وفي هذه الصفحة وان كان الملتقط محتاجا فله ان يصرف اللقطة الى نفسه بعد التعريف لان الصرف الى فقير آخر لايصال الثواب الى المالك ،وفي حق هذه المعنى الصرف الى فقير آخر والصرف الى نفسه سواء

ولما الشامي جلد۲/ ۵۱ طبع سعيد

(قوله وجازت التطوعات الخ)قيد بها ليخرج بقية الواجبات كالنذر والعشر والكفارات وجزاء الصيد الا خمس الركاز فانه يجوز صرفه اليهم كما في النهر عن السراج

ولما في فتاوى قاضي خان ۲۸۵/۳ طبع قديمي كتب خانه

فبعد ذلك في القليل ان جاء صاحبها دفعها اليه،وان لم يجي فهو بالخيار ان شاء امسكها حتى يجي صاحبها وان شاء تصدق بها ،فان تصدق ثم جاء صاحبها كان صاحبها بالخيار:ان شاء اجاز الصدقة ويكون الثواب له وان لم يجز الصدقة فان كانت اللقطة قائمة في يد الفقير،اخذها من الفقير، وان لم تكن قائمة كان له الخيار :ان شاء ضمن الفقير وان شاء ضمن الملتقط

ولما فی احکام مال الحرام۲٦ صرف الربح فی حاجت نفسه

ذکر صاحب الاختیار فی شرح المختار انه وان وجب التصدق به و لکن ان احتاج الیه ، و صرفه فی حاجته بنیة انه یتصدق بمثله فیمابعد جاز له .....والملک الخبیث سبیله التصدق به ولو صرفه فی حاجت نفسه جاز.ثم ان کام غنیاتصدق بمثله وان کان فقیرا لا یتصدق ولکنه مقید بمااذا لم یکن عنده مال اخر لدفع حاجته قال صاحب الهندیة، الا اذا کان لا یجد غیره لانه محتاج الیه.وله ان یصرفه الی حاجت نفسه .فلو اصاب مالا تصدق بمثله ان کان غنیا وقت الاستعمال وان کان فقیرا فلاشی، علیه وعلله السرخیؒ بقوله :وحاجته تقدم علی حق الفقراء ... وانما قلنا ذلک لان حق الفقراء فی هذه المال بمنزلة حقهم فی اللقطه علی معنی ان له ان یتصدق،وله ان یردها علی المالک ان شاء.....وکثیرا ما یقع فی زماننا ان ما کسبه المرء مدی سنین طویلة کله حرام عن طریق الربا اوالرشوة وغیرها من التعاملات المحظوره ولا سبیل الی رد تلک الاموال الی اصحابها،فوجب علیه التصدق بها ثم یوفقه الله سبحانه وتعالی ان یتوب عن الکسب الحرام، ولکن لیس عنده مال سواه لیسد بهاحاجته وحاجت عیاله،فیحتمل ان یعتبر ذلک المرء فقیرا من حیث انه لا یملک من المال الحلال شیئا، وما فی یده لیس مملوکا له شرعا فتجری علیه احکام الفقراء فی هذه المسئله،فیجوز له ان یصرف ذلک المال فی حاجت نفسه الی ان یملک نصاب الزکوة من مال حلال، فاذا ملک النصاب وصار غنیا شرعا،ولکن لا یکفی النصاب لحاجته وحاجت عیاله فحینئذ یجوز له الاقتراض مما عنده من المال المکتسب بطریق الحرام بشرط ان یلتزم اداء مثله الی الفقراء حسبما ذکرنا.

الجواب صحیح :مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

صفرالخیر ۱۴۳۵ھ

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: شفقت اللہ

فتویٰ نمبر:۳۸۷۱

﴿سامان چھوڑ کر چلا گیا، مالک معلوم نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تقریباً 4 مہینے قبل ایک خریدار میری دوکان میں کچھ اشیاء چھوڑ کر چلا گیا، آج تک وہ اشیاء میری دوکان میں ہیں، اور میں اس خریدار کو نہیں جانتا، تا کہ وہ اس تک پہونچادوں۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ میں اس سامان کا کیا کروں؟

مستفتی: محمد الیاس خان خضدار

﴿جواب﴾ ایسی صورت میں یہ اشیاء لقطہ کے حکم میں ہیں، لقطہ کا حکم یہ ہے کہ اصل مالک تک پہنچانے کی پوری کوشش ہونی چاہیئے، مالک تک پہنچانا ممکن نہ ہو جیسا کہ آپ نے ذکر کیا کہ

میں اس کو نہیں جانتا۔ اور اتنا عرصہ گزر جائے کہ اب یقین یا غالب گمان کے درجہ میں آپ جانتے ہیں کہ مالک لوٹ کر نہیں آئے گا، تو ایسی صورت میں وہ چیز یا اسکی قیمت مالک کیطرف سے صدقہ کرنا ضروری ہوتا ہے اور آپ خود اگر فقیر ہیں تو اپنے استعمال میں بھی لاسکتے ہیں، لیکن مالک ملنے کی صورت میں اسکو بتانا ضروری ہوگا، پھر اگر وہ قیمت کا مطالبہ کرے تو ادا کرنا واجب ہوگا، اور صدقہ کا ثواب آپ کو ملے گا۔

لما فی الدر مع الرد: ۲۷۹/۴(طبع ایچ۔ ایم سعید)

(فينتفع)الرافع (بهالوفقيرا والاتصدق بهاعلى فقير ولوعلى اصله وفرعه وعرسه)۔۔۔(قوله فينتفع الرافع)أى من رفعهامن الارض:التقطها واتى بالفاء.فدل على انه انماينتفع بهابعدالاشهادوالتعريف الى ان غلب على ظنه ان صاحبها لايطلبها،والمرادجوازالانتفاع بهاوالتصدق ،وله امساكهالصاحبها۔

لما فی الهدایه:۲/۶۱۷(رحمانیه)

فان جاء صاحبها والاتصدق بها ايصالا للحق الى المستحق وهو واجب بقدرالامكان وذلك بايصال عينها عندالظفربصاحبها وايصال العوض وهوالثواب على اعتباراجازته التصدق بهاوان شاء امسكهارجاء الظفرلصاحبها.فان جاء صاحبهافهو بالخياران شاء امضى الصدقه وله ثوابها وان ضمن الملتقط.

لما فی البحر:۱۵۷/۵(ایچ ایم سعید)

وينتفع بها لوفقيرا والاتصدق على اجنبى ولابويه وزوجته وولده لوفقيرا.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری غفرلہ ولوالدیہ

۲۱ صفر ۱۴۳۵ھ فتویٰ نمبر: ۳۹۱۵

﴿سیلاب میں قیمتی وغیر قیمتی اشیاء کا بہنا لقطہ کے حکم میں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں سیلاب آنے کی وجہ سے لوگوں کی بہت ساری قیمتی وغیر قیمتی اشیاء پانی میں بہہ گئی ہیں، دوسرے علاقے کے لوگوں نے ان اشیاء کو پانی سے نکال دیا، پوچھنا یہ ہے کہ جن لوگوں نے ان اشیاء کو اپنے قبضے میں لیا ہے، کیا ان کے لئے یہ اشیاء استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں غیر قیمتی اشیاء جو عرفاً وعادۃً مباح سمجھی جاتی ہوں، یہ ان کے لئے جائز ہیں، اپنے استعمال میں لاسکتے ہیں، البتہ وہ چیزیں جو قیمتی ہیں تو یہ لوگ ان کی

تعریف وتشہیر کریں تا کہ اصل مالک وصول کرے، اعلان وتشہیر کے باوجود مالک کا پتہ نہ چل سکا اور غالب گمان ہوا کہ اصل مالک کا ملنا مشکل ہے تو ایسی صورت میں مالک کیطرف سے صدقہ کردیں اور لینے والا خود بھی اگر ضرورتمند ہے تو وہ بھی استعمال کرسکتا ہے لیکن یہ نیت کرنا ضروری ہے کہ اگر کسی بھی وقت اصل مالک ملا تو یہ چیزیں یا انکی قیمت اسکو واپس کردیں گے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲۲۲/۶،کتاب اللقطة،طبع امدادیه)

(......حطب وجدفی الماء ان له قیمة فلقطة والا فحلال لآخذه)کسائر المباحات الاصلیة درر.

وفی الشامیة:وذکر فی شرح الوهبانیة ضابطاًوهوأن مالا یسرع الیه الفساد ولا یعتاد رمیه کحطب وخشب فهو لقطة ان کانت له قیمة ولوجمع من أماکن متفرقة فی الصحیح کمالووجد جوزة ثم اخری وهکذا حتی بلغ ماله قیمة.

ولمافی هامش الهندیة:(۲۸۹/۲،کتاب اللقطة،طبع رشیدیه کوئٹه)

حطب وجدفی الماء ان لم یکن له قیمة فهو حلال لمن أخذه وان کانت له قیمة یکون لقطة.

ولمافی الولوالجیة:(۲۲۸/۲-۲۲۹،کتاب اللقطة،طبع فاروقیه،پشاور)

بل یعرف التلیل بقدرمایغلب علی ظنه أن صاحبها لایطالبها بعدذلک فان لم یجیء صاحبها ان شاء تصدق وان شاء أمسک فان تصدق بها ثم جاء صاحبها ان شاء أجازالصدقة ویکون له ثوابها فان اختار الضمان ان کانت قائمة فی یدالفقیر کان له أن یاخذها من الفقیروان کانت هالکة کان بالخیاران شاء ضمن الذی تصدق بهاوان شاء ضمن المسکین،لأن الذی تصدق بها سلم ماله بغیراذنه الملتقط اذاأرادأن یصرف اللقطة الی نفسه ان کان فقیراًله ذلک لأن حاجته مقدمة علی حاجة غیره فیمافی یده.

ولمافی الهدایة:(۵۹۶/۲،کتاب اللقطة،طبع رحمانیه)

قال:اللقطة أمانة اذاأشهدالملتقط أنه یاخذهالیحفظهاویردهاعلی صاحبهالأن الأخذعلی هذا الوجه ماذون فیه شرعابل هوالأفضل عندعامةالعلماء.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ والله اعلم بالصواب:صادق محمد سواتی غفرلہ ولوالدیہ

۲۱ محرم الحرام ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر:۲۷۹۰

﴿لقطہ کا مالک نہ ملے تو اٹھانے والا اگر مستحق ہے تو استعمال کرسکتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس کے مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی کو سڑک پر واقع ایک مسجد سے کچھ رقم ملی اور اس نے بنیت حفاظت اٹھائی، مذکورہ مسجد لب سڑک پر واقع ہے جس میں مسافروں کی گاڑیاں نماز کیلئے کھڑی ہوتی ہیں۔

اٹھانے والا خود غریب آدمی ہے اس نے دس دن تک مسلسل اعلان کیا لیکن مالک نہ ملا، اب یہ رقم اٹھانے والا خود استعمال کرے یا مسجد کے متولی کے حوالہ کرے؟ اور کب تک اعلان جاری رکھنا ضروری ہے؟ سائل: عباس خان وزیر بنوں

﴿جواب﴾ عام لوگ جہاں جمع ہوتے ہیں وہاں پر اعلان کرنا ضروری ہے، البتہ جب یہ یقین یا غالب گمان ہو جائے کہ مالک اب اس کو تلاش نہیں کر رہا ہے پھر آپ خود اگر مستحق ہیں تو اپنے استعمال میں لا سکتے ہیں اور اگر آپ مستحق نہیں تو کسی غریب پر صدقہ کرنا واجب ہے۔

لیکن یہ واضح رہے کہ بعد میں مالک اگر مل جائے تو دونوں صورتوں میں آپ کو مذکورہ رقم اس کے حوالے کرنا ہوگی۔

لمافی التنویر مع الرد:(۴۳۶/۶،طبع امدادیہ)

(وعرف الی ان علم ان صاحبہا لایطلبہا الخ)

وفی الشامیۃ:لم یجعل للتعریف مدۃ اتباعا للسرخسیؒ ثم قال:وصححہ،فی الھدایۃ وفی المضمرات،والجوھرۃ وعلیہ الفتوی.

ولمافی التنویر مع الدر:(۴۳۷/۶-۴۳۸،طبع امدادیہ)

(فینتفع بہالوفقیرا والاتصدق بہاعلی فقیر)

وفی الشامیۃ:(قولہ لوفقیرا)قیدبہ لان الغنی لایحل لہ الانتفاع بہاالابطریق القرض،لکن باذن الامام نقلہ عن النھر.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:عبیداللہ عابدغفرلہ ولوالدیہ

۱/۵/۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر:۱۸۶۲

﴿مسجد میں چپل تبدیل ہو جائے تو کیا کرے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کی چپل مسجد سے کوئی پہن کر لے جائے اور اس کی جگہ پر دوسری چپل پڑی ہو اور یہ شخص یہ سمجھ کر کہ شاید میری چپلوں کو غلطی سے پہن کر اپنی چپل چھوڑ گیا ہے، ان چپلوں کو پہن کر لے جاتا ہے، ایسے شخص کے لئے ان چپلوں کا استعمال میں لانا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: محمد ابرار بلال کالونی

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں اگر اس بات کا یقین ہو کہ رکھی ہوئی چپل اسی شخص کی ہے جو چپل لے کر گیا ہے تو ایسی صورت میں ان چپلوں کو استعمال میں لانا جائز ہے لیکن لیتے وقت

اس بات کی نیت ہو کہ جب بھی انکا اصل مالک مل جائے گا اس کو یہ چپل لوٹا کر اپنی واپس لے لونگا اور اسی مقصد کے لئے ان چپلوں کو پہن کر مسجد میں آتا ہے لیکن کوشش اور اہتمام کے باوجود اگر اصل مالک کے ملنے کی امید نہ ہو اور اس کی چھوڑی ہوئی چپل اعلیٰ قسم (قیمتی) کی ہو تو ایسی صورت میں تقوی اور احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ دونوں چپلوں کے مابین قیمتوں کا فرق معلوم کر کے اضافی رقم صدقہ کر دی جائے۔

لمافی الشامی:(۲۸۵/۴-۲۸۶،طبع سعید)

وکذلک الجواب فی المکعب اذاسرق اه وقیدبعضهم بان کان یکون المکعب الثانی کالاول اواجود،فلودونه له الانتفاع به بدون هذاالتکلیف لان أخذالأجود وترک الأدون دلیل الرضاء بالانتفاع به..... قلت:ماذکرمن التفصیل بین الادون وغیرها انمایظهرفی المکعب المسروق امالواخذمکعب غیره وترک مکعبه غلطاًلظلمة او نحوهاویعلم ذلک بالقرائن فهوفی حکم اللقطة ـ وکذالواشتبه کونه غلطاًاوعمداًلعدم دلیل الاعراض هذاماظهرلی فتأمله.وکذافی الهندیة:(۲/۲۹۵،طبع رشیدیه) والبحرالرائق: (۵/۱۵۸،کتاب اللقطة،طبع ایچ ایم سعید)

ولمافی الشامی:(۶/۵۰۱،طبع سعید)

(قوله وقیل اذاایس الخ)کذاعبرفی المنح:وظاهره انه من غیر جنس حقه،والافلومن جنسه فله اخذقدره منه بلاکلام......الخ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ
۱۳ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ

واللہ اعلم بالصواب:نعیم اقبال عفااللہ عنہ
فتوی نمبر:۲۶۱۹

﴿اکاؤنٹ میں کسی کی رقم غلطی سے آ جائے تو مالک کو لوٹانا ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے بینک میں اکاؤنٹ کھلوایا تھا تو اسکے اکاؤنٹ میں کہیں سے رقم جمع ہوئی تھی اور اس کو پتہ نہیں ہے کہ میرے اکاؤنٹ میں رقم کس طرح آ گئی اور کہاں سے آ گئی؟

اب پوچھنا یہ ہے اگر یہ شخص بینک والوں سے یہ کہتا ہے کہ میرے اکاؤنٹ میں اتنا پیسہ زیادہ آیا ہے بینک والے فوراً کہیں گے کہ یہ تو ہمارے ہیں تو یہ شخص اگر اس رقم سے کاروبار شروع کرے جب بھی اس کا مالک مل جائے تو اسکے حوالہ کرے گا کیا اس طرح کرنا جائز ہے؟ یا پھر کیا کرے؟

﴿جواب﴾ آپ کو یقینی طور پر معلوم ہے کہ میرے اکاؤنٹ میں کسی دوسرے کا پیسہ جمع

ہو گیا ہے تو آپ پر اس کا مالک تلاش کرنا ضروری ہے۔ اس رقم کو استعمال میں لانا ہرگز جائز نہیں ہے بینک نظام میں یہ معلوم کرنا کہ رقم کہاں سے آئی کوئی مشکل نہیں ہے۔ بینک کے ذمہ دار افراد کو بتائیں گے تو وہ کہیں گے کہ یہ پیسہ ہمارا ہے یہ بے جا اندیشہ ہے۔ ذمہ داری تو بینک والوں کی ہے اور عموماً بینک والوں سے اسطرح کی غلطی ہو جاتی ہے۔ بہر حال اگر آپ بینک والوں کو نہیں بتانا چاہتے تو اسٹیٹمنٹ نکلوانا ویسے بھی آپ کا حق ہے۔ اسٹیٹمنٹ سے معلوم ہو جائیگا کہ یہ رقم کہاں سے آئی ہے پھر آپ خود ہی مالک تک پہنچانے کی کوشش کریں اور اس کا حق اسکے حوالہ کریں دوسرے کا مال غلطی سے آپ کے ہاتھ آ جائے تو اسکا استعمال ہرگز جائز نہیں ہے۔

لمافی المحیط البرھانی(۲۷/۸طبع ادارۃ القرآن)

ونوع آخر یعلم أن صاحبه یطلبه کالذهب والفضة،وسائر العروض،وأشباهها ،وفی هذالوجه له أن یأخذها، یحفظها، ویعرفها،حتی یوصلهاالی صاحبها.

ولمافی الھندیہ:(۲۹۰/۲رشیدیہ)

ونوع آخر یعلم أن صاحبه یطلبه کالذهب والفضه وسائر العروض وأشباهها وفی هذالوجه له أن یأخذها ویحفظها ویعرفها حتی یوصلهاالی صاحبها.

ولمافی المبسوط:(۳/۱۱دارالمعرفہ بیروت)

فأما(النوع الثانی)وهو مایعلم أن صاحبه یطلبه فمن یرفعه فعلیه ان یحفظه ویعرفه لیوصله الی صاحبه.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد داؤد فاروقی ٹانکوی

۲۴ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ فتویٰ نمبر: ۳۰۱۹

﴿موبائل میں نامعلوم بیلنس پہنچنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ بسا اوقات موبائل میں غلطی سے کسی کا بیلنس آجاتا ہے جبکہ اس کے مالک کا پتہ نہیں چلتا، اس بیلنس کا شرعاً کیا حکم ہے؟ اسکا استعمال شرعاً جائز ہوگا یا نہیں؟ سائل: عازم ایبٹ آبادی

﴿جواب﴾ موبائل میں بیلنس آنے کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، کمپنی بھی بیلنس بھیجتی ہے لیکن اسکی شناخت ہوتی ہے بعض اوقات دوست احباب بھی عطیہ کیطور پر ایسا کرتے ہیں، بہر حال کمپنی یا دوست کیطرف سے بیلنس پہنچنے کا غالب گمان ہو تو اسکو استعمال کر سکتے ہیں، البتہ غلطی سے

کسی کا بیلنس پہنچنے کا غالب گمان ہو تو اسکو استعمال کر کے اس مقدار کی رقم کو صدقہ کرے اور مالک ملنے کی صورت میں اگر وہ مطالبہ کرے تو اصل رقم اسکو دینی پڑے گی اور صدقہ کا ثواب آپ کو ہوگا۔

لما فی التنویر مع الدر:(۴/۲۷۹، سعید)(فینتفع)الرافع (بہالو فقیرا والا تصدق بہا علی فقیر)

وفی الشامیة:(قولہ لو فقیرا)قیدبہ لان الغنی لا یحل لہ الانتفاع بہا الا بطریق القرض لکن بأذن الامام نقلہ عن النہر.

ولما فی التاتارخانیة:(۵/۲۰۳،طبع قدیمی)

وفی الفتاوی العتابیة سأل رجل عطاء،رجل نام فی المسجد واستیقظ وفی یدہ صرة فیہا دنانیر؟قال ان الذی صرہا فی یدك لم یصرہا الا وہو یرید ان یجعلہا لک.

الجواب صحیح:عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم:عبید اللہ عابد غفرلہ ولوالدیہ

۲۶صفر الخیر ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر:۱۹۳۳

﴿ایسے سامان کا حکم جس کا مالک معلوم نہ ہو﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے ہیں کہ میری الیکٹرک کی دکان ہے جسکو تقریباً بیس پچیس سال ہو گئے ، وہاں پر لوگوں کی مختلف اقسام کی موٹر، واشنگ مشین، استری، پنکھے اور مختلف چیزیں ٹھیک ہونے آتی ہیں، بعض مرتبہ ہوتا یہ ہے کہ مشین کا مالک نہیں آتا،اس کو کافی دن ہو جاتے ہیں،اب اس طرح کا بہت سارا سامان جمع ہو گیا جن کے مالک نہیں آئے جسکی وجہ سے دکان بھر گئی،اپنے سامان کو رکھنے میں بھی پریشانی ہوتی ہے،معلوم یہ کرنا ہے کہ اگر مذکورہ اشیاء کو ہم استعمال کریں تو جائز ہے یا پھر ان اشیاء کا کیا کریں؟واضح رہے کہ یہ سامان نہ ہم مالک کو پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہم مالک کو جانتے ہیں۔ مستفتی:محمد عبید کورنگی

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں یہ سامان آپ کے پاس لوگوں کی امانتیں ہیں اور ان تک پہنچانا مشکل ہو اور آپ کو یقین ہو جائے کہ مالک ان کو لینے نہیں آئیں گے تو پھر مالک کی جانب سے صدقہ کر دیں،انشاء اللہ آپ کے حسن عمل کی وجہ سے آپ کو بھی صدقہ کا ثواب ملے گا اور اگر خود مستحق ہیں تو پھر اپنے استعمال میں بھی لا سکتے ہیں اگر نہیں تو پھر آپ کے لئے استعمال جائز نہیں ہے۔

لما فی قولہ تعالیٰ:(سورة النساء آیت ۵۸)ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامٰنٰت الیٰ اھلھا......الآیة.

ولما فی الھدایة:(۲/۵۹۷،کتاب اللقطة،طبع رحمانیہ)

رای الملتقط یعرفھا الی ان یغلب علیٰ ظنہ ان صاحبھا لا یطلبھا بذلک ثم یتصدق بہ

وان کانت اللقطة شیئا لایبقی عرفه حتی اذا خاف ان یفسد تصدق به.

ولما فی الهندیة:(۲/۲۹۱،طبع رشیدیه)

ان کان الملتقط محتاجا فله ان یصرف اللقطه الی نفسه بعد التعریف کذا فی المحیط وان کان الملتقط غنیا لا یصرفها الی نفسه بل یتصدق علی اجنبی او الوالدیه او ولده او زوجته اذا کانوا فقراء کذا فی الکافی.

ولما فی التخریج لاحادیث الهدایة:(۲/۵۹۷،طبع رحمانیه)

عن ابی هریرة ان النبی ﷺ سئل عن اللقطه فقال لاتحل اللقطة فمن التقط شیئا فلیعرفه سنة فان جاء صاحبه فلیرده الیه وان لم یأت فلیتصدق به فان جاء فلیخیره بین الاجر وبین الذی له.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:محمد زبیر اکرام

۱۳ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ　　　　فتویٰ نمبر:۲۵۱۹

﴿لقطہ پر خرچہ کرنے سے مطالبہ کا حق حاصل ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ سے متعلق کہ ایک آدمی صحرا میں رہتا تھا ایک دن اس کے گھر میں کہیں سے بھینس آ گئی، اس نے اس کو باندھ لیا اور شہر میں جا کر اعلان بھی کروایا کہ اس رنگ کی بھینس ملی ہے جس کسی کی ہو آ کر لے جائے، چنانچہ تین دن کے بعد مالک آیا اور بھینس لے لی لیکن بھینس پکڑنے والے کا مطالبہ تھا کہ تین دن میں نے اس کو جو چارہ وغیرہ کھلایا ہے اس کا خرچہ دے دو تو شرعاً کیا اس آدمی کا مطالبہ درست ہے اور مالک کے ذمے خرچہ ادا کرنا ضروری ہے؟　　　　مستفتی:عبدالغفار تلہ گنگ

﴿جواب﴾ جانور یا اس طرح کی کوئی چیز ضائع ہونے کے اندیشے سے بغرض حفاظت اپنے قبضہ میں اگر کوئی لے لے تو اس کی رکھوالی کے سلسلہ میں جانور وغیرہ پر جو خرچ ہو رہا ہے شرعاً یہ تبرع ہے یعنی اس کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا، البتہ باقاعدہ قاضی حکم دے دے کہ اس پر خرچہ کرتے رہو جب اس کا مالک ملیگا تو اس سے وصول کر لینا تو ایسی صورت میں وصول کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے، مذکورہ صورت میں قاضی نے ایسا کوئی حکم چونکہ نہیں دیا اس لیے خرچ کرنے والے کو مطالبہ کا حق حاصل نہیں ہے تاہم مالک دیدے تو بہتر ہے اور اچھے اخلاق کا تقاضا تو یہی ہے کہ وہ شخص چاہے تقاضا نہ کرتا تب بھی دیدیتا۔

لما فی التنویر والدر:(۴/۲۸۱،طبع: سعید)

(وهو فی الانفاق علی اللقیط واللقطة متبرع)لقصور ولایته (الا اذا قال له قاض انفق

لترجع)فلو لم یذکر الرجوع لم یکن دیناً فی الاصح

ولما فی الرد المحتار:(۲۸۱/۲طبع: سعید)

(قوله الا اذا قال له قاض)ای بعد اقامة البینة من الملتقط کما شرطه فی الاصل وصححه فی الهدایة لاحتمال ان یکون غصباً فی یده والبینة لکشف الحال لا للقضاء فلا یشترط لها خصم وان قال لا بینة لی یقول له بین یدی ثقات انفق علیها ان کنت صادقا (قوله لم یکن دیناً فی الاصح)لان الامر متردد بین الحسبة والرجوع فلا یکون دیناً بالشک

ولما فی العالمگیریة:(۲۰۹/۲ قدیمی کتب خانه)

وما انفق الملتقط علی اللقطة بغیر اذن الحاکم فهو متبرع کذا فی الکافی وباذن القاض یکون دیناً وصورة اذن القاضی ان یقول له انفق علی ان ترجع فلو امره به ولم یکن له علی ان ترجع لا یکون دینا وهوالاصح کذا فی البحر ولا یامره بالانفاق علیها حتی یقیم البینة انها لقطة عنده فی الصحیح وان عجز عن اقامة البینة یامره بالانفاق علیها مقیدا بان یقول بین جماعة من الثقات ان هذا ادعی ان هذه لقطة ولا ادری أهو صادق أم کاذب وطلب ان أمره بالانفاق علیها فاشهدوا انی امرته بالانفاق علیها ان کان الامر کما یقول

ولما فی قاضی خان:(۲۸۶/۲ قدیمی کتب خانه)

قال انفق علیها من مال نفسه فان فعل ذلک بامر القاضی یرجع علی صاحبه وبغیر امر القاضی لا یرجع۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق انکی

۳رجب المرجب ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۲۹۸

﴿کافر کے لقطہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کے پاس غیر مسلم کا مال رکھا ہوا ور کوشش کے باوجود اس غیر مسلم کا علم نہ ہو کہ وہ کہاں ہے تا کہ وہ مال اس تک پہنچایا جائے، اب اس مال کا کیا حکم ہے؟ مستفتی: محمد ظہیر مسجد ابوبکر ڈیفنس فیز ۲ کراچی

﴿جواب﴾ سب سے پہلے اس مال کے مالک یا اس کے ورثاء کا پتہ لگایا جائے اگر انتہائی کوشش کے باوجود مال کے مالک یا اس کے ورثاء کا پتہ نہ چلے تو پھر ایسی صورت میں اس کے مال کو بیت المال میں جمع کرادیا جائے، اسلامی حکومت نہ ہونے کی وجہ سے چونکہ بیت المال نہیں ہے، اس لئے اس غیر مسلم کے مال کو کسی رفاہی ادارے (ٹرسٹ) وغیرہ میں جمع کرادیا جائے جو کہ انسانیت کی خدمت کیلئے کام کررہا ہو۔

لما فی الهندية:(۲/ ۲۹۰ مطبع رشيديه)

كل لقطة يعلم انها كانت لذمى لاينبغى ان يتصدق ولكن يصرف الى بيت المال لنوائب المسلمين كذافى السراجية.

ولما فى التنوير مع الدر:(۴/ ۲۷۹ مطبع ايچ ايم سعيد)

(فينتفع)الرافع(بها لو فقيرا...... الا اذاعرف انها لذمى فانها توضع فى بيت المال)

وفى الشامية:(قوله توضع فى بيت المال)للنوائب بحر ط.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

۱۱ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ

واللہ اعلم بالصواب: عدنان خدابخش

فتویٰ نمبر: ۲۵۸۰

﴿کتاب البیوع﴾

﴿اندازے سے لینا دینا جائز ہے بشرطیکہ وزن کا عقد میں ذکر نہ ہو﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی دوکاندار کے پاس آتا ہے کہ 200 روپے کا آٹا دیدو، دوکاندار اندازے سے آٹا اٹھا کر دیتا ہے کہ یہ 200 کا ہے اور گاہک اس کو لے جاتا ہے، غرض سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح بغیر تولے اندازے کے ساتھ بیچنا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: مولوی نور محمد عبدالخیل ڈیرہ اسماعیل خان

﴿جواب﴾ خریدار نے آٹے کا خاص وزن یا مقدار بول کر دینے کو اگر کہا نہیں ہے تو اندازے سے لینا دینا جائز ہے۔

لما فی الهداية:(۳/ ۲۱ طبع :رحمانية لاہور)

قال: والاعواض المشار اليها لا يحتاج الى معرفة مقدارها فی جواز البيع لان بالاشارة كفاية فی التعريف وجهالة الوصف فيه لاتفضى الى المنازعة .

ولما فيها ايضاً ـــــ

قال ويجوز بيع الطعام والحبوب مكايلةً ومجازفة . وهذا اذا باعه بخلاف جنسه لقوله عليه السلام اذا اختلف النوعان فبيعوا كيف شئتم بعد أن يكون يداً بيد.

ولما فی الشامی:(۴/ ۵۰۴، طبع :سعيد كراچی)

قال فی البحر: وقوله غير مشار اليه قيد فيهما لان المشار اليه مبيعاً كان أو ثمناً لا يحتاج الى معرفة قدره و وصفه ، فلو قال بعتك هذه الصبرة من الحنطة أو هذه الكورجة من الارز والشاشات و هی مجهولة العدد بهذه الدراهم التی فی يدك وهی مرئية فتقبل جاز ولزم .لان الباقی جهالة الوصف يعنی القدر وهو لا يضرّ اذ لا يمنع من التسليم والتسلم.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد ابرار غفرلہ ولوالدیہ

۵ جمادی الثانی ۱۴۳۳ھ فتویٰ نمبر: ۲۷۶۶

﴿ادھار پر عام قیمت سے زیادہ پر بیچنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں جیولری کا کام کرتا ہوں، سونا نقد بھی فروخت کرتا ہوں اور ادھار پر بھی، ادھار کی صورت یہ ہوتی ہے کہ گاہک اگر پندرہ دن کی ادھار پر خریدتا ہے تو اس کو اصل قیمت سے تین ہزار سے زیادہ پر فروخت کرتے ہیں

اوراگرایک مہینہ کے ادھار پر خریدتا ہے تو پھر اصل قیمت سے چھ ہزار سے زیادہ پر فروخت کرتے ہیں، تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ نیز اگر پندرہ دن یا مہینہ پر چند دن گذر بھی جائے تو اس پر مزید کوئی اضافی (سود) پیسے نہیں لیے جاتے۔ مستفتی: عبدالرؤف پنجاب

﴿جواب﴾ اس مسئلے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر معاملہ کرتے وقت کوئی قیمت متعین نہ کرے بلکہ یوں کہے کہ اگر پندرہ دن کے ادھار پر لوگے تو تین ہزار کے اضافی قیمت پر ملے گا اور اگر مہینہ کے ادھار پر لوگے تو چھ ہزار اصل قیمت سے زیادتی پر تو یہ صورت جائز نہیں ہے بوجہ جہالت ثمن کے، اور اگر اس طرح معاملہ نہ کرے بلکہ پہلے سے یہ معلوم کر کے کہ یہ شخص ادھار لے گا اور پھر قیمت میں بنسبت نقد کے کچھ بڑھا دے تو یہ جائز ہے بشرطیکہ عوضین میں سے کسی ایک پر مجلس عقد میں قبضہ ہو جائے۔

کسی چیز کو نقد بیچنے پر کم قیمت لینا اور ادھار بیچنے پر زیادہ قیمت لینا اس وقت جائز ہے جب معاملہ کرتے وقت ایک ہی بات ہو اور قیمت بالکل متعین کرلی جائے اور ادائیگی کی مدت بھی متعین کرلی جائے، اور اگر سونے چاندی کو کاغذی نوٹ کے ذریعے ادھار پر دیا جارہا ہو تو اس میں یہ شرط ہے کہ عوضین میں سے کسی ایک پر مجلس عقد میں قبضہ ہو جائے۔

لما فی جامع الترمذی:(کتاب البیوع قدیمی)

عن ابی هريرة رضى الله عنه قال:نهى رسول الله ﷺ عن بيعتين في بيعة۔حديث ابی هريرة حديث حسن صحيح،والعمل على هذا عند اهل العلم،وقد فسر بعض اهل العلم قالوا:بيعتين في بيعة ان يقول ابيعك هذا الثوب بنقد بعشرة ونسيئة بعشرين،ولا يفارقه على احد البيعتين،فاذا فارقه على احد هما فلا بأس اذا كانت العُقدة على واحد منهما ۔

ولما فی المبسوط للسرخسی:(۸۰۷/۳،کتاب البیوع باب بیوع الفاسدة)

واذا عقد العقد على انه الى اجل كذا بكذا وبالنقد بكذا او قال الى شهر بكذا او الى شهرين بكذا فهو فاسد لانه لم يعاطه على ثمن معلوم،ونهى النبي ﷺ عن شرطين في بيع وهذا هو تفسير الشرطين في بيع، ومطلق النهي يوجب الفساد في العقود الشرعية وهذا اذا افترقا على هذا،فان كان يتراضيان بينهما ولم يفترقا حتى قاطعه على ثمن معلوم واتما العقد عليه فهو جائز لانهما ما افترقا الا بعد تمام شرط صحة العقد.

ولما فی الشامی:(۱۸۰/۵،باب الربوا طبع سعید)

سئل الحانوتي عن بيع الذهب بالفلوس نسيئة،فأجاب بانه يجوز اذا قبض أحد البدلين.

ولما فی المبسوط للسرخسی:(۲۴/۱۴،باب البیع)وبیع الفلوس بالدراهم لیس بصرف

ولما فی البزازیة:(۲۱۱/۱،طبع قدیمی)

ولو اشتری مائة فلوس بدرهم یکفی التقابض من أحد الجانبین۔

ولما فی رد المختار :(۱۴۲/۵،طبع سعید)

ویزاد فی الثمن لأجله اذا ذکر الأجل بمقابلة زیادة الثمن۔

ولما فی بحوث فی قضایا فقهیه معاصرة ص۱۲۔

أما الائمه الاربعة وجمهور الفقهاء والمحدثین فقدأجاروا البیع المؤجل بأکثر من سعر النقد بشرط أن یبعث العاقدان بأنه بیع مؤجل بأجل معلوم،وبثمن متفق علیه عند العقد،فأما اذا قال البائع:أبیعک نقداً بکذا ونسیئة بکذا،وافترقا علی ذلک،دون أن یتفقا علی تحدید واحد من السعرین،فان مثل هذا البیع لایجوز،ولکن اذا عین العاقدان أحد الشقین فی مجلس العقد،فالبیع جائز۔

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:محمد تنویر عفااللہ عنہ

یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر:۳۷۱۷

﴿خریدار کے قبضے میں مبیع کا نقصان ہوجائے تو خود ذمہ دار ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے قسطوں پر ایک ڈائسن خریدی اور ابھی قسطوں کی ادائیگی مکمل نہیں ہوئی کہ ڈائسن مجھ سے دیوار کے ساتھ لگ گئی اور اس کو کافی نقصان پہنچ گیا اب یہ نقصان فروخت کرنے والے پر آئے گا یا مجھ پر؟

﴿جواب﴾ بیع چاہے نقد رقم سے ہو یا قسطوں کے ساتھ ایجاب وقبول کر لینے کے بعد بیع تام ہوجاتی ہے اور مبیع مشتری کی ملکیت میں داخل ہوجاتی ہے،اس کے بعد مبیعہ کو جو بھی نقصان پہنچے گا وہ مشتری(خریدار) پر ہوگا فروخت کرنے والے پر نہیں،لہٰذا صورت مسئولہ میں جب آپ نے ڈائسن پر قبضہ کر لیا تو اب آپ اس کے مالک بن گئے اس کے بعد جو بھی نقصان اس کو پہنچے گا وہ آپ کے ذمہ ہوگا فروخت کنندہ پر نہیں ہوگا۔

لما فی الهدایه:(۲۰/۳،کتاب البیوع طبع رحمانیه)

واذا حصل الایجاب والقبول لزم البیع ولا خیار لواحد منهما الا من عیب او عدم رؤیة۔

ولما فی شرح المجلة:(۲۲۳،۲۲۲/۲،الفصل الخامس المادة،۲۹۳،۲۹۲)

المبیع اذا هلک فی ید البائع قبل ان یقبضه المشتری یکون من مال البائع ولاشیء علی المشتری ،واذا هلک المبیع بعد القبض هلک من مال المشتری والا شیء علی البائع۔

ولما فی الفقه الاسلامی وأدلته:(۳۲۷۹/۵،طبع رشیدیه)

اذا هلک بعض المبیع بعد القبض:فان کان الهلاک بآفة سماویة أو بفعل المشتری أو المبیع نفسه أو بفعل اجنبی فالهلاک علی المشتری.

ولما فی الهدایه:(۳۲/۳،طبع رحمانیه)

فان هلک فی یده هلک بالثمن،وکذا اذا دخله عیب بخلاف اذا کان الخیار للبائع.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:محمد تنویر عفا اللہ عنہ

۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ　　　　فتویٰ نمبر:۳۷۲۱

﴿زمین کی بیع میں درخت تبعاً داخل ہوتے ہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک آدمی سے زمین خریدی اس میں درخت بھی تھے اور خریدنے کے وقت اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہوا تھا ،اب وہ درخت میں نے کاٹ لیئے پھر ۲ دو مہینے بعد وہ شخص آیا اور کہنے لگا کہ میں نے تو آپ پر صرف زمین فروخت کی تھی درخت نہیں اور مزید ۱۰ دس ہزار روپے کا مطالبہ کر رہا ہے تو کیا اس آدمی کا یہ مطالبہ کرنا درست ہے یا نہیں؟　　　　مستفتی:وقار احمد مردان

﴿جواب﴾ زمین کے فروخت کرنے کی صورت میں درخت خود بخود عقد بیع میں داخل ہوجاتے ہیں اگر چہ اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہوا ہو،لہٰذا مذکورہ صورت میں اس آدمی کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہے ہاں اگر عقد کرتے وقت درختوں کو مستثنیٰ کرتے تو پھر یہ بائع کی ملکیت ہوتی اور مطالبہ کرنا درست ہوتا۔

لما فی البحر الرائق:(۲۹۲/۵،کتاب البیع، طبع سعید)

ویدخل البناء والشجر فی بیع الارض بلا ذکر لکونه متصلاً بها للقرار فیدخل تبعاً

ولما فی الهندیه:(۳۳/۳،طبع رشیدیه)

اذا باع ارضاً او کرماً ولم یدخل الحقوق والاالمرافق فانه یدخل تحت البیع ما رکب فیها للتابید نحو الغرس والاشجار والابنیة ثم ان محمدا رحمه الله تعالی ذکر ان الشجر یدخل فی بیع الارضین من غیر ذکر ولم یفصل بین المثمرة وغیر المثمرة ولا بین الصغیرة والکبیرة والاصح ان الکل یدخل من غیر ذکر کذا فی الفتاوی الصغری سواء کانت للحطب او غیره وهو الصحیح کذا فی الخلاصة.

ولما فی الهدایه:(۳/۲۶، کتاب البیوع)

ومن باع ارضا دخل ما فیها من النخل والشجر وان لم یسمه لانه متصل به للقرار فاشبه البناء

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد تنویر عفااللہ عنہ

۲۰ جمادی الثانیہ ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر: ۲۸۰۰

﴿منقولہ چیز قبضے سے قبل فروخت کرنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ خالد ایک گاڑی بیس ہزار روپے میں بک کراتا ہے اور وہ گاڑی اس کو چھ مہینے پہلے بک کرائی ہے، خالد نے گاڑی ابھی نکالی نہیں ہے، کیا خالد مذکورہ گاڑی کو نکالے بغیر منافع پر رسید فروخت کرسکتا ہے یا پورے پیسے جمع کر کے پھر گاڑی کو بیچ سکتا ہے؟ مستفتی: محمد جمیل

﴿جواب﴾ جو چیز خریدی جائے جب تک اس کو وصول کر کے اس پر قبضہ نہ کرلیا جائے اس کا آگے فروخت کرنا جائز نہیں، لہٰذا مذکورہ صورت میں خالد جب تک گاڑی پر قبضہ نہ کرلے اس سے پہلے رسید فروخت نہیں کرسکتا، اس نے پورے پیسے جمع کئے ہوں یا نہیں۔

لما فی الهدایة:(۳/۷۰، طبع رحمانیه)

فصل ومن اشتری شیئامماینقل ویحول لم یجزله بیعه حتی یقبضه لأنه ﷺ نهیٰ عن بیع مالم یقبض ولأن فیه غرر انفساخ العقد علیٰ اعتبار الهلاك. کذافی البحر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۲۴ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۱۸۸

﴿ادائیگی رقم کے بعد بیچی ہوئی چیز کو کم قیمت پر خریدنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے زید سے ایک جوتا تیس روپے کا خریدا اور پھر میں نے اسے عمرو کو پچاس روپے کے عوض بیچ دیا پھر میں نے اسکو عمرو سے واپس تیس روپے کا خریدا، تینوں صورتوں میں رقم خریداری کے وقت ہی ادا کردی، کیا اسطرح خرید وفروخت کرنا جبکہ رقم کی ادائیگی ساتھ ساتھ ہوجائز ہے؟ مستفتی: محمد حنیف کراچی

﴿جواب﴾ سوال میں ذکر کردہ صورت جائز ہے کیونکہ اسمیں تینوں معاملے الگ الگ ہوئے ہیں اور ہر ایک میں رقم کی ادائیگی بھی ہوئی ہے، البتہ اگر رقم ادا نہ کی ہوتی تو پھر بیچی ہوئی چیز کو قیمت فروخت سے کم پر اسی شخص سے خریدنا جائز نہ ہوتا۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲۶۷/۷-۲۶۸،باب البیع الفاسد،طبع امدادیہ)
(و)فسد(شراء ما باع بنفسه أو بوکیله بالأقل)من قدر الثمن الأول(قبل نقد)کل (الثمن) الأول. (فإن اختلف)جنس الثمن أو تعیب المبیع(جاز مطلقا)کما لوشراه بأزید أو بعد النقد.
وفی الشامیة:قوله:(وفسد شراء ماباع الخ)ای لوباع شیئا وقبضه المشتری ولم یقبض البائع الثمن فاشتراه بأقل من الثمن الأول لایجوز زیلعی ... والحاصل أن نقد کل الثمن شرط لصحة الشراء لاللفساد،لأنه یفسد قبل نقد الکل أو البعض،فتأمل.
ولمافی الهندیة:(۱۳۲/۳،طبع رشیدیہ)
وفی فتاوی العتابیة لوقبض الثمن ثم اشتراه بأقل جاز.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ
۱۲ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ

واللہ اعلم: عبدالرحمٰن غفرلہ ولوالدیہ
فتویٰ نمبر: ۲۰۲۸

﴿جو چیز اپنے پاس موجود نہ ہو اس کو فروخت کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم چمڑے کا کاروبار کرتے ہیں اور اس سے اشیاء تیار کرتے ہیں، چمڑے کی صفائی کے دوران جو کچرا نکلتا ہے وہ بھی قابل استعمال ہوتا ہے اور اس کی بھی خرید وفروخت ہوتی ہے، ہم اس غرض سے کہ جگہ صاف رہے کچرا ایک سال کے لئے ایڈوانس اندازے سے فروخت کردیتے ہیں۔

اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مثلاً ہم ایک شخص سے یہ معاہدہ کرتے ہیں کہ دس ہزار روپے کے عوض وہ ہم سے سال بھر کچرا اٹھاتا رہے اور ہم یہ رقم معاملہ کے وقت وصول کرلیتے ہیں، واضح رہے کہ کچرا کبھی کم نکلتا ہے اور کبھی زیادہ، پوچھنا یہ ہے کہ ہمارا اس طریقہ سے معاملہ کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اگر درست نہیں تو اس کی صحیح صورت کیا ہوسکتی ہے؟ مستفتی: فیصل جنید کراچی

﴿جواب﴾ خرید وفروخت کا معاملہ صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ جو چیز فروخت ہورہی ہے وہ بیچنے والے کے پاس موجود ہو یا کم از کم مارکیٹ میں موجود ہو تاکہ خود بیچنے والے کے پاس اگر نہ ہو تو دوسری جگہ سے لے کر خریدار کو دے سکے، اس کے علاوہ مقدار اور وقت ادائیگی کی تعیین بھی ضروری ہے، لہٰذا آپ کے اس معاملہ کی صحیح صورت یہ ہوسکتی ہے کہ دونوں شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے کچرے کی مقدار اور سپردگی کی مدت بھی طے کرلیا کریں۔

مثلاً اس طرح سودا کریں کہ ایک مہینے کے اندر کم از کم اتنا کچرا خریدنے والے کو ملے گا اور

بعد میں اگر چہ زیادہ نکلے تو وہ اس کو ہبہ کر دیا کریں تو یہ معاملہ بیع سلم میں داخل ہو کر درست سمجھا جائیگا۔

لمافی الهداية:(۳/۱۰۰،طبع رحمانیه)

ولا يصح السلم عند أبي حنيفة الابسبع شرائط جنس معلوم...... ونوع معلوم...... وصفة معلومة ...... ومقدار معلوم ...... واجل معلوم...... ومعرفة مقدار رأس المال...... وتسمية المكان.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد کاشف عزیز غفرلہ

۳۰ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر: ۲۱۰۷

﴿جواز التصرف فی المبیع قبل القبض﴾

﴿قبضہ سے پہلے مبیع میں تصرف کرنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ انا نشترى السيارة المعيوبة بالثمن المؤجل فنرممها ونزينها ثم نبيعها ونعطى من هذا الثمن ما كان علينا من الدين يعنى للبائع الاول هل يجوز هذه المعاملة ام لا؟ بينوا توجروا. مستفتيه ام زينت الله

﴿جواب﴾ نعم يجوز هذه المعاملة لاستجماع اركانها وشرائطها فانه لما رضى البائع لتاجيل الثمن وقبضتم المبيع فلكم الاختيار فى بيعه والتصرف فيه وعليكم اداء ثمنه عند حلول الاجل والله اعلم.

لما فى قوله تعالى:(سورة البقرة،آيت ۲۷۵) وأحل الله البيع وحرم الربوا..... الأية.

ولما فى الفقه الاسلامى:(۵/۳۸۵،طبع رشيديه) فان كان مؤجلا فلا يثبت حق الحبس لانه سقط بالتأجيل.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد غفرلہ ولوالدیہ

۷ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر:

﴿کانے کی بیع کے ایک صورت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اور مفتیان عظام درج ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ گھاس، کانے وغیرہ کی گٹھڑی قیمت طے کر کے خریدنا جبکہ ان میں کافی فرق ہوتا ہے اور انکی مقدار معلوم نہیں ہوتی اسی طرح مٹی، پتھر اور ریت کا ٹیلہ اور ٹرالی منگوانا معلوم قیمت پر کیسا ہے؟

﴿جواب﴾ کانے، نرکل، گھاس وغیرہ کے بنڈل اور گٹھوں میں اگر چہ کچھ نہ کچھ فرق

ہوتا ہے لیکن اس قدر تفاوت اور فرق عرف میں برداشت کیا جاتا ہے یعنی لوگ اس سے تسامح برتتے ہیں آپس میں ناراضگی اور جھگڑے کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا لہذا یہ جائز معاملہ ہے اسی طرح ریت، پتھر، اور مٹی کے ٹرالے وغیرہ منگوانے کا بھی یہی حکم ہے۔

(لما في تنوير مع الدر: ۲۱۲،۲۱۱/۵، طبع ، ایچ ، ایم ، سعید)

(و) لا في (حطب) بالحزم ورطبة بالجرز الا اذا ضبط بما لايؤدي الى نزاع وجاز وزنا فتح

(ولما في الرد: ۲۱۲/۵، طبع ایچ ، ایم سعید)

(قوله الا اذا ضبط) بأن بين الحبل الذي يشد به الحطب والرطبة وبين طوله وضبط ذلك بحيث لايؤدي الى النزاع. زيلعي

(ولما في العالمگيرية المعروف بالهندية: ۱۸۵/۳ ، طبع ، رشيديه)

واذا أسلم في الجذوع ضربا معلوما وسمى طوله وغلظه و أجله والمكان الذي يوفيه فيه فهو جائز وكذلك الساج وصنوف العيدان والخشب والقصب واعلام الغلظ في القصب باعلام ما يشده الطن بشبر أوذراع أونحو ذلك فعند ذلك لا تجرى المنازعة بينهما كذافي المبسوط.

(ولما في البناية: ۸۱/۱۱ ، طبع ، حقانية ملتان)

ولا في الحطب حزما ولا في الرطبة جرزا للتفاوت الا اذا عرف ذلك بأن يبين له طول ما يشد به الحزمة أنه شبر أو ذراع فحينئذ يجوز اذاكان على وجه لا يتفاوت.

(ولما في فتح القدير: ۲۰/۷ ، طبع ، رشيديه)

قوله: ولا في الحطب حزما) أوأ. قارا لأن هذا مجهول لايعرف طوله وعرضه وغلظه فان عرف ذلك فهوجائز كذافي المبسوط.

(ولما في الهداية: ۹۸/۳ ، طبع برحمانيه)

ولا في الجلود عددا ولا في الحطب حزما ولا في الرطبة جرزا للتفاوت الا اذا عرف ذلك بأن يبين له طول مايشد به الحزمة أنه شبر أو ذراع فحينئذ يجوز اذا كان على وجه لا يتفاوت.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد سلمان غفرلہ ولوالدیہ

۸ صفر الخیر ۱۴۳۵ھ　　　فتویٰ نمبر ۳۸۸۲

﴿درخت کے پتوں کو بمع شاخوں فروخت کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں لوگ درختوں کے پتوں کی خرید وفروخت کرتے ہیں، طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ بائع مشتری کو کہتا ہے کہ تم اس سال اس درخت کے پتے پانچ سو روپے میں لے لو، ابھی پتوں کی نشوونما مکمل نہیں ہوتی

جب پتوں کی نشوونما مکمل ہو جاتی ہے تو مشتری بوقت ضرورت بقدر ضرورت وقتاً فوقتاً کاٹ کر لے جاتا ہے کیونکہ تمام پتے ایک ہی مرتبہ کاٹ کر نہیں لئے جاسکتے اگر ایسا کیا جائے تو پتے خشک ہو کر بے کار ہو جاتے ہیں اور جانوروں کے کھانے کے قابل نہیں رہتے بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ موسم کی خرابی یعنی بارشیں وغیرہ کم ہونے کی وجہ سے پتے اس مقدار سے کم آتے ہیں جتنی مقدار کا بائع اور مشتری اندازہ لگا کر قیمت طے کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ مشتری اس کو اپنا نقصان سمجھتا ہے لیکن بائع عام طور پر اس قیمت میں کمی نہیں کرتا اس تفصیل کے بعد مندرجہ ذیل سوالوں کے بارے میں جواب مطلوب ہے:

(۱) کیا یہ طریقہ بیع کا جائز ہے؟ (۲) موسم کی خرابی کی وجہ سے پتے کم نکلنے کی صورت میں مشتری کو قیمت میں کمی کا اختیار ہوگا؟ (۳) اگر مذکورہ طریقہ درست نہیں تو متبادل جائز اور صحیح صورت کیا ہوگی؟ براہ کرم مسئلے کا حل بیان فرما کر ثواب دارین حاصل کریں۔

(نوٹ) پتوں کے کاٹنے کا خاص موسم ہوتا ہے اور چھوٹی چھوٹی شاخوں کے ساتھ کاٹے جاتے ہیں۔ بینوا توجروا۔ مستفتی: نعمان احمد ایبٹ آباد

﴿الجواب﴾ پتوں کی فروخت کا مذکورہ طریقہ اصل مسئلہ کی رو سے صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اس صورت میں بائع اور مشتری کے درمیان جھگڑے کا اندیشہ ہوتا ہے لیکن چونکہ آجکل عام طور پر اسطرح کی بیوعات ہوتی رہتی ہیں اور لوگوں میں کوئی جھگڑا وغیرہ بھی نہیں ہوتا، لہٰذا ضرورت اور عموم بلویٰ کی وجہ سے متاخرین نے جس طرح پھلوں کی باغات میں پکنے سے پہلے فروخت کے جواز کا فتویٰ دیا ہے، اس لئے ضرورت کیوجہ سے پتوں کی بیع کی مذکورہ صورت بھی جائز معلوم ہو رہی ہے۔

لمافی تکملة فتح الملهم:(۱/۲۹۲، طبع دار العلوم کراچی)

ان تباع سائر ثمار الشجر او البستان فی حین ظهر بعضها ولم يظهر بعضها وفيه خلاف بين مشائخنا الحنفية فظاهر المذهب انه لا يجوز ايضا ولكن افتى شمس الائمة الحلوانی رحمه الله بانه لو كان الخارج اكثر جاز البيع فی الجميع وبه افتى الامام الفضلی بل يظهر من عبارته انه لا يشترط كون الخارج اكثر بل يجعل الموجود اصلا فی البيع وما يحدث بعد ذلك تبعا له ويقول استحسن فيه لتعامل الناس فانهم تعاملوا بيع ثمار الكرم بهذه الصفة، ولهم فی ذلك عادة ظاهرة وفی نزع الناس من عادتهم حرج حكاه ابن الهمام فی الفتح (۵/۱۰۵) ثم قال وقد رأيت رواية فی نحو هذا عن محمد رحمه الله وهو بيع الورد على الاشجار فان الورد متلاحق ثم جوز البيع فی الكل بهذا الطريق

وهو قول مالك رحمه الله. والحاصل ان هذه الصورة وان كانت غير جائزة في اصل المذهب غير ان فيها سعة عند عموم البلوى وفي هذه الصورة يقول العلامة ابن عابدين الشامي رحمه الله ولا يخفى تحقق الضرورت في زماننا ولا سيما في دمشق الشام كثيرة الاشجار والاثمار فانه لغلبة الجهل على الناس لايمكن التزامهم بالتخلص باحد الطرق المذكوره وفي نزعهم عن عادتهم حرج كما علمت ويلزم تحريم اكل الثمار في هذه البلدان اذلا تباع الا كذلك والنبي ﷺ انما رخص في السلم للضرورة مع انه بيع المعدوم فحيث تحققت الضرورة هنا ايضا امكن الحاقه بالسلم بطريق الدلالة فلم يكن مصادما للنص فلذا جعلوه من الاستحسان.]

ولما في الهندية:(۱۰۷/۳،طبع رشيديه)

اشترى اوراق التوت ولم يبين موضع القطع لكنه معلوم عرفا صح ولو ترك الاغصان فله ان يقطعها في السنة الثانية ولو تركها مدة ثم اراد قطعها فله ذلك ان لم يضر ذلك بالشجره كذا في البحر الرائق...... قال الفقيه ابو جعفر ان اشترى الاوراق باغصانها وبين موضع القطع لايكون للمشترى ان يرد البيع بحكم ذهاب الوقت ويجبر على جزها الا ان يكون قطع الاغصان يضر بالشجرة فحينئذ يخير البائع ان شاء فسخ البيع وان شاء رضى بالقطع.

اور دوران سال پتے اس مقدار سے اگر کم نکل آئیں جس مقدار کا اندازہ لگا کر بائع اور مشتری نے قیمت طے کی تھی تو بعد میں مشتری کو خیار مغبون کا اگرچہ متاخرین نے صحیح ہونے کا فتویٰ دیا ہے لیکن اختیار تب ہے جب مشتری کو غبن بائع کی طرف سے ہو جبکہ یہاں مشتری بیع کرتا ہے تو یہ پوری صورت حال اسکے سامنے ہے اسکے باوجود بیع کرتا ہے، لہٰذا آنیوالے ممکنہ نقصان اور خسارے کو برداشت کرنے پر پہلے سے گویا راضی ہے مزید یہ کہ مذکورہ صورت میں غبن بائع کی طرف سے بھی نہیں ہے، اس لئے مشتری قیمت میں کمی کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔

لما في تكملة فتح الملهم:(۳۸۰/۱،طبع دار العلوم كراچى)

وافتى المتاخرون من الحنفية باثبات الخيار لمن غبن فاحشا بتغرير البائع فاما اذا لم يغره البائع فلا خيار له.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: نثار محمود کوہاٹی شکردرہ

۲۹ محرم الحرام ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۱۹۳۸

﴿بیع مرابحہ میں خیانت ظاہر ہو جائے تو واپس لوٹانے کا اختیار ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ایک شخص نے دکاندار سے بوٹ خریدنا چاہا، دکاندار

نے کہا کہ یہ بوٹ ہم نے خود بارہ سو کا لیا ہے اور آپ سے صرف سو روپے منافع لیتا ہوں، اس نے بوٹ خریدا، بعد میں معلوم ہوا کہ دکاندار نے بارہ سو کا نہیں ہزار روپے کا خریدا تھا اور تین سو روپے منافع وصول کیا ہے تو کیا شرعاً دکاندار کو بوٹ واپس کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ یہ بیع مرابحہ کی صورت ہے جس کا مدار امانت و دیانت پر ہوتا ہے، بیع مرابحہ میں ایسی خیانت ظاہر ہو جائے تو مشتری کو واپس لوٹانے کا اختیار ہوتا ہے بشرطیکہ مشتری کے پاس اس چیز میں کوئی خاص تبدیلی نہ آئی ہو، پیسہ کم کرنے کا اختیار نہیں ہوتا۔

لہٰذا بوٹ کے جوڑے میں استعمال کیوجہ سے کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہو تو واپس کر سکتے ہیں اور اپنی پوری رقم لے سکتے ہیں۔

لمافی الهداية:(۷۵/۳،طبع رحمانيه)

فان اطلع المشترى على خيانة فى المرابحة فهو بالخيار عند أبى حنيفة رحمه الله ان شاء اخذه بجميع الثمن وان شاء تركه.

ولمافى الهندية:(۱۶۲/۳،طبع رشيديه)

وان خان فى المرابحة فهو بالخيار ان شاء اخذه بكل الثمن وان شاء تركه.

ولمافى الفقه الحنفى وادلته:(۵۲/۲،طبع دار الكلم الطيب)

فان علم بخيانة فى التولية اسقطها من الثمن لانه لو لم يسقط فى التولية لاتبقى تولية وفى المرابحة ان شاء اخذه بجميع الثمن وان شاء رده فلو هلك قبل ان يرده اوحدث فيه مايمنع الفسخ يلزمه جميع الثمن.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: حبیب الرحمٰن سواتی

۲۶ صفر المظفر ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۰۰۶

﴿ثمن اول معلوم نہ ہو تو بیع مرابحہ درست نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ میرے ایک دوست نے بیل خریدا دوسرا شخص اس سے کہتا ہے کہ مجھے قیمت سے پانچ ہزار کی زیادتی پر فروخت کر دے، جبکہ اس دوسرے شخص کو بیل کی قیمت کا علم نہیں ہے، تو کیا اس طرح بیع کرنا جائز ہے؟

﴿جواب﴾ بیع کے وقت خریدار کو خریدی ہوئی چیز کی قیمت کا علم ہونا ضروری ہے، اور یہ حکم بیع مرابحہ میں زیادہ تاکید سے ہے، لہٰذا اس دوسرے شخص کو اسی مجلس میں بیل کی قیمت اگر معلوم

نہیں ہوئی تو یہ بیع شرعاً معتبر نہیں ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۱۴۲/۵،طبع:سعید)

(ولی رجلا شیئا) ای باعه تولیة(بما قام علیه او بما اشتراه)به(ولم یعلم المشتری بکم قام علیه فسد)البیع لجهالة الثمن (وکذاحکم المرابحة وخیر)المشتری بین اخذه وترکه (لوعلم فی مجلسه)والابطل.

ولما فی الشامیه:(۵۰۵/۴،طبع:سعید)

واما الثالث وهو شرائط الصحة............ ومعلومیة الثمن بما یرفع المنازعة.

ولما فی الهندیه :(۳/۳،طبع:رشیدیه)

منها ان یکون المبیع معلوما والثمن معلوما علما یمنع من المنازعة فبیع المجهول جهالة تفضی الیها غیر صحیح.

ولما فی الهدایة:(۷۸/۳، طبع :رحمانیه)

(ومن ولی رجلاشیئا بما قام علیه ولم یعلم المشتری بکم قام علیه فالبیع فاسد) لجهالة(فان اعلمه فی المجلس فهو بالخیار ان شاء اخذه وان شاء ترکه)لان الفسادلم یتقرر فاذا حصل العلم فی المجلس جعل کابتداء العقد صار کتاخیر القبول الی اخر المجلس

ولما فی الفتح القدیر:(۲۶۸/۶،طبع:رشیدیه)

ومن ولی رجلا شیئا بما قام علیه ولم یعلم المشتری بکم قام علیه فالبیع فاسد لجهالة الثمن،فان اعلمه البائع،یعنی فی المجلس)ما قام به علیه(فهو بالخیار،ان شاء رد البیع وان شاء وقبل) لان الفساد، وان کان فی صلب العقد لکنه لم یتقرر)انما یتقرر بمضی المجلس ــــــ(کتاخیر القبول الی اخر المجلس)فانه یجوز ویتصل بالایجاب السابق اول المجلس کذا هذایکون سکوته عن تعیین الثمن فی تحقق الفساد موقوفا الی اخره.

الجواب صحیح :مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ — واللہ اعلم بالصواب: ریحان اللہ دیروی

عنہ ۲۵ صفر الخیر ۱۴۳۴ھ — فتوی نمبر: ۳۵۵۰

﴿نسوار کا کاروبار کرنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ نسوار کا کاروبار کرنا جائز ہے یا نہیں؟ — مستفتی: قاری ارشد خندان سواتی

﴿جواب﴾ نسوار کا استعمال مناسب نہیں ہے لیکن بلا شبہ یہ کوئی نشہ آور چیز نہیں ہے، اس لئے اسکا کاروبار جائز ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۴۵۴/۶،طبع سعید)

(وصح بیع غیرالخمر)ممامرومفاده صحة بیع الحشیشة والافیون.

وفی الشامیة:(قوله:وصح بیع غیر الخمر)ای عنده خلافالهمافی البیع والضمان لکن الفتوی علی قوله فی البیع وعلی قولهمافی الضمان.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: حبیب الرحمٰن سواتی

۶ محرم الحرام ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر:۱۸۲۸

﴿بچوں کے کھلونے بیچنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام کہ میں بچوں کے کھلونے وغیرہ بیچ کراپنا گزارہ کرتا ہوں جن میں جاندار وغیرہ کی تصاویر بھی ہوتی ہیں، آیاایسے کھلونے وغیرہ بیچنا جائز ہے یانہیں؟

﴿جواب﴾ بچوں کے کھلونوں میں اگرچہ تصاویر ہوتی ہیں لیکن خرید وفروخت جائز ہے۔

لمافی الشامی:(۱/۲۵۰،طبع سعید)

(اشتری ثوراوفرسامن خزف لاجل استئناس الصبی لایصح)ولاقیمةله(فلایضمن متلفه وقیل بخلافه)یصح ویضمن قنیة،وفی أخرحظرالمجتبیٰ عن ابی یوسف یجوز بیع اللعبة وان یلعب بهاالصبیان اھ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: حبیب الرحمٰن سواتی

۱۷ محرم ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر:۱۸۵۰

﴿مبیع کا مقدار سے زائد ہونے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے دو کنال زمین فروخت کی اور ہر کنال کی قیمت بھی متعین کرلی کہ فی کنال پچاس ہزار روپے کا ہے، بیع کے بعد مذکورہ زمین کی پیائش کی گئی تو وہ متعین مقدار سے دو مرلے زیادہ نکلی، اس صورت میں زائد زمین مشتری کا حق ہے یا بائع کا؟ بینواتوجروا۔ مستفتی: جمال الدین

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں متعین مقدار سے زائد زمین بائع کا حق ہے، البتہ مشتری کو یہ اختیار حاصل ہے کہ یا تو وہ اس زمین کو چھوڑ دے یا پھر مزید رقم ادا کرکے کل زمین لے لے لیکن بائع کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ مشتری سے متعین مقدار کی رقم لے لے اور زائد زمین اپنے پاس رکھ لے۔

لمافی البحرالرائق:(۵/۲۹۱،طبع سعید)

(قوله ولوقال کل ذراع بکذاونقص اخذبحصتهاأوترك وان زادأخذکله کل ذراع بکذاأو

فسخ) لما قدمنا انه وان كان وصفا اذا أفرد بثمن صار أصلا وارتفع عن التبعية فنزل كل ذراع منزلة ثوب فاذا وجدها ناقصة خير لانه لو أخذها بكل الثمن لم يكن آخذا كل ذراع بدرهم ولو وجدها زائدة لم تسلم له لصيرورتها أصلا فخير بين أن يأخذ الزائد بحصته ، بين أن يفسخ لرفع الضرر عن التزام الزائد.

ولما في الهداية:(۲/۲۲،طبع رحمانیه)

ولو قال بعتكها على أنها مائة ذراع بمائة درهم كل ذراع بدرهم فوجدها ناقصة فالمشتري بالخيار ان شاء اخذها بحصتها من الثمن وان شاء ترك وان وجدها زائدة فهو بالخيار ان شاء اخذ الجميع كل ذراع بدرهم وان شاء فسخ البيع.

لانه ان حصل له الزيادة في الذرع تلزمه زيادة الثمن فكان نفعا يشوبه ضرر فيتخير وانما يلزم الزيادة لما بينا انه صار اصلا ولو اخذه بالاقل لم يكن اخذا بالمشروط.(ومثله في النهر الفائق:(۲/۲۵۱،طبع قدیمی)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۳۳۶

﴿ٹیکس کی وجہ سے قیمت میں زیادتی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہم کمپنی سے بیس لاکھ میں مثلاً گاڑی قسطوں پر لیتے ہیں پھر دوسرے کے ہاتھ پچیس لاکھ میں قسطوں پر فروخت کرتے ہیں، مہینے کے بعد کمپنی کہتی ہے کہ ہمارے اوپر ٹیکس مزید بڑھ گیا، یہ گاڑی اکیس لاکھ کی ہوگئی تو جس کو ہم نے پچیس لاکھ میں گاڑی دی ہے قسطوں پر آیا ہم اس کے لئے قیمت بڑھا سکتے ہیں؟ مستفتی: امان اللہ کنڈی

﴿جواب﴾ سودے کے موقع پر بائع اور خریدار کے درمیان جو قیمت طے ہو جاتی ہے بس وہی واجب الادا ہے، اس میں کمی بیشی کرنا دوسرے فریق کی مرضی کے بغیر جائز نہیں ہے۔

لہٰذا مذکورہ صورت میں کمپنی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ گاڑی کی قیمت میں اضافہ کردے اسی طرح یہ خریدار اگر آگے کسی دوسرے شخص کو فروخت کردیتا ہے تو وہ بھی از خود اس کی طے شدہ قیمت پر اضافہ نہیں کرسکتا۔

لما في الهداية:(۲/۲۰،طبع رحمانیه)

واذا حصل الايجاب والقبول لزم البيع ولا خيار لواحد منهما الا من عيب وعدم رؤية.

ولما في البحر الرائق:(۵/۲۵۸،طبع سعید)

وأما شرط العقد فموافقة القبول للايجاب بان يقبل المشتري ما أوجبه البائع بما أوجبه

فان خالفه بان قبل غیر ما أوجبه أو بعض ما أوجبه أو بغیر ما أوجبه أو ببعض ما أوجبه لم ینعقد لتفرق الصفقة وانه لا یجوز الا فی الشفعة بان باع عبدا وعقارا فطلب الشفیع أخذ العقار وحده فله ذلک وان تفرقت الصفقة علی البائع ---- الا فیما اذا کان الایجاب من المشتری فقبل البائع بانقص من الثمن أو کان من البائع فقبل المشتری بازید انعقد فان قبل البائع الزیادة فی المجلس جازت کما فی التاتار خانیة.

ولما فی الهندیة:(۲/۲،طبع رشیدیه)

أما شرائط الانعقاد فانواع:منها فی العاقد.....ومنها فی العقد وهو موافقة القبول للایجاب بان یقبل المشتری ما أوجبه البائع بما أوجبه فان خالفه بان قبل غیر ما أوجبه أو بعض ما أوجبه أو بغیر ما أوجبه أو ببعض ما أوجبه لم ینعقد الا فیما اذا کان الایجاب من المشتری فقبل البائع بانقص من الثمن أو کان من البائع فقبل المشتری بازید انعقد فان قبل البائع الزیادة فی المجلس جازت.وکذا فی الرد علی الدر:(۱۲/۷،طبع امدادیه)

الجواب صحیح:عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم:صلاح الدین ڈیروی

۲۱ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر:۵۸

﴿زمین کے بدلے زمین کا سودا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زمین کے بدلے زمین کا سودا کرنا کیسا ہے کیا یہ صحیح ہے؟ از روئے شریعت اس کی وضاحت فرمائیں۔

﴿جواب﴾ زمین کے بدلے زمین کا سودا کرنا از روئے شریعت بالکل درست اور صحیح ہے۔اور دونوں کی زمین مقدار میں برابر ہونا بھی کوئی ضروری نہیں ہے اس لئے کہ زمین اموال ربویہ میں سے نہیں ہے۔

لما فی الفقه الاسلامی وادلته (۳۷۰۱/۵/ مکتبه رشیدیه)

کما لا ربا فی الاموال القیمیة مثل انواع الحیوان والبسط والطنافس والاثاث والاراضی والشجر والدور .فلا یحرم فیها الزیادة . فیجوز فیها اخذ کثیر مقابل قلیل من جنسه . لان القیمیات لیست من المقدرات ای مما لا تخضع فی مبادلتها کیلی او وزنی .

ولما فیه ایضا (۳۷۰۸/۵/ مکتبه رشیدیه)

واما الاموال القیمیة کافراد الحیوان والبسط والطنافس والاشجار والاراضی والدور . فلا یجری فیها ربا الفضل لانها لیست من المقدرات ای التی تجمع بین افرادها وحدة مقیاس ومقدار معین . فیجوز اعطاء الکثیر منها فی مقابل القلیل من جنسه کبیع غنمة بغنمتین لان ربا الفضل زیادة احد المتجانسین علی الاخر فی المقدار والکمیة والقیمیات لیست من المقدرات .

ولما فيه ايضا (۲۷۰۷/۵، مكتبه رشيديه)

وعلى هذا فان الاموال المثلية (المكيلات والموزونات) هي التي يجري فيها الربا. اما الاموال القيمة كالحيوان والدور وانواع الطنافس والجواهر واللآلي فلا يجري فيها الربا. فيجوز مبادلة الكثير بالقليل كغنمة بغنمتين. لان القيميات ليست من المقدرات اي التي تجمع بين افرادها وحدة مقياس ومقدار.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفی اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: مختشم غفرلہ ولوالدیہ

۱۲صفر الخیر ۱۴۳۵ھ | فتوی نمبر: ۳۹۴۹

﴿زمین کے بغیر زمین پر موجود چشمے کی خرید وفروخت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کی زمین میں پانی کا میٹھا چشمہ ہے، علاقے کے لوگ اس پانی کو پائپ لائن کے ذریعے اپنے گھروں تک لانا چاہتے ہیں، اب زید نے زمین کے بغیر صاف پانی کو ان لوگوں کے ہاتھوں فروخت کر دیا، اب سوال یہ ہے کہ اس طرح کا معاملہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: نظام الدین

﴿جواب﴾ زمین کا حق شرب زمین کے توابع میں شامل ہے، اس لئے بغیر زمین کے صرف پانی فروخت کرنے کو فقہاء کرام نے ناجائز قرار دیا ہے، لہٰذا زید کا اس طرح معاملہ کرنا شرعاً درست نہیں ہے۔

لمافي التنوير مع الدر:(۸۰/۵، طبع سعيد)

(وكذا) بيع (الشرب) وظاهر الرواية فساده الاتبعاخانية وشرح وهبانية.

وفي الشامية: (قوله وكذا بيع الشرب) اي فانه يجوز تبعاً للارض بالاجماع...... قال: هو والمصنف هناك ولايباع الشرب، ولا يوهب ولا يؤجر ولا يتصدق به لانه ليس بمال متقوم في ظاهر الرواية وعليه الفتوى.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۱۶رجب ۱۴۲۷ھ | فتوی نمبر: ۵۴۰

﴿مشتری اور بائع آپس میں کمی زیادتی کر سکتے ہیں؟﴾

﴿سوال﴾ بعض دفعہ خرید وفروخت میں بائع اور مشتری کے درمیان ایک معاملہ طے پاتا ہے، اسکے بعد مشتری اپنی طرف سے ثمن میں زیادتی کر کے دیتا ہے یا بائع جو طے ہوا تھا اس

سے کم ثمن لیتا ہے یا مبیع میں زیادتی کر کے دے دیتا ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

﴿جواب﴾ خرید و فروخت میں آدمی اتنے ہی مال کے مطالبے کا حق رکھتا ہے جو باہم طے پایا ہے، ہاں اگر معاملہ طے پانے کے بعد مشتری تبرعاً اپنی طرف سے قیمت میں کچھ اضافہ کر دے یا بائع اپنی طرف سے سودے میں کچھ اضافہ کر دے یا قیمت میں کچھ کمی کر دے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

لمافی الھدایۃ:(۸۰/۳،طبع رحمانیہ)

ویجوز للمشتری ان یزید للبائع فی الثمن ویجوز للبائع ان یزید للمشتری فی المبیع ویجوز ان یحط عن الثمن ویتعلق الاستحقاق بجمیع ذلک .فالزیادۃ والحط یلتحقان باصل العقد عندنا.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

۲۳ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۴۵۸

﴿قبضہ سے پہلے کسی چیز کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہم مختلف اشیاء کی خرید و فروخت کرتے ہیں، خرید و فروخت کے وقت مال سامنے نہیں ہوتا بلکہ نام یا مارکہ ذکر کر کے مال بکتا ہے، اس طرح کا معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ یا مال کا سامنے ہونا ضروری ہے؟ خریدار مال خرید لیتا ہے، اس کے بعد قبضہ میں آنے سے پہلے ہی اس کو آگے بیچنا شروع کر دیتا ہے، اس طرح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ بغیر دیکھے مال خریدنا جائز ہے لیکن دیکھنے کے بعد اگر مال مطلوبہ معیار کا نہ نکلا تو خریدار کو معاملہ ختم کرنے کا اختیار ہوگا اور بائع کو بخوشی قبول کرنا ہوگا، البتہ جس چیز پر قبضہ نہیں ہوا اس کو آگے فروخت کرنا جائز نہیں، قبضہ کے بعد فروخت کرنے کی اجازت ہے۔

لمافی البحر الرائق:(۲۶/۶،طبع سعید)

(قولہ شراء مالم یرہ جائز)ای صحیح لمارواہ ابن ابی شیبۃ من اشتری شیئالم یرہ فلہ الخیار اذا رآہ ان شاء اخذہ وان شاء ترکہ وجھالتہ بعدم الرؤیۃ لاتفضی الی المنازعۃ لانہ لولم یوافقہ یردہ فصار کجھالۃ الوصف فی المعاین المشار الیہ واطلاق الکتاب یقتضی جواز البیع سواء سمی جنس المبیع أولا وسواء أشار الی مکانہ أوالیہ وھو حاضر مستور أولا الخ.

ولمافی الھدایۃ:(۷۸/۳،طبع رحمانیہ)

ومن اشتری شیئامماینقل ویحول لم یجزلہ بیعہ حتی یقبضہ لانہ نھی عن بیع مالم

يقبض ولان فيه غرر انفساخ العقد على اعتبار الهلاك.

والسافى الهداية:(۳/۴۷،طبع رحمانيه)

ومن اشترى شيئا لم يره فالبيع جائز وله الخيار اذا رآه ان شاء اخذه بجميع الثمن وان شاء رده.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۱۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۳۲۰

﴿سونے کے فروخت کرنے کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم سے بعض اوقات لوگ سونا خرید لیتے ہیں، اور وصول کئے بغیر ہمارے پاس چھوڑ کر کہتے ہیں کہ بعد میں لے لوں گا، پھر بعد میں وہی سونا ہم پر بیچ دیتے ہیں، کیا یہ معاملہ شرعاً جائز ہے۔ اسی طرح بعض اوقات ہمارے پاس سونا نہیں ہوتا تو ہم کچھ اجرت کے ساتھ دوسرے سے خریدار کے کہنے پر جسکا کمیشن بھی لیتے ہیں خرید لیتے ہیں، پھر وہ آدمی وہی سونا ہمارے پاس بطور قرض رکھوا دیتا ہے، بعد میں جب قیمت بڑھ جاتی ہے تو خریدار کہتا ہے کہ میرا سونا بیچ دو، تو بیچنے پر بھی ہم کمیشن لیتے ہیں۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ اس سونے کی قیمت قرض رکھواتے وقت اگر پچاس ہزار تھی تو اب ہم اس کو اکسٹھ ہزار پر بیچ دیتے ہیں، تو کیا ہمارے لئے یہ اجرت لینا اور خریدار کے لئے یہ اضافی گیارہ ہزار روپیہ لینا جائز ہے؟

﴿جواب﴾ سونا چاندی پیسوں کے ساتھ خریدنا، بیچنا جائز ہے، بشرطیکہ دونوں عوض میں سے کسی ایک پر مجلس میں قبضہ ہو، دونوں طرف ادھار ہی ادھار ہو تو جائز نہیں ہے۔ لہٰذا مذکورہ دونوں معاملوں میں آپ خریدار سے اسی مجلس میں پیسے اگر وصول کر لیتے ہیں تو دونوں جائز صورتیں ہیں، اور بعد میں سونے کی قیمت بڑھ جائے تو واپس آپ کو یا آپ کے ذریعہ کسی تیسرے شخص کو نفع کے ساتھ فروخت کرنا بھی جائز ہے، اور حاصل ہونے والا نفع، اسی طرح آپ کے لئے وکالت پر اجرت (کمیشن) لینا بھی جائز ہے، بشرطیکہ پہلے سے یہ کمیشن طے شدہ اور معلوم ہو۔

پہلی صورت میں بیع قبل القبض اگر چہ ہے لیکن مبیع عین نہیں ہے بلکہ دین ہے، اور جس کے ذمہ ہے اس کو فروخت کیا جا رہا ہے فقہاء کرام نے اسکو جائز قرار دیا ہے، البتہ "بيع الدين لا على من عليه الدين" یعنی تیسرے شخص کو فروخت کرنا قبضہ سے پہلے جائز نہیں ہے، اور دوسرے معاملہ میں آپ وکیل ہیں اور وکیل کا قبضہ مؤکل کا قبضہ شمار ہوتا ہے، اس لئے تیسرے

شخص کو فروخت کرنا جائز ہے۔ بیع قبل القبض لازم نہیں آتا۔

لما فی المبسوط ۲۵،۲۴/۱۲ طبع :دارالمعرفه بیروت

واذاشتری الرجل فلوساً بدراهم ونقدالثمن ولم تکن الفلوس عندالبائع فالبیع جائز،لان الفلس الرائجة ثمن کالنقود وقد بینا ان حکم العقد فی الثمن وجوبها ووجودها معاً ولا یشرط قیامها فی ملک بائعها لصحة العقد کما لا یشرط ذالک فی الدراهم والدنانیر۔۔۔۔وانما یجب التقابض فی الصرف بمقتضی اسم العقد وبیع الفلوس بالدراهم لیس بصرف ،وکذالک لو افترقا بعد قبض الفلوس قبل قبض الدراهم ۔۔۔وان لم یتقابضا حتی افترقا بطل العقد ،لانه دین بدین،والدین بالدین لا یکون عقدا بعد الافتراق۔

ولما فی المبسوط ایضا،۳۸/۱۲

وان اقرضه درهما ثم اشتری به فلوسا بعینها او بغیرها فهو جائز ان قبضها قبل ان یفترقا ،لا ن الفلوس الرائجه لا تتعین عند المقابله بخلاف جنسها فان فارقه قبل القبض بطل لانه دین بدین۔

ولما فی البزازیه ۲۱۱/۱۰ طبع قدیمی

ولو اشتری مائة فلوس بدرهم یکفی التقابض من احدالجانبین۔

ولما فی البزازیه ایضا ۳۹۲/۱

اذا تجانس القبضان تنا وبا بان کانا قبض اما نة او ضما ن ،وان اختلفا نا ب المضمون عن غیره لا غیره ، بیانه ان الشی حتی کان فی یده بغضب او عقد فاسد فاشتراه من المالک صحیحا ینوب القبض الاول عن الثانی حتی لو هلک قبل ان یصل الی منزله وتمکن من قبضه هلک علیه۔

ولما فی البدائع ۱۴۸/۵، طبع: سعید

ویجوز بیعه ممن علیه لان المانع ہو العجز عن التسلیم ولا حاجة إلی التسلیم ههنا ونظیره بیع المغضوب انه یصح من الغائب۔

ولما فی الهدایه ۱۹۰/۳، ،طبع :رحمانیه

فان هلک المبیع فی یده قبل حبسه هلک من مال الموکل ولم یسقط الثمن ،لان یده کید الموکل۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

یکم ربیع الاول ۱۴۳۴ھ | فتویٰ نمبر: ۳۵۶۹

﴿ایجنٹ خود نہ بائع ہوتا ہے اور نہ خریدار بلکہ واسطہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک کمپنی نے اپنے مال کو

فروخت کرنے کے لئے کچھ ایجنٹ رکھے ہیں جن کو نفع کا دس فیصد ملتا ہے۔ غرض مسئلہ یہ ہیکہ اگر کوئی ایجنٹ کسی کے لئے مال دلواتے وقت اپنے نفع میں کچھ کمی کردے مثلاً اپنا نفع 10 فیصد کے بجائے 2 فیصد لے تو کیا یہ جائز ہے؟ کیا یہ معاملہ بیع قبل القبض نہیں ہے؟ مستفتی: ولی محمد کوئٹہ

﴿جواب﴾ ایجنٹ یا دلال خریدار اور بائع کے درمیان واسطہ ہوتا ہے وہ خود نہ خریدار ہوتا ہے اور نہ بائع۔ اس لئے مذکورہ صورت بیع قبل القبض کی نہیں ہے، بلکہ ایجنٹ کو جو کمیشن ملنے والی تھی بائع نے ایجنٹ کی اجازت سے مبیع کی قیمت میں کمی کردی، لہذا یہ جائز معاملہ ہے اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

لما فی الهدایة: ۸۰/۳ طبع رحمانیة

ویجوز للمشتری أن یزید للبائع فی الثمن ویجوز للبائع أن یزید للمشتری فی المبیع، ویجوز أن یحط عن الثمن ویتعلق الاستحقاق بجمیع ذالک ۔۔ ولنا أنهما بالحط والزیادة یغیران العقد من وصف مشروع الی وصف مشروع وهو کونه رابحاً أوخاسراً أو عدلا ولهما ولایة الرفع فأولی أن یکون لهما ولایة التغیر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر عفا اللہ عنہ

۲۵ جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ — فتوی نمبر: ۳۸۱۱

﴿بلٹی کرادنے کے بعد مال گم ہوجائے تو نقصان کس کے ذمے ہوگا؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک دوکاندار آدمی ہوں، اور میں نے لاہور سے کچھ مال منگوایا، اور آدھے پیسے بھی بھیج دیئے، تو لاہور والے دوکاندار نے بلٹی پر وہ مال بھیج دیا، پھر راستہ میں وہ مال غائب ہوگیا، ابھی لاہور والا دوکاندار مجھ سے بقایا پیسے مانگ رہا ہے، حالانکہ میرے تو آدھے پیسے گئے اور سامان بھی نہیں ملا، تو گزارش یہ ہے کہ یہ مال کس کے کھاتے سے ضائع ہوگیا؟ مستفتی: ولی محمد کوئٹہ

﴿جواب﴾ مال بلٹی کرکے غائب ہوا، غائب ہونے کی کوئی وجہ بھی تو ہوگی، راستہ میں ڈاکو لوگوں نے اسلحہ کے زور پر مال لوٹ لیا ہو، یا چوری ہونے کے شواہد موجود ہوں، یا کسی آسمانی آفت کی وجہ سے مال ضائع ہوگیا ہو، تو ایسی تمام صورتوں میں بلٹی کرانے والے کا مال ضائع ہوگیا ہے، لاہور والے دوکاندار کے ذمہ ہے کہ آپکی تمام رقم جو انہوں نے وصول کی ہے واپس کردے، البتہ

بلٹی کا انتظام آپ نے خود اگر کیا تھا، یا بائع یعنی لاہور والے دوکاندار نے آپ کے حکم سے مال بلٹی کیا تھا، تو ایسی صورت میں آپکا مال ضائع ہو گیا ہے، بقایا رقم ادا کرنا بھی آپکے ذمہ ہے۔

اور غائب ہونے کی کوئی معقول وجہ بلٹی کمپنی والوں کے پاس اگر نہیں ہے یا مال بردار گاڑی کے ڈرائیور وغیرہ کی بداحتیاطی واضح ہے تو پورے مال کا تاوان ادا کرنا بلٹی کمپنی والوں کے ذمہ ہے۔

لما فی الفقه الاسلامی: ۳۲۹۵/۵ طبع رشیدیه

البیع بالمراسلة أو بواسطة رسول یصح اتفاقا ویکون مجلس التعاقد هو مجلس بلوغ الرسالة من العاقد الأول الی العاقد الثانی.

ولما فی الهندیة: ۱۹/۳ طبع رشیدیه

اذا قال المشتری للبائع ابعث الی ابنی واستأجر البائع رجلا یحمله الی ابنه فهذا لیس بقبض والأجرة علی البائع الا أن یقول استاجر علی من یحمله فقبض الأجیر یکون قبض المشتری ان صدقه أنه استأجر ودفع الیه وان أنکر استئجاره والدفع الیه فالقول قوله. کذافی التاتارخانیه

ولما فی الهندیه: ۵۰۰/۴ طبع رشیدیه

وحکم الأجیر المشترک أن ما هلک فی یده من غیر صنعة فلا ضمان علیه فی قول أبی حنیفة رحمه الله تعالی وهو قول زفر والحسن وأنه قیاس سواء هلک بأمر یمکن التحرز عنه کا لسرقة والغصب أو بأ مر لایمکن التحرز عنه کا لحرق الغالب والغارة الغالبة والمکابرة وقال ابویوسف ومحمد رحمهما الله تعالی ان هلک بأمر یمکن التحرز عنه فهو ضامن وان هلک بأمر لایمکن التحرز عنه فلا ضمان کذا فی المحیط ــوبقولهما یفتی الیوم لتغیر أحوال الناس وبه یحصل صیانة أموالهم کذا فی التبیین

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۷ جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ　　　فتویٰ نمبر: ۳۷۴۷

﴿صفقۂ واحدہ میں بیع کے بعد مبیع پر قبضے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ ایک آدمی نے اڑھائی، اڑھائی لاکھ میں دو گاڑیاں ایک مالک سے ایک ہی سودے میں خریدیں پھر چار لاکھ ادا کر کے ایک گاڑی قبضہ میں لینے کا مطالبہ کر رہا ہے لیکن مالک اس پر راضی نہیں، وہ کہتا ہے کہ پورے پانچ لاکھ روپے لیکر دونوں گاڑیاں ایک ساتھ حوالہ کرونگا، کیا مالک کا ایسا کرنا صحیح ہے؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ جب ایک ہی سودے میں دونوں گاڑیوں کی خرید وفروخت ہوئی ہے تو مالک

کیلئے اسکی اجازت ہے کہ وہ کل قیمت وصول کرنے تک دونوں گاڑیوں کو اپنے پاس روکے رکھے۔

لمافی الشامی:(۵۶۱/۴،مطلب فی حبس المبیع،طبع سعید)

[تنبیه]للبائع حبس المبیع الی قبض الثمن،ولوبقی منه درهم ولوالمبیع شیئین بصفقة واحدة،وسمی لکل ثمنافله حبسهماالی استیفاء الکل،ولا یسقط حق الحبس بالرهن ولابالکفیل،ولاباِبرائه عن بعض الثمن حتی یستوفی الباقی.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم:شاہد اسحاق عفااللہ عنہ

۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر:۲۴۷

﴿نقدرقم قرض دینے کے بجائے کوئی چیز مہنگی دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے کسی سے تین ہزارروپے قرض لیناچاہا،اس نے بجائے قرض دینے کے ایک کپڑاساڑھے تین ہزار روپے میں اس کوادھار پرفروخت کیاجبکہ بازارمیں اس کپڑے کی قیمت تین ہزارروپے ہے، ضرورتمند نے کپڑالیکر بازارمیں تین ہزارروپے میں فروخت کردیا،اس صورت میں قرض دینے والے کوجوپانچ سوروپے زائدملے گاشرعاًاس کی کیاحیثیت ہے؟ مستفتی:ناصرعلی لانڈھی

﴿جواب﴾ قرض دینے کیلئے مذکورہ ترتیب اختیار کرنے میں اگرچہ ضرورتمند کی خیرخواہی کیساتھ ساتھ نفع خوری کاجذبہ بھی نمایاں نظرآرہاہے لیکن بیع کی جملہ شرائط کی رعایت کرنے کی وجہ سے یہ عقد جائزہے اورادھار بیچنے کی صورت میں نقد کی نسبت زیادہ پیسہ وصول کرنابھی جائزہے،فقہاء کرام نے اس کی تصریح کی ہے،لہٰذاایسامعاملہ کرناشرعاًمنع نہیں ہے۔

لمافی فتح القدیر:(۳۲۴/۶،طبع رشیدیه)

کان یحتاج المدیون فیأبی المسؤل أن یقرض بل أن یبیع مایساوی عشرة بخمسة عشرالی أجل فیشتریه المدیون ویبیعه فی السوق بعشرحالة ولاباس فی هذافان الاجل قابله قسط من الثمن والقرض غیرواجب علیه دائمابل هومندوب فان ترکه لمجردرغبة عنه الی زیادة الدنیافمکروه أولعارض یعذربه فلا ــ ومالم ترجع الیه العین التی خرجت منه لایسمی بیع العینة لانه من العین المسترجعة لاالعین مطلقاًوالافکل بیع بیع العینة.

ولمافی الشامی:(۳۲۶/۵،طبع سعید)

فان لم یعدکمااذاباعه المدیون فی السوق فلاکراهة فیه بل خلاف الأولی،فان الأجل قابله قسط من الثمن والقرض غیرواجب علیه دائمابل هومندوب ومالم ترجع الیه العین التی خرجت منه لایسمی بیع العینة لأنه من العین المسترجعة لاالعین مطلقا

والافكل بيع بيع العينة اه.

ولمافى البحرالرائق:(۲۳۵/۶،طبع سعيد)

ومعناه الامرببيع العينة مثل أن يستقرض من تاجرعشرة فيأبى فيبيع منه ثوبايساوى عشرة بخمسة عشرمثلار غبة فى نيل الزيادة ليبيعه المستقرض بعشرة ويتحمل خمسة سمى به لمافيه من الاعراض عن الدين الى العين وهومكروه لمافيه من الاعراض عن مبرة الاقراض مطاوعة لمذموم البخل.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ
واللہ اعلم بالصواب: رضوان اللہ حقانی

یکم ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ
فتویٰ نمبر: ۲۱۲۳

﴿سامان تجارت پر آنے والے اخراجات کو قیمت خرید میں شمار کرنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام کہ ایک دوکاندار دوسرے شہر سے دوکان کا سامان خرید کر لاتا ہے تو اب اس پر جو آنے جانے کا خرچ ہوا ہے وہ اصل قیمت خرید میں شامل کر کے فروخت کر سکتا ہے یا نہیں؟ اور شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟
مستفتی: ناصر علی لانڈھی

﴿جواب﴾ سامان تجارت پر آنے والے اخراجات کو قیمت خرید میں شمار کر مزید نفع حاصل کرنا بلاشبہ جائز ہے اور یہی تو تجارت کا مقصد ہے لیکن بعض اوقات چیز کی قیمت خرید واضح طور پر بتانے کی ضرورت پڑ جاتی ہے تو ایسی صورت میں اضافی اخراجات ملا کر قیمت بتانا جھوٹ ہوگا جس سے بچنا ضروری ہے، البتہ اس طرح کہا جائے کہ یہ چیز مجھے اتنے میں پڑی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

لمافى التنويرمع الدر:(۱۳۵/۵،طبع سعيد)

(ويضم)البائع(الى رأس المال أجرالقصّار والصبغ)......(والطرازوالفتل وحمل الطعام)وسوق الغنم وأجرة الغسل والخياطة(وكسوته)وطعام المبيع بلااسرف...... الخ.

ولمافى الهداية:(۷۵/۳،طبع رحمانيه)

ويجوزان يضيف الىٰ رأس المال اجرة القصّار والطراز والصبغ والفتل واجرة حمل الطعام ويقول قام علىّ بكذاولايقول اشتريته بكذاكيلايكون كاذباً.

ولمافى البحرالرائق:(۱۰۹/۶،طبع سعيد)

(وله أن يضم الى رأس المال أجرالقصّار والصبغ والطرازوالفتل وحمل الطعام وسوق الغنم ويقول قام علىّ بكذا)ولايقول اشتريته لانه كذب وهوحرام.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ
واللہ اعلم بالصواب: رضوان اللہ حقانی

۳۰ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ
فتویٰ نمبر: ۲۱۲۲

﴿مردار کی کچی کھال بیچنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام کہ مردار کی کھال بیچنا جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مردار کی کچی کھال بیچنا جائز نہیں ہے، البتہ دباغت کے بعد بیچنا جائز ہے۔

لما فی الهداية:(۵۷/۳،طبع رحمانيه)

(ولا بيع جلود الميتة قبل أن تدبغ)لأنه غير منتفع به قال عليه السلام ولا تنتفعوا من الميتة باهاب وهو اسم لغير المدبوغ على مامر فى كتاب الصلوة(ولا بأس ببيعها والانتفاع بها بعد الدباغ)لانها طهرت بالدباغ.

ولما فى الفتاوى السراجية:(ص۹۷،طبع سعيد)لا يجوز بيع جلود الميتة قبل أن يدبغ.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد سجاد غفرلہ

۷ ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۱۴۵

﴿حلال جانوروں کے خون کی بیع جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام دریں مسئلہ کہ حلال جانوروں کا خون جو ذبح کے وقت نکلتا ہے اس کی بیع وشراء جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: محمد خان

﴿جواب﴾ جانور حلال ہو یا حرام، ذبح کے وقت جو خون اس سے نکلتا ہے اس کی خرید و فروخت جائز نہیں ہے۔

ولما فى التنوير مع الدر:(۲۳۵/۷،طبع امداديه)

(بطل بيع ما ليس بمال)والمال ما يميل اليه الطبع ويجرى فيه البذل والمنع،درر فخرج التراب ونحوه(كالدم)المسفوح فجاز بيع كبد وطحال.وفى الهداية:(۵۰/۳،رحمانيه)

ولما فى البحر الرائق:(۷۰/۶،طبع سعيد)

قوله:(لم يجز بيع الميتة والدم)لانعدام المالية التى هى ركن البيع فانهما لا يعدان مالا عند احد وهو من قسم الباطل،والمؤلف رحمه الله تعالىٰ لما استعمل الفاسد فى الباب للأعم عبر بعدم الجواز الشامل للباطل والفاسد.

ولما فى بدائع الصنائع:(۳۰۵/۵،طبع سعيد)

واما البيع الباطل وذلك نحو بيع الميتة والدم والعذرة والبول وبيع الملاقيح والمضامين وكل ما ليس بمال.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۹ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۳۹۲

﴿تقسیم سے پہلے اپنے حصے کی زمین کو بیچنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پانچ آدمیوں کے درمیان ایک مشترکہ زمین ہے، ہر ایک کا حصہ تقریباً ایک سو بیس گز بنتا ہے، ان میں سے ایک حصہ دار اپنا حصہ فروخت کرنا چاہتا ہے تو کیا مشترکہ زمین میں سے وہ اپنا حصہ کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر سکتا ہے؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: محمد ارشد

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں مشترکہ زمین میں سے اپنا معلوم حصہ کسی دوسرے کو فروخت کرنا جائز ہے اگر چہ تقسیم نہ ہوئی ہو لیکن اگر فروخت کرتے وقت یہ معلوم نہ ہو کہ میرا اتنا حصہ بنتا ہے مثلاً اسی گز یا سو گز وغیرہ، تو ایسی صورت میں یہ بیع جہالت کی وجہ سے ناجائز ہوگی۔

لما فی الهداية: (۲/۱۰۵، طبع رحمانيه)

ويجوز بيع احدهما نصيبه من شريكه فی جميع الصور ومن غير شريكه بغير اذنه الافی صورة الخلط والاختلاط فانه لايجوز الاباذنه.

ولما فی تنوير الابصار: (۴/۳۰۰، طبع سعيد)

(فصح له بيع حصته ولو من غير شريكه بلااذن الافی صورة الخلط)

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۵ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتوی نمبر: ۳۷۱

﴿جس دودھ میں چھپکلی گری ہو، اس دودھ کا بیچنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام دریں مسئلہ (۱) کہ میں ایک دودھ فروش آدمی ہوں اگر ایک من دودھ میں چھپکلی زندہ یا مردہ نکلے تو ایسا دودھ پاک ہوگا یا ناپاک؟ اور ایسا دودھ ہم کسی اور کو فروخت کر سکتے ہیں یا نہیں؟ (۲) چوہا اگر ایک من دودھ میں زندہ یا مردہ نکلے تو اس کا کیا حکم ہوگا۔

﴿جواب﴾ (۱) مذکورہ صورت میں اگر دودھ میں سے ایسی چھپکلی نکل آئے جس میں بہنے والا خون نہیں ہے خواہ زندہ نکل آئے یا مردہ اس سے دودھ ناپاک نہیں ہوتا، اس کو استعمال کر سکتے ہیں، ہاں اگر طبی لحاظ سے ایسا دودھ مضر اور نقصان دہ سمجھا جائے تو ایسا دودھ نہ خود استعمال کر سکتے ہیں نہ کسی اور کے ہاتھ فروخت کر سکتے ہیں اور اگر چھپکلی ایسی ہے جس میں بہنے والا خون ہے تو وہ اگر زندہ نکلے تب بھی دودھ پاک ہوگا اور اگر مردہ نکل آئی تو دودھ ناپاک ہے اس کو کسی دوسرے

کے ہاتھ فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

لمافی شرح العنایۃ حاشیۃ لفتح القدیر:(۸۸/۱،طبع رشیدیہ)

(وموت مالیس لہ نفس سائلۃ)یموت فیہ مالیس لہ دم سائل کالبق والذباب والزنابیر والعقرب ونحوھا فی الماء لاینجسہ عن سلمان أنہ قال فیہ ای فی مثل ھذہ الحادثۃ فانہ علیہ السلام(سئل عن اناء فیہ طعام اوشراب یموت فیہ مالیس لہ دم سائل فقال ھوالحلال أکلہ وشربہ والوضوء منہ)ولان المنجس ھواختلاط الدم المسفوح باجزائہ عندالموت الخ.

ولمافی فتح القدیر:(۱۰۷/۱،طبع رشیدیہ)

وقال أیضاوان ماتت فیھافأرۃ لوعصفورۃ اوصعوۃ اوسودانیۃ اوسام(ابرص)حاصل ھذہ المسائل ان الحیوان الواقع فی البئرلایخلو من اوجہ سبعۃ امان یکون فأرۃ اونحوھااودجاجۃ اونحوھااوشاۃ لونحوھاوکل منھاامان یخرج حیااومیتاوالمیت اما ان یکون منتفخاولافالخرج حیالاینجس فی الفصول کلھاالاالخنزیرلکونہ نجس العین وماأخرج میتافغی الوجہ الاول وھوماذاکان المیت فیھافأرۃ أوعصفورۃ وسام ابرص الکبیرمن الوزغ ولم ینتفخ(نزح)منھامابین عشرین دلواالی ثلاثین بحسب کبر الدلو وصغرھا.

(۲)اگر چوہا ایک من دودھ کے اندر سے زندہ نکل آئے تو ایسا دودھ مکروہ تنزیہی ہے، احتیاط اس میں ہے کہ دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کرے اور اگر مردہ چوہا پایا گیا تو دودھ ناپاک ہے اس کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

لمافی الھدایۃ علی صدرفتح القدیر:(۱۰۷/۱،طبع رشیدیہ)

(وان ماتت فیھافأرۃ أوعصفورۃ الی ان قال فزح منھامابین عشرین دلواالی ثلاثین بحسب کبرالدلووصغرھافی القدیس(قولہ نزح جمیع مافیھا)غذااذامات والحاصل ان المخرج حیاان کان نجس العین اوفی بدنہ نجاسۃ معلومۃ نزحت کلھا وان کان نجس السئورفقط اومشکوکہ فان لم یدخل فاہ الماء فلابأس وان أدخلہ نزح الکل فی النجس بخلاف المکروہ فانہ غیرمسلوب الطھوریۃ الخ.

ولمافی التنویرمع الدر:(۲۲۲/۱،طبع سعید)

(وسواکن بیوت)طاھرللضرورۃ(مکروہ)تنزیھافی الاصح ان وجدغیرہ.

وفی الشامیۃ:(قولہ وسواکن بیوت)أی ممالہ دم سائل کالفأرۃ والحیۃ والوزغۃ،بخلاف مالادم لہ کالخنفس والصرصروالعقرب فانہ لایکرہ کمامر،وتمامہ فی الامداد(قولہ: طاھرللضرورۃ)بیان ذلک ان القیاس فی الھرۃ نجاسۃ سؤرھالانہ مختلط بلعابھا المتولدمن لحمھاالنجس،لکن سقط حکم النجاسۃ اتفاقابعلۃ الطواف المنصوصۃ بقولہ صلی اللہ علیہ وسلم "انھالیست بنجسۃ،انھامن الطوافین علیکم والطوافات"

……يعني انها تدخل المضائق ولازمه شدة المخالطة بحيث يتعذر صون الأواني منها، وفي معناها سواكن البيوت للعلة المذكورة، فسقط حكم النجاسة للضرورة وبقيت الكراهة لعدم تحاميها النجاسة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۲۵ رجب ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۵۵۷

﴿معیوب مبیع کو واپس کرنا کیسا ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا شیشے کے ایسے پیالے بیچنا جن میں چائے ڈالنے سے وہ ٹوٹ جاتے ہیں، جائز ہے؟ اُن کے عیب کے بارے میں خریدتے وقت ہمیں بالکل ہی پتہ نہیں ہوتا تاہم جب ہمارے گاہکوں کی طرف سے شکایت آتی ہے، تب ہمیں پتہ چلتا ہے اور پھر ہم واپس کریں تو بائع واپس لیتا بھی نہیں، کیا ہمارے لئے مذکورہ پیالیوں کا بیچنا جائز ہے؟ نیز کیا ہم اُنہیں بطورِ زکوٰۃ مدرسہ وغیرہ کو دے سکتے ہیں؟۔ مستفتی: امجد

﴿جواب﴾ شیشے کے مذکورہ پیالے اگر اکثر معیوب (یعنی چائے وغیرہ ڈالنے سے ٹوٹ جاتے) ہوں تو انہیں مشتری کو اطلاع کیے بغیر آگے بیچنا آپ کے لئے ناجائز ہے کیونکہ اس میں دھوکہ ہے، ایسی صورت میں گاہک کو وہ پیالے واپس کرنے کا حق حاصل ہے، تاہم اگر آپ کے اطلاع کرنے کے باوجود وہ خرید لے تو اُسے واپس کرنے کا حق حاصل نہیں، نیز اس صورت میں مذکورہ پیالیوں (وغیرہ) کو زکوٰۃ کے طور پر دینا بھی جائز ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اکثر پیالے معیوب نہ ہوں بلکہ ایک آدھ ایسے (ٹوٹنے والے) نکل آئے تو کوئی حرج نہیں، البتہ اس صورت میں بھی گاہک نقصان کے لئے رجوع کر سکے گا، اس صورت میں مذکورہ پیالوں کو زکوٰۃ کے طور پر دینا بھی درست ہے۔ واللہ اعلم۔

لمافي جامع الترمذي:(۱/۱۵۷،طبع فاروقی ملتان)

عن أبي هريرة أن رسول الله ﷺ مر على صبرة طعام فادخل يده فيها فنالت أصابعه بللا……فقال من غش فليس منا.

ولما في الدر المختار:(۵/۴۷،طبع سعيد)

أفروع لا يحل كتمان العيب في مبيع او ثمن لان الغش حرام……الخ.

ولما في التنوير مع الدر:(۵/۲۶،طبع سعيد)

(باع ما اشتراه فرد) المشتری الثانی (علیه بعیب رده علی بائعه لورده علیه بقضاء)

ولما فی الهدایة: (۴۵/۳، طبع رحمانیه)

ومن اشتری بیضا او بطیخا فکسره فوجده فاسدا فان لم ینتفع به رجع بالثمن کله وان کان ینتفع به یرجع بنقصان العیب.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد شریف حسین چترالی عفا اللہ عنہ

۲۷ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۴۷۹

﴿پھل آنے سے پہلے باغات کی بیع درست نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام کہ ہمارے علاقے (سوات) میں باغات پھل آنے سے پہلے بیچ دیے جاتے ہیں، زیادہ تر سیب اور آڑو کے باغات ہیں جو کہ ناجائز ہے۔

تاہم بعض مقامی علماءِ کرام نے اس سلسلے میں ایک جائز صورت یہ تجویز کی ہے کہ "بیع کے وقت بائع خریدار سے یہ کہدے کہ میں یہ باغ آپ کو بیچتا ہوں زمین کے مکمل تصرف کیساتھ حالانکہ پہلے بھی زمین کا تصرف ہوتا تھا، کیا مذکورہ صورت میں بیع درست ہو جائیگی؟

دوسرا یہ کہ بیع کے وقت پیشگی کے طور پر کچھ رقم خریدار بائع کو دیتا ہے مثلاً بیس لاکھ کا باغ ہے تو پانچ لاکھ روپے پہلے دیدیے اب اگر کسی سماوی آفت کی وجہ سے پھل نہ آئے یا بہت کم آئے تو مشتری اگر بائع کو باغ واپس دینا چاہے تو وہ پانچ لاکھ روپے اس کو واپس نہیں دیئے جائیں گے۔ بیع کے وقت یہ شرط لگادی جاتی ہے کہ ندامت کی صورت میں وہ واپس نہیں کی جائیگی۔ کیا ایسا کرنا درست ہے؟ وضاحت فرمائیں۔ مستفتی: محمد رفیق

﴿جواب﴾ مسئولہ صورت میں چونکہ پھل آنے سے پہلے انہیں بیچا جارہا ہے اس لئے یہ معاملہ ناجائز ہے۔

لما فی الدر المختار: (۸۵/۷، طبع امدادیه) اما قبل الظهور فلا یصح اتفاقا.

باقی رہا وہ طریقہ جو آپ کے مقامی علماء کرام نے تجویز فرمایا ہے وہ مذکورہ معاملے کے جائز ہونے کے لئے کافی نہیں ہے، کتب فقہ میں اس کا کوئی حوالہ نہیں ملا اور یہ شرط لگانا کہ بائع پیشگی وصول کردہ رقم واپس نہیں کریگا، غیر معتبر ہے، لہٰذا بائع پر لازم ہے کہ وہ پیشگی وصول کردہ رقم معاملہ فاسد ہونے کی صورت میں مشتری کو واپس کردے۔ واللہ اعلم۔

لما فی الشامی:(۸۱/۷،طبع امدادیه)

لان استیجار الارض لایتاتیٰ هنالان الاشجار باقیة علیٰ ملک البائع وقیامها فی الارض مانع من صحة استیجار الارض،الاان یاخذهاولا معاملة کمامر.لانهاتصیر فی تصرفه اوتکون الاشجار علی المساناۃ فانها حینئذلاتمنع صحة اجارة الارض کمایعلم من بابها.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　واللہ اعلم:محمد شریف حسین چترالی عفااللہ عنہ

۹ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ　　　فتوی نمبر:۱۰۴

﴿پھل ظاہر نہ ہوں تو بیع کی جگہ مساقات کا معاملہ کریں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ بارے میں کہ درختوں پر پھل ظاہر ہونے سے پہلے اس کی بیع صحیح ہے یا نہیں؟ ہمارے علاقے میں ایسے پھلوں کی بیع کئی سالوں تک ہوتی ہے۔

﴿جواب﴾ پھل اگر درختوں پر ظاہر نہ ہوں تو معدوم اور نامعلوم ہیں شریعت معدوم اور نامعلوم چیز کی بیع کو منع کرتی ہے۔آپ کے علاقے میں اس طرح کی بیع اگر لوگ کرتے ہیں تو علمائے کرام کو چاہیے کہ وہ لوگوں کو اس کے بارے میں بتائیں کہ یہ عقد شرعا جائز نہیں ہے اس سے خریدار اور بائع دونوں گناہ گار ہورہے ہیں۔اور ساتھ متبادل جائز صورت بھی بتادیا کریں۔

ایک صورت یہ ہے کہ جب درختوں پر پھل ظاہر ہوں تو اس وقت سودا کریں پہلے نہ کریں اور اگر پہلے ہی کرنا چاہتے ہیں یا کئی سالوں کیلئے باغ لینا چاہتے ہیں تو مساقات کی ترتیب اختیار کریں،مساقات کا مطلب یہ ہے کہ جس کو پھل لینا مقصود ہو،وہ درختوں کو پانی دینے، صاف کرنے،حفاظت کرنے اور اسی طرح دیگر متعلقہ تمام خدمات انجام دینا اپنے ذمہ لے اور اس کے بدلے حاصل ہونے والے پھل میں سے خاص حصہ لینے کا وہ مطالبہ کرے،مثلا دو تہائی یا زیادہ جتنا باہمی رضامندی سے چاہیں طے کریں،تو یہ مساقات کا معاملہ ہے۔اور شرعا جائز ہے لیکن ظاہر ہے مالک کو بڑی رقم کا مطالبہ کرنا ہوگا،جس کیلئے بعد میں باغ والی زمین بھی کرایہ پر لینے کا عقد کریں عامل اس پر گندم یا کوئی اور چیز کاشت کرنا چاہے تو زمین استعمال میں لاسکے گا اور اس بہانہ مالک کو مطلوبہ رقم بھی مل سکتی ہے،اس لئے کہ شرعا کرایہ طے کرنے میں کوئی حد بندی نہیں ہے باہمی رضامندی سے زیادہ یا کم طے کرسکتے ہیں اور یاد رہے کہ مساقات کے معاملہ کیلئے کچھ شرائط ہیں جن میں قدرے تفصیل ہے۔اس لئے مقامی علماء

سے معلوم کریں اور چاہے تو اس کے لئے الگ استفتاء لکھ کر بھیج دیں تو شرائط کی بھی تفصیل لکھ کر ان شاء اللہ ارسال کر دیں گے۔

لما فی الصحیح المسلم ل:(۱۱/۲ طبع:قدیمی)

عن عبداللہ ابن جابرؓ نہی رسول اللہ ﷺ عن المحاقلة والمزابنة والمعاومة والمخابرة قال احدهما بيع السنين هی المعاومة وعن الثنيا ورخص فی العرايا.

ولما فی فتح القدیر:(۲۶۴/۶،طبع:رشیدیہ،کوئٹہ)

(ومن باع ثمرة لم يبدو صلاحها) لاخلاف فی عدم جواز بيع الثمار قبل ان تظهر۔۔۔الخ

ولما فی الدر المختار :(۵۵۵/۴،طبع:سعید کراچی)

(ومن باع ثمرة بارزة) اما قبل الظهور فلا يصح اتفاقا۔۔۔الخ

ولما فی الشامی :(۸/۶،طبع:سعید کراچی)

وفی فتاوی الحانوتی :التنصيص فی الاجارة علی بياض الارض لايفيد الصحة حيث تقدم عقد الاجارة علی عقد المساقات،اما اذا تقدم عقد المساقات بشروطه كانت الاجارة صحيحة كما صرح فی البزازية.

ولما فی الشامی :(۵۵۷/۴،۵۵۸،طبع:سعید کراچی)

يشتری الموجود من الثمر بكل الثمن ويحل له البائع ماسيوجد لان استئجار الارض لايتأتی هنا،لان الاشجار باقية علی ملك البائع وقيامها فی الارض مانع من صحة استئجار الارض الان يأخذها او لامعاملة كما مر لانها فی تصرفه او تكون الاشجار علی المسناة فانها حينئذ لاتمنع صحة اجارة الارض۔۔۔الخ

ولما فی حاشیة الطحطاوی علی الدر:(۲۲/۳)

(قوله والحيلة)ای فی بيع الاثمار مع بقائها علی الاشجار وهی المخلصة من الفساد الحرمة .(قوله ان يأخذ) المشتری الثمر (قوله معاملة) ای مساقاة۔۔۔(قوله علی ان له)ای للبائع قال فی شرح الملتقی وينبغی ان يقول المشتری للبائع بعد ما دفع الثمن اخذت منك هذا الشجر معاملة علی ان لك جزء من الف جزء ولی الف جزء الاجزاء ای من الثمر۔الخ

ولما فی بدائع الصنائع :(۲۸۴/۸تا۲۹۰،طبع:دار الکتب العلمیة بیروت)

(تعریف وتوضیح وحکم وشرائط المساقاة)

المساقاة لغة :مفاعلة من السقی، لان اهل الحجاز اكثر حاجة شجرهم الی السقی،لانهم يستقون من الابار فسميت بذالك.

واصطلاحا:دفع الشجر الی من يصلحه بجزء من ثمرة اما حكم المعاملة الصحيحة (عند من يجيزها) فالانواع منها:ان كل ما كان من عمل المعاملة مما يحتاج اليه الشجر والكرم ،والرطاب،واصول الباذنجان من:السقی واصلاح النهر، والحفظ،

والتلقيح للنخل، فعلى العامل لانها من توابع المعقود عليه فيتناوله العقد، وكل ما كان من باب النفقة على الشجر والكرم ـــ والشجر والرطاب ونصب العرايش ونحو ذلك فعليهما على قدر حقيهما لان العقد لم يتناوله، لا مقصوداً، ولاضرورة وكذالك الجذاذ والقطاف لان ذالك يكون بعد انتهاء العمل فلايكون من حكم عقدالمعاملة.

منها: ان يكون الخارج بينهماعلى الشرط.

منها:انه اذالم يخرج الشجرشيئافلاشيء لواحد منهما.

منها:ان هذاالعقدلازم من الجانبين ،حتى لايملك احدهماالامتناع والفسخ من غيررضاصاحبه الامن عذر.

منها:جواز الزيادة على الشرط والحط عنه وانعدم الجوازوالاصل فيه مامرفى كتاب المزارعة ان كل موضع احتمل انشاء العقد احتمل الزيادة والا فلا،والحط جائز فى الموضعين واصله بالزيادة فى الثمن والمثمن فاذادفع نخلابالنصف معاملة فخرج الثمر،فان لم يتناه عظمه جازت الزيادة منهماايهماكان لان الانشاء للعقد فى هذه الحالة ،فكانت الزيادة جائزة.

ولوتناهى عظم البسرجازت الزيادة من العامل لرب الارض شيئا،ولاتجوز الزيادة من رب الارض للعامل شيئالان هذه الزيادة فى الاجرة لان العامل اجيروالمحل لايحتمل الزيادة.

منها:ولاية جبرالعامل على العمل الامن عذر.

منها:ان العامل لايملك ان يدفع الى غيره معاملة الااذاقال له رب الارض اعمل فيه برايك لان الدفع الى غيره اثبات الشركة فى مال غيره بغيره اذنه فلايصح.

واماالشرط المصححة لهاعلى قول من يجيزها_الخ

منها:ان يكون العاقدين عاقلين ،فاماالبلوغ فليس بشرط وكذاالحرية الخ

منها:الايكونامرتدين فى قول ابى حنيفة على قياس قول من اجاز المعاملة ،حتى لوكان احدهمامرتداوقعت المعاملة ثم ان كان المرتد هو الدافع ،فان اسلم ،فالخارج بينهم على الشرط وان قتل اومات على الردة اولحق ،فالخارج بين الدافع المسلم وبين ورثته العامل المرتد ،على الشرط بالاجماع _الخ

هذااذاكانت المعاملة بين مسلم ومرتد ،فاما ان كانت بين مسلمين ثم ارتدااوارتد احدهما فالخارج على الشرط ـــ ويجوز معاملة المرتدة دفعاواخذابالاجماع.

ومنها:ان يكون المدفوع من الشجرالذى فيه ثمرة معاملة فيمايزيد ثمرة بالعمل فان كان المدفوع نخلافيه طلع او بسرقد احمراواخضرالاانه لم يتناه عظمه جازت المعاملة وان كان قد تناهى عظمه الا انه لم برطب فالمعاملة فاسدةلانه اذاتناهى عظمه لايؤثر فيه العمل بالزيادة عادة فلم يوجد العمل المشروط عليه فلايستحق الخارج بل يكون كله لصاحب النخل.

ومنها:ان تكون حصة كل واحد منهما من بعض الخارج مشاعامعلوم القدر.

ومنها:ان یکون الخارج لهما فلو شرطا ان یکون لاحدهما فسدت ۔الخ
ومنها:ان یکون محل العمل وهو الشجر معلوما ۔۔الخ
ومنها:التسلیم الی العامل وهو التخلیة حتی لو شرطا العمل علیهما فسدت لانعدام التخلیة فاما بیان المدة فلیس بشرط لجواز المعاملة استحسانا ویقع علی اول ثمرة تخرج ه فی اول السنة ۔۔الخ۔۔۔۔ولو دفع ارضا لیزرع فیها الرطاب اودفع ارضا فیها اصول رطبة نابتة ولم یسم المدة فان کان شیئا لیس لابتداء نباته ولا لانتهاء جذه وقت معلوم فالمعاملة فاسدة وان کان وقت جذه معلوم یجوز ویقع علی جذه الاولی کما فی الشجرة المثمرة.

الجواب صحیح:مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب:شفقت اللہ
۴ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ   فتوی نمبر:۳۹۰۴

﴿"میں خرید لوں گا" بیع نہیں ہے بلکہ وعدہ بیع ہے﴾

﴿سوال﴾ حضرت مفتی صاحب:السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔میرے پاس ایک گاہک آکر یہ کہتا ہے کہ آپ کچھ جوتے مثلاً دوسو جوڑے اعلیٰ کوالٹی کے الگ کرلیں میں ایک اور گاہک لاؤں گا جو ان کو خرید لے گا اگر کچھ خرید لئے اور کچھ بچ گئے تو بقیہ میں خود خرید لونگا اور اگر اس نے بالکل نہ خریدے تو میں بھی نہیں خریدوں گا،آیا یہ معاملہ درست ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ معاملہ کی حیثیت صرف وعدہ کی ہے،ابھی تک مستقل بیع نہیں ہے اور اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم:عبدالرحمٰن غفرلہ
۲۴ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ   فتوی نمبر:۲۰۷۶

﴿آٹے کے بدلے آٹا اُدھار لینا﴾

﴿سوال﴾ ہمارے علاقے میں یہ دستور چلا آرہا ہے کہ پڑوسی ایک دوسرے کو گھریلو اشیاء مثلاً آٹا،چینی،پتی اور گھی وغیرہ قرض دیا کرتے ہیں جبکہ وزن وغیرہ کچھ نہیں کیا کرتے،البتہ برتن کا حساب ضرور ہوتا ہے،تاہم برتنوں کی بھرائی میں فرق یعنی کمی،زیادتی کا احتمال ہوا کرتا ہے اور کبھی کبھار برتن کی مقدار کے حساب سے ہٹ کر محض تخمیناً مذکورہ لین دین ہوتا ہے،کیا شرعی اعتبار سے مذکورہ دونوں صورتیں درست ہیں؟   مستفتی:عبدالحمید صاحب

﴿جواب﴾ پڑوسیوں کا مندرجہ بالا معاملہ اگر باقاعدہ ناپ تول کے ساتھ ہو تو درست

ہے،اسی طرح اگر کسی برتن کے ذریعے ناپ کر (اندازہ کر کے) مذکورہ اشیاء کا تبادلہ کیا جائے جس کا مقررہ وقت تک ضائع ہو جانے کا اندیشہ نہ ہو تو جائز ہے مثلاً گھر کے کسی برتن سے ناپ کر کے دیدیا اور پھر اسی برتن سے ناپ کر واپس وصول کرلیا۔

گندم،آٹا وغیرہ کا تھوڑی مقدار میں تبادلہ کرنا اگر چہ اندازے سے ہی ہو،ناپ تول اور وزن کر کے نہ ہو،جیسے اگر ایک کلو سے کم گندم غلہ وغیرہ اندازے سے ایک دوسرے کو دیا جائے تو بھی جائز ہے۔

لمافی الدرمع الرد:(۵/۱۶۲،طبع سعید)

وفی الاشباه:کل قرض جر نفعاً حرام. وفیها استقراض العجین وزنایجوز وینبغی جوازه فی الخمیر بلا وزن سئل رسول الله ﷺ عن خمیرة یتعاطاها الجیران أیکون ربا فقال "مارآه المسلمون حسنا فهو عندالله حسن ومارآه المسلمون قبیحا فهو عندالله قبیح".

وفی الشامیة:واحترز بالوزن عن المجازفة،فلایجوز بحر.

ولمافی التنویرمع الدر:(۷/۲۰۶-۲۰۷،طبع سعید)

(وحل)بیع ذلک(متماثلا)لامتفاضلا(وبلامعیار شرعی)اذ لم یقدر الشرع لم یقدر المعیار بالذرة وبمادون نصف صاع(کحفنة بحفنتین)وثلاث وخمس مالم یبلغ نصف صاع.

ولمافی الهدایة:(۳/۲۲،طبع رحمانیه)

ویجوز باناء بعینه لایعرف مقداره وبوزن حجر بعینه لایعرف مقداره،لان الجهالة لا تفضی الی المنازعة لمانه یتعجل فیه التسلیم فیندر هلاکه قبله.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　واللہ اعلم:محمد شریف حسین چترالی عفااللہ عنہ

۲۳ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ　　فتویٰ نمبر:۱۸۰

﴿ادھار کا ایک مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام دریں مسئلہ کہ زید نے خالد کو حیدر آبادی چپلیں بیس ہزار روپے میں فروخت کیں اور کہا کہ ایک ماہ کے اندر رقم ادا کردینا لیکن دس دن کے بعد زید خالد کے پاس آیا اور کہا کہ آپ مجھے ابھی رقم دیدیں اور میں اس رقم میں سے پانچ سو روپے آپ کے لئے چھوڑ رہا ہوں،کیا اس طرح کرنا جائز ہے؟　　مستفتی:افضال احمد،کورنگی

﴿جواب﴾ دین میں بشرط تعجیل (یعنی یہ شرط لگانا کہ مجھے ابھی ادا کردو) کمی کرنا جائز نہیں کیونکہ دائن پیشگی لینے کے واسطے رقم چھوڑ رہا ہے اور مدیون بھی اس وجہ سے رقم کم ادا کر رہا ہے کہ

اس سے مقررہ وقت سے پہلے مطالبہ کیا جارہا ہے تو رقم اجل کا عوض ہوئی اور اجل کا معاوضہ لینا حرام ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں خالد کیلئے زید جو پانچ سو روپے چھوڑ رہا ہے حلال نہیں۔

لما فی الهدایة:(۲۵۶/۳،طبع رحمانیه)

ولو كانت له الف مؤجلة فصالحه على خمس مائة حالة لم يجز لان المعجل خير من المؤجل وهو غير مستحق بالعقد فيكون بازاء حطه عنه وذلك اعتياض عن الاجل وهو حرام.

ولما فی الکفایة مع فتح القدیر:(۷۷/۷،طبع رشیدیه)

(قوله:اعتياض عن الاجل وهو حرام)وهذا لان الاجل صفة كالجودة والاعتياض عن الجودة لايجوز فكذا عن الاجل ألاترى أن الشرع حرم ربا النسئة وليس فيه الامقابلة المال بالاجل شبهة فلان يكون مقابلة المال بالاجل حقيقة حراما أولى..... والاصل فيه ان الاحسان متى وجد من الطرفين يكون محمولاً على المعاوضة كهذه المسئلة فان الدائن اسقط من حقه خمس مائة والمديون اسقط حقه فى الاجل فى الخمس المائة الباقية فيكون معاوضة بخلاف مااذا صالح من ألف على خمس مائة فانه يكون محمولا على اسقاط بعض الحق دون المعاوضة لان الاحسان لم يوجد الا من طرف رب الدين.

ولما فی التنویر مع الدر:(۶۳۰/۵ طبع سعید)

(أوعن ألف مؤجل على نصفه حالا)..... والاصل ان الاحسان ان وجد من الدائن فاسقاط وان منهما فمعاوضة.

وفی الشامیة:(قوله حالا)لانه اعتياض عن الاجل وهو حرام.....(قوله فمعاوضة)أى ويجرى فيها حكمها فان تحقق الربا أو شبهته فسدت والاصحت ط قال طبيان صالح على شيئى هو أدون من حقه قدرا أو وصفا أو وقتا وان منهما:أى من الدائن والمدين بان دخل فى الصلح مالا يستحقه الدائن من وصف كالبيض بدل السود أو ماهو فى معنى الوصف كتعجيل المؤجل أو عن جنس بخلاف جنسه(وكذا فى البحر الرائق:(۱۵۶/۷، طبع سعيد)

الجواب صحیح :عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۱۴ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۴۰۰

﴿اناج کو اناج کے بدلے ادھار لینا﴾

﴿سوال﴾ ہمارے علاقے میں یہ معاملہ بہت عام ہے کہ کسی کی فصل جلدی پک جاتی ہے اور کسی کی بعد میں، اب ہوتا یہ ہے کہ جس کی فصل پہلے تیار ہوئی تو ضرورتمند لوگ اس سے اناج لیتے ہیں اس شرط کے ساتھ کہ جب ہماری فصل تیار ہوگی تو آپ کو اتنا ہی واپس کردینگے، براہ کرم مسئلہ کی وضاحت فرمائیں کہ از روئے شرع جائز ہے یا نہیں؟ کہیں اس میں ربا تو نہیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ معاملہ شریعت کی رو سے درست ہے بشرطیکہ باقاعدہ وزن کر کے دیا اور

لیا جائے یعنی تخمینے اور اندازے سے ایسا معاملہ نہ کیا جائے جس میں کمی بیشی کا بھی احتمال ہوتا ہے اگر وزن کر کے برابر، برابر لین دین کیا جائے تو کوئی سود نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

لما فی الدر مع الرد:(۵/۱۶۷ مطبع سعید)

وفیہا استقراض العجین وزنا یجوز وینبغی جوازہ فی الخمیرۃ بلا وزن سئل رسول اللہ ﷺ عن خمیرۃ یتعاطاھا الجیران ایکون ربا؟ فقال "مارآہ المسلمون حسنا فھو عنداللہ حسن ومارأہ المسلمون قبیحا فھو عنداللہ قبیح.

وفی الشامیۃ:(قولہ استقراض العجین وزنا یجوز)ھو المختار مختار الفتاوی واحترز بالوزن عن المجاوزۃ فلا یجوز.بحر ط.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد شریف حسین عفا اللہ عنہ

۲۹ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۵۰۶

﴿شیئرز کی بیع کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ اسٹاک ایکسچینج میں جو شیئرز بکتے ہیں اُنہیں زائد قیمت پر بیچ کر منافع حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: ولید کورنگی

﴿جواب﴾ مذکورہ شیئرز کو زائد قیمت پر بیچنا اور نفع حاصل کرنا جائز ہے بشرطیکہ اُس کمپنی کے اثاثے سیّال (Liquid assets) یعنی نقد رقم نہ ہوں، بلکہ فکسڈ (Fixed assets) اثاثے ہوں، یعنی کمپنی نے کوئی بلڈنگ وغیرہ بنالی ہو، یا زمین وغیرہ خریدی ہو، غرض کوئی بھی (جائز) کاروبار کھول لیا ہو، نیز اسٹاک ایکسچینج (Stock exchenge) سے شیئرز کی خرید وفروخت کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ کمپنی کی بنیاد حلال کاروبار پر رکھی گئی ہو یعنی سود، قمار وغیرہ کے لئے نہ بنائی گئی ہو لیکن بعد میں اگر کسی درجہ میں وہ کمپنی حرام کام جیسے سود وغیرہ میں ملوث ہو (لیکن اُس کا اکثر لین دین حلال امور ہی پر مشتمل ہو) تو شرط یہ ہے کہ شیئرز ہولڈر کمپنی کے سالانہ میٹنگ (GeneralMeeting) میں آواز اٹھائے ''کہ ہم سود وغیرہ کے (حرام) کاروبار کو جائز نہیں سمجھتے'' اور اس کی اجازت نہیں دیتے۔

چوتھی شرط جو دراصل تیسری شرط ہی کا ایک حصہ ہے یہ کہ'' منافع کی تقسیم کے موقع پر شیئرز ہولڈر پر لازم ہے کہ وہ انکم اسٹیٹ (income state) سے معلوم کرلے کہ آمدنی کا کتنا فیصد حصہ ناجائز طور پر حاصل ہوا ہے مثلاً سودی ڈپازٹ سے حاصل ہوا ہے تو اسی نسبت

اپنے پاس حاصل شدہ نفع سے صدقہ کردے۔

لما فی قوله تعالیٰ:(سورة البقرة،ایت۲۷۶)﴿یمحق الله الرّبٰوا ویربی الصّدقات..... الأیة﴾

الجواب صحیح:عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم:محمد شریف حسین عفا اللہ عنہ

۱۴۲۷ھ   فتویٰ نمبر:۵۱۱

﴿قسطوں کی ادائیگی میں تاخیر پر جرمانہ لینا ناجائز اور حرام ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ میں مسمی امان اللہ کنڈی پرانی اور نئی گاڑیوں کا کاروبار کرتا ہوں اور قسطوں پر گاڑی دیتا ہوں کچھ نقد اور کچھ قسط پر پھر کوئی قسط اگر مقررہ تاریخ سے آؤٹ ہوجائے تو پانچ سو روپے جرمانہ ہوتا ہے جس کو ہم لیٹ فیس کہتے ہیں کیا یہ فیس لینا جائز ہے؟   مستفتی:امان اللہ کنڈی

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں گاڑی بیچنے والے کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر خریدار نے مقررہ وقت پر قسطیں ادا نہ کی تو اپنی قسطیں قانونی ذرائع سے وصول کرلے یا سودا کرتے وقت قسطوں کی وصولی کے لئے ضمانت طلب کرنے کی شرط لگالے یا خریدار کی کوئی چیز اپنے پاس بطور رہن رکھوائے تاکہ خریدار اس رہن کے دباؤ کی وجہ سے وقت مقررہ پر قسط ادا کرنے کا اہتمام کرے لیکن بائع کو یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہے کہ مقررہ وقت پر قسط ادا نہ کرنے کی صورت میں پانچ سو روپے جرمانہ وصول کرلے،اس طرح کرنا حرام وناجائز ہے اور سود میں داخل ہے۔

لما فی البحر الرائق:(۱۱۴/۶-۱۱۵،طبع سعید)

لان للأجل شبها بالمبیع الاتری انه یزاد فی الثمن لأجل الأجل ثم قال بعد سطور:ان الاجل فی نفسه لیس بمال فلا یقابله شیئی حقیقة اذا لم یشترط زیادة الثمن بمقابلته قصدا ویزاد فی الثمن لاجله اذا ذکر الاجل بمقابلة زیادة الثمن قصدا فاعتبر مالا فی المرابحة احترازا عن شبهة الخیانة ولم یعتبر مالا فی حق الرجوع عملا بالحقیقة.

ولما فی الهدایة:(۲۵۷/۳،طبع رحمانیه)ذلک اعتیاض "عن الاجل وهو حرام.

ولما فی الهدایة:(۷۸/۳،باب المرابحة والتولیة،طبع رحمانیه)

الا یری انه یزاد فی الثمن لاجل الاجل(باب المرابحة والتولیة.

ولما فی الشامی:(۲۶۲/۷،طبع امدادیه)

قوله:(لزم کل الثمن حالا)لان الاجل فی نفسه لیس بمال فلا یقابله شیئی حقیقة اذا لم یشترط زیادة الثمن بمقابلته قصدا،ویزاد فی الثمن لاجله اذا ذکر الاجل بمقابلة زیادة

الثمن قصدا،فاعتبر ما لا فی المرابحة احترازا عن شبهة الخیانة،ولم یعتبر ما لا فی حق الرجوع عملاً بالحقیقة بحر.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ والله اعلم:صلاح الدین ڈیروی

۲۱ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر:۵۷

﴿ایک ملک کی کرنسی کے تبادلہ میں تفاضل ناجائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کو بس کنڈیکٹر ہونے کی بناء پر دوران سفر مسافروں سے کرایہ لینے کے وقت ریزگاری کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے تو وہ کسی دوکاندار وغیرہ کو ایک ہزار دس روپے نوٹ کی شکل میں دے کر اس سے صرف ایک ہزار روپے ریزگاری کی شکل میں لیتا ہے،اسی طرح زید عیدی وغیرہ بانٹنے یا کسی اور غرض کے لئے دوکاندار وغیرہ کو ایک ہزار دس روپے پرانے نوٹ کی شکل میں دے کر اس سے صرف ایک ہزار روپے نئے نوٹوں کی شکل میں لیتا ہے تو یہ معاملہ شرعاً کیسا ہے؟ مستفتی:محمد معاذ گاشکوڑ سواتی

﴿جواب﴾ مذکورہ دونوں صورتوں میں یہ معاملہ سود ہونے کی بناء پر شرعاً ناجائز اور حرام ہے کیونکہ قانونی طور پر نئے اور پرانے نوٹ،اسی طرح سکوں اور نوٹوں کی قیمت برابر ہے،البتہ اگر سخت ضرورت ہو تو یہ صورت اختیار کی جائے کہ ایک ہزار دس روپے کے پرانے نوٹوں کے عوض ایک ہزار روپے کے نئے نوٹوں کے ساتھ اور کوئی معمولی چیز وصول کرے۔

اسی طرح ایک ہزار دس روپے کے نوٹوں کے عوض ایک ہزار روپے کے سکوں کے ساتھ اور کوئی معمولی چیز وصول کرے مثلاً:ایک یا دو روپے کی ٹافی یا پان یا چاکلیٹ وغیرہ دیدیں تو یہ اگرچہ حیلہ ہی ہے لیکن ضرورت کی خاطر کرنے کی گنجائش معلوم ہو رہی ہے۔

لما فی الشامی:(۲۱۲/۷،کتاب البیوع،باب الربا،طبع امدادیہ)

قولہ:(وجیدہ مال الربا ورديئه سواء)ای فلا یجوز بیع الجید بالردی،مما فیہ الربا الا مثلا بمثل لاهدار التفاوت فی الوصف هداية.

ولما فی تبیین الحقائق:(۵۵۱/۴،کتاب الصرف،طبع سعید)

قال رحمه الله تعالى:فلو تجانسا شرط التماثل والتقابض وان اختلفا جودة وصياغة والا شرط التقابض يعني اذا بيع جنس الاثمان بجنسه كالذهب بالذهب او الفضة بالفضة يشترط فيه التساوي والتقابض قبل الافتراق ولا يجوز التفاضل فيه وان اختلفا في الجودة والصياغة.

ولما فی الھدایۃ:(۱۱۱/۳،کتاب الصرف طبع رحمانیہ)

فان باع فضۃ بفضۃ أو ذھبا بذھب لا یجوز الا مثلا بمثل وان اختلفت فی الجودۃ والصیاغۃ،لقولہ علیہ السلام الذھب بالذھب مثلا بمثل وزنا بوزن ید أبید والفضل ربوا (الحدیث)وقال علیہ السلام :جیدھا وردیھا سواء.

ولما فی شرح فتح القدیر:(۱۴۰/۷،کتاب الصرف طبع رشیدیہ کوئٹہ)

ولو تبایع فضۃ بفضۃ الخ ولو باع عشرۃ دراھم وشیئا معہ بخمسۃ عشر درھما فاما ان یکون لہ قیمۃ أولا،والأول اما ان تبلغ قیمتہ الفضۃ أولا،فان کان مما لا قیمۃ لہ کالتراب مثلا لا یجوز البیع لأن الزیادۃ لم یقابلھا عوض فتحقق الربا،وان کانت قیمتہ تبلغ الفضۃ کثوب یساوی خمسۃ جاز بلا کراھۃ وان لم تبلغ فھو جائز مع لکراھۃ.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: صادق محمد سواتی غفرلہ ولوالدیہ

۲۰ محرم الحرام ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر:۲۷۷۶

﴿پچاس روپے سے کم ایزی لوڈ کرنے پر ایک روپیہ سروس چارج لینا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جو لوگ ایزی لوڈ کا کام کرتے ہیں تو جب کوئی پچاس (50) روپے سے کم لوڈ کروائے تو ان سے ایک (۱) روپیہ سروس چارج لیتے ہیں یعنی اگر کوئی تیس (30) روپے کا ایزی لوڈ کروائے تو اس سے تیس (30) روپے لیکر انتیس (29) روپے کا ایزی لوڈ کرتے ہیں۔اسی طرح پچاس (50) روپے سے کم میں سہولت فراہم کرنے کا (۱) روپیہ سروس چارج لیتے ہیں۔ مستفتی:سعید الرحمٰن کراچوی

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں دوکانداروں کا خریداروں سے ایک (۱) روپیہ لینا جائز ہے اور یہ خریداروں کو ایزی لوڈ کی سہولت فراہم کرنے کی اجرت ہے،البتہ اس بات کا لحاظ رہے کہ خریداروں کو تحریری یا زبانی طور پر بتانا ضروری ہے یا عرف عام میں یہ مشہور ہو چکا ہو کہ دوکاندار پچاس (50) روپے سے کم ایزی لوڈ کرنے پر ایک (۱) روپیہ سروس چارج لیتے ہیں یعنی مثلاً تیس (30) روپے کا ایزی لوڈ کروانے پر انتیس (29) روپے کا لوڈ کرتے ہیں اور ایک روپیہ سروس چارج لیتے ہیں۔

لما فی قولہ تعالیٰ:(سورۃ المطففین،آیت ۱-۲-۳)

ویل للمطففین الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون واذا کالوھم او وزنوھم یخسرون..... الآیۃ.

ولما فی الشامی:(۶/۵،کتاب الاجارۃ،طبع سعید)

قولہ:(کون الاجرۃ والمنفعۃ معلومتین)اما الاول فکقولہ بکذا دراھم او دنانیر الخ.

ولما فی الھدایۃ:(۳/۲۹۵،کتاب الاجارات،طبع رحمانیہ)

الاجارۃ عقد یرد علی المنافع بعوض وقد شھدت بصحتھا الآثار وھی قولہ علیہ السلام اعطوا الاجیر اجرہ قبل ان یجف عرقہ.

ولما فی الھدایۃ مع حاشیتہ:(۳/۱۹-۲۰،کتاب البیوع،طبع رحمانیہ)

(ولھذا ینعقد بالتعاطی)والمراد ھھنا اعطاء المبیع والثمن من الجانبین بلا ایجاب وقبول وقیل یکفی فی التعاطی الاعطاء من احد الجانبین کمن وضع فلسا واخذ قطعۃ حلواء مقدرۃ بہ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:محمد شعیب پشاوری

۱۸صفر الخیر ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر:۲۸۸۱

﴿میڈیکل سٹور کھولنے کا سرٹیفیکیٹ کرایہ یا عاریت پر دینا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ میرا میڈیکل سٹور ہے جو میں نے باقاعدہ ایک سالہ ڈپلومہ حاصل کر کے اور حکومت سے منظوری لے کر کھولا ہے جب کہ میرے علاقے میں کچھ دیگر میڈیکل سٹورز ہیں جن کے پاس منظور شدہ سرٹیفیکیٹ نہیں ہیں اور جب سرکاری افسران تفتیش کے لئے آتے ہیں تو یہ حضرات مجھ سے میرا سرٹیفیکیٹ کرایہ پر لے کر جاتے ہیں اور افسران کو دکھا کر واپس لے آتے ہیں۔

پوچھنا یہ ہے کہ آیا اس طرح سرٹیفیکیٹس کو کرایہ پر دینا جائز ہے یا نہیں؟ نیز اگر عاریت پر دے تو کیا تب بھی جائز ہوگا یا نہیں؟ جبکہ وہ میرے ہی سرٹیفیکیٹ کی بنیاد پر اپنی دکان چلا رہے ہیں۔

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں سرٹیفیکیٹ کرایہ یا عاریت پر دینا جائز نہیں کیونکہ اس میں جھوٹ، دھوکہ اور ملکی قانون کی خلاف ورزی ہے اس لئے کہ سوال میں جو مذکور ہے کہ باقاعدہ ایک سالہ ڈپلومہ حاصل کر کے اور حکومت سے منظوری لے کر میڈیکل سٹور کھولا گیا ہے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ میڈیکل سٹور کھولنے کے لیے جو سرٹیفیکیٹ درکار ہوتا ہے وہ خاص تعلیمی صلاحیت کا امتحان پاس کرنے پر ملتا ہے، لہٰذا کسی ایسے شخص کو جو اس صلاحیت کا حامل نہ ہو دینا جائز نہیں کیونکہ اس میں جھوٹی گواہی بھی ہے۔

لما فی قوله تعالیٰ:(سورة النساء،آیت ۵۹)

یاایها الذین آمنوا أطیعوا الله وأطیعوا الرسول وأولی الأمر منکم.....الأیة..

ولما فی قوله تعالیٰ:(سورة الحج،آیت ۳۰)﴿واجتنبوا قول الزور.....الأیة.﴾

ولما فی صحیح البخاری:(۳۶۲/۱،باب ما قیل فی شهادة الزور،طبع قدیمی)

عن انس قال سئل النبی صلی الله علیه وسلم عن الکبائر فقال.....وشهادة الزور.

ولما فی الشامی:(۲۶۳/۴،مطلب فی وجوب طاعة الامام،طبع سعید)

(قوله افترض علیه اجابته) والاصل فیه قوله تعالی: واولی الامر منکم وقال صلی الله علیه وسلم "اسمعوا واطیعوا ولو امر علیکم عبد حبشی اجدع" وروی "مجدع" وعن ابن عمر انه علیه الصلاة والسلام قال "علیکم بالسمع والطاعة لکل من یؤمر علیکم ما لم یأمر کم بمنکر".

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:محمد شعیب پشاوری

۲۳محرم الحرام ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر:۲۸۱۳

﴿ادھار فروختگی پر زیادہ قیمت مقرر کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام درج ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کے پاس لوگ اپنی ضرورت کے لئے آتے ہیں تو وہ ان سے پوچھتا ہے کہ تمہیں کیا چیز چاہیے تو وہ انکی ضرورت کے مطابق چیز خرید کر ان لوگوں کو معینہ مدت تک اصل رقم سے زائد رقم پر دیتا ہے مثلاً ۳۰۰۰ روپے کا موبائل خرید کر ضرورت مند سے کہتا ہے کہ مجھے تین ماہ میں ۴۵۰۰ روپے ادا کرو گے لیکن اگر معینہ مدت سے زائد مدت گزر جائے تب بھی وہ اتنی ہی رقم لیتا ہے جو شروع میں طے ہو چکی تھی (یعنی ۴۵۰۰)(۱) کیا یہ معاملہ شرعاً درست ہے؟(۲) کیا ادھار فروختگی کی صورت میں نقد فروختگی کے مقابلے میں مال کی قیمت زیادہ مقرر کرنا ربوا (سود) کے دائرے میں آتا ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾(۱) صورت مسئولہ میں یہ معاملہ شرعاً درست ہے بشرطیکہ یہ شخص کاروباری ہونے کی حیثیت سے معروف ہو یا ضرورت مند جانتا ہو کہ یہ شخص وکیل کی حیثیت سے میرے لئے نہیں خریدتا بلکہ کاروباری کی حیثیت سے خریدتا ہے اور یہ بھی واضح رہے کہ اس صورت میں ضرورت مند لینے کا پابند نہیں ہے۔

(۲) ادھار فروختگی کی صورت میں نقد فروختگی کے مقابلے میں مال کی قیمت زیادہ مقرر کرنا ربا (سود) کے دائرے میں نہیں آتا بلا شبہ ادھار فروختگی کی صورت میں عموماً قیمت زیادہ ہوتی

ہے لیکن اس بات کا خیال رہے کہ بہت مہنگے دام نہ ہوں یعنی ضرورت مند کی مجبوری کا غلط فائدہ اٹھانے کے مترادف نہ ہو نیز مدت و قیمت اس درجہ متعین ہو جائے کہ نزاع یعنی جھگڑے کا اندیشہ بھی نہ رہے۔

لمافی البحر الرائق:(۱۱۵/۶،باب المرابحة والتولية،طبع سعيد)

الأجل في نفسه ليس بمال ولايقابله شيء من الثمن حقيقة اذالم يشترط زيادة الثمن بمقابلته قصداً،ويزادفي الثمن لأجله اذاذكرالأجل بمقابلة زيادة الثمن قصداً.انتهى.

ولمافي بدائع الصنائع:(۱۸۷/۵،طبع سعيد)

لامساواة بين النقدوالنسيئة لأن العين خيرمن الدين والمعجل أكثرقيمة من مؤجل.

ولمافي الخلاصة:(۲۰/۲،جنس آخرفيمايتعلق بالثمن،طبع رشيديه)

رجل باع شيئاًعلىٰ انه بالنقدبكذاوبالنسيئة بكذاوالىٰ شهربكذاوالىٰ شهرين بكذالم يجز.اھ.

ولمافي الهداية:(۷۸/۳،باب المرابحة والتولية،طبع رحمانيه)

لأن للأجل شبهاًبالمبيع الايرىٰ انه يزادفي الثمن لأجل الأجل.

ولمافي حاشية الهداية:(۷۸/۳،باب المرابحة والتولية،طبع رحمانيه)

ومانحن فيه هوان يقول ان اجلتني مدة كذافثمنه يكون بزيادة مقدارفيثبت زيادة الثمن بالشرط.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد شعیب پشاوری

۲۰ محرم الحرام ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر: ۲۷۸۴

﴿قسطوں کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں حضرات علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک ادارہ اپنے ملازمین کو قسطوں پر کچھ اشیاء (موٹر سائیکل، فریج وغیرہ) دیتا ہے اوران اشیاء کی قیمت مارکیٹ ریٹ کے برابر یا کم ہوتی ہے لیکن اس کی شرطوں میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ اگر کسی آدمی نے قسط کی ادائیگی میں تاخیر کی تو اس پر جرمانہ عائد کیا جائے گا، دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایک آدمی کو معلوم ہے کہ ان کی یہ شرط فاسد ہے لیکن پھر بھی وہ اس ادارے سے معاملہ کر لیتا ہے کہ میں کبھی بھی قسط کی ادائیگی میں تاخیر نہیں کروں گا، آیا اس طرح کا معاملہ کرنا شریعت کی رو سے جائز ہے یا ناجائز؟

﴿جواب﴾ قسطوں کی ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے جرمانہ لینا سود کے حکم میں ہے، معاملہ کے شروع میں باقاعدہ شرط کے درجہ میں اگر طے ہو تو اس سے پورا معاملہ سودی قرار پاتا ہے،

شرعاً اسکی ہرگز گنجائش نہیں ہے، اب کوئی اس توقع پر شروع میں معاملہ کرلے کہ سود دینے کی نوبت نہیں آئے گی، اس سوچ سے یہ معاملہ جائز نہیں ہوسکتا، یہ شیطانی دھوکہ ہے اس لئے کہ سودی معاملہ میں نہ صرف لینادینا حرام ہے بلکہ محض معاملہ پر رضامندی بھی سود ہی کی طرح حرام ہے۔

لمافی البحر:(۱۱۲/۶،المرابحة والتولية،طبع سعيد)

لان للاجل شبيهابالمبيع الاترى انه يزادفى الثمن لاجل الاجل......ان الاجل فى نفسه ليس بمال فلايقابله شيء حقيقة اذالم يشترط زيادة الثمن بمقابلته قصدا ويزادفى الثمن لاجله اذاذكرالاجل بمقابلة زيادةالثمن قصدافاعتبر مالافى المرابحة احترازا عن شبهة الخيانةولم يعتبر مالافى حق الرجوع عملابالحقيقة.

ولمافى الهداية:(۲۵۲/۳،الصلح فى الدين،طبع رحمانيه)

ولوكانت له الف مؤجلةفصالحه على خمسمائةحالةلم يجزلان المعجل خيرمن المؤجل وهوغيرمستحق بالعقدفيكون بازاء ماحطه عنه وذلك اعتياض عن الاجل وهوحرام.

ولمافى البحوث فى قضايافقهية معاصره:(۱۰/۱،بيع بالتقسيط،طبع دارالعلوم كراچى)

اماما يفعله بعض الناس من تحديدثمن البضاعة على اساس سعرالنقد،وذكرالقدر الزائد على اساس انه جزء من فوائد التاخير فى الاداء فانه رباصراح.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: تاجد محمود کھوٹہ

۱۱ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ | فتویٰ نمبر: ۳۰۰۲

﴿جنگل کی لکڑیاں اور درخت فروخت کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جنگل کی لکڑیاں اور درخت کاٹ کے بیچنا کیسا ہے؟ جنگل جب حکومت اور محکمہ جنگلات کی ملکیت میں ہو بعض لوگ ایسا کرتے ہیں، شرعی نقطہ نظر سے اس کا کیا حکم ہے؟ مستفتی: نزاکت علی

﴿جواب﴾ درخت اور لکڑیاں اگر حکومت اور محکمہ جنگلات یا کسی شخص کی ذاتی ملکیت میں ہوں تو انکی خرید وفروخت ناجائز ہے اگر کسی کی ملکیت میں نہ ہوں تو جائز ہے، حکومت کی ملکیت ہو اور منع نہ کرے تب بھی گنجائش ہے۔

لمافى الشامى:(۴۲۰/۶،طبع:سعيد كراچى)

والحطب فى ملك رجل ليس لأحدأن يحتطبه بغيراذنه،وان كان غيرملك فلاباس به،ولايضرنسبته الى قرية أوجماعة مالم يعلم أن ذلك ملك لهم،وكذلك الزرنيخ والكبريت والثمارفى المروج ولاودية مضمرات،ويملك المحتطب بمجردالاحتطاب

وان لم يشده ولم يجمعه.

ولما في بدائع الصنائع:(۵/۱۳۶،طبع سعيد)

(ومنها)أن يكون مملوكا لان البيع تمليك فلا ينعقد فيما ليس بمملوك كمن باع الكلأ وكذا بيع الكمأ وبيع صيد لم يوجد في أرضه لا ينعقد لأنه مباح غير مملوك لانعدام سبب الملك فيه وكذا بيع الحطب والحشيش والصيود التي في البراری والطير الذي لم يصد في الهواء والسمك الذي لم يوجد في الماء.

ولما في البحر:(۶/۷۷،طبع سعيد)

(قوله والمراعي واجارتها)اى لا يجوز بيع الكلأ واجارته اما البيع فلأنه ورد على ما لا يملكه لاشتراك الناس فيه بالحديث:الناس شركاء في ثلاث في الماء والكلأ والنار.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب:طاہرزمان راولپنڈی

۲۲صفر الخیر۱۴۳۲ھ   فتویٰ نمبر:۲۸۹۷

﴿بل آف ایکسچینج(ہنڈی)کا کسی تیسرے کو بیچنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک کمپنی نے اپنا مال دوسری کمپنی کو ۴،ماہ کے ادھار پر بیچا پھر دائن کمپنی کو رقم کی فوری ضرورت پڑ گئی تو اس نے قرضہ کا وثیقہ بینک کو فروخت کردیا اور بینک سے اپنے دین سے ۵،فیصد کم رقم فوراً حاصل کرلی،اب بینک ۴،ماہ گزرنے کے بعد مدیون کمپنی سے پوری رقم وصول کرے گا،کیا شرعاً اس طرح کا معاملہ درست ہے یا نہیں؟   مستفتی:ایک نمازی ابوبکر مسجد

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں دائن کمپنی اپنے دین کا مالک بینک کو بنا رہی ہے جو کہ غیر مدیون ہے اور یہ بیع الدین من غیر من علیہ الدین ہے اور نا جائز ہے۔

لما في الشامي:(۴/۵۱۷،مطلب في بيع الجامكية،طبع ايچ ایم سعيد کمپنی)

وعبارة المصنف في فتاواه سئل عن بيع الجامكية:وهوان يكون لرجل جامكية في بيت المال ويحتاج الى دراهم معجلة قبل ان تخرج الجامكية فيقول له رجل:بعتني جامكيتك التي قدرها كذابكذا أنقص من حقه في الجامكية فيقول له. بعتك فهل البيع المذكور صحيح ام لا لكونه بيع الدين بنقدأجاب اذا باع الدين من غير من هو عليه كما ذكر لا يصح.

ولما في التنوير مع الدر:(۵/۶۴۲-۶۴۳،فصل في التخارج طبع ایچ۔سعيد)

(وبطل الصلح ان خرج احدالورثة وفي التركة ديون بشرط ان تكون الدين لبقيتهم)لان تمليك الدين من غير من عليه الدين باطل.

ولما فی الهدایة:(۲/۲۶۱،کتاب الصلح،طبع رحمانیه)

قال وان کان فی الترکة دین علی الناس فادخلوه فی الصلح علی ان یخرجوا المصالح عنه ویکون الدین لهم فالصلح باطل لان فیه تملیک الدین من غیر من علیه وهوحصة المصالح.

ولما فی بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة:(۲/۱۰۳۵مبحث بیع الدین والاوراق طبع دارالعلوم)

بیع الدین من غیر المدیون :الصورة الثالثة من بیع الدین:ان یبیع الدائن دینه من طرف ثالث غیر المدیون،وان هذه الصورة وقع فیها اختلاف بین الفقهاء.فذهب الحنفیة والحنابلة والظاهریة الی ان بیع الدین من غیر من علیه الدین لایجوز.قال الامام محمدبن الحسن الشیبانی":لاینبغی للرجل اذاکان له دین ان یبیعه حتی یستوفیه،لانه غرر،فلایدری أیخرج أم لایخرج.وقال ابن حزم" من الظاهریة:ولایحل بیع الدین یکون لانسان علی غیره،لابنقدولابدین،لابعین ولابعرض،کان ببینة أو مقرأبه أولم یکن،کان ذلک باطل......ثم ان الذین منعوابیع الدین من غیرالمدیون انمامنعواعن طریق البیع،امااذاوقع نقل الدین بطریق الحوالة فانه جائزعندالجمیع والفرق بین البیع والحوالة ظاهرجداًعلی مذهب الحنفیة،فانهم قائلون بانه اذاتوی الحوالة بافلاس المحال علیه أوجحوده عندعدم البینة فان المحتال(الدائن الاصیل)ان یرجع علی المحیل (المدیون الاصلی)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:نثاراحمد

۲۸محرم الحرام۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر:۲۸۵۳

﴿بل آف ایکسچینج (ہنڈی کا حکم)﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماءکرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک ٹرک ڈرائیور ہوں،پشاور سے کراچی تک ٹرک چلاتا ہوں،کمپنی مالکان ہمیں جوکرایہ ادا کرتے ہیں اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ بسااوقات ہمیں ایک رسید دیتے ہیں جس کی ادائیگی چنددن بعد ہونا ہوتی ہے کہ کمپنی سے رقم فلاں تاریخ کو ملے گی لیکن رقم کاملنا یقینی ہوتا ہے،اب اگر ہم اس رقم کا انتظار کریں تو ہمیں نقصان ہوتا ہے،لہذا ہم یہ رسید کسی شخص کوکم پیسوں میں فروخت کردیتے ہیں،مثلا پچاس ہزار(۵۰۰۰۰) کی رسید ہوتی ہے،انچاس ہزار(۴۹۰۰۰) میں فروخت کردیتے ہیں،خریدار رسید دے کر ۵۰۰۰۰وصول کرلیتاہے،شریعت کی رو سے کیایہ معاملہ درست ہے؟

﴿جواب﴾ قرض وصول کرنے سے پہلے دوسرے کوفروخت کرنا شرعاًویسے بھی ممنوع ہے

جبکہ اس صورت میں درج شدہ رقم سے کم پیسوں میں فروخت کرنا سود بھی ہے لہٰذا یہ معاملہ ہرگز جائز نہیں ہے۔

لما فی رد المحتار: (۵۱۷/۴، طبع: سعید)

عبارة المصنف فی فتاواه سئل عن بیع الجامکیة وہو ان یکون لرجل جامکیة فی بیت المال و یحتاج الی دراهم معجلة قبل ان تخرج الجامکیة فیقول له رجل: بعتنی جامکیتک التی قدرها کذابکذا انقص من حقه فی الجامکیة فیقول له بعتک فهل البیع المذکور صحیح ام لا لکونه بیع الدین بنقد اجاب اذاباع الدین من غیر من هو علیه کما ذکر لا یصح قال مولانا فی فوائده وبیع الدین لا یجوز ولوباعه من المدیون اووهبه.

لما فی بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة: (۲۱/۱، طبع: دار العلوم کراتشی)

ولکن المشکلة انما تحدث من جهة ان الکمبیالیة قد اصبحت الیوم آلة قابلة للتداول وان حامل الکمبیالیة هو الدائن الاصل ربما یبیعها الی طرف ثالث باقل من المبلغ المکتوب علیها طمعاً فی استعجال الحصول علی المبلغ قبل حلول الاجل وان هذا البیع یسمی خصم الکمبیالیة فکلما اراد احامل الکمبیالیة ان یتعجل فی قبض مبلغها ذهب الی شخص ثالث وهو البنک فی عموم الاحوال وعرض علیها الکمبیالیة والبنک یتقبلها بعد التظهیر من الحامل ویعطی مبلغ الکمبیالیة لهذا الشکل غیر جائز شرعاً اما لکونه بیع الدین من غیر من علیه الدین او لانه من قبیل النقود بالنقود متفاضلة وموجلة و حرمته منصوصة فی احادیث ربا الفضل.

لما فی بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة: (۱۰۳/۲، طبع: دار العلوم کراتشی)

الصورة الثالثة من بیع الدین: ان بیع الدین دینه من طرف ثالث غیر المدیون وان هذا الصورة وقع فیها اختلاف بین الفقهاء فذهب الحنفیة والحنابلة و الظاهریة الی ان بیع الدین من غیر من علیه الدین لا یجوز قال الامام محمد بن الشیبانی رحمه الله تعالی "لا ینبغی للرجل اذا کان له دین ان یبیعه حتی یستوفیه، لانه غرر فلا یدری ا یخرج ام لا یخرج و قال الکاسانی رحمه الله تعالی ولا ینعقد بیع الدین من غیر من علیه الدین لان الدین اما ان یکون عبارة عن مال حکمی فی الذمة واما ان یکون عبارة عن فعل تملیک المال و تسلیمه و کل ذلک غیر مقدور التسلیم فی حق البائع ولو شرط التسلیم فیکون شرطاً فاسداً فیفسد البیع.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ	واللہ اعلم بالصواب: محمد حامد یاسین، بھکر
۳۰ صفر المظفر ۱۴۳۴ھ	فتویٰ نمبر: ۳۵۶۵

﴿حصہ مشاع کی خرید وفروخت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ڈی ایچ اے نے نوری آباد میں ایک ہاؤسنگ اسکیم

شروع کی ہے جس کی زمین اور رقبہ متعین ہے اور اس اسکیم سے اپنے ملازمین اور عام لوگوں کو پلاٹ فروخت کیے ہیں اور رقم بھی وصول کر لی ہے مگر خریدار کے پلاٹ کی جگہ کا تعین نہیں کیا گیا تو آیا شرعاً یہ جائز ہے یا ناجائز؟ اسی طرح ایک عمارت کی دسویں منزل کی قبل از تعمیر فروخت اور پھر قبل از قبضہ فروخت در فروخت کا کیا حکم ہے؟ مستفتی: محمد سہیل اور خالد اسٹیٹ ایجنسی ڈیفنس

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں ڈی ایچ اے کی ہاوسنگ اسکیم درست ہے اور تمام خریدار اس زمین متعینہ میں مشاعاً شریک ہیں اور عمارت کی دسویں منزل کی فروخت بیع استصناع ہے جو کہ بلڈر کے ساتھ جائز ہے، البتہ بک کروانے والے کے ساتھ تیسرے شخص کا معاملہ جائز نہیں۔

لمافي الشامي:(۳۰۰/۴، مطلب ان الدين يملك، طبع۔ ایچ۔ایم۔سعيد)

(قوله فصح له بيع حصته) تفريع على التقييد بمال صاحبه ط ..... والفرق ان الشركة اذا كانت بينهما من الابتداء، بان اشتريا حنطة أو ورثاها كانت كل حبة مشتركة بينهما فبيع كل منهما نصيبه شائعا جائز من الشريك والاجنبي، بخلاف ما اذا كانت بالخلط أو الاختلاط كان كل حبة مملوكة بجميع اجزائها ليس للآخر فيها شركة، فاذا باع نصيبه من غير الشريك لايقدر على تسليمه الا مخلوطا بنصيب الشريك فيتوقف على اذنه، بخلاف بيعه من الشريك للقدرة على التسليم والتسلم اه فتح وبحر.

ولمافي المحيط البرهاني :(۲۱۰/۲۲-۲۱۱، طبع ادارة القرآن مجلس علمي)

شركة الاختيار: وهي ان يملك اثنان عينا دارا أو عبدا أو عروضا أو غير ذلك بشراء أو ارث أو نحو ذلك ..... والشركة متى تثبت بالارث والشراء، وما يجري مجراهما يجوز بيع احدهما نصيبه من الشريك، ومن الاجنبي باذن شريكه وبغير اذن شريكه ولا يملك التصرف في غير نصيب صاحبه الا باذنه.

ولمافي الهداية:(۲۲/۳، كتاب البيوع، طبع رحمانيه)

ومن اشترى عشرة اذرع من مائة ذراع من دار أو حمام فالبيع فاسد عند أبي حنيفةؒ وقالا هو جائز وان اشترى عشرة اسهم من مائة سهم جاز في قولهم جميعا.

ولمافي الشامي:(۲۲۳/۵، طبع ایچ ایم سعيد)

قوله هو طلب الصنعة اى ان يطلب من الصانع العمل ففي القاموس :الصناعة: ككتابة حرفة الصانع وعمله الصنعة اه وفي البدائع من شروطه: بيان جنس المصنوع ونوعه وقدره وصفته، وان يكون فيه تعامل، وان لايكون مؤجلا والا كان سلما وعندهما المؤجل استصناع الا اذا كان مما لا يجوز فيه الاستصناع فينقلب سلما في قولهم جميعا.

ولمافي الشامي:(۵۰۵/۴، شرائط البيوع، انواع اربعة، طبع ایچ ایم سعيد)

وشرائط المعقود عليه ستة: كونه موجودا مالا متقوما مملوكا في نفسه وكونه الملك

للبائع فيمايبيع لنفسه، وكونه مقدور التسليم فلم ينعقدبيع المعدوم وماله خطرالعدم كالحمل واللبن في الضرع والثمر قبل ظهوره وهذاالعبدفاذاهوجارية.

والله اعلم بالصواب: نثار احمد

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۲۸۵۲

۴ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ

﴿گنے کی فصل کو اگنے سے پہلے اور اُگنے کے بعد بیچنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ مفتی صاحب یہ بات تو واضح اور معلوم ہے کہ گنے کی کٹائی سطح زمین سے اوپر کی جاتی ہے اور اس کی جڑیں زمین میں باقی رہ جاتی ہیں جس سے دوبارہ اور سہ بارہ فصل آتی ہے، پوچھنا یہ ہے کہ ہمارے ہاں لوگ اس طرح کرتے ہیں کہ ایک فصل کی کٹائی کے بعد ان مذکورہ جڑوں سے جو دوسری فصل اگنے والی ہے اس کو ابھی سے فروخت کرتے ہیں جبکہ دوسری فصل کا اگنا ابھی شروع نہیں ہوا ہوتا ہے، البتہ چند دنوں میں شروع ہو جائیگی اور بعض لوگ اس دوسری فصل کو اس وقت فروخت کرتے ہیں جب وہ تو اگ چکی ہوتی ہے لیکن فی الحال قابل انتفاع نہیں ہوتی نہ جانوروں کے کھانے کے قابل ہوتی ہے اور نہ اس سے رس (گڑ) نکل سکتی ہے، کیا شریعت مطہرہ کی رو سے اس طرح معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ صورت اولی میں یعنی جب دوسری فصل ابھی تک اگی نہیں اور ظاہر نہیں ہو چکی ہے تو اس کو ابھی سے فروخت کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ اگنے اور ظاہر ہونے سے پہلے وہ فصل معدوم ہے اور معدوم چیز کی خرید وفروخت شریعت مطہرہ کی رو سے جائز نہیں ہے، البتہ دوسری صورت میں یعنی جب دوسری فصل اگ چکی ہو اور ظاہر ہوئی ہو تو اس کو ابھی سے فروخت کرنا جائز ہے کیونکہ فی الحال اگر چہ قابل انتفاع تو نہیں ہے لیکن بعد میں قابل انتفاع ہے اور مبیع موجود ہے معدوم نہیں ہے۔

لما في بدائع الصنائع: (۵/۱۳۸، طبع سعيد)

واما الذي يرجع الى المعقود عليه فانواع (منها) ان يكون موجودا فلا ينعقد بيع المعدوم وماله خطر العدم كبيع نتاج النتاج، وكذا بيع الحمل لانه ان باع الولد فهو بيع المعدوم وان باع الحمل فله خطر المعدوم، وكذا بيع اللبن في الضرع لانه له خطر، وكذا بيع الثمر والزرع قبل ظهوره لانهما معدوم وان كان بعد الطلوع جاز وان كان قبل بدوصلاحهما اذا لم يشترط الترك ومن مشائخنا من قال لا يجوز الا اذا صار بحال ينتفع

به بوجه من الوجوه فان كان بحيث لاينتفع به اصلا لاينعقد. وهذا خلاف الرواية. والدليل على جواز بيعه ماروى عن النبى عليه الصلاة والسلام انه قال من باع نخلا مؤبرة فثمرته للبائع الاان يشترطها المبتاع جعل الثمرة للمشترى بالشرط من غير فصل بين ما اذا بدا صلاحها اولا. دل انها محل البيع كيف ماكان والمعنى فيه وهوانه باع ثمرة موجودة وهى بعرض ان تصير منتفعا بها فى الثانى وان لم يكن منتفعا بها فى الحال فيجوز بيعها. الخ.

ولما فى الفقه الاسلامى وادلته: (۳۳۹۸/۵، طبع رشیدیه)

اتفق ائمة المذاهب على انه لاينعقد بيع المعدوم وماله خطر العدم كبيع النتاج النتاج. وبيع الحمل الموجود لانه على خطر الوجود، وبيع الثمر والزرع قبل ظهوره لان النبى ﷺ نهى عن بيع حبل الحبلة. الخ.

ولما فى البزازية على هامش الهندية: (۳۷۷/۴، طبع رشیدیه)

والحاصل ان شراء القصيل قبل أن يصلح للانتفاع به بعض على عدم الجواز۔ واختار القدورى والاسبيجابى الجواز ونص محمد دل عليه قال باع قصيلا أو ثمرا فى اول مايطلع ان جزه المشترى فى الحال فالعشر على البائع وان تركه باذن البائع وجزه بعد الادراك فعلى المشترى۔ فلولا جواز البيع لمالزم على المشترى...... وفى التجريد بيع الثمرة والزرع الموجود قبل كونه زرعا منتفعا به جائز بلاشرط الترك وبه يفسد...... وان اشترى مطلقا وترك ان تناهى عظمها اولم يتناه لكنه باذن البائع طاب الخ.

واللہ اعلم بالصواب: ابوانس بلال شاہ وزیرستانی — الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۲۹۵۶ — ۲۷ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ

﴿گنے کی جڑوں کو بیچنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ یہ بات تو مشاہد اور معلوم ہے کہ گنے کی کٹائی سطح زمین سے اوپر کی جاتی ہے اور اس کی جڑیں زمین میں باقی رہ جاتی ہیں جس سے دوبارہ اور سہ بارہ فصل اگتی ہے، پوچھنا یہ ہے کہ ہمارے علاقے میں لوگ اس طرح کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ کٹائی کے بعد دوسری فصل کے آنے سے پہلے ان جڑوں کو فروخت کرتے ہیں جبکہ دوسری فصل کے آنے میں کچھ مدت لگتی ہے، کیا شریعت مطہرہ کی رو سے اس طرح معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

مستفتی: محمود شاہ وزیرستانی

﴿جواب﴾ آپ کے علاقے میں گنے کی جڑوں کو فروخت کرنے کا اگر رواج ہے اور زمین میں فصل کو تیار ہونے کی مدت تک چھوڑنے کا بھی اگر رواج ہے اور آپس میں کوئی تنازع، جنگ

وغیرہ نہیں ہوتا تو ایسا معاملہ جائز ہے، اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

لمافی الشامی:(۵/۵۳،طبع ایچ ایم سعید)

قلت: بقي شئ لم أر من نبه عليه، وهو مايكون أصله تحت الأرض ويبقى سنين متعددة مثل المصفصة تزرع في أرض الوقف وتكون كالكردار للمستأجر في زماننا فاذاباع ذلك الأصل وعلم وجوده في الأرض صح بيعه الخ.

ولمافی التنویر مع الرد:(۴/۵۵۲،طبع ایچ ایم سعید)

(ولا يدخل الزرع في بيع الارض بلاتسمية)

وفي الشامية:(قوله ولايدخل الزرع الخ)اطلاقه يعم مااذالم ينبت وبالاطلاق اخذ ابو الليث نهر، وقال في الفتح واختار الفقيه أبو الليث أنه لايدخل بكل حال كماهو اطلاق المصنف رحمه الله ... والخلاف مبني على الاختلاف في جوازبيعه قبل أن تناله المشافر والمناجل قال في الفتح يعني أن من قال لايجوزبيعه، قال يدخل ومن قال يجوزقال لايدخل، ولايخفى أن كلا من الاختلافين مبني على سقوط تقومه وعدمه ... والأوجه جوازبيعه على رجاء تركه [illegible] مع الجحش كماولدرجاء حياته فينتفع في ثاني الحال الخ.

ولما في فيض الباري:(۳/۲۴۱،طبع رشیدیه)

قال صاحب الهداية ان باعه [illegible] بالترك، طاب الفضل للمشترى وقال الشامي [illegible] الترك مشروطافي العقد، ولامعروفابين الناس والا فالمعروف [illegible] قلت: وتفصيل الشامي ليس بمختار عندى فيجوزله الفضل وان كان الترك معروفا، والحاصل: أن الشرط اذالم يكن في العقدولم يأمره البائع بالقطع طاب له تركه سواء كان معروفاأولا، ولاألتفت الى ما قاله الشامي: أن المعروف كالمشروط بعدماوجدت رواية عن الامام عندالحافظ ابن تيمية في فتاواه، وهكذافي تكملة فتح الملهم:(۱/۳۴۲،طبع دارالعلوم کراچی)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: یونس بابال شاہ جنوبی وزیرستان

۲۳ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر: ۲۹۳۲

﴿اراضی مکہ کی خرید وفروخت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ہذا کے بارے میں کہ مکہ کی زمین کی خرید وفروخت جائز ہے یا ناجائز؟ بینوا توجروا

مستفتی: عبدالوہاب لقمانی کراچی

﴿جواب﴾ مکہ کی زمین اور اس کے مکانات کی خرید وفروخت جائز ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۶/۲۹۲،طبع سعید)

(و)جاز(بیع بناء بیوت مکة وأرضها)بلاکراهة وبه یفتی عینیوقدمرّفی الشفعة وفی البرهان فی باب العشرولایکره بیع أرضهاکبنائها وبه یعمل وفی مختارات النوازل لصاحب الهدایة لابأس ببیع بنائها واجارتهالکن فی الزیلعی وغیره یکره اجارتهاوفی آخر الفصل الخامس من التتارخانیة واجارةالوهبانیة قالا:قال أبوحنیفة أکره اجارة بیوت مکة فی أیام الموسم وکان یفتی لهم أن ینزلواعلیهم فی دورهم لقوله تعالیٰ سواء العاکف فیه والباد-ورخص فی غیرأیام الموسم اه فلیحفظ.

ولمافی مجمع الأنهر:(۲/۲۱۲،فصل فی البیع،طبع المنار)

(یجوزبیع بناء)بیوت مکة فتجب الشفعة فیهاکمامرّ(ویکره بیع أرضهاواجارتها)عند الامام(خلافألهماوقولهماروایةالحسن عن الامام)لأن الناس یتبایعون فی أراضیها ودورهافی سائرالأمصارمن غیرانکاروهوأقوی الحجج.قلت:أی فیجوزبیع أرضها بلاکراهة کماهوروایةالحسن وهی أحسن بل بهایفتی کمافی المنح عن العینی وعبارة البرهان ومواهب الرحمن ولایکره أبویوسف بیع أرضهاکبنائهاوهوروایة عنهماوبه یعمل انتهیٰ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:محمد آمین

۸صفرالخیر۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر:۲۸۶۷

﴿اضافی اخراجات کو قیمت خرید کیساتھ ملانیکا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے علماء کرام کہ ایک شخص کا بیگ،بستہ کا کاروبار ہے تو وہ تیار شدہ مال اور وہ کپڑا جو بیگ میں استعمال ہوتا ہے لاہور سے،فیصل آباد سے منگواتا ہے تو منگوانے کی صورت میں اس پر کافی اخراجات آتے ہیں جسکی وجہ سے ان چیزوں کی قیمت بڑھ جاتی ہے تو کیا ان اضافی اخراجات کو بھی اصل قیمت یعنی قیمت خرید میں شمار کیا جائے گا یا نہیں؟

﴿جواب﴾ جی ہاں کرایہ وغیرہ کیوجہ سے جو اضافی اخراجات سامان تجارت پر آتے ہیں، ان سب کو قیمت خرید کے ساتھ ملانے کی اجازت شریعت نے دی ہے اور بائع گاہک سے اس زیادتی کے مطالبہ کا حقدار ہے،البتہ گاہک کو یہ نہ کہے کہ اتنے میں لیا ہے بلکہ کہے کہ یہ بیگ اتنے میں پڑا ہے۔

لما فی الهدایة:(۳/۷۵،طبع رحمانیه)

ویجوزأن یضیف الی رأس المال أجرة القصار والطراز والصبغ والفتل وأجرة حمل الطعام لأن العرف جاربالحاق هذه الأشیاء برأس المال فی عادة التجارة ولان کل

مایزیدفی المبیع اوقیمته یلحق به هذاهوالاصل.

ولمافی التنویرمع الدر:(۵/۱۳۵-۱۳۶،طبع سعید)

(ویضم)البائع(الی رأس المال أجرة القصار والصبغ)......وسوق الغنم وأجرة الغسل والخیاطة......وضابطه کل مایزیدفی المبیع اوفی قیمته یضم درر(ویقول قام علی بکذاولایقول اشتریته)لأنه کذب.

ولمافی البحرالرائق:(۶/۱۰۹،طبع سعید)

وله أن یضم الی رأس المال أجرة القصارویقول قام علی بکذاولایقول اشتریته لانه کذب وهوحرام ولایضم أجرة الراعی والتعلیم وکراء بیت الحفظ لعدم العرف بالحاقه.

واللہ اعلم بالصواب: محمد عمران الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۲۹۳۷ ۶۲ صفرالخیر ۱۴۳۲ھ

﴿نقد رقم قرض دینے کی بجائے ادھار سامان دینا﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام کہ ایک شخص کا قسطوں پر دینے کا کاروبار ہے، کبھی کبھار اس کے پاس کوئی آدمی آتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے دس ہزار روپے قرض دے دو، وہ آدمی بجائے قرض رقم دینے کے اسکو ایک موبائل بارہ ہزار پر ادھار فروخت کردیتا ہے جبکہ اس موبائل کی قیمت مارکیٹ میں دس ہزار ہوتی ہے، ضرورت منداس موبائل کولیکر بازار میں دس ہزار پر فروخت کردیتا ہے، اس طرح ضرورتمند کو دس ہزار روپے ملے اور بائع کو متعین مدت کے بعد بارہ ہزار روپے ملیں گے تو اسطرح کا معاملہ کرنا شریعت کی رو سے جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ معاملہ جائز ہے اس لئے کہ اس میں بیع کے منافی کوئی بات نہیں ہے اگرچہ اس میں دوسری کی ضرورت پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا فائدہ بھی ہے، البتہ اگر یہ آدمی ضرورت مند کو نقد رقم بطور قرض دے دیتا تو اس کیلئے باعث اجر وثواب ہوتا اور ادھار کی وجہ سے زیادہ قیمت لینا شرعاً ممنوع نہیں ہے۔

لمافی الشامی:(۵/۳۲۶،طبع سعید)

فان لم یعدکمااذاباعه المدیون فی السوق فلاکراهة فیه بل خلاف الأولی،فان الأجل قابله قسط من الثمن والقرض غیرواجب علیه دائمابل هومندوب ومالم ترجع الیه العین المسترجع لاالعین مطلقاوالافکل بیع بیع العینة.

ولمافی البحرالرائق:(۶/۲۳۵،طبع سعید)

المرادبقوله تعین علی حریراشتری حریرابطریق العینة ومالم ترجع الیه العین التی خرجت

منه لا يسمى بيع العينة المستر جمة لا لمعين مطلقا، والافكل بيع بيع العينة، وفي الهداية ان الكراهة في هذا البيع حصلت من المجموع فان الاعراض عن الاقراض ليس بمكروه والبخل الحاصل من طلب الربح في التجارات كذلك والا لكانت المرابحة مكروهة.

ولما في الشامي:(۵/۱۴۲، طبع سعيد)

لأن للأجل شبها بالمبيع. ألا ترى أنه يزاد في الثمن لأجله.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد عمران

۲۳ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ فتوی نمبر: ۲۹۲۲

﴿ کمپنی کیلئے مال کمیشن پر فروخت کرنے کے متعلق ایک سوال ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں مالک دکان کیساتھ تنخواہ پر سیلری کا کام کرتا ہوں اسکے علاوہ مجھے مالک دکان کیطرف سے کھلی اجازت حاصل ہے کہ میں ان کی دکان میں کسی اور شخص یا ادارے کا سامان بھی بیچوں، لھذا میرے پاس دو کمپنیوں والے ڈبل روٹی فروخت کرنے کے لئے رکھتے ہیں، اُن میں سے ایک کمپنی والے مجھے کچھ معاوضہ بھی دیتے ہیں دونوں کی کوالٹی تقریباً ایک جیسی ہے۔

اب ہوتا یہ ہے کہ جب میرے پاس کوئی گاہک آتا ہے اور اس کمپنی کی ڈبل روٹی مجھ سے خریدنا چاہتا ہے (جو مجھے کوئی معاوضہ نہیں دیتے) تو میں دوسری کمپنی والوں کی ڈبل روٹی کی تعریف کر لیتا ہوں کہ یہ اچھی چیز ہے، لہذا گاہک میرے تعریف سے متاثر ہو کر وہی ڈبل روٹی لے لیتا ہے، اب پوچھنا یہ ہے کہ اس صورت میں جو دوسری کمپنی والوں کا سامان نہ نکلنے کی وجہ سے جو نقصان ہوتا ہے اس کی وجہ سے میں گناہ کا مرتکب تو نہیں ٹھہرتا؟ مستفتی: زبیر صاحب کورنگی

﴿جواب﴾ جو کمپنی آپ کو ڈبل روٹی فروخت کرنے پر کمیشن دی رہی ہے تو ان کے مال کی حقیقت کے حد تک تعریف کی گنجائش ہے بشرطیکہ دوسری کمپنی کے مال کی تحقیر نہ کرے ایسی صورت میں دوسری کمپنی والوں کا جو نقصان ہو رہا ہے اس کا آپ سے مواخذہ نہیں ہوگا انشاء اللہ،

البتہ مذکورہ صورت میں چونکہ گاہک دوسری کمپنی کی چیز لینے پر راضی ہو چکا ہے اور کمپنی کیطرف سے بھی دلالۃ راضی ہونا پایا گیا ہے، لہذا ایسی صورت میں دوسری کمپنی کی چیز کی ترغیب دینا جائز نہیں کیونکہ یہ سوم علی سوم غیرہ کی ممانعت میں داخل ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۱۰۱/۵،طبع سعید)

(و)کرہ(النجش) ... ان یزید ولا یرید الشراء او یمدحه بمالیس فیه لیروجه ویجری فی النکاح وغیره ثم النھی محمول علی ما(اذاکانت السلعة بلغت قیمتھا،أما اذالم تبلغ لا)یکرہ لانتفاع الخداع.

ولما فی فتح القدیر:(۲۳۶/٦،طبع رشیدیه)

(ونھی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن النجش)بفتحتین(وھوان یزید الرجل فی الثمن ولا یرید الشراء لیرغب غیرہ)ویجری فی النکاح وغیرہ حیث قال علیه الصلوٰۃ والسلام(ولاتناجشوا)ای لاتفعلوا ذلک وسبب ذلک ایقاع رجل فیه بازیدمن الثمن وھوخداع والخداع قبیح جاورھذاالبیع فکان مکروھاوظھرمن ھذاان الراغب فی السلعة اذاطلبھامن صاحبھابانقص من ثمنھافزادشخص لایریدالشراء الی مابلغ تمام قیمتھالایکون مکروھالانتفاع الخداع.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:سلمان احمد

۲۲محرم الحرام ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر:۲۹۸۳

﴿ڈیلر کے لئے کمیشن لینا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ڈیلر حضرات جو ہم کو زمین یا دکان یا کوئی پلاٹ وغیرہ خرید کروا دیتے ہیں تو یہ لوگ بائع اور مشتری دونوں سے ایک لاکھ کے پیچھے دو ہزار کمیشن صرف سودا بنانے کا لیتے ہیں تو کیا یہ کمیشن از روئے شرع جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی:شہباز قصور

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں ڈیلر کا بائع یا مشتری کی جانب سے کمیشن لینے میں از روئے شرع کوئی قباحت نہیں کیونکہ یہ اس کی اپنی محنت کا صلہ ہے،لہٰذا جس فریق نے بھی اس کو متعین کیا ہے ڈیلر ان سے کمیشن لے سکتا ہے اور اگر دونوں نے مقرر کیا ہو تو دونوں فریقوں سے متعین کمیشن لے سکتا ہے۔

لما فی الشامی:(٦۳/٦،طبع سعید)

[تتمة]قال فی التاتارخانیة:وفی الدلال والسمسار یجب اجر المثل،وماتواضعواعلیه ان فی کل عشرۃ دنانیر کذافذاك حرام علیھم.وفی الحاوی:سئل محمد بن سلمة عن اجرۃ السمسار،فقال:ارجوانه لاباس به وان کان فی الاصل فاسدالکثرۃ التعامل وکثیرمن ھذاغیر جائز،فجوزوہ لحاجة الناس الیه کدخول الحمام.

ولما فی الشامی:(٥٦۰/۴،طبع سعید)

وأما الدلال فان باع العین بنفسه باذن ربھافأجرته علی البائع وان سعی بینھماوباع

المالک بنفسه یعتبر العرف وتمامه فی شرح الوهبانیة.

وفی الشامیة:(وقوله یعتبر العرف)فتجب الدلالة علی البائع او المشتری او علیهما بحسب العرف جامع الفصولین.

ولما فی خلاصة الفتاوی:(۱۵۰/۲،طبع رشیدیه)

دلال باع ضیعة رجل بامره قال الاجر بعتها بغیر أجرة وقال الدلال بعتها باجر، ان کان الدلال معروفا بذلک لایصدق الامر ویجب علیه اجر المثل.

ولما فی الولوالجیة:(۲۸۲/۳،طبع فاروقیه پشاور)

دلال باع ضیعة رجل بامره،فقال البائع بعتها بغیر اجرة وقال الدلال باجر ان کان الدلال معروفا بذلک بان یبیع اموال الناس ویاخذ علی ذلک اجرا ولا یصدق لامر ویجب علیه اجر المثل لان المعروف کالمشروط.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:محمد عمران غفرلہ ولوالدیہ

۲۵محرم الحرام ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر:۲۸۱۳

﴿گارنٹی پر سامان دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ مشین، فریزر، گھڑیاں، فریج وغیرہ بازار میں ایک مدت تک گارنٹی پر دی جاتی ہیں یا اس مدت معینہ میں خراب ہونے کی صورت میں اسکو درست کرنے کی ذمہ داری لی جاتی ہے تو کیا شرعاً اس طرح کا معاملہ کرنا درست ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ سال یا کم زیادہ کی گارنٹی کی شرط لگانا اگر عقد کے دوران ہو تو صحیح نہیں ہے، یہ شرط فاسد ہے، اس سے معاملہ فاسد ہو جاتا ہے لیکن شروط فاسدہ کے متعلق فقہاء کرام نے یہ بھی تصریح فرمائی ہے کہ ایسی شروط جو عام طور پر لگائی جاتی ہوں اور ان کا ایک رواج سا ہو جائے تو یہ صحیح شمار ہوتی ہیں اگرچہ اصلاً فاسد ہوں، الیکٹرونک اشیاء کی گارنٹی لینے کا رواج عام ہو چکا ہے اس لئے اس کی گنجائش ہے۔

لما فی الفقه الاسلامی:(۳۴۷۱/۵،طبع رشیدیه)

من الشروط الصحیحة،ماجری به العرف،کشراء الساعة او المذیاع او الغسالة أو الثلاجة بشرط أن یصلحها البائع لمدة سنة مثلا اذا أصابها خلل،فیجوز البیع استحسانا، والقیاس أن لا یجوز وهو قول زفر ووجه الاستحسان أن الناس تعاملوا هذا الشرط فی البیع،کما تعاملوا الاستصناع،فسقط القیاس بتعامل الناس کما سقط فی الاستصناع.

ولما فی الدر المختار:(۸۵/۵،طبع سعید)أما لو جری العرف به ..... فلا فساد.

ولما فی درر الحکام:(۱/۱۵۹،طبع ماجدیہ)

الشرط المتعارف ولو لم یکن من مقتضیات العقد جوز البیع معه استحسانا وصار معتبرا لان الشرط متی کان متعارفا فلا یکون باعثا علی النزاع.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد عمران چارسدہ

۳ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۲۹۷۰

﴿حرام اور ناجائز چیز کے بیچنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ دوکان میں ایسی چیز بیچی جائے جس کے بیچنے کو شریعت نے ناجائز قرار دیا ہے یا وہ چیز حرام ہو وغیرہ تو آدمی جب زکوٰۃ دیتا ہے کیا اس سے وہ مال بھی صاف ہو جاتا ہے؟

﴿جواب﴾ خدانخواستہ کوئی ایسی چیز بیچ دے جس کا بیچنا از روئے شرع ممنوع ہو تو باوجود زکوٰۃ ادا کرنے کے بھی اُس سے حاصل شدہ منافع حلال نہیں ہونگے۔

البتہ حدیثِ پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ تاجر حضرات سے دورانِ تجارت بعض جو فضول باتیں وغیرہ صادر ہوتی رہتی ہیں اُن کا کفارہ صدقہ وخیرات سے ہو جائے گا۔

لما فی مشکوۃ المصابیح:(۱/۲۴۳،طبع سعید)

وعن قیس بن أبی غرزۃ قال کنا نسمیٰ فی عهد رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم السماسرۃ فمر بنا رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فسمانا باسم هو أحسن منه فقال "یا معشر التجار ان البیع یحضره اللغو والحلف فشوبوه بالصدقة رواه أبوداؤد والترمذی والنسائی.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد شریف حسین عفااللہ عنہ

۲۱ رجب ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۵۷۱

﴿ادائیگی ثمن سے پہلے مشتری کے قبضے میں مبیع کا ہلاک ہو جانا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے متعلق کہ زید نے خالد سے ایک گھوڑا خریدا اور کہا میں اس کی قیمت ایک ماہ میں ادا کروں گا، خالد نے بھی مان لیا اور زید گھوڑا لے گئے دس، بارہ دن کے بعد گھوڑا کسی مرض کی وجہ سے مر گیا، اب پوچھنا یہ ہے کہ مہینہ پورا ہونے کے بعد زید پوری قیمت ادا کرے گا یا کمی کی گنجائش ہے؟ مستفتی: سیف الرحمٰن

﴿جواب﴾ جب زید نے گھوڑے پر قبضہ کرلیا تو بیع تام ہوگئی، گھوڑا ہلاک ہونے کی

صورت میں طے شدہ قیمت میں کمی نہیں ہو سکتی، مہینہ پورا ہونے کے بعد زید کو پوری قیمت ادا کرنی ہوگی۔

لمافی الهداية:(۲/۲۰،طبع رحمانيه)

واذاحصل الايجاب والقبول لزم البيع ولاخيارلواحدمنهماالامن عيب أوعدم رؤية.

ولمافی الهداية:(۲/۲۲،طبع رحمانيه)

فان هلك في يده هلك بالثمن وكذااذادخله عيب بخلاف اذاكان الخيار للبائع.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۴ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ　　فتویٰ نمبر: ۲۵۷

﴿ایک چیز کو مختلف داموں پر فروخت کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام کہ کاروبار میں ایک ہی چیز ایک آدمی کے ہاتھ مہنگے دام فروخت کرنا جبکہ وہی چیز کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ سستے داموں فروخت کرنا کیسا ہے، کیا ایک ہی چیز مختلف قیمتوں پر فروخت کر سکتے ہیں؟ اس لئے کہ بعض گاہک اصرار کرتے ہیں تو ہم قیمت کم کر دیتے ہیں اور بعض بالکل اصرار نہیں کرتے تو قیمت وہی رہتی ہے جو پہلے بتائی تھی۔

﴿جواب﴾ ہر ایک گاہک کو ایک ہی دام پر فروخت کرنا ضروری نہیں ہے، ایک کو مقررہ قیمت پر چیز دی، دوسرے کے ساتھ رعایت کر لی تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، البتہ ایسے شخص کے ساتھ معاملہ کرنا جو مارکیٹ کے بھاؤ سے ناواقف ہے یا اتفاق سے ایسی چیز صرف آپ کے پاس اس وقت موجود ہے مارکیٹ میں عام دستیاب نہیں ہے تو ایسی صورتوں میں زیادہ پیسے لینا مجبوری سے فائدہ اٹھانے کے مترادف ہے جو کہ شرعاً قبیح اور ناپسندیدہ عمل ہے۔

لمافی قوله تعالیٰ:(سورة النساء، ایت ۲۹)

﴿يا أيها الذين أمنوا لا تأكلوا اموالكم بينكم بالباطل إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم﴾

ولمافی العناية بهامش فتح القدير:(۵/۴۵۲،رشيديه)البيع مبادلة المال بالمال بالتراضي.

ولمافی الهندية:(۳/۱۶۱،طبع رشيديه)من اشترى شيئا واغلى في ثمنه فباعه مرابحة على ذلك جاز.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: محمد ضیاء الدین

۱۴۲۸/۳/۱۴ھ　　فتویٰ نمبر: ۶۶۶

﴿یوٹیلیٹی اسٹور سے اشیاء خرید نے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ آج کل یوٹیلیٹی اسٹورز میں چینی مارکیٹ کی بنسبت کچھ سستی ملتی ہے لیکن بعض یوٹیلیٹی اسٹورز والے پانچ کلو چینی کیساتھ یہ شرط لگاتے ہیں کہ دو کلو چینی سستی تب ملے گی کہ سوڈیڑھ سو کا سامان اور بھی ہمارے ہاں سے خریدو، شریعت کی نظر میں انکے ساتھ خرید وفروخت کا معاملہ ایسی صورتحال میں درست ہے؟

تنقیح: سامان خرید نے کی جو شرط لگاتے ہیں، یہ حکومت کی طرف سے ہوتی ہے؟

جواب تنقیح: جی ہاں، یہ شرط حکومت کی طرف سے ہوتی ہے، خواہ حکومتی یوٹیلیٹی اسٹور ہو یا ذاتی، البتہ حکومتی یوٹیلیٹی اسٹور میں اس شرط کی زیادہ پابندی نہیں ہوتی کیونکہ اگر دوسری اشیاء کی خریداری کم ہو جائے تو نقصان حکومتی خزانے سے پورا کیا جاتا ہے۔ مستفتی: محمد یعقوب

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں یوٹیلیٹی اسٹور سے خریداری جائز ہے کیونکہ دوسری چیز جو شرط کی طور پر آپ کو خریدنی پڑ رہی ہے وہ بھی بیع کے لئے محل بننے کی صلاحیت رکھتی ہے، لہذا خریداری میں کوئی شبہ نہیں کرنا چاہیے۔

لما فی الهداية:(۶۱/۳ طبع رحمانيه)

ومن باع عبدا على ان يعتقه المشترى اويدبره اويكاتبه اوامة على ان يستولدها فالبيع فاسد لان هذا بيع وشرط وقد نهى النبى صلى الله عليه وسلم عن بيع وشرط الا ان يكون متعارفا لان العرف قاض على القياس.

ولما فی فتح القدير:(۲۹۹/۶ طبع رشيديه)

وقبول العقد فى الذى فيه الخيار وان كان شرطا لانعقاد العقد فى الاخر لكن هذا غير مفسد لكونه)اى من فيه الخيار محلا للبيع فهو (كالوجمع بين قن ومدبر) وباعهما بالف حيث ينعقد البيع فى القن بحصته وان كان قبول العقد فى المدبر شرطا فيه وذلك لدخول المدبر فى البيع لمحليته له فى الجمله.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: سلمان احمد

۱۶ محرم الحرام ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر: ۲۷۶۲

﴿کسی چیز کو اس شرط کے ساتھ بیچنا کہ واپس مجھ ہی کو بیچو گے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ زید نے بکر کو بیس ہزار روپے کا جانور فروخت کیا اور

کہا کہ جب یہ بڑا ہو جائے گا تو میں تم سے چالیس ہزار روپے میں خرید لوں گا لیکن تم یہ جانور کسی اور کو نہیں بیچ سکتے، زید کا مذکورہ شرط کیساتھ جانور کو فروخت کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

﴿جواب﴾ بیع میں اس قسم کی شرط لگانا شرعاً جائز نہیں ہے، اس سے بیع فاسد ہو جاتی ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں بیع فاسد ہونے کی وجہ سے واجب الفسخ ہے۔

لما فی الهندية:(۳/۱۳۴ طبع رشيديه)

ولو باع شيئاً على ان يهب له المشترى اويتصدق عليه اويبيع منه شيئاًاويقرضه كان فاسدا.

ولما فی التنوير مع الدر:(۵/۸۴-۸۵ طبع ايچ ايم سعيد)

(و)لا(بيع بشرط)عطف على الى النيروز يعنى الاصل الجامع فى فسادالعقدبسبب شرط(لايقتضيه العقد ولايلائمه وفيه نفع لاحدهما او)فيه نفع(لمبيع)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد ضیاء الدین

۵ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ فتویٰ نمبر: ۷۳۵

﴿شرط فاسد لگانے سے بیع فاسد ہو جاتی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے اپنا گھر پڑوسی کو بیچا رقم کی ادائیگی قسطوں پر متعین کی گئی، میں نے یہ شرط بھی لگائی کہ جب آپ قسط مکمل کر لو گے اس کے بعد بھی مجھے چار مہینے تک گھر میں رہنے دو گے تا کہ میں دوسری جگہ اپنے لئے گھر بنا لوں تو کیا میرے لئے اس گھر میں چار مہینے رہنا جائز ہے۔ مستفتی: امر اللہ صاحب

﴿جواب﴾ بیع میں اسطرح کی شرط لگانے سے بیع فاسد ہو جاتی ہے اور اس کا فسخ کرنا ضروری ہوتا ہے، لہٰذا آپ دونوں اس بیع کو ختم کریں پھر دوبارہ چاہیں تو نیا سودا کریں اور رہنے وغیرہ کی کوئی شرط نہ لگائیں، البتہ جب تک خریدار آپ کو پورے پیسے نہ دیں آپ گھر قبضہ میں نہ دیں، اس طرح سودا بھی صحیح ہوگا اور گھر میں رہائش بھی بلا معاوضہ کر سکتے ہیں لیکن سوال میں مذکورہ تفصیل کیساتھ سودا میں ایسی شرط لگائیں گے تو جائز نہیں ہوگا۔

لما فی التنوير مع الدر:(۵/۸۴-۸۵ طبع ايچ ايم سعيد)

(و)لا(بيع بشرط)عطف على الى النيروز يعنى الاصل الجامع فى فسادالعقدبسبب شرط(لايقتضيه العقدولايلائمه وفيه نفع لاحدهما او)فيه نفع(لمبيع)هو(من اهل الاستحقاق)للنفع.

وفی الشامیة:(قوله مثال لمافیه نفع للبائع)ومنه مالوشرط البائع ان یهبه المشتری شیئااویقرضه اویسکن الدارشهرااوان یدفع المشتری الثمن الی غریم البائع. وفی فتح القدیر:(۶/۲۰۹-۲۱۰،طبع رشیدیه)

ولمافی الشامی:(۴/۵۲۱،طبع ایچ ایم سعید)

[تنبیه]للبائع حبس المبیع الی قبض الثمن ولوبقی منه درهم ولوالمبیع شیئین بصفقة واحدة وسمی لکل ثمنافله حبسهماالی استیفاء الکل. وفی الفقه الحنفی: (۲/۴۲،طبع بیروت)

الجوب صحیح :عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب :سلمان احمد

۲۷ربیع الاول ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر:۲۰۸۹

﴿بیع فسخ ہوتو بیعانہ کی رقم واپس کرنا ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ کسی چیز کوخرید نے سے پہلے بائع کو کچھ رقم بطور بیعانہ رکھواتے ہیں کہ اگر مشتری نے وہ چیز نہ خریدی تو وہ رقم ضبط ہوجاتی ہے تواس طرح کرنا صحیح اور یہ مذکورہ رقم بائع کیلئے حلال ہے؟

﴿جواب﴾ کسی وجہ سے بائع ومشتری بیع فسخ کرنا چاہیں توباہمی رضامندی سے فسخ کرسکتے ہیں لیکن بیعانہ کی رقم واپس کرنا ضروری ہے، بائع کو بیعانہ ضبط کرنے کا شرعاکوئی حق نہیں ہے۔

لمافی اعلاء السنن:(ج۱۴ص۱۹۷ طبع دارالکتب العلمیة)أن النبی ﷺ: نهی عن بیع العربان.

ولمافی الهدایة:(۳/۶۱ طبع رحمانیه)

کل شرط لایقتضیه العقدوفیه منفعة لاحدالمتعاقدین اوللمعقودعلیه وهومن اهل الاستحقاق یفسده.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب :عبدالستار

۱۴ربیع الاول ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر:۶۶۷

﴿جانوروں کوقسطوں پر لینا﴾

﴿سوال﴾ حضرت مفتی صاحب ہمارے ہاں جانورقسطوں پر لیتے ہیں، اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جوشخص قیمت ادا کرتا ہے وہ خود جانور خرید کردیتا ہے اور بعض اوقات وہ پیسے دے دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تم جانورخریدلو، جتنے میں خریدو مجھے اس پر اتنا نفع مثلاً چار ہزارروپے بعد میں

قسطوں میں ادا کر دینا۔ بینوا توجروا
مستفتی: حاجی عبدالغفار کورنگی

﴿جواب﴾ قسطوں پر معاملہ کرنا شرعاً جائز ہے، اسلئے پہلی صورت میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں یعنی جو شخص خود جانور خرید کر آگے قسطوں پر زیادہ دام لے کر بیچتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں، البتہ دوسری صورت درست نہیں کیونکہ ایک ہی شخص خریدار بھی ہوتا ہے اور بیچنے والا بھی ہوتا ہے، اس کا جائز طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ جو شخص جانوروں کی قیمت ادا کرتا ہے وہ خریدنے والے کو اپنا وکیل مقرر کرلے خرید کر مالک کے حوالے کردے یا مالک کی طرف سے دوسرا شخص وکیل ہو، وہ اس پر قبضہ کرلے پھر اس دوسرے شخص کو فروخت کردے یا مالک کو حوالے کے بعد اسکو بیچ دے، البتہ اس دوران اگر جانور ہلاک ہوجائے تو وہ موکل (پیسے دینے والے) کی ملکیت سے ہلاک ہوگا اور یہ شخص (جس کیلئے جانور خریدا گیا) جانور خریدنے کے بعد اگر انکار کرے کہ اب میں یہ جانور نہیں لیتا تو ان جانوروں کا لینا اس پر لازم نہیں۔

لمافی الهداية:(۳/۱۹۰-۱۹۱،طبع رحمانیه)

فان هلک المبیع فی یده قبل حبسه هلک من مال الموکل لم یسقط الثمن---ولو وکله بشراء شیء بعینه فلیس له ان یشتریه لنفسه.

ولمافی تنویر الابصار:(۵/۵۱۲،طبع ایچ ایم سعید)

(هلک المبیع من یده قبل حبسه هلک من مال موکله ولم یسقط الثمن)

ولمافی الشامی:(۵/۵۱۸،طبع سعید)

وفیه الوکیل بالبیع لایملک شراء ه لنفسه لان الواحد لایکون مشتریاو بائعافیبیعه من غیره ثم یشتریه منه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالستار

۱۰ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۷۵۱

﴿کتے کی خرید وفروخت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کتے کی خرید وفروخت ازروئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ شکار کرانے کیلئے، کھیت وغیرہ کی حفاظت کیلئے اسی طرح گھر کی چوکیداری کیلئے کتا رکھنا جائز ہے اور ان مقاصد کیلئے اسکی خرید وفروخت بھی جائز ہے۔

لمافی الهدایة:(۱۰۷/۳،طبع رحمانیه)

قال علی ابن ابی بکر المرغینانیؒ ویجوز بیع الکلب.....ولانه منتفع به حراسة واصطیادا فکان مالا فیجوز بیعه.

ولمافی الکنزوحاشیته :(۲۵۷/۲،طبع قدیمی)

صح بیع الکلب والفهدوالسباع والطیور لانه مال متقوم آلة للاصطیاد کالبازی،ومثله فی الشامیة:(۲۲۶/۵،طبع سعید)

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب :اسرار عزیز عفا اللہ عنہ

۱۸ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ　　　　فتویٰ نمبر:۹۹۹

﴿ادائیگی سے پہلے بائع کا اسی چیز کو واپس کم ریٹ پر خریدنا﴾

﴿سوال﴾ آج کل سونے کی معروف قیمت مثلاً ۱۵۰۰۰ ہزار ہے،ادھار ۱۸۰۰۰ ہزار پر بیچنا کیسا ہے؟ جبکہ بغیر کسی شرط کے لینے والے سے واپس ۱۵۰۰۰ ہزار پر خریدے اور اس حیلہ کا کیا حکم ہے؟ کہ پہلے مشتری کو ۱۸۰۰۰ ہزار قرض دیدے اور پھر اسی رقم (۱۸۰۰۰) پر ایک تولہ سونا دیدے جبکہ عام ریٹ ۱۵۰۰۰ ہزار ہو اور بغیر کوئی شرط لگائے ہوئے واپس اس مشتری سے ۱۵۰۰۰ ہزار پر خرید لے؟　　　　مستفتی: شاکر اللہ صاحب

﴿جواب﴾ سونا ہو یا کوئی اور چیز ادھار کیوجہ سے مہنگا بیچنے کی گنجائش ہے لیکن ادھار معاملہ میں بیچنے والے کو رقم ادا کئے بغیر پہلی قیمت سے کم پر واپس اسی کو فروخت نہیں کر سکتے کیونکہ یہ ''شراء ماباع باقل مماباع قبل ان ینقدالثمن'' کی صورت ہے جسکو فقہاء کرام نے ناجائز قرار دیا ہے اگر چہ پہلے سے کوئی شرط نہ لگائی ہو،ہاں اسی رقم پر یا اس سے زیادہ پر یا پیسوں کے علاوہ سامان پر اسی شخص کو بیچ سکتے ہے۔

لمافی الهدایة:(۵۹/۳،طبع رحمانیه)

قال ومن اشتری جاریة بالف درهم حالة اونسیئه فقبضهاثم باعهامن البائع بخمس مائة قبل ان ینقدالثمن لایجوزالبیع الثانی ولناقول عائشه رضی الله عنهالتلک المرأة وقد باعت بست مائه بعدمااشتریت بثمان مائة بئس ماشریت واشتریت ابلغی زیدبن ارقم ان الله تعالی ابطل حجه وجهاده مع رسول الله صلی الله علیه وسلم ان لم یتب.

ولمافی البحر:(۸۲/۶،طبع سعید)ای لم یجزشراء البائع ماباع باقل مماباع قبل نقدالثمن.

مذکورہ حیلہ درست نہیں کیونکہ یہ بیع عینہ کی ایک صورت ہے اور بیع عینہ میں بائع کو واپس

بیچنا ناجائز ہے۔

ولما فی الشامی:(۵/۳۲۵-۳۲۶،طبع ایچ ایم سعید)

أو یقرضه خمسة عشر درهمًا ثم يبيعه المقرض ثوبًا يساوی عشرة بخمسة عشرة ليأخذ الدراهم التی اقرضه علی انها ثمن الثوب فيبقى عليه الخمسة عشر قرضا.درر..... وقال محمد هذا البيع فی قلبی کأمثال الجبال ذميم اخترعه أكلة الربا وقد ذمهم رسول الله صلی الله عليه وسلم فقال: "اذا تبايعتم بالعينة واتبعتم اذناب البقر ذللتم وظهر عليكم عدوكم"......وقيل اياك والعينة فانها العينة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب:فرمان اللہ

۱۱ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ | فتویٰ نمبر:۷۵۴

﴿سونا ادھار بیچنا؟﴾

﴿سوال﴾(۱) آج کل کی معروف کرنسی کے عوض سونا ادھار بیچنا کیسا ہے؟(۲) معروف کرنسی کے عوض سونا خریدنے میں مثلاً بمثل کی شرط ختم ہوگئی ہے اور اسی طرح یدا بید کی شرط ختم تو نہیں ہوئی ہے؟(۳) بیوی سے متعین مدت تک مہر والا زیور ادھار لینا کیسا ہے؟ مثلاً کہ اب میں اس سے تجارت شروع کرونگا اور اٹھ دس مہینے بعد اتنا زیور واپس کرونگا۔ مستفتی:شاکراللہ

﴿جواب﴾(۱) معروف کرنسی کے عوض سونا ادھار بیچنا جائز ہے کیونکہ کرنسی کی پشت پر اب سونا نہیں ہے موجودہ کرنسیاں فلوس نافقہ کے حکم میں ہیں اس لئے کرنسی کے عوض سونے کی بیع پر بیع صرف کے احکام جاری نہیں ہونگے ،البتہ ادھار کی مدت متعین ہونی چاہیے۔

(۲) سونے کی بیع سونے کے عوض ہو تو یدا بید اور مثلاً بمثل دونوں ضروری ہے یعنی زیادتی (تفاضل) اور ادھار (نسیئہ) دونوں ناجائز ہے لیکن سونے کی بیع کرنسی کے عوض ہو تو یدا بید اور مثلاً بمثل دونوں قید ختم ہو جاتی ہیں کیونکہ سونے اور کرنسی کی جنس وقدر ایک نہیں ہے۔

(۳) یہ صورت جائز ہے کیونکہ یہ قرض حسنہ ہے یعنی جب بیوی خوشی سے دے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۵/۱۶۲،طبع ایچ ایم سعید)

(فيصح استقراض الدراهم والدنانير وكذا) كل (مايكال..... الخ)

ولما فی تکملة فتح الملهم:(۱/۵۱۷،طبع دارالعلوم کراچی)

ولكن من العلماء من جعل اوراق العملة فی حكم الاثمان العرفية وحكم بوجوب الزكاة

علیها واداء الزکاة بها، وجواز مبادلتها بالذهب والفضة.

ولما فی تکملة فتح الملهم: (۱/ ۵۸۹، طبع طبع دار العلوم کراچی)

واما اوراق النقدیة وهی التی تسمی "نوت" المختار عندنا قول من یجعلها اثمانا اصطلاحیة، وحینئذ تجری علیها احکام الفلوس النافقة سواء بسواء.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: فرمان اللہ غفرہ اللہ

ا ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۶۱۱۷

﴿سونا، سونے کے بدلے میں ہو تو نقد اور برابری دونوں ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم مارکیٹ سے خالص سونے کے بدلے سونے کے تیار زیورات خریدتے ہیں مثلاً اگر ہم پانچ تولے تیار زیورات خریدے تو اس کے بدلے میں ہمیں پانچ تولہ خالص سونا دینا پڑتا ہے اور یہ معاملہ ہاتھ در ہاتھ ہوتا ہے، اس کے علاوہ کبھی ہم اپنے جاننے والوں سے تیار زیورات ادھار لیتے ہیں پھر کئی مہینوں بعد ان کو خالص سونے کی صورت میں ادائیگی کرتے ہیں، لیکن دونوں صورتوں میں زیورات اور خالص سونے کا وزن برابر ہوتا ہے، حالانکہ زیورات تیار کرتے وقت ان میں کچھ کھوٹ ملایا جاتا ہے۔

اب پوچھنا یہ ہے کہ خرید وفروخت کا یہ طریقہ جائز ہے یا نہیں؟ اور کھوٹ کو منہا کر کے زیورات میں موجود سونے کے برابر اگر ہم خالص سونا ادا کریں تو اس صورت میں بیع جائز ہوگی یا نہیں؟ برائے مہربانی وضاحت فرمائیں۔

﴿جواب﴾ سونے کی سونے کے بدلے خرید فروخت کرنا شریعت کی اصطلاح میں "بیع صرف" کہلاتا ہے جس میں ہاتھ در ہاتھ یعنی نقد اور برابری دونوں ضروری ہے، لہٰذا سوال میں ذکر کردہ پہلی صورت جس میں تیار زیورات خرید کر ان کے بدلے فوراً آپ خالص سونا ادا کرتے ہیں جائز ہے، بشرطیکہ وزن برابر ہو اور زیورات میں کھوٹ کیوجہ سے بدلے میں دینے والا سونا وزن کم کر کے دینا طے نہ ہو اس لئے کہ معمولی ملاوٹ کا اعتبار نہیں ہے یہ تمام سونا شمار ہوتا ہے۔

البتہ دوسری صورت جس میں آپ اپنے جاننے والوں سے ادھار زیورات خریدتے ہیں اور پھر کچھ عرصہ بعد ان کو سونے کی صورت میں ادائیگی کرتے ہیں یہ ناجائز صورت ہے، کیونکہ "بیع صرف" میں ادھار معاملہ جائز نہیں ہوتا اسی مجلس میں ہر دونوں کا قبضہ ضروری ہے۔

لما فی الهندية:(۳/۲۱۹طبع رشيديه كوئٹه)

واذا كان الغالب على الدراهم الفضة فهي فضة ان كان الغالب على الدنانير الذهب فهي ذهب ويعتبر فيهما من تحريم التفاضل ما يعتبر في الجياد حتى لا يجوز بيع الخالصة بها ولا بيع بعضها ببعض الا متساويا في الوزن وكذا لايجوز استقراضها الا وزنا

لما فی اللباب المحتی فی ثوبه الجديد :(۳/۳۲۵طبع دار القلم دمشق)

ولا يصح بيع الذهب الخالص بذهب غير خالص ,ولا بيع فضة خالصةبفضة غير خالصة ولا بيع بعضه ببعض الا متساويا وزنا فيما غلب ذهبه وفضته.

لما فی الهندية:(۳/۲۱۷طبع رشيديه كوئٹه)

(اما شرائطه)فمنها قبض البدلين قبل الافتراق كذا في البدائع .سواء كان يتعينان كالمصوغ او لا يتعينان كالمضروب أو يتعين احدهما ولا يتعين الاخر.

لما فی الهداية :(۳/۱۱۱طبع رحمانيه)

فان باع فضة بفضة أوذهبا بذهب لا يجوز الا مثلا بمثل وان اختلفت في الجودة والصياغة .ولا بد من قبض العوضين قبل الافتراق ــــ سواء كان يتعينان كالمصوغ او لا يتعينان كالمضروب أو يتعين احدهما ولا يتعين الاخر.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　　واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری

۲۵ جمادی الثانی ۱۴۳۵ھ　　　　　فتوی نمبر:۴۱۹۹

﴿مٹی میں شامل سونے چاندی کے ذرات مٹی سمیت پیسوں سے بیچنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم سونے کا کاروبار کرتے ہیں اور چونکہ زیورات اپنی دوکان میں تیار کرتے ہیں جسکی وجہ سے اکثر اوقات سونے کی کٹائی کے دوران کچھ ذرات مٹی میں گر جاتے ہیں اور پھر ہم اس مٹی اور راکھ کو جمع کر کے فروخت کرتے ہیں۔اب پوچھنا یہ ہے کہ از روئے شرع ہمارا یہ معاملہ درست ہے یا نہیں؟اگر درست ہے تو مارکیٹ ویلیو کے مطابق ہم باہمی رضامندی سے اسکی قیمت لگا سکتے ہیں؟

﴿جواب﴾ مٹی میں شامل سونے چاندی کے ذرات مٹی سمیت پیسوں سے بیچنا جائز ہے بشرطیکہ خالی مٹی نہ ہو سونے چاندی کے ذرات واقعی شامل ہوں ورنہ دھوکہ ہے جو کہ کسی طرح جائز نہیں ہے۔

لما فی البناية فی شرح الهداية:(۱۰/۷۰طبع مكتبه حقانيه)

اعلم ان بيع تراب الصاغة بخلاف الجنس انما يجوز اذا وجد فيه الذهب اوالفضة

واذالم یوجد فلا۔

لمافی الولواجیة: (۳؍ طبع مکتبہ فاروق پشاور)

رجل اشتری تراب الصواغین بعرض فھذا علی وجھین ان وجد فیھا ذھبا أو فضة جاز البیع لأنه تبین انه اشتری الذھب و الفضة بالعروض ان لم یجد فیھا ذھبا أو فضة لا یجوز۔

لما فی الھدایه:(۲؍۶۹طبع رحمانیه لاھور)

بخلاف تراب الصاغة لانه انما لایجوز بیعه بجنسه لاحتمال الرباحتی لو باعه بخلاف جنسه جاز۔

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری غفرلہ ولوالدیہ

۲۸ جمادی الثانی ۱۴۳۵ھ فتوی نمبر: ۴۲۱۰

﴿دو مہینوں کے اندر واپسی کی شرط پر قرضہ وصول کر کے زیورات رکھوانا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں خرید وفروخت کی ایک یہ صورت بھی رائج ہے کہ کچھ لوگ اپنے زیورات لیکر آتے ہیں اوران کی قیمت لکوا کر اس شرط پر وصول کرتے ہیں کہ اگر دو مہینوں کے اندر یہ پیسے واپس نہ کر سکے تو ان بدلے آپ ہمارے زیورات رکھ دینا۔ کیا اسلامی اصولوں کے مطابق ہمارا اس طرح کا معاملہ کرنا درست ہے یا نہیں؟ وضاحت فرمائیں۔ مستفتی: بھائی شفیق الرحمٰن

﴿جواب﴾ آپ لوگوں کے ہاں رائج خرید وفروخت کے مذکورہ طریقہ کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔

(۱) دو ماہ کے اندر پیسے لوٹانے اور زیورات واپس لینے کی شرط باقاعدہ عقد کا حصہ اگر ہے یعنی سودا کرتے ہوئے دونوں آپس میں اس طرح اگر طے کر لیتے ہیں تو اس سے بیع فاسد ہوجاتی ہے۔ البتہ حکماً ''رھن'' شمار ہوتا ہے، لہذا یہ لوگ اس تاریخ تک پیسہ اگر لوٹا دیں تو انکو زیورات واپس کرنا آپ کے ذمہ ہوگا اور پیسہ اگر نہیں لوٹا سکے تو اس تاریخ میں زیورات کی مارکیٹ ویلیو جو بھی ہو اس حساب سے آپ زیورات کے مالک ہوجائیں گے، لہذا قیمت زیادہ ہونے کی صورت میں بقایا آپ کو ادا کرنا ہوگا، اور آپ کی رقم کی نسبت قیمت اگر کم بنتی ہے تو اتنی رقم کی حد تک ان لوگوں سے مطالبہ کرنے کا آپ کو حق حاصل ہوگا۔

(۲) عقد مکمل ہونے کے بعد اگر اس طرح شرط لگائی جائے تو یہ ایک وعدہ ہے، جس کو شریعت کی اصطلاح میں ''بیع الوفاء'' کہا جاتا ہے، اس صورت میں جب مالک پیسے واپس کریگا تو

آپ پر زیورات لوٹا ضروری ہوگا۔ البتہ مالک اگر اس بیع کو نافذ کر دے تو پھر آپ زیورات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

لما في شرح المجلة :(۱۲۱/۲ رشیدیہ کوئٹہ)

اختلـوا في البيـع الذى يسميه الناس بيع الوفاء وبيع الجائز .قال أكثر المشائخ منهم الشيخ الامام ابو شجاع والقاضي الاما م ابوالحسن على السغدى : حكمه حكم الرهن .لايملكه المشترى ويضمن المشترى ماأكل من ثمره .ولايباح له الانتفاع ولا الأكل الاباباحة المالك .ويسقط الدين بهلاكه اذاكان به وفاء بالدين .ولايضمن الزيادة اذا هلك لا بصنعه وللباع ان يستردها اذا قضى الدين.والصحيح ان العقد الذى جرى بينهما ان كان بلفظ البيع لا يكون رهنا ثم ينظر :ان ذكر اشرط الفسخ في البيع فسد البيع .وان لم يذكر اذالك في البيع وتلفظا بلفظ البيع بشرط الوفاء .او تلفظابالبيع الجائز .وعندهما اى في نية المتعاقدين هذالبيع عبارة عن بيع غير لازم .فكذالك .ان ذكراالبيع من غير شرط ثم ذكرا الشرط المواعدة .فالبيع جائز ويلزم الوفاء بالوعد.لان المواعيد قدتكون لازمة فتجعل لازمة لحاجة الناس۔

(هكذا في فتاوى قاضيخان:۹۱/۲ طبع قديمی)

ولما في المقالات الفقهية :(ص ۵۲ مكتبه دار العلوم كراچى)

اذانظرنا الى ماذكره اجلة الفقهاء من المذاهب الاربعة وجدناهم متفقين على ان بيع الوفاء لوكان خالياعن شرط الردفى صلب العقديكون جائزا.امااذاشرط ردالبيع فى صلب العقديكون البيع فاسداعندالاحناف والمالكية والشافعية اماالحنابلة فيرون البيع صحيحاوالشرط فاسدافاذاكان البيع خالياعن شرط ردالمبيع فالراجح فى المذاهب الاربعة انه جائز وذلك لكونه بيعاخالياعن شرط وهل يجب الردعلى احدالمتعاقدين اذااتفقاعلى ردالمبيع عندردالثمن وكان ذلك الاتفاق قبل عقدالبيع اوبعده بصورة المواعدة فنرى الراجح انه يجب عليهماالرداذاتراعداعلى ذلك ويكون الوعدملزماديانة وقضاء .اماوجوب الوعدديانة فظاهرلقوله تعالى :واوفوابالعهدان العهدكان مسئولا .وبالنصوص التى تدل على ايفاء الوعد.واماالزومه قضاء فالامرعندالامام مالك ظاهركماتقدم .والفقهاء الحنفية ايضاالختاروافى هذه المسئلة لزوم الوعدقضاء لحاجة الناس فهوالراجح عندالامامين الجليلين .

ولما في المحيط البرهاني (ج۱۰/۳۶۹ طبع ادارة القرآن

وفى فتاوى النسفى :ان البيع الذى تعارفوه اهل سمرقند وسموه بيع الوفاء تحرزاعن الربا. فى الحقيقة رهن والمبيع فى يدالمشترى كالرهن فى يد المرتهن لايملكه ولايحل له الانتفاع به الاباذن الراهن وهوضامن لماأكل من ثمرته واستهلكه من عينه .والدين ساقط بهلاكه فى يده اذكان به وفاء بالدين وللبائع استرداده اذاقضى الدين اذلافرق

عندنا بينه وبين الرهن فی حق حكم من الاحكام.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری غفرلہ ولوالدیہ

۸رجب المرجب ۱۴۳۵ھ   فتویٰ نمبر: ۴۲۲۸

﴿عام ریٹ سے مہنگا بیچنا، دوکاندار سے کمیشن لینا﴾

﴿سوال﴾ کسی دوسری دوکان سے کوئی چیز اٹھا کر گاہک کو مہنگے ریٹ بیچنا جائز ہے؟ جو کہ ہم دوکاندار سے سستے ریٹ پر لیتے ہیں، اسی طرح گاہک کو دوسری دوکان پر لے جانا اور اس دوکان والے سے کمیشن لینا جائز ہے؟   مستفتی: محمد دین وزیرستانی

﴿جواب﴾ دوسری دوکان سے چیز اٹھا کر گاہک کو مہنگا دینا جائز ہے لیکن عام مارکیٹ سے بہت مہنگا دینا، گاہک کی ناواقفیت یا مجبوری سے غلط فائدہ اٹھانا، خلاف مروّت ہے تاہم منافع جائز ہیں، دوسرے دوکاندار کو گاہک مہیا کر کے دوکاندار سے کمیشن لینا جائز ہے بشرطیکہ پہلے سے معروف یا متعین ہو۔

لما فی قوله تعالى: (سورة النساء، آيت ۲۹)

﴿يايها الذين امنوا لاتأكلوا اموالكم بينكم بالباطل الّا ان تكون تجارة عن تراض منكم﴾

ولما فی الهندية: (۱۶۱/۳، طبع رشيديه)

ومن اشترى شيا واغلى فی ثمنه فباعه مرابحة على ذلك جاز وقال ابويوسفؒ اذا زاد زيادة لايتغابن الناس فيها فانی لااحب ان يبيعه مرابحة حتى يبين.

ولما فی الدر مع الرد: (۵۶۰/۴، طبع سعيد)

واما الدلال فان باع العين بنفسه باذن ربها فاجرته على البائع وان سعى بينهما وباع المالک بنفسه يعتبر العرف.

وفی الشامية: (فاجرته على البائع) وليس له اخذ شئی من المشتری لانه هو العاقد حقيقة شرح الوهبانية وظاهره انه لايعتبر العرف هنا لانه لا وجه له (قوله يعتبر العرف) فتجب الدلالة على البائع او المشتری او عليهما بحسب العرف جامع الفصولين.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: فرمان اللہ غفرلہ

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ   فتویٰ نمبر: ۷۸۰

﴿عیب ظاہر ہونے کیصورت میں خریدار مبیع کو لوٹا سکتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ میں استعمال شدہ بوٹ اور

جوتے خریدتا اور بیچتا ہوں کبھی جوتوں کے بنڈل میں ایسے جوڑے بھی آجاتے ہیں کہ بناوٹ اور ساخت میں تو ایک ہی قسم کا ہوتا ہے لیکن ایک جوتا چالیس انچ کا ہوتا ہے اور دوسرا بیالیس انچ کا، کیا میرے لیے صرف ایسے جوڑے واپس کرنے کا اختیار ہے یا نہیں، اسطرح کے جوڑے گاہک کو بغیر بتائے بیچ سکتا ہوں یا نہیں جبکہ اکثر گاہکوں کو اسکا پتہ نہیں چلتا، چنانچہ خریداری کے بعد اگر گاہک اسی وجہ سے جوتا واپس کرنا چاہے تو کیا میرے لیے واپس لینا ضروری ہے؟

﴿جواب﴾ عیب کیوجہ سے خریدار کو مبیع واپس کرنے کا حق حاصل ہے بشرطیکہ پوری وضاحت کیساتھ شروع میں وہ خود اپنا یہ حق ساقط نہ کردے مثلاً یوں کہے کہ ہر طرح کے عیب کیساتھ بھی مجھے منظور ہے یا بائع کہدے کہ اس چیز میں کسی قسم کے عیب کی میری کوئی ذمہ داری نہ ہوگی اور خریدار اس شرط کو منظور کرے تو ایسی صورت میں خریدار کو واپس کرنے کا حق باقی نہیں رہتا، لہٰذا جوڑے کے سائز میں فرق کیصورت میں گاہک آپکو واپس کرسکتا ہے۔

البتہ پورے بنڈل کا سودا ایک ساتھ کیا ہو تو ایسی صورت میں صرف ایک دو جوڑے واپس لینے پر بائع کو مجبور نہیں کیا جاسکتا، آپ واپس کرنا چاہتے ہیں تو پورا بنڈل واپس کریں اسلئے کہ بائع اچھے اور کمزور ملا کر بیچنا چاہتا ہے اور کمزور عیب دار جوتے نکالنے کیلئے اچھے جوڑوں کے بھی کم پیسے وصول کرتا ہے۔

لمافی فتح القدیر:(۶/۳۰-۳۱ طبع رشیدیه)

(و)اما(لو)كان(قبضهما أعنى العبدين(ثم وجدباحدهما عيبا)فان له أن(يرده خاصة خلافا لزفر)۔ ثم هذا فيما يمكن افرادأحدهمادون الآخرفى الانتفاع كالعبدين أمااذالم يمكن فى العادة كنعلين أوخفين أومصراعى باب فوجدباحدهماعيبافانه يردهما أويمسكهمابالاجماع لانهمافى المعنى والمنفعة كشئ واحدوالمعتبرهوالمعنى.

ولمافى البحرالرائق:(۶/۳۶ طبع سعید)

(قوله من وجدبالمبيع عيباأخذه بكل الثمن أورده)لان مطلق العقديقتضى وصف السلامة فعندفواته يتخير كيلايتضرر بلزوم مالايرضى به دل كلامه انه ليس له امساكه وأخذه النقصان لان الاوصاف لايقابلهاشئ من الثمن فى مجردالعقدولانه لم يرض بزواله عن ملكه باقل من المسمى فيتضرربه ودفع الضررعن المشترى ممكن بالردبدون تضرره أطلقه فشمل مااذاكان به عندالبيع لوحدث بعده فى يدالبائع ومااذاكان فاحشاأويسيراكذافى السراج الوهاج.

ولما فی البحر الرائق:(۶/۶۲،طبع سعید)

(قوله ولو برئ من کل عیب به صح وان لم یسم الکل ولا یرد بعیب)لان الجھالة فی الاسقاط لاتفضی الی المنازعة وان کان فی ضمنه التملیک لعدم الحاجة الی التسلیم فلاتکون مفسدة.

ولما فی التنویر مع الدر:(۵/۵،طبع ایچ ایم سعید)

(من وجد بمشریه ماینقص الثمن)ولو یسیرا جوهرة(عندالتجار)المراد بهم أرباب المعرفة بکل تجارة وصنعة قاله المصنف(أخذه بکل الثمن أورده)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:عبدالرحمٰن کوہاٹی

۲۸ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر:۲۱۷۶

﴿مردہ جانور کے دودھ کی بیع کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ہماری ہاں ایک آدمی کی بھینس مرگئی پھر اس آدمی نے مری ہوئی بھینس کا دودھ نکالا اور دوسرے صاف دودھ کے ساتھ ملا کر بیچ دیا، کیا اس آدمی کا یہ فعل جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ اس آدمی کا یہ فعل جائز ہے۔

لما فی الجوهرة النیرة:(ص۲۰،طبع میر محمد)

وان ماتت شاة فخرج من ضرعها لبن قال ابو حنیفةؒ هو طاهر یحل شربه.

ولما فی الهندیة:(۵/۳۳۹،طبع رشیدیه)

البیضة اذاخرجت من دجاجة میتة أکلت وکذا اللبن الخارج من ضرع الشاة المیتة.

ولما فی الدر مع الرد:(۱/۲۱۰،طبع امدادیه)

وکذا کل مالا تحله الحیاة حتی الانفحة واللبن علی الراجح.

وفی الشامیة:قوله:(علی الراجح)ای الذی هو قول الامام،ولم ار من صرح بترجیحه، ولعله اخذه من تقدیم صاحب الملتقی له وتاخیره قولهما کماهو عادته فیما یرجحه. وعبارته مع الشرح:وانفحة المیتة ولو مائعة ولبنها طاهر کالمذکاة خلافا لهما لتنجسهما بنجاسة المحل.قلنا نجاسته لاتؤثر فی حال الحیاة اذ اللبن الخارج من بین فرث ودم طاهر فکذا بعد الموت.اه.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:محمد حسین

۲۲ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر:۸۰۶

﴿بیعانہ کا شرعی حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے کہ میں نے ایک پلاٹ دس لاکھ کا خریدا اور لاکھ روپے بطور بیعانہ کے بائع کو دیدیا اور کہا کہ باقی پیسے ادا کر کے میں پلاٹ پر قبضہ کرلوں گا، چند دنوں کے بعد بائع آیا اور اس نے کہا کہ آپ نے جو ایک لاکھ روپے بطور بیعانہ دیا ہے، اس کا دوگنا لے لو لیکن میں پہلی والی بیع فسخ کرتا ہوں اور پلاٹ دینے کیلئے تیار نہیں ہوں، پوچھنا یہ ہے کہ ایک لاکھ بیعانہ کے ساتھ مزید ایک لاکھ لے سکتا ہوں؟ اور کیا بائع کو اس صورت میں فسخ کرنے کا اختیار ہے؟ جب کہ ایجاب وقبول کے وقت اس نے کسی قسم کا خیار بھی اپنے پاس نہیں رکھا تھا؟ مستفتی: محمد سلیم ڈیفنس فیز ا

﴿جواب﴾ بیع ایجاب وقبول سے مکمل ہوگئی ہے، اب مشتری پر ضروری ہے کہ پیسے ادا کرے اور بائع پر واجب ہے کہ وہ مبیع کو مشتری کے سپرد کرے، بصورت دیگر اگر بائع مبیع کو حوالہ سے انکار کرے تو وہ اس انکار کی وجہ سے گنہگار ہوگا مگر آپ کیلئے بیعانہ کا دوگنا لینا جائز نہیں ہے، اب اگر نزاع سے بچنے کیلئے اپنے حق کو چھوڑ دیں تو عند اللہ ماجور ہونگے۔

لمافی المرقاۃ: (۱۳۵/۶ طبع رحمانیہ)

عن ابی مرۃ الرقاشی عن عمہ قال قال رسول اللہ ﷺ: الا لا تظلموا الا لا یحل مال امری الا بطیب نفسہ.

ولمافی الھدایۃ: (۲۰/۳، طبع رحمانیہ)

واذا حصل الایجاب والقبول لزم البیع ولا خیار لواحد منھما الا من عیب او عدم رویۃ.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: خضر حیات کمالوی

۲۶ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۷۰۳

﴿مبیعہ کا قبضہ میں آنے نیز ادھار کی صورت میں قیمت بڑھانے کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں (۱) میں نے ایک لاکھ روپے نقد دیکر ایک دوکاندار سے چینی خریدی دوکاندار نے چینی میرے سامنے وزن کرکے الگ رکھ دی، اب میں اس چینی کو فروخت کرسکتا ہوں یا وہاں سے اٹھانا ضروری ہے؟

(۲) مذکورہ چینی کو میں ڈیڑھ لاکھ ماہانہ تین ہزار قسطوں پر بیچ سکتا ہوں ادھار کی صورت

میں زیادہ قیمت لینا سود کے زمرے میں تو نہیں آتا؟ مستفتی: محمد دین

﴿جواب﴾ (۱) بیع کے بعد اگر بائع مبیعہ میں تخلیہ کر دے تو اس سے حکماً مشتری کا قبضہ ثابت ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے مشتری کے لئے آگے بیچنا درست ہو جاتا ہے اور مذکورہ صورت میں بھی دوکاندار کا چینی کو وزن کر کے الگ رکھ دینا تخلیہ ہے، اس لئے خریدار کیلئے آگے بیچنا شرعاً درست اور جائز ہے۔

لما فی الهندية: (۱۶/۳، طبع رشیدیه)

واجمعوا على ان التخلية في البيع الجائز تكون قبضاً وفي البيع الفاسد روايتان والصحيح انها قبض ,ومثله في الشامية: (۵/۵۱۱-۶۲، طبع ایچ ایم سعید)

(۲) مذکورہ صورت بیع تام کی ہے، اس لئے خریدار اپنی چینی کو نقد کی صورت میں کم قیمت پر اور ادھار کی صورت میں زیادہ قیمت پر فروخت کر سکتا ہے، البتہ مجلس عقد میں نقد یا ادھار نیز قیمت اور قسطوں کی تعیین ضروری ہے۔

لما فی جامع الترمذی: (۱/۱۴۷، طبع فاروقی ملتان)

نهى رسول الله ﷺ عن بيعتين في بيعة---ان يقول ابيعك هذاالثوب بنقدبعشرة وبنسئة بعشرين ولايفارقه على احدالبيعين فان فارقه فلابأس به اذاكانت العقدة على احدمنهما.

ولما فی الشامی: (۵/۱۴۲، طبع ایچ ایم سعید)

لان الاجل في نفسه ليس بمال ,فلايقابله شيء حقيقة اذالم يشترط زيادة الثمن بمقابلته قصدا، ويزادفي الثمن لاجله اذاذكرالاجل بمقابلة زيادة الثمن قصدا.

الجواب صحیح: عبد الرحمن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: رشید عالم مروت

۲۵ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ　　　فتوی نمبر: ۸۲۲

﴿سامان پہنچنے سے پہلے ریٹ مقرر کرنے نیز اپنے حق سے زیادہ لینے کی شرعی تحقیق﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں (۱) میں ایک تاجر آدمی ہوں مال کی خرید و فروخت میرا ذریعہ معاش ہے، بسا اوقات سامان فروختگی یعنی چینی، گندم، گھی وغیرہ میرے پاس حالاً موجود نہیں ہوتا اور اس دوران گاہک سامان خریدنے کیلئے آجاتا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ کیا ہم باہمی رضامندی سے قسط وار ریٹ مقرر کر سکتے ہیں جب کہ مطلوبہ سامان

میرے پاس موجود نہ ہو اور نہ میں نے منگوایا ہے، البتہ بازار میں موجود ہو، نیز اس بات کی بھی وضاحت کریں کہ مذکورہ صورت بیع کی ہوگی یا صرف وعدہ بیع ہوگا؟

(۲) حکومت کے کنٹرول سے مقررہ نرخ پر جو چیزیں ملتی ہیں مثلاً یوٹیلٹی اسٹور وغیرہ سے، جن کا ریٹ نسبتاً سستا ہوتا ہے اگر کوئی شخص چالاکی کر کے محدود مقدار سے زیادہ خریدے تو کیا ان چیزوں گھی، چینی، دال وغیرہ کو زیادہ قیمت پر بیچ سکتا ہے یا نہیں؟ مستفتی: محمد دین

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت کی وضاحت یہ ہے کہ بائع مشتری سے یہ کہے کہ اس وقت آپ کا مطلوبہ سامان چینی یا گندم وغیرہ میرے پاس موجود نہیں ہے، اس لئے فلاں تاریخ تک آپ کو انتظار کرنا پڑے گا اور جس دن سامان میرے پاس پہنچے گا تو قسط وار اتنی قیمت پر دیدوں گا اور خریدار بھی یہ کہے کہ ہاں میں آپ سے اتنا سامان قسط وار اتنی قیمت پر لے لوں گا۔

یہ وعدہ بیع ہوگا بیع نہیں ہوگی کیونکہ بیع کی صحت کیلئے ضروری ہے کہ مبیعہ بائع کی ملکیت اور قبضے میں ہو جب کہ مذکورہ صورت میں بائع نے ابھی سے سامان خریدا ہی نہیں ہے، اس لئے آگے بیچنا "بیع مالا یملک یا بیع قبل القبض" میں آئے گا جو کہ شرعاً ناجائز ہے، لہٰذا اس طرح کا زبانی معاملہ اگر کسی مسلمان کیساتھ کرلیا ہو تو سامان پہنچنے پر طے شدہ قیمت کے مطابق باہمی رضامندی سے دوبارہ ایجاب وقبول کرنا ضروری ہوگا، ورنہ بیع فاسد ہی رہی گی۔

لما فی الهندية: (۳/۲، طبع رشیدیه)

ومنها فی المبیع وهو ان یکون موجودا فلا ینعقد بیع المعدوم وماله خطر العدم ..... وان یکون مملوکا فی نفسه وان یکون ملک البائع فیما یبیعه لنفسه فلا ینعقد بیع الکلا ولو فی ارض مملوکة ولا بیع مالیس مملوکا له وان ملکه بعده الا السلم

(۲) حکومت کی طرف سے رعایتی نرخ پر معین مقدار میں جو چیزیں یوٹیلٹی اسٹور وغیرہ سے ملتی ہیں، متعینہ مقدار میں خرید کر ذاتی استعمال میں لانا چاہے یا منافع پر کسی کو فروخت کرنا چاہے تو یہ جائز ہے، البتہ چالاکی سے اپنے حق سے زیادہ خرید کر دوسروں کو منافع پر بیچنا دھوکہ اور ناجائز عمل ہے۔

لما فی قوله تعالى: (سورة البقرة، آیت ۱۸۸) ﴿ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل ..... الآية.﴾

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: رشید عالم مروت

۱۴۲۸ھ — فتوی نمبر:

﴿ٹیلی فون پر بیع کی صورت میں اگر مال راستے ہی میں ضائع ہوگیا تو نقصان کس پر آئیگا؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے بھائی بخت منیر سے بذریعہ فون (ایک ہزار) کلو شہد منگوایا، انہوں نے میرے کہنے پر مال کو ٹرک کے ذریعے روانہ کیا، راستے میں آتے وقت گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا، اور اس مال میں سے (سو) کلو ضائع ہوگیا، اب اس نقصان کا ذمہ دار میں ہوں گا یا بھائی بخت منیر ہوگا یا گاڑی کا ڈرائیور ہوگا؟

واضح رہے کہ یہ کاروبار ہمارا آپس میں کافی عرصے سے چل رہا ہے لیکن ہم نے یہ واضح نہیں کیا تھا کہ اگر راستے میں مال ہلاک ہوا تو نقصان کس کو اٹھانا پڑے گا، اب ہم دونوں چاہتے ہیں کہ ہمیں شرعی مسئلہ معلوم ہوجائے تاکہ اس پر عمل کریں۔ مستفتی: محمد محسن صاحب

﴿جواب﴾ مذکورہ مسئلہ میں نقصان کا ذمہ دار خریدار ہوگا۔ کیونکہ خریدار کے کہنے پر بائع نے جب مال گاڑی کے حوالہ کردیا اور گاڑی کے عملہ نے اس مال کو قبضے میں لے لیا تو گویا کہ مال بائع کے قبضے سے نکل کر خریدار کے قبضے میں آگیا کیونکہ گاڑی کا عملہ خریدار کی طرف سے وکیل کی حیثیت رکھتا ہے اور وکیل کا قبضہ مؤکل کا قبضہ سمجھا جاتا ہے اور جب گاڑی کے عملہ کا سامان پر قبضہ کرلینا حکماً خریدار ہی کا قبضہ قرار دیا یا تو اب نقصان کا ذمہ دار بھی خریدار ہوگا لیکن یہ اس صورت میں جب گاڑی کرایہ پر لینے کا خریدار نے آرڈر دیا ہو، بالفرض گاڑی کا انتظام کرنے کو خریدار نے آڈر نہیں دیا ہو اور پہلے سے بھی ایسا معمول نہ رہا ہو بلکہ بائع ازخود گاڑی کا انتظام کرلیتا ہے تو اس صورت میں نقصان بائع کا شمار ہوگا۔

دوسری بات یہ بھی ملحوظ رہے کہ ڈرائیور نے بھی حتی الامکان مال بچانے کی کوشش کی ہو اور اگر مال ڈرائیور کی بے احتیاطی کی وجہ سے ہلاک ہوگیا ہو تو پھر نقصان کا ذمہ دار گاڑی کا ڈرائیور ہوگا۔

لما فی الفقہ الاسلامی وادلتہ: (۳۳۹۵/۵، طبع رشیدیہ)

البیع بالمراسلۃ اوبواسطۃ رسول (ای وکیل) یصح اتفاقا ویکون مجلس التعاقد ھو مجلس بلوغ الرسالۃ من العاقد الاول الی العاقد الثانی الخ.

ولما فی العالمگیریۃ: (۱۹/۳، طبع رشیدیہ)

اذاقال المشتری للبائع ..... استاجر علی من یحملہ فقبض الاجیر یکون قبض المشتری ان صدقہ انہ استاجر ودفع الیہ وان انکر استئجارہ والدفع الیہ فالقول قولہ.

ولمافی الفقه الاسلامی وادلته:(۵/۳۳۷۹،طبع رشیدیه)

اذاهلک بعض المبيع بعدالقبض: فان كان الهلاك بأفة سماوية اوبفعل المشترى او المبيع نفسه اوبفعل اجنبى فالهلاك على المشترى.

ولمافی العالمگیریة:(۲/۵۰۰،طبع رشیدیه)

وحكم اجيرالواحدانه امين فى قولهم جميعاحتى ان ماهلک من عمله لاضمان عليه..... وحكم الاجيرالمشترك ان ماهلک فى يده من غيرصنعه فلاضمان عليه فى قول ابى حنيفةؒ وهوقول زفروالحسنؒ وانه قياس سواء هلک بامريمكن التحرزعنه كالسرقة والغصب اوبامرلايمكن التحرزعنه كالحرق الغالب والغارة الغالبة والمكابرة وقال ابو يوسف ومحمدؒ:ان هلک بامريمكن التحرزعنه فهوضامن وان هلک بامرلايمكن التحرزعنه فلاضمان كذافى المحيط ... وبقولهمايفتى اليوم لتغيراحوال الناس وبه يحصل صيانة اموالهم كذا فى التبيين.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم:رشید عالم مروت

۲۶جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر:۹۲۳

﴿سمندری جہاز کا مال پہنچنے سے پہلے بیع کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام کہ ہم باہر سے مال منگواتے ہیں اوروہ مال ابھی تک سمندرمیں ہوتا ہے کہ ہم ان کاغذات (مال) کودوسرے پربیچ دیتے ہیں اسی طرح وہ آگے تیسرے پربیچ دیتاہےتو کیایہ معاملہ درست ہے، نیز اگر مال ہلاک ہوگیاتو کس کاہلاک ہوگا؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اس مال کا مالک یعنی پہلا خریدار کسی دوسرے کویہ مال فروخت کرسکتاہے اسلئے کہ جہاز کے عملہ کا قبضہ خریدار کی طرف سے وکالۃ قبضہ تصور ہوگا لہٰذا یہ بیع قبل القبض میں داخل نہ ہوگا۔

لمافی الهندیة:(۳/۱۹،طبع رشیدیه)

الاان يقول استاجرعلى من يحمله فقبض الاجيريكون قبض المشترى ان صدقه انه استاجره فدفع اليه وان انكراستئجاره والدفع اليه فالقول قوله كذافى التاتارخانية.

البتہ ہلاک ہونے کی صورت میں اصل خریدار کا نقصان شمار ہوگا اسلئے کہ مال جہاز کے عملہ کے قبضہ میں ہے جو بائع کا وکیل ہے۔

لمافی فتح القدیر:(۶/۲۸۳،طبع رشیدیه کوئٹه)

(ولوهلک)المبيع(فى يدالبائع)والحال ان الخيارله فلااشكال فى انه ينفسخ(ولا شئى

علی المشتری اعتبارا بالبیع الصحیح المطلق) عن شرط الخیار فان فیه اذا هلک المبیع فی ید البائع قبل التسلیم انفسخ البیع.

ولما فی الهندیة: (۱۸/۳، طبع رشیدیه)

ولو قبض بعد ذالک حقیقة الآن یصیر مشتریا قابضا حتی لو هلک هلک علیه بالاتفاق کذافی الغیاثیه (بحواله مذکوره بالا بتغیر)

لیکن یہ دوسرا شخص آگے کسی تیسرے خریدار کو مال پہنچنے سے پہلے نہیں بیچ سکتا ورنہ تو بیع قبل القبض ہوگی جو کہ ناجائز ہے۔

لما فی الصحیح لمسلم: (۵/۲، طبع قدیمی)

عن ابن عباسؓ قال قال رسول الله ﷺ من ابتاع طعاما فلا یبیعه حتی یقبضه قال ابن عباسؓ احسب کل شئی بمنزلة الطعام.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: بلال احمد غفرہ الاحد

۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۸۱۶

﴿قیمت مقرر کرنے سے پہلے بیچنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک سبزی فروش صبح سویرے منڈی سے سبزی لاتا ہے پھر تھوڑی دیر بعد اس کی قیمت مقرر کرتا ہے، گاؤں کے بعض لوگ اس سے قیمت مقرر کرنے سے پہلے سبزی خرید لیتے ہیں اور بعد میں سبزی فروش جو قیمت مقرر کرتا ہے وہ ادا کرتے ہیں تو کیا قیمت مقرر کرنے سے پہلے بیچنا جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ قیمت طے کر کے سودا ہونا چاہیے تاہم قیمت طے کئے بغیر حسن اعتماد سے سبزی وغیرہ بیچ دی اور قیمت وصول کرتے ہوئے کسی قسم کے جھگڑے یا ناراضگی کا کوئی اندیشہ نہ ہو تو جائز ہے ورنہ ناجائز جبکہ بہتر یہی ہے کہ پہلے سے قیمت طے ہو۔

لما فی بدائع الصنائع: (۱۵۶/۵، طبع سعید)

منها أن یکون المبیع معلوما وثمنه معلوما علما یمنع من المنازعة فان کان أحدهما مجهولا جهالة مفضیة الی المنازعة فسد البیع وان کان مجهولا جهالة لاتفضی الی المنازعة لایفسد لان الجهالة اذا کانت مفضیة الی المنازعة کانت مانعة من التسلیم والتسلم فلا یحصل المقصود واذا لم تکن مفضیة الی المنازعة لاتمنع من ذلک فیحصل المقصود.

ولما فی الهندیة: (۳/۳، طبع رشیدیه)

منها أن یکون المبیع معلوما والثمن معلوما علما یمنع من المنازعة فبیع المجهول

جهالة تفضی الیها غیر صحیح.

ولمافی ردالمحتار:(۲/۵۰۵،طبع سعید)

وأما الثالث وهو شرائط الصحة...... ومعلومية الثمن بما يرفع المنازعة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب:عبداللہ عفا اللہ عنہ

۱۶ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ

فتویٰ نمبر:۹۹۶

﴿خریدار پر عقد کے وقت طے شدہ قیمت ہی لازم ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عبداللہ نے ایک دوکاندار سے ۶۵۰ روپے کی گھڑی خریدی اور گھر جا کر گھڑی ڈبے سے نکال دی، ۴ گھنٹے بعد عصر کے وقت وہ دوکاندار عبداللہ کیساتھ ملا اور کہا، کہ میں نے جو آپ کو گھڑی بیچی تھی، میں نے ریٹ لسٹ نہیں دیکھا تھا۔اس کی قیمت ۶۵۰ نہیں بلکہ ایک ہزار روپے ہے۔

اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا مشتری (عبداللہ) پر مزید ۳۵۰ روپے دینا از روے شرع ضروری ہے یا نہیں؟ براہ کرم شریعت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں؟ مستفتی: قاری سید قیوم دیروی

﴿جواب﴾ دوکاندار کا ریٹ لسٹ نہ دیکھنا اسکی اپنی کوتاہی ہے عبداللہ کے ذمہ صرف وہی رقم ۶۵۰ روپے ہے اضافی رقم ۳۵۰، اس کے ذمہ نہیں ہے بائع اور مشتری ایک چیز کی قیمت سودا کے وقت جو طے کر لیتے ہیں اسی کا اعتبار ہوتا ہے۔رہا یہ کہ ایسی صورت میں دوکاندار کا واضح نقصان ہے تو تجارت میں کبھی نقصان ہونا بھی تجارت کا حصہ ہے لھذا یہ کوئی بات نہیں، تاہم عبد اللہ بخوشی ۳۵۰ روپے یا کم وبیش اپنی طرف سے دیدے تو یہ اس کا احسان ہوگا۔

لمافی الدرالحکام شرح مجلة الاحکام:(۱/۲۶۷،۲۶۸،طبع: ماجدیه)

لا یثبت الخیار بالغبن الفاحش بلاتغریر الا ان بیع مال الوقف ومال الیتیم ومال بیت المال بغبن فاحش یعد باطلا..............وکذا لو اشتری شخص من آخر داره بلا تغریر بأربعین الف قرش أی بدون ان یقول للبائع ان دارك لاتساوی اکثرمن أربعین الف قرش فلیس للبائع ان یفسخ البیع بداع انه باع الدار باقل من قیمتها

ولمافی تنویر الابصار مع الدر المختار:(۲/۱۴۲،طبع :سعید)

(ان غره)ای غر المشتری البائع اوبالعکس اوغره الدلال فله الرد (والا لا)وبه أفتی صدر الاسلام وغیره

وفی الشامیة وحیث کان ظاهر الراویة محمول علی هذاالقول یکون هو ظاهر

الـروايـة وحينئذلـم يبق لنا الا قول واحد وهو الـمصرح بانه ظاهر الرواية بانه التفصيل المصحح المفتى به

ولما في تكملة فتح الملهم:(۱/۱۶۳،طبع دار العلوم كراچي

واما الحنفية والشافعية واكثر المالكية فلاخيا ر عند هم للمغبون سوا ء كان مسترسلا او غيره لان العقد وقع على ثمن مخصوص بالتراضي وكل من المتعاقدين عاقل فصار تجارة عن تراض.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سمیع الرحمٰن دیروی

۵شعبان ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۳۶۵

﴿والد اپنے بیٹے کو اپنی جائیداد فروخت کرسکتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام دریں مسئلہ کہ باپ اپنے بیٹے کو اپنی مملوکہ زمین، گھر فروخت کرسکتا ہے یا نہیں؟ مستفتی: عرباض شمس

﴿جواب﴾ والد اپنی مملوکہ جائیداد میں ہر قسم کے تصرفات کا حق رکھتے ہیں اور جس کو بھی چاہے فروخت کرسکتے ہیں لہٰذا اپنے بیٹے کو بھی اپنی مملوکہ زمین فروخت کرسکتے ہیں، اس میں شرعا کوئی قباحت نہیں ہے۔

لما في فتاوى قاضي خان على هامش الهندية:(۲/۲۸۳،طبع رشيديه)

ولـو كانت الدار مشتركة بين الأب وأجنبي فقالت المرأة لهما اشتريت منكما هذه الدار لابني بماله فقالا بعنا يجوز لان الأب لما جوز شرائها للصغير جملة الدار فقد أذن لها بشراء الجملة.

ولما في البزازية على هامش الهندية:(۴/۲۶۱،طبع رشيديه)

دار لرجل اومشترك بين الاب والرجل وللاب ابن صغير له ام فقالت اشتريت هذه الدار لابني بماله والاب حاضر او اشتريت منكما لابني بماله فقالا بعنا وقع الملك للابن لاجازة الاب بالحضور او بقبول العقد.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ظہور احمد شمس

۲۷ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۷۳۹

﴿روٹیوں کے ٹکڑے فروخت کرنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام دریں مسئلہ میں کہ ضرورت سے زیادہ روٹیاں ''ٹکڑے'' جمع کر کے فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: عرباض شمس

﴿جواب﴾ بنیادی طور پر خرید و فروخت کے لئے کسی چیز کا مال متقوم ہونا لازمی ہے چونکہ

روٹی "ٹکڑے" اور آٹا مال متقوم میں سے ہیں اس لئے اسکی خرید وفروخت شرعاً جائز ہے۔

لما فی حاشیۃ الشلبی علی تبیین الحقائق:(۴/۲۶۷،طبع سعید)

وشرط ان یکون فی العقد عوضان کل واحد منهما مال لیتحقق رکن البیع وهو مبادلۃ المال بالمال.

ولما فی البحر الرائق:(۶/۹۲،طبع ایچ ایم سعید)

وقید بقوله وکل من عوضیه مال لیخرج البیع بالمیتۃ وکل بیع باطل کالبیع مع نفی الثمن فانه باطل ومع السکوت عنه فاسد.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:ظہور احمد شمس

۲۷رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۷۴۰

﴿مملوکہ حوض میں بارش کے جمع شدہ پانی کے بیچنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں ایک آدمی اپنی مملوکہ زمین میں ٹینکی بنادے یا گھر کے اندر حوض سا بنادے جس میں بارش کا پانی جمع ہو جائے تو یہ شخص اس پانی کو بیچ سکتا ہے یا نہیں؟ نیز دوسرے لوگوں کو روک سکتا ہے یا نہیں؟ شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ اس شخص نے چونکہ اپنی مملوکہ زمین وغیرہ میں پانی کو جمع کرنے کا سسٹم بنا رکھا ہے، اس لئے یہ پانی بھی اسکی ملکیت میں داخل ہے، اس میں جس طرح تصرف کرنا چاہے کرسکتا ہے اور دوسروں کو اس میں تصرف کرنے سے روک بھی سکتا ہے چونکہ دور حاضر میں پانی کی مقدار کو آلات کے ذریعے معلوم کرنا بھی آسان ہے اور پانی بیچنے کا مانع (جہالت مقدار) دور ہوگیا ہے، اس لئے بیچنے کی بھی گنجائش معلوم ہو رہی ہے، البتہ انسانوں اور جانوروں کے پینے کا پانی بیچنا جائز نہیں بلا معاوضہ دینا چاہیے۔

لما فی المرقاۃ:(۶/۷۳،طبع رشیدیه)

(وعنه) ای عن جابر (قال نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن بیع فضل الماء) ای ممن یرید ان یشربه او یسقیه دابته فأما ان اراد ان یسقیه الزرع او النخل جاز لصاحب الماء ان لا یعطیه الا بعوض.(والحدیث رواه مسلم)

ولما فی تکملۃ فتح الملهم:(۱/۵۲۱-۵۲۲،طبع دار العلوم کراچی)

واما کون الماء المحرز مملوکا فیدل علیه حدیث الباب الی قوله. وقد عقد الامام البخاری بابا لاثبات الملک علی الماء المحرز فی کتاب الشرب...... فیقاس علیها الماء فانه مباح فی اصله ویتملک بالاحراز وصارت هذه الاستنباطات الیوم موکدة باجماع الامۃ

فلا یجوز العدول عنه.

ولما فی تکملة فتح الملهم:(۱/۲۲-۵۲۳،طبع دار العلوم کراچی)

والثالث ماء الابهار والحیاض والعیون ......وقیاس هذا التعلیل ان یجوز ذلک الیوم لان الیوم قد وجد العدادات التی یمکن بها ضبط مقدار الماء، وعلی هذا ینبغی ان یجوز ذلک الیوم اذا امکن ضبط مقداره بالعداد.

ولما فی حاشیة شرح الوقایة:(۸۷/۲،قبیل باب الصرف طبع امدادیه)

ولو فرخ هذه احکام اخری بنی فی الاشیاء المباحة لمناسبة الملک واصله ان المباح لا یملک الا بسبق الید..... او حفر حفرة لاجتماع الماء.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:عزیز الرحمٰن چارسدوی

۶ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر:۱۴۴۶

﴿زندہ مرغیوں کو وزن کر کے بیچنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ دیہاتوں میں مرغیاں اٹکل اور اندازہ سے بیچی جاتی ہیں جبکہ شہروں میں زندہ مرغیاں وزن کر کے بیچنے کا بھی رواج ہے، زندہ مرغی کو وزن کر کے خریدنے کے بعد ذبح کیا جائے، تو صاف کرنے کے بعد اس کا وزن کافی کم رہ جاتا ہے، پوچھنا یہ ہے، زندہ مرغیاں وزن کر کے بیچنا جائز ہے؟ مستفتی: زین العابدین مینگورہ سوات

﴿جواب﴾ فقہاء کرام نے زندہ جانور کو وزن کر کے بیچنے سے منع فرمایا ہے کیونکہ جانور کے وزن کا صحیح اندازہ مشکل ہے، اس لئے کہ جانور طبعی طور پر اپنے آپ کو بوجھل بنا دیتا ہے اور کبھی ہلکا سا ہو جاتا ہے اور وزن صحیح معلوم نہ ہونے کی بناء پر بیع درست نہیں ہونی چاہیے، تاہم آجکل کے عرف میں یہ طریقہ عام اور رائج ہو گیا ہے اور لڑائی جھگڑے کا اندیشہ بھی نہیں رہتا، اس لئے مرغیوں کو وزن کر کے بیچنے کی گنجائش دی گئی ہے۔

لما فی الهدایة:(۸۷/۳،طبع رحمانیه)

لان الحیوان لا یوزن عادة ولا یمکن ثقله بالوزن لانه یخفف نفسه مرة ویثقل اخری.

ولما فی فتح القدیر:(۲۶/۷،طبع رشیدیه)

وانما قلنا ان الحیوان لیس بموزون (لانه لا یوزن عادة) فلیس فیه احد المقدرین ...... فلا یدری حاله بخلاف الدهن والسمسم.

ولما فی الکفایة علی هامش فتح القدیر:(۲/۷،طبع رشیدیه)

(لانه یخفف نفسه مرة لصلابته) لاسترخاء مفاصله والمیت لاسترخاء مفاصله اثقل

من الحی والنساء لاسترخاء هن اثقل من الرجال لصلابتهم.

ولمافی التنویر مع الدر:(۱۱/۷-۱۲،طبع امدادیه ملتان)

وشرعا:(مبادلة شئی مرغوب فیه بمثله)خرج غیر المرغوب ....ای بأیجاب او تعاط.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم:عزیزالرحمٰن چارسدوی غفرلہ

۱۷ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۴۰۱

﴿مکان کے اطراف میں موجود درخت بدون ذکر کے بھی بیع میں داخل ہونگے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مکان کی فروختگی کے وقت احاطے میں انار کے چند درخت لگے ہوئے تھے وقتی طور پر ان کا مستقل تذکرہ نہیں کیا گیا تھا،اس کے کچھ عرصہ بعد بائع کی اہلیہ کا اصرار ہے کہ یہ درخت ہمارے ہیں،اب سوال یہ ہے کہ بدون تذکرہ کے مکان کی بیع کے ضمن میں درخت داخل ہے یا نہیں؟ مستفتی: حافظ راشد چارسدہ

﴿جواب﴾ درخت پھل دار ہو یا نہ ہو زمین کے تابع ہو کر بیع میں داخل ہوتا ہے،الگ سے بیع کرنے کی ضرورت نہیں ہے لہٰذا مذکورہ عورت کا اصرار غلط دعوٰی ہے انار کے ایک دانے میں بھی اسکا حق نہیں ہے،البتہ موسم میں پھل میں سے اسکو بھی اگر کچھ دیتے ہیں تو یہ آپ کا احسان ہے بائع یا اسکی بیوی کو مطالبہ کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۷۹/۷،طبع امدادیه ملتان)

(ویدخل الشجر فی بیع الارض بلاذکر)قیدللمسالتین فبالذکراولی مثمرة کانت اولا صغیرة اوکبیرة الاالیابسة.

وفی الشامیة:قوله:(ویدخل الشجرالخ)قال فی المحیط:کل ماله ساق ولایقطع اصله کان شجرایدخل تحت بیع الارض بلاذکرومالم یکن بهذه الصفة لایدخل بلاذکرلانه بمنزلة الثمرة.اه عن الهندیة..... قلت:لکن فی الذخیرة ان العرانش والاشجاروالابنیة تدخل،لانهالیس لنهایتهامدة معلومة فتکون للتأبید فتتبع الارض......ومقتضاه ان غیرالمثمرالمعدللقطع کالزرع،الاان یقال:انه لیس له نهایة معلومة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:عزیزالرحمٰن چارسدوی

۱۹ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۳۹۹

﴿سڑک کے کنارے بیٹھ کر خرید وفروخت کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں،علماء کرام اور مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک

شخص روڈ کے کنارے بیٹھ کر مستقل صبح سے شام تک سودا بیچتا ہے، اب پوچھنا یہ ہے کہ شریعت کی رو سے یہ خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: رضوان مردانی

﴿جواب﴾ آپ اور آپ کے سامان سے عام لوگوں کو اگر تکلیف نہ ہو اور گزرنے میں دشواری کا سبب نہ بنے تو ایسی خرید وفروخت میں کوئی مضائقہ نہیں۔

لما فی التنویر مع الدر: (۲۵۹/۱۰ طبع امدادیه)

(والقعود فی الطریق لبیع وشراء) یجوز ان لم یضر باحد، والا لا (علی هذا التفصیل) السابق، وهذا فی النافذ (وفی غیر النافذ لا یجوز ان یتصرف باحداث مطلقا) اضربهم اولا (الا باذنهم) لانه کالملک الخاص بهم.

ولما فی الخلاصة: (۱۰۱/۳ طبع رشیدیه)

رجل یبیع ویشتری علی الطریق ان لم یکن فی قعوده ضرر للناس لسعة الطریق لا باس بالشراء منه وان کان فی قعوده ضرر لا ینبغی له ان یشتری فیه منه وقیل یکره للبائع وان کان الطریق واسعا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: عزیز الرحمٰن غفرلہ

۲۰ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۴۰۲

﴿پرندوں کو فروخت کرنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پرندوں کو شکار کر کے فروخت کرنا مثلاً باز چیل وغیرہ اور اس میں کمائی کرنا شرعاً کیسا ہے؟ مستفتی: غلام ربی دیروی

﴿جواب﴾ پرندوں کا شکار اور خرید وفروخت جائز ہے اور اسکو کاروبار اور کمائی کا ذریعہ بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ ان کے کھانے پینے اور رہن سہن کے حقوق بجالانا بھی ضروری ہے۔

لما فی التنویر مع الدر: (۲۲۶-۲۲۷/۵ طبع سعید)

(وصح بیع الکلب) ولو عقورا..... وکذا الطیور.

وفی الشامیة: (قوله وکذا الطیور) أی الجوارح..... والفهد والبازی یقبلان التعلیم فیجوز بیعهما علی کل حال والحاصل أن المتون علی جواز بیع ماسوی الخنزیر مطلقا وصحح السرخسی التقیید بالمعلم منها وکذا فی الهندیة: (۱۱۴/۳، طبع رشیدیه)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد حسن عفا اللہ عنہ

۳۰ رجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۷۶۴

﴿شیئرز (Shares) کی بیع قبل القبض کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کہ آج کل شیئرز (Shares) کی خرید وفروخت عام ہوگئی ہے بعض اوقات ایک شخص شیئرز خرید لیتا ہے لیکن اس شیئرز پر قبضہ اور ڈیلیوری (Deliverey) سے پہلے آگے فروخت کر دیتا ہے، کیا اسطرح قبضہ اور ڈیلیوری ملنے سے پہلے آگے فروخت کرنا جائز ہے؟

﴿جواب﴾ کسی چیز کو خرید کر قبضہ کرنے سے پہلے آگے فروخت کرنا جائز نہیں لیکن قبضہ کے اندر ہمیشہ حسی قبضہ (Physical possession) ضروری نہیں ہوتا بعض چیزوں پر حکمی قبضہ (Construitve possession) کافی ہوتا ہے یعنی وہ چیز جب خریدار کے ضمان (Risk) میں آجائے، چونکہ یہ بھی قبضہ تصور کیا جاتا ہے تو اسکے بعد آگے بیچنے کی اجازت ہے، اس لئے فقہاء کرام نے شئی ضمان میں آجانے، حقوق وذمہ داریاں خریدار کی طرف منتقل ہوجانے اور غرر ودھوکہ سے محفوظ ہونے کی صورت میں قبضہ تصور کیا ہے۔

شیئرز (Shares) درحقیقت کمپنی کے اندر شیئرز ہولڈر (hares holder) کی ملکیت کا نام ہے اور شیئرز سرٹیفکیٹ اس ملکیت کی علامت اور اسکا ثبوت وشہادت ہے، لہذا شیئرز خریدتے ہی قانونی طور پر کمپنی کے اثاثے اور املاک شیئرز کے بقدر خریدار کے ضمان میں آجاتے ہیں اور حقوق وذمہ داریاں خریدار کی طرف منتقل ہوجاتی ہیں۔

ایسی صورت میں قانونی دشواریوں کی وجہ سے اگر چہ شیئرز سرٹیفکیٹ نہ ملا ہو تب بھی خریدتے ہی ان پر خریدار کا قبضہ سمجھا جائیگا اور اسمیں تصرف کرنا جائز ہوگا بشرطیکہ ہلاکت کی صورت میں خریدار کا نقصان سمجھا جاتا ہو، لہٰذا شیئرز کی خرید وفروخت کی ترتیب اگر مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق ہے تو شیئرز سرٹیفکیٹ ہاتھ آنے سے پہلے بھی آگے بیچنا جائز ہے، تاہم احتیاط کا تقاضہ بہر صورت یہی ہے کہ جب تک ڈیلیوری نہ مل جائے اس وقت تک آگے فروخت نہ کیا جائے۔

لمافی الصحیح لمسلم:(۲/۵،طبع قدیمی)

عن ابن عباسؓ ان رسول اللہ ﷺ قال:من ابتاع طعامافلایبعه حتی یستوفیه قال ابن عباسؓ:احسب کل شئی مثله.

ولمافی سنن النسائی:(۲/۲۲۲،طبع قدیمی)لاتبعه حتی تقبضه.

ولمافی درس المسلم للمفتی الاکبرمحمدرفیع العثمانی حفظه الله:(۲/۵۰،طبع دارالعلوم)

نقل الشیخ السهارنفوریؒ فی بذل المجهودعن الخطابی انه قال القبض تختلف فی

الاشياء حسب اختلافها في انفسها فمنها مايكون بان يوضع المبيع في يدصاحبه و منها مايكون بالتخلية بينه وبين المشتري ومنها مايكون بالنقل من موضعه ومنهاما يكون بان يكتال.

ولمافي البدائع:(۵/۱۴۸ طبع ايچ ايم سعيد)

ولايشترط القبض بالبراجم لان معنى القبض هو التمكين والتخلي وارتفاع الموانع عرفاوعادة حقيقة.

ولمافيه ايضا:(۵/۲۴۴ طبع سعيد)

ثم لاخلاف بين اصحابنافي ان اصل القبض يحصل بالتخلية في سائر الاموال..... تفسير التسليم والقبض فالتسليم والقبض عندناهو التخلية والتخلي هوأن يخلى البائع بين المبيع وبين المشتري برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيه فيجعل البائع مسلماللمبيع والمشتري قابضاله.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد اسلم چترالی غفرلہ

۳ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۳۸۸

﴿کوئی چیز ادھار خرید کر نقد اً بیچنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہمارے ہاں لوگ پنجاب جا کر ادھار پر ٹریکٹر خریدتے ہیں اور یہاں ہمیں نقد قیمت پر بیچتے ہیں جبکہ بسا اوقات یہ بیچنے والے ان لوگوں کو جن سے ٹریکٹر ادھار کے طور پر خریدا ہے قسطیں ادا نہیں کرتے، اب پوچھنا یہ ہے کہ اسطرح ہمیں ان لوگوں سے ٹریکٹر خریدنا جائز ہے یا نہیں؟ شریعت کی رو سے اس کی کیا حیثیت ہے؟

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ کے مطابق اس شخص کا اقساط کی ادائیگی میں کوتاہی وٹال مٹول کرنا ظلم اور انسانی شرافت کے خلاف ہے جس کی مذمت حدیث شریف میں وارد ہوئی ہے: مطل الغنی ظلم (ترجمہ) مالدار شخص کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔

بلا شبہ اس شخص کا یہ عمل شرعاً مذموم اور قابل اصلاح ہے اسلئے دوسری جگہ سے ٹریکٹر وغیرہ خریدنا ممکن ہو تو ایسا ہی کریں ممکن ہے کہ آپ کے اس رویے کی بناء پر وہ اپنی اس حرکت سے باز آجائے تاہم اس شخص سے خریدنا بھی جائز ہے اگر چہ قسطوں کی ادائیگی میں وہ کوتاہی کر رہا ہے کیونکہ فروخت کنندہ اور خریدار کے درمیان ایجاب وقبول کے بعد بیع تام ہو جاتی ہے اور انعقاد بیع کے بعد بغیر رضا مندی کے بیع فسخ کرنے کا حق نہیں رہتا لہٰذا بیع تام ہونے کی وجہ سے آگے بیچنا بھی جائز ہے۔

لما فی شرح المجلۃ:(۲/۲۷۴،طبع رشیدیہ)

اذا کان البیع لازماً فلیس لاحد المتبایعین الرجوع عنہ.

ولما فی الھدایۃ:(۲۰/۳،طبع رحمانیہ)

واذا حصل الایجاب والقبول لزم البیع ولا خیار لواحد منھما الا من عیب أو عدم رویۃ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد اسلم چترالی عفا اللہ عنہ

۲۲ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۲۳۹

﴿مبیع پر قبضے کا مطلب﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے کپڑے کی گٹھڑیاں خالد کو فروخت کیں. خالد نے اٹھا کر ابھی تک اپنے گودام منتقل نہیں کیں یعنی ابھی تک زید کے گودام میں مال پڑا ہے زید کو ایک تیسرے شخص نے زیادہ قیمت کی پیشکش کی. زید چاہتا ہے کہ کسی طرح یہ نفع بھی حاصل کر سکے لیکن سودا خالد سے ہو چکا ہے اب کوئی صورت ہے کہ شریعت کے خلاف بھی نہ ہو اور اس موقع سے فائدہ بھی حاصل کر سکے اور نفع حاصل کرے خالد کی اجازت سے تو وضاحت فرمائیں؟ مستفتی: ایک سائل

﴿جواب﴾ دین اسلام میں مسلمان کی زبان کا بڑا اعتبار ہے ایک بار ایجاب وقبول ہو جائے خواہ صرف زبانی ہو تو اس سے سودا مکمل ہو جاتا ہے چنانچہ بائع اس چیز کا مالک نہیں رہتا مشتری اس کا مالک ہو جاتا ہے اب اس سودے کو ختم کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ بائع ومشتری اس عقد کو کمی وبیشی کے بغیر باہمی رضامندی سے فسخ کر دیں جس کو فقہی اصطلاح میں ''اقالہ'' کہتے ہیں اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہے۔

زید چونکہ اس مال کا اب مالک نہیں رہا اس لیے تیسرے شخص کو فروخت کرنے کا اسے اختیار نہیں ہے البتہ خالد سودا فسخ کرنے پر راضی ہو تو سودا فسخ کر لیں پھر زید تیسرے شخص کو چاہے تو فروخت کر سکتا ہے۔

ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ زید خالد کی رضامندی سے دلالی پر تیسرے شخص کے ساتھ سودا کرے تو جائز ہوگا بشرطیکہ خالد نے مال پر قبضہ کیا ہو قبضہ سے پہلے آگے بیچنا جائز نہیں ہے احادیث میں اس کی ممانعت آئی ہے مذکورہ صورت میں بظاہر خالد نے ابھی تک مال پر قبضہ نہیں

کیا ہے لیکن ممکن ہے غیرحسی معنوی قبضہ کیا ہوتو بھی بیع قبل القبض کے زمرہ میں نہیں آئیگا یعنی آگے بیچنا جائز ہوگا چنانچہ فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ قبضہ دوطرح کا ہوتا ہے

(۱) حسی قبضہ جو کہ ظاہر ہے (۲) معنوی قبضہ کہ مشتری کو مبیع اپنی تحویل میں لینے کا پورا موقع ملے اور بائع کی جانب سے مشتری کے لیے تصرف کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو سو یہاں پر خالد کا مال اگر ممتاز ہو یعنی زید کے دیگر مال میں مخلوط نہ ہو اور زید نے خالد کے لیے اپنا گودام کھول دیا ہو وہ چاہتا تو اٹھالیتا لیکن کسی وجہ سے نہیں اٹھایا تو یہ صورت بھی معنوی قبضہ کی ہے گویا خالد نے مال پر قبضہ کرلیا ہے اس لیے آگے بیچنا جائز ہے خود بیچے یا کسی دلال وغیرہ کے ذریعے بیچنا چاہے دونوں طرح جائز ہے۔

لما في الصحيح لمسلم:(۵/۲ قديمى كتب خانه)

عن ابن عباس رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ من ابتاع طعاما فلا يبعه حتى يقبضه قال ابن عباس واحسب كل شيء بمنزلة الطعام

عن ابن عمر رضي الله عنه قال كنا في زمان رسول الله ﷺ نبتاع الطعام فيبعث علينا من يامرنا بانتقاله من المكان الذى ابتعناه فيه الى مكان سواه قبل ان نبيعه.

عن ابن عمر رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ من ابتاع طعاما فلا يبعه حتى يقبضه.

ولما في الرد المحتار:(۵۶۲/۴ طبع: سعيد)

ثم التسليم بالتخلية على وجه يتمكن من القبض بلا مانع ولا حائل وشرط في الاجناس شرطا ثالثا وهو ان يقول خليت بينك وبين المبيع

ولما في الرد المحتار:(۵۶۲/۴ طبع: سعيد)

وحاصله ان التخلية قبض حكما لو مع القدرة عليه بلا كلفة لكن ذلك يختلف بحسب حال المبيع ففي نحو حنطة في بيت مثلا فدفع المفتاح اذا امكنه الفتح بلا كلفة قبض وفي نحو دار فالقدرة على اغلاقها قبض .وبعد اسطر قلت ومفاده ان تخلية القرب في الهبة قبض لكن هذا في غير الفاسد كما في الخانيه حيث قال اجمعوا على ان التخلية في البيع الجائز تكون قبضا وفي البيع الفاسد روايتان والصحيح انه قبض.

ولما في بدائع الصنائع:(۱۴۸/۵ طبع: سعيد)

ولا يشترط القبض بالبراجم لان معنى القبض هو التمكين والتخلى وارتفاع الموانع عرفا وعادة قديمة

ولما في بدائع الصنائع:(۲۴۴/۵ طبع: سعيد)

(وأما)تفسير التسليم والقبض .فالتسليم والقبض عندنا التخلية والتخلي وهو ان

يخلى البائع بين المبيع وبين المشترى برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشترى من التصرف فيه فيجعل البائع مسلما للمبيع والمشترى قابضا له وكذا تسليم الثمن من المشترى الى البائع .

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق اکی

۱۳ صفر الخیر ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۲۴۴

﴿خریدے ہوئے درخت کو جڑ سے اکھاڑنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے دوسرے سے درخت خریدا، درخت کاٹتے وقت بائع وخریدار کے درمیان اختلاف ہوا، خریدار درخت کو جڑ سے اکھاڑنا چاہتا ہے جبکہ بائع کو اپنی زمین کی خرابی کا خوف ہے، اس وجہ سے وہ سطح زمین سے کاٹنے کو کہہ رہا ہے، سوال یہ ہے کہ بائع وخریدار میں سے کس کا قول معتبر سمجھا جائیگا؟ نیز شریعت میں اس کی کوئی حد مقرر ہے؟

مستفتی: محب اللہ

﴿جواب﴾ درخت کی خرید وفروخت کے وقت کوئی شرط نہ لگائی گئی ہو تو خریدار کیلئے درخت کو جڑ سے اکھاڑنے کا حق ہے، البتہ بائع نے سطح زمین سے کاٹنے کی شرط پہلے سے لگائی ہو تو سطح زمین [illegible] لیکن جڑ سے اکھاڑنے کی صورت میں قریبی دیوار یا زمین وغیرہ کو نقصان پہنچنے کا قوی اندیشہ ہو تو سطح زمین سے ہی کاٹنا ہوگا۔

لما في الشامي: (۴/۵۵۴، طبع ایچ ایم سعید)

اشترى شجرة للقلع يؤمر بقلعها بعروقها، وليس له حفر الارض الى انتهاء العروق بل يقلعها على العادة الا ان شرط البائع القطع على وجه الارض، أو يكون في القلع من الاصل مضرة للبائع ككونها بقرب حائط أو بئر فيقطعها على وجه الارض.

ولما في البحر: (۵/۲۹۲، طبع سعید)

وفيها اذا اشترى شجرة للقلع فانه يؤمر بقلعها بعروقها وليس له حفر الارض الى انتهاء العروق بل يقلعها على العادة الا ان شرط البائع القطع على وجه الارض أو يكون في القلع من الاصل مضرة على البائع كما اذا كانت بقرب حائط أو بئر فانه يقطعها على وجه الارض.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد اسلم چترالی غفرلہ

۱۷ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۶۲۳

﴿بیعانہ کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سعید نے ایاز سے مکان لینے کا سودا کیا اور بیعانہ کے طور پر دس ہزار روپے (۱۰۰۰۰) کی ادائیگی کردی بعد میں سعید کا ارادہ تبدیل ہو گیا اور اس نے اس سے انکار کر دیا اور ایاز سے بیعانہ کا مطالبہ کیا لیکن ایاز بیعانہ واپس کرنے کو تیار نہیں، اب سوال یہ ہے کہ بیعانہ کے رقم پر قبضہ کر لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اور کیا سعید کو بیعانہ کے مطالبہ کا حق حاصل ہے؟

مستفتی: راشد خان

﴿جواب﴾ سودا کرنے کے بعد خریدار اور بیچنے والے دونوں میں سے کسی ایک کو بھی انکار کی گنجائش نہیں ہے، ایاز مکان حوالہ کر دینے کا پابند ہے اور سعید پوری قیمت ادا کرنے کا پابند ہے، دین اسلام مسلمان کے قول کو بڑی اہمیت دیتا ہے، سودا کرنے کے بعد یکطرفہ فیصلہ سے عقد ختم نہیں ہوگا، البتہ باہمی رضامندی سے دونوں سودا ختم کرنے پر متفق ہوں تو جائز ہے، شریعت میں اس کو "اقالہ" کہتے ہیں، اقالہ کی صورت میں خواہ صرف بیعانہ کی رقم ہو یا پوری رقم خریدار کو واپس کر دینا ضروری ہے، یہ خریدار کا واپس اپنا حق بن جاتا ہے جس کا وہ مطالبہ بھی کر سکتا۔

لمافی قوله تعالی:(سورة المائدة،آیت ۱)یاایها الذین امنوا اوفوا بالعقود .....الأية.

ولمافی مشكوة المصابيح:(۲۵۵/۱،طبع سعيد)

قال رسول الله ﷺ الالا يحل مال امرئ الا بطيب نفس منه.

ولمافی الهداية:(۲۰/۳،طبع رحمانيه)

اذاحصل الايجاب والقبول لزم البيع ولاخيار لواحدمنهما الامن عيب أوعدم رؤية .وفی حجة الله البالغة:(۱۹۱/۲،طبع قديمی)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: عبدالرزاق عفا اللہ عنہ

۱۷ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ

فتویٰ نمبر: ۱۷۲۳

﴿کتاب سے متعلق جملہ حقوق صاحب تالیف کی ملکیت ہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں حضرات علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص اپنی تحقیق کر کے کسی کتاب کا مسودہ تیار کر لے اور چھپائی سے قبل کوئی دوسرا شخص اس کو چرا کر اپنے نام سے چھپوا لے تو ایسے شخص کا کیا حکم ہے؟ اور جس شخص نے محنت کی ہو اگر اسے جائز اور قانونی

طریقے سے حصول حق کی توقع نہ ہو تو کیا جھوٹ بول کر یا رشوت دیکر اس شخص سے اپنا حق وصول کر سکتا ہے یا نہیں؟

مستفتی: حق نواز ڈیفنس کراچی

﴿جواب﴾ اگر کوئی شخص اپنی تحقیق کر کے کسی کتاب کا مسودہ تیار کر لے تو اس کے جملہ حقوق صاحب تالیف کی ملکیت میں آجاتے ہیں پھر کوئی دوسرا شخص چھپائی سے پہلے اس مسودہ کو چرا کر اپنے نام سے چھپوالے تو ایسا شخص چور اور غاصب ہے، اس پر قانونی طور پر ضمان عائد کیا جائے اور اپنا حق وصول کرنے کی کوشش کی جائے اگر قانونی چارہ جوئی سے اپنا حق وصول کرنا ممکن نہ ہو تو توریہ کر کے یعنی گول مول بات کر کے (صاف جھوٹ سے بچتے ہوئے) یا رشوت وغیرہ دیکر اپنا حق وصول کر لے تو اس کی بھی گنجائش ہے۔

لمافی سنن ابی داؤد:(۸۶/۲،طبع رحمانیہ) من سبق الی ما، لم یسبقه الیه مسلم فهوله.

ولمافی الدرمع الرد:(۴۲۷/۶،طبع سعید)

الکذب مباح لاحیاء حقه ودفع الظلم عن نفسه والمرادالتعریض لان عین الکذب الحرام الخ.

وفی الشامیة: واعلم ان الکذب قدیباح وقدیجب والضابط فیه کمافی تبیین المحارم وغیره من الاحیاء ان کل مقصود محمود یمکن التوصل الیه بالصدق والکذب جمیعا الخ.

ولمافی الشامی:(۴۲۳/۶-۴۲۴،طبع سعید)

(قوله اذاخاف علی دینه) عبارة المجتبی لمن یخاف وفیه ایضادفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له لیس برشوة یعنی فی حق الدافع اه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: انیس طالب کان اللہ لہ

۳ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۲۸۴

﴿راستہ کی بیع کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک زمین ہم چار آدمیوں میں یعنی زید، عمرو، بکر اور خالد کے درمیان مشترکہ تھی، اس زمین سے متصل ایک ایسا راستہ ہے جو کہ ایک طرف سے بند اور دوسری طرف سے ایک بڑے راستہ کی طرف کھل رہا ہے، اسکے بعد ہم چاروں نے اپنا اپنا حصہ الگ کر لیا، بکر اور خالد نے اپنا اپنا حصہ ہماری اجازت اور ہم سے پوچھے بغیر عثمان کو بیچ دیا جسکا گھر ہماری مشترکہ زمین کے پاس دائیں ہاتھ میں واقع ہے، عثمان نے ان دونوں سے خریدی ہوئی زمین میں سے ہمارے لئے اتنا راستہ چھوڑ دیا تاکہ

ہم دونوں یعنی زید اور عمرو اس راستہ کی طرف نکل سکیں جو کہ ایک طرف سے بند اور دوسری طرف سے ایک بڑے راستہ کی طرف نکل رہا ہے۔

اسکے بعد عمرو نے بھی مجھ کو اپنی زمین بیچ دی تو یہ راستہ صرف میری ملکیت میں رہ گیا، عثمان نے بکر اور خالد سے جو زمین خریدی تھی اس میں خالد کا حصہ چونکہ میری زمین سے متصل تھا تو اس نے وہ حصہ ہم کو دے دیا اور ہم نے بدلے میں اسکو وہ راستہ دے دیا (جو عثمان نے ان دونوں سے خریدی ہوئی زمین میں سے ہمارے لیے چھوڑا تھا) جو کہ اس کے گھر سے متصل ہے۔

جب میں نے اور عثمان نے یوں آپس میں زمین اور راستہ کا تبادلہ کیا تو عمرو کہنے لگا کہ عثمان نے جو تم کو راستہ کے بدلے میں زمین دی ہے اس میں میرا بھی حصہ بنتا ہے کیونکہ یہ زمین تم کو اس راستہ کے بدلے میں ملی ہے جس میں تمھارے ساتھ میں اپنے حصہ کی زمین تم کو بیچنے سے پہلے شریک تھا جبکہ میں نے اسے کہا کہ جب تم نے اپنی زمین مجھ کو بیچ دی تو راستہ بھی زمین کے ساتھ بک گیا اور میری ملکیت میں آ گیا۔

مفتی صاحب! آپ سے دو باتوں کا جواب مطلوب ہے:

(۱) بکر اور خالد نے اپنی زمین عثمان کو ہم سے پوچھے بغیر بیچ دی حالانکہ ہم اسکے ساتھ زمین میں براہ راست شریک تھے تو کیا اب ہم کو شفعہ کا حق حاصل ہے؟

(۲) عمرو نے اپنے حصہ کی زمین مجھ کو بیچ دی ہے اور وہ راستہ جو کہ میرے اور عمرو کے درمیان مشترک تھا اب میرے استعمال میں ہے، عمرو کا کہنا ہے کہ یہ راستہ زمین بیچنے سے پہلے چونکہ دونوں کی ملکیت تھا، لہٰذا اس راستہ میں میرا حق اب بھی باقی ہے، برائے مہربانی شریعت کی روشنی میں بتلائیں کہ عمرو کا مطالبہ صحیح ہے؟ مستفتی: محمد زید

﴿جواب﴾ (۱) بلا شبہ آپکو شفعہ کا حق حاصل تھا۔ (۲) فقہاء کرام نے راستے کی تین اقسام ذکر کی ہیں: (۱) شارع عام کی طرف نکلنے والا راستہ جو کہ ایک طرف سے بند ہو۔ (۲) کسی ایک طرف بند راستہ میں کھلنے والا چھوٹا راستہ جو چند اُفراد کا مشترکہ ہو۔ (۳) کسی کی ذاتی مملوکہ زمین میں ذاتی راستہ، لہٰذا مذکورہ راستوں سے متعلقہ زمین کا سودا اگر کوئی کرے تو پہلے والے دونوں راستوں کو ذکر کیے بغیر بھی سودا میں شامل ہے، البتہ صرف راستہ نمبر (۳) جو کسی کی ذاتی

ملکیت میں ذاتی راستہ ہوتو ایسا راستہ ذکر کیے بغیر سودا میں شامل نہ ہوگا، آپ کا متنازعہ راستہ، راستہ نمبر(۲) ہے، سودا کے وقت اگر چہ اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہوا ہے لیکن زمین بیچنے میں اس راستہ کا بھی سودا ہو گیا، لہٰذا عمر کا مطالبہ غلط ہے۔

لما فی الشامی:(۵/۷۷،طبع سعید)

(قوله وصح بيع الطريق)ثم في الدرر عن التتارخانية:الطرق ثلاثة:طريق الى الطريق الأعظم،وطريق الى سكة غيرنافذة،وطريق خاص في ملك انسان.فالأخير لايدخل في البيع بلاذكره أوذكر الحقوق أوالمرافق.والأولان يدخلان بلاذكراه ملخصاً. وحاصله:لوباع دارامثلادخل فيهما الأولان تبعابلاذكربخلاف الثالث—والفرق بين هذا الطريق والطريق الثاني وهومايكون في سكة غيرنافذة،أن هذا ملك للبائع وحده ولذاسمي خاصا،بخلاف الثاني فانه مشترك بين جميع أهل السكة،وفيه أيضاحق للعامة كمايأتي بيانه قريبا،وقداشتبه ذلك على الشرنبلالي فراجعه.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: حزل شاہ

۔۔شعبان ۱۴۳۰ھ — فتوی نمبر: ۲۳۹۲

﴿سرکاری زمین پر اُگے درخت ملازمین فروخت کرسکتے ہیں﴾

﴿سوال﴾ سرکاری زمین جیسے سرکاری سکولوں، عام شاہراہوں پر اُگے ہوئے درختوں کو سرکاری ملازمین کے ذریعے فروخت کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ حکومت کیطرف سے اگر ملازمین کو اجازت ہو اور رقم حاصل کر کے قومی خزانہ میں پہنچتی ہو تو متعلقہ ملازمین کے لئے درختوں کو فروخت کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے۔

البتہ ملازم خیانت و بددیانتی سے فروخت کرتے ہوں تو اس صورت میں فروخت کرنا اور علم ہونے کے باوجود اس سے خریدنا شرعاً جائز نہیں کیونکہ قومی ملکیت ہونے کی وجہ سے ان درختوں میں پوری قوم کا حصہ ہے۔

لمافي شرح المجلة:(۲/۲۸۵-۲۸۶،المادة ۱۴۹۵،طبع رشيديه)

ليس للوكيل ان يبيع بأنقص مماعينه المؤكل يعني اذاكان المؤكل قدعين ثمنا فليس للوكيل ان يبيع بانقص من ذالك واذاباع ينعقدالبيع موقوفاعلى اجازة مؤكله ولوباعه بانقص مماعينه بلااذن المؤكل وسلم المال الى المشتري فللمؤكل ان يضمنه ذلك النقصان—ثم لوخالف الوكيل بالبيع وباع وسلم المبيع للمشتري ثم

هلك في يد المشتري يكون الوكيل ضامنا لقيمته لانه بالمخالفة صار غاصبا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ناظمبور احمد شمس

۲۷ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۴۲۸

﴿ادھار معاملہ میں زیادہ قیمت مقرر کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ ایک شخص گندم کی بوری سات سو روپے میں نقد خرید کر چھ ماہ ادھار پر سات سو پچاس روپے میں فروخت کرتا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ شریعت میں اسکا یہ معاملہ جائز ہے یا ناجائز؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اس شخص کا یہ معاملہ بلاشبہ درست ہے، البتہ چھ ماہ گذرنے کے بعد مذکورہ رقم نہ دے سکے تو تاخیر کی وجہ سے زیادہ کا مطالبہ کرنا شرعاً درست نہ ہوگا۔

لما في الهداية: (۷۸/۲، طبع رحمانيه)

لان للاجل شبها بالمبيع الايرى انه يزاد في الثمن لاجل الاجل.

ولما في قضايا فقهية: (۷/۱، طبع دار العلوم كراچي)

اما الائمة الاربعة وجمهور الفقهاء والمحدثين فقد اجازوا البيع الموجل باكثر من سعر النقد.

ولما في الفقه الاسلامي: (۷۰۹/۲، طبع دار الفكر بيروت)

لان الاجل سبب في زيادة الثمن عادة، فان ثمن المبيع يختلف بين النسيئة والنقد.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالحکیم

۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۴۱۹

﴿بیع ثمار کی مروجہ صورتوں کا شرعی حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں کہ (۱) اگر پھل درخت پر موجود نہ ہوں تو بیع جائز ہے یا نہیں؟ (۲) پھل اگر بالکل کچے ہوں قابل انتفاع بھی نہ ہو تو بیع جائز ہے یا ناجائز؟ (۳) کچھ پھل موجود ہوں اور کچھ موجود نہ ہوں بلکہ دن بدن اسمیں اضافہ ہوتا رہے جو عقد کے وقت موجود نہ ہو تو انکی بیع کا کیا حکم ہے؟ (۴) آج کل جو لوگ پھلوں کی بیع کرتے ہیں اور کاٹتے نہیں بلکہ کچھ عرصہ تک درختوں پر چھوڑنے کی شرط لگاتے ہیں، اس بیع کا کیا حکم ہے؟ حالانکہ فقہاء عظام نے ایسی بیع کو فاسد قرار دیا ہے جس میں پھلوں کو درخت پر چھوڑنے کی شرط لگائی جائے۔

مستفتی: فرمان اللہ کوہاٹی

﴿جواب﴾ پھلوں کی بیع ایسی حالت میں کہ وہ موجود ہی نہ ہوں، جائز نہیں ہے کیونکہ بیع

کے وقت مبیع کا وجود ضروری ہے، حدیث میں اسکو بیع معاومہ یا بیع سنین سے تعبیر کیا گیا ہے۔

لمافی جامع الترمذی:(۱۵۷/۱،طبع فاروقی ملتان)

عن جابران النبی ﷺ نهی عن المحاقلة والمزابنة والمخابرة والمعاومة ورخص فی العرایا.هذاحدیث حسن صحیح.

ولمافی الشامی:(۸۵/۷،طبع امدادیه)

قال فی الفتح:لاخلاف فی عدم الجوازبیع الثمارقبل ان تظهر.

ولمافی تکملة فتح الملهم:(۳۹۳/۱،طبع دارالعلوم کراچی)

ان تباع الثمارقبل ظهورهاوهذالم یقل بجوازه احدسواء جری به التعامل اولا،والمراد من الظهورانفراك الزهرعنهاوانعقادهاثمرة وان صغرت کماصرح به ابن عابدین فی ردالمحتار(۴۲،۴)ولا ینعقدهذاالبیع سلمالفقدان شرائطه من کون المبیع معلوم القدر وکون الاجل معینا وغیرذلک.

(۲) پھل کم از کم موجود ہوں، خواہ بالکل کچے ہوں اور نا قابل انتفاع ہوں تو انکی بیع جائز ہے کیونکہ بعد میں قابل انتفاع ہو سکتے ہیں۔

لمافی الشامی:(۸۵/۷،طبع امدادیه)

والصحیح انه یجوزلانه مال منتفع به فی ثانی الحال ان لم یکن منتفعابه فی الحال، والحیلةفی جوازه باتفاق المشائخ ان یبیع الکمثری اول ماتخرج مع اوراق الشجرفیجوزفیهاتبعاللاوراق کانه ورق کله.

ولمافی تکملة فتح الملهم:(۳۹۴/۱،طبع دارالعلوم کراچی)

ان تظهرجمیع الثماربمعنی انعقادهاثمرةولکنهاغیرمنتفع بهافی الاکل ولافی علف الدواب وفیه خلاف ایضابین مشائخناالحنفیة فذکرقاضی خان ان بیعهالایجوز عندعامةالمشائخ ولکن صحح ابن الهمام جوازه کمااسلفناعن الفتح.

(۳) کچھ پھل موجود ہوں اور کچھ بعد میں وجود پزیر ہوں گے ایسی حالت میں سودا کو فقہاء کرام نے عموم بلوی کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے اور اب علماء کرام جواز کا ہی فتوی دیتے ہیں۔

لمافی الشامی:(۸۶/۷،طبع امدادیه)

قلت:لکن لایخفی تحقق الضرورة فی زماننا ولاسیمافی مثل دمشق الشام کثیرة الاشجاروالثمار،فانه لغلبة الجهل علی الناس لایمکن الزامهم بالتخلص باحدالطرق المذکورة،وان امکن ذلک بالنسبة الی بعض افرادالناس لایمکن بالنسبة الی عامتهم وفی نزعهم عن عادتهم حرج کماعلمت،ویلزم تحریم اکل الثمارفی هذه البلدان اذلاتباع الا کذلک،والنبی ﷺ انمارخص فی السلم للضرورة مع انه بیع المعدوم،

فحیث تحققت الضرورة هنا ایضا امکن الحاقه بالسلم بطریق الدلالة فلم یکن مصادما للنص فلذا جعلوه من الاستحسان، لان القیاس عدم الجواز، وظاهر کلام الفتح المیل الی الجواز، ولذا اورد له الروایة عن محمد بل تقدم ان الحلوانی رواه عن اصحابنا، وماضاق الامر الا اذا اتسع، ولا یخفی ان هذا مسوغ للعدول عن ظاهر الروایة کما یعلم من رسالتنا المسماة (نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف) فراجعها.

ولما فی تکملة فتح الملهم:(۱/۳۹۴ مطبع دار العلوم کراچی)

ان تباع سائر الثمار الشجر او البستان فی حین ظهر بعضها ولم یظهر بعضها وفیه خلاف بین مشائخنا الحنفیة فظاهر المذهب انه لا یجوز ایضا ولکن افتی شمس الائمة الحلوانی لو کان الخارج اکثر جاز البیع فی الجمیع وبه افتی الامام الفضلی بل یظهر من عبارته انه لا یشترط کون الخارج اکثر بل یجعل الموجود اصلا فی البیع وما یحدث بعد ذلک تبعا له ویقول استحسن فیه لتعامل الناس فانهم تعاملوا بیع ثمار الکرم بهذه الصفة ولهم فی ذلک عادة ظاهرة وفی نزع الناس من عاداتهم حرج، حکاه ابن الهمام فی الفتح(۵ص ۱۰۵) ثم قال، وقد رایت روایة فی نحو هذا عن محمد رحمه الله وهو بیع الورد علی الاشجار فان الورد متلاحق. ثم جوز البیع فی الکل بهذا الطریق وهو قول مالک رحمه الله والحاصل ان هذه الصورة وان کانت غیر جائزة فی اصل المذهب غیر ان فیها سعة عند عموم البلوی.

(۴) اگرچہ احتیاط کا تقاضا یہ ہے، کہ عقد کے دوران صراحت کے ساتھ ترک (چھوڑنے) کی شرط نہ لگائی جائے لیکن آج کل اسکا بھی عام رواج ہو گیا ہے، اس لئے عموم بلوی اور ضرورت کے پیش نظر ایسی بیع کے جواز کی گنجائش معلوم ہو رہی ہے۔

لما فی تکملة فتح الملهم:(۱/۳۹۵ مطبع دار العلوم کراچی)

قال العبد الضعیف عفا الله عنه یظهر من کلام ابن الهمام فی الفتح(۵/۱۰۲) ایضا ان العرف اذا جری ببیع الثمار بعد بدو صلاحها بشرط الترک واشتدت الیه الحاجة کان قیاس قول محمد رحمه الله الجواز وان لم یتناه عظم الثمار لانه اجاز شرط الترک بعد ما تناهی عظمها للعرف والضرورة قلت وکذلک اجاز محمد رحمه الله بیع الثمار فی حین ظهر بعضها ولم یظهر بعضها للضرورة والعرف، کما قدمنا عن الفتح ورد المحتار فکان قیاس قوله الجواز عند الضرورة وان لم یتناه عظمها ثم ههنا۔ لان التعامل رافع للنزاع.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ریاض الرحمٰن کوہاٹی غفرلہ

۲۵ ذی الحجہ ۱۴۲۸ھ — فتوی نمبر: ۱۰۵۰

﴿خودرو گھاس فروخت کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں کے بڑے

بڑے پہاڑ ہیں. سردی کے موسم میں افغانی لوگ مال مویشی سمیت آتے ہیں پھر چھ مہینوں کیلئے پہاڑ اجرت پر لیتے ہیں ایک لاکھ روپیہ کے عوض تاکہ اس میں مال مویشی چرائیں تو کیا شرعاً اس طرح کا عقد جائز ہے؟

مستفتی: ملک خوائیداد خان کوھائی

﴿جواب﴾ چراگاہ جانوروں کو چرنے کیلئے کرایہ پر دینا یا اس میں موجود خودرو گھاس کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے.

البتہ یہ پہاڑ آپ لوگوں کی اگر ملکیت ہے تو پورا پہاڑ یا اس کا خاص حصہ جانوروں کو رکھنے کیلئے کرایہ پر دے سکتے ہیں کرایہ باہمی رضامندی سے جو بھی طے کریں جائز ہے اور پورے پہاڑ میں جانوروں کو چرنے سے نہ روکا جائے. خودرو گھاس میں سب لوگ برابر شریک ہیں.

لما فی الشامی: (۵/۶۶..۶۷ سعید)

(والمرعی) أی الکلأ أما بطلان بیعها فلعدم الملک لحدیث "الناس شرکاء فی ثلاث فی الماء والکلأ والنار" واما بطلان اجارتها فلانها علی استهلاک عین (قوله وحیلة) أی حیلة جواز بیع الکلأ وکذا اجارته قال فی البحر: والحیلة فی جواز اجارته أن یستأجرها ارضا لایقاف الدواب فیها أو لمنفعة اخری بقدر ما یرید صاحبه من الثمن أو الاجرة فیحصل به غرضهما.

ولما فی البحر الرائق: (۶/۷۷،۷۸، طبع: سعید)

(قوله والمرعی واجارتها) ای لاتجوز بیع الکلأ واجارته ـــــ والحیلة فی جوازه اجارته ان یستأجر أرضا لایقاف الدواب فیها او لمنفعة اخری بقدر مایرید صاحبه من الثمن او الاجرة فیحصل به غرضها.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ارشد سعید کوھائی

۶ ربیع الاول ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۳۲۰

﴿کیا پانی کی باری کو فروخت کرنا جائز ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں زمین سیراب کرنے کیلئے پانی کی باریاں مقرر ہیں، اب اگر کوئی شخص زمین کو سیراب کرنے کیلئے کوئی اور پانی استعمال کرے اور اپنی باری کو فروخت کرنا چاہے تو شرعاً یہ جائز ہوگا یا نہیں؟

﴿جواب﴾ پانی کی باری کو فروخت کرنے سے متعلق فقہاء احنافؒ کا اصل فتویٰ تو ناجائز ہونے کا ہے، لیکن مشائخ بلخ اور موجودہ دور کے بعض محققین علماء بھی جواز کا فتویٰ دے رہے ہیں۔

لما في الشامي: (۸۰/۵، طبع: سعيد)

وكذا بيع الشرب اى فانه يجوز تبعا للارض بالاجماع ووحده في رواية، لايباع الشرب ولا يوهب ولا يؤجر ولا يتصدق لانه بمال متقوم في ظاهر الرواية وعليه الفتوى ثم نقل عن شرح الوهبانية ان بعضهم جوز بيعه ثم قال وينفذ الحكم بصحه بيعه.

ولما في الهداية (۵۷/۳، طبع: رحمانيه)

بخلاف الشرب حيث يجوز بيعه تبعا للارض باتفاق الروايات ومفردا في رواية وهو اختيار مشائخ بلخ

ولما في المبسوط سرخسي: (۱۷۱/۲۳، طبع: دار القلم بيروت)

وفي بعض المتأخرين من مشائخنا افتى ان يبيع الشرب وان لم يكن معه ارض للعادة الظاهرة فيه في بعض البلدان وهذه عادة معروفة بنسف

دیکھئے (جدید فقہی مباحث، مولانا مجاہد اسلام قاسمیؒ: ۱۷۹/۳) (احسن الفتاوی = مفتی رشید احمدؒ صاحب: ۴۶۴/۸) (فقہی مقالات = مفتی محمد تقی عثمانی صاحب: ۱۸۶/۱) (جدید معاملات کے شرعی احکام = مفتی [illegible] ان اللہ صاحب: ۲۱۴/۱)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: ارشد سعید کوھائی

۲۱ محرم الحرام ۱۴۳۳ھ | فتوی نمبر: ۳۱۲۵

﴿ثمن ادا کرنے سے پہلے مشتری کا بائع کو وہی چیز فروخت کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے حنیف نامی ایک شخص سے دوہزار ۲۰۰۰ روپیہ کے عوض موبائل خریدا ثمن دینے سے پہلے میں نے موبائل حنیف سے لیا، دیکھا تو وہ میری پسند کا نہیں تھا۔ [illegible] نے چاہا کہ اسکو کہیں فروخت کردوں تو حنیف ہی نے (جو بائع اول تھا) مجھ سے [illegible] روپیہ کے عوض خریدا تو میں نے موبائل مع دوسو روپیہ (کیونکہ ۲۰۰۰ روپیہ عقد اول میر[illegible]ے ذمہ لازم تھے) حنیف کو حوالہ کردیا۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ اس طرح عقد کرنا جائز ہے؟ اگر جائز نہیں تو جواز کی کوئی صورت ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ [illegible] کسی چیز کا سودا کوئی کرلے تو سودا مکمل نہیں ہوتا دیکھنے کے بعد خریدار کو پسند نہ آئے تو شریعت نے سودا ختم کرنے کا خریدار کو اختیار دیا ہے۔ بائع کو منظور ہو یا نہیں۔ خریدار لینے کا پابند نہیں ہے۔ بلکہ خریدار نے پہلے سے اگر ثمن ادا کردیا ہے تو بائع پر لوٹانا واجب ہے۔

البتہ دیکھنے کے بعد خریدار ایک بار سودا منظور کرلے تو سودا مکمل ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد

صرف باہمی رضامندی سے کمی بیشی کے بغیر عقد فسخ ہوسکتا ہے۔جس کو شریعت میں "اقالہ" کہتے ہیں۔اور اگر ثمن ادا کردیا ہوتو کمی وبیشی کیساتھ نیا سودا بھی ہوسکتا ہے۔آپ نے پہلے دیکھا نہیں تھا اور دیکھنے کے بعد موبائل پسند نہیں آیا تو اسی سے سودا ختم ہوگیا اضافی رقم ۲۰۰ روپے لینے کا حق بائع کو حاصل نہیں ہے واپس کرنا لازم ہے۔اور بالفرض دیکھنے کے بعد آپ سودا منظور کرتے تب بھی ۲۰۰ روپیہ کی شرط سے سودا ختم کرنا جائز نہیں ہے۔بائع کو منظور ہوتو اسی رقم پر یا اس سے زائد رقم پر سودا ختم کریں۔اضافی رقم لینا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے اس لئے کہ آپنے ابھی تک ثمن ادا نہیں کیا۔ہاں ثمن بھی پورا ادا کرتے تو آپس میں نیا عقد کمی وبیشی کیساتھ کرنا جائز ہوتا۔

لما فی تنویر الابصار:(۸۲/۵ مطبع سعید)

(و)فسد (شراء ماباع بنفسہ او بوکیلہ) من الذی اشتراہ أو حکما کوارثہ (بالاقل)من قدر الثمن الاول (قبل النقد) کل (الثمن) لاول .صورتہ باع شیئا بعشرۃ ولم یقبض الثمن ثم شراہ بخمسۃ لم یجز

ولما فی الھندیہ:(۱۳۲/۳ مطبع: رشیدیہ)

ولم یجز شرامن لا یصح شہادتہ لہ ماباع بنفسہ أو بیع لہ بأن باع وکسا باقل نقد الثمن الاول.

ولما فی البحر الرائق:(۸۱/۶ مطبع سعید)

(قولہ شراء ماباع بالاقل قبل النقد) أی لم یجز شراء البائع ما باع بالاقل مما باع قبل نقد الثمن فھو مرفوع علی بیع لا انہ مجرور عطفاً علی المجرورات لانہ لوکان کذلک لصار المعنی لم یجز بیع شراء وھو فاسد وانما منعنا جوازہ استدلالا بقول عائشۃؓ لتلک المرأۃ وقد باعت بستمائہ بعد ماشترت بثمانمائہ بئسما شریت واشتریت ابلغی زید بن ارقم ان اللہ تعالی أبطل حجہ وجھادہ مع رسول اللہ ان لم یتب ولا ن الثمن لم ید خل فی ضمانہ.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ارشد سعید کوہائی

۸ ربیع الاول ۱۴۳۳ھ — فتوی نمبر: ۳۳۴۷

﴿بیٹ کی خرید وفروخت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں: کہ مرغیوں کی بیٹ کی خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں؟ ہمارے علاقہ میں بکثرت اسکی خرید وفرخت ہونے لگی ہے،لوگ بطور کھاد استعمال کرتے ہیں برائے کرم شریعت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں.

﴿جواب﴾ مرغیوں کی بیٹ ہو یا چوپائے جانوروں کا گوبر بطور کھاد استعمال کرنا جائز ہے

اور ایسی چیزوں کی خرید و فروخت بھی شرعاً منع نہیں ہے۔

لما فی البحر (ج۶ص۱۹۰) طبع سعید

(کرہ بیع العذرۃ لا السرقین لأن المسلمین یتمولون السرقین وانتفعوا به فی سائر البلاد والأمصار من غیر نکیر، فانهم یلقونه فی الأراضی لاستکثار الریع بخلاف العذرۃ لأن العادۃ لم تجر بالانتفاع بها الا مخلوطۃ برماد أو —

ولما فی التنویر مع الدر (ج۶ص۳۸۵) طبع سعید

(وکرہ بیع العذرۃ) رجیع الآدمی (خالصۃ لا) یکرہ بل یصح بیع (السرقین) أی الزبل۔

ولما فی الشامی (قوله أی الزبل) وفی الشرنبلالیۃ: هو رجیع ما سوی الانسان۔

ولما فی الشامی (۵/۷۰) طبع سعید ویجوز بیع السرقین والبعر والانتفاع به والوقود به.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سیف اللہ

۲ صفر المظفر ۱۴۲۳ھ — فتویٰ نمبر: ۲۱۴۶

﴿مہتمم صاحب اپنی کتابیں مدرسہ کو فروخت کرسکتا ہے یا نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیان عظام اس مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ مہتمم صاحب اپنی کتابیں مدرسہ کو اگر فروخت کرے مناسب قیمت پر اور مدرسہ کو ضرورت بھی ہو تو کیا وہ اسطرح کرسکتے ہیں؟ مستفتی: مولوی عنایت اللہ کلاچوی

﴿جواب﴾ ایک آدمی بائع اور خریدار نہیں بن سکتا، مہتمم صاحب بائع ہے تو خریدار انکے علاوہ کوئی اور ہو تو بیع جائز ہے ورنہ نہیں، مدرسہ خود خریدار نہیں ہوسکتا، البتہ مہتمم صاحب کے علاوہ اس مدرسہ کی اگر کمیٹی ہے تو کمیٹی والے خریدار ہوجائیں پھر قیمت مدرسہ کے پیسوں سے ادا کریں یا مدرسہ میں پڑھنے والے طلباء عاقل بالغ ہوں تو وہ بھی مدرسہ کیلئے خرید سکتے ہیں، اس کے علاوہ علاقہ کے علماء کرام بھی خریدار بن سکتے ہیں اس لئے کہ جہاں قاضی نہیں ہوتا تو ایسے امور میں علماء کرام قاضی کے قائم مقام ہوتے ہیں۔

لما فی الهدایه (۳/۲) طبع رشیدیه کوئٹه

اما شرائط الانعقاد فانواع منها فی العاقد وهو ان یکون عاقلا ممیزا کذا فی الکافی والنهایه فیصح بیع الصبی والمعتوه الذین یعقلان البیع واثره کذا فی فتح القدیر وان یکون متعددا فلا یصح الواحد عاقدا من الجانبین.

ولما فی بدائع الصنائع (۶/۳۷۰) طبع دار الکتب العلمیه بیروت)

العدد فی العاقد فلا یصلح الواحد عاقدا من الجانبین فی باب البیع الا الاب فیما یبیع مال

نفسه من ابنه الصغير بمثل قيمته او بما يتغابن الناس فيه عادة او يشتري مال الصغير لنفسه بذالك عند اصحابنا الثلاثة استحسانا، و القياس ان لا يجوز ذالك ايضا و هو قول زفر رحمه الله تعالى.

وجه القياس ان الحقوق في باب البيع ترجع الى العاقد وللبيع حقوق متضادة مثل التسليم والتسلم والمطالبة .فيؤدي الى ان يكون الشخص الواحد في زمان واحد مسلما و متسلما .طالبا و مطالبا .و هذا محال ولهذا لم يجز ان يكون الواحد كيلا من الجانبين في باب البيع.

ولما في الهنديه(۳/۵۸۸طبع رشیدیه کوئٹه)

الوكيل بالبيع لا يملك شراءه لنفسه لان الواحد لا يكون مشتريا و لا بائعا كذا في الوجيز لكردي.

ولما في الشامي(۶/۵۷۰طبع ایچ ایم سعید)

(كتاب الوقف مطلب في قطع الجهات لاجل العمارة)

لو عمل المتولي في الوقف باجر جاز و يفتي بعدمه اذ لا يصلح موجرا و مستاجرا و صح لو امره الحاكم ان يعمل فيه اه وعليه كما في القنية اذا عمل القيم في عمارة المسجد و الوقف كعمل الاجير لا يستحق اجرا محمول على ما اذا كان بلا امر الحاكم والظاهر ان الناظر غير قيد بل كل من عمل في التعمير من المستحقين له اجرة عمله وانما نصوا على الناظر لانه لا يصلح موجرا و مستاجرا اي مستاجرا لنفسه .فاذا كان بامر الحاكم كان الحاكم هو المستاجر له .بخلاف غيره من المستحقين فان المستاجر له هو الناظر .فلا شبهة في استحقاقه الاجرة كالاجنبي.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفی اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد داؤد فاروقی

۱۶ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۳۹۲۸

﴿گاڈر کی بیع گاڈر کے بدلے جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک گاڈر کے بدلے دوسرے گاڈر کی بیع جائز ہے یا نہیں؟ اگر کسی نے اسطرح کی بیع کر لی تو اسمیں ربا تو لازم نہیں آئیگا۔

﴿جواب﴾ گاڈر اصل کے اعتبار سے تو موزونی ہے لیکن آجکل چونکہ اسکی خرید و فروخت فٹ کے حساب سے عام رائج ہو گئی ہے اسلئے اب یہ موزونی نہیں رہا لہذا گاڈر کی بیع گاڈر کے بدلے کمی بیشی کیساتھ بھی جائز ہے لیکن دونوں ایک ہی جنس کے ہیں اس لئے ادھار بیچنا جائز نہیں بلکہ سودا کے وقت دونوں فریق کے گاڈر کا موجود اور متعین ہونا ضروری ہے خواہ ہر ایک اپنے گاڈر کو اسی وقت نہ اٹھائیں بائع کے پاس امانت پڑا رہے، ہاں تبادلہ ایسی چیزوں کا ہو کہ ہر ایک

کا جنس الگ الگ ہو اور وہ کیلی موزونی اشیاء میں سے نہ ہو تو کمی بیشی کیساتھ بیچنا بھی جائز ہے اور ادھار معاملہ بھی جائز ہے۔

لمافی شرح المجلۃ تحت المادۃ ۱۲۲ ج ۲/ ۱۶ طبع رشیدیۃ

﴿بیع المقایضۃ بیع العین بالعین ای مبادلۃ مال بمال غیر النقدین﴾

ثم ان اتفقا جنسا وقدرا اشترط لصحتہا تساوی البدلین وتعیینہما ،وان اتفقا جنسا فقط اوقدرا فقط اشترط التعیین دون التساوی فصح بیع کرحنطۃ بکرحنطۃ معینین ولایصح نسیئۃ ولامتفاضلا وصح بیع کرحنطۃ بکری شعیروثوب ہروی بثوبین ہرویین معینات ولایصح نسیئۃ ،وان اختلفا جنسا وقدرا فلایشترط شئی ،فصح بیع ثوب ہروی بثوبین مرویین الی اجل معلوم لانہ اذا وجد القدر والجنس حرم کل من الفضل والنسأ وان عدما حل کل منہما فالمراد بالتعیین عدم التأ جیل لاالتقابض واما اشتراط التقابض فیما اذا اتفقا جنسا وقدرا اوجنسا فقط اوقدرا فقط فلاقائل بہ ،لان التقابض فی المجلس لایشترط الافی الصرف وہوبیع الاثمان بعضہا ببعض اما ماعداہ فانہ یشترط فیہ التعیین لاالتقابض کمافی ردالمحتار وغیرہ .

ولمافی الہدایۃ ج۳ /۸۳ طبع رحمانیۃ

واذاعدم الوصفان الجنس والمعنی المضموم الیہ حل التفاضل والنسأ لعدم العلۃ المحرمۃ والاصل فیہ الاباحۃ واذاوجدا حرم الفضل والنسأ لوجود العلۃ واذاوجداحدہما وعدم الاخرحل التفاضل وحرم النسأ مثل ان یسلم ہرویافی ہروی اوحنطۃ فی شعیر،فحرمۃ ربوی الفضل بالوصفین وحرمۃ النسأ باحدہما .

ولمافی المحیط البرہانی ج۹ /۳۲۵ طبع ادارۃ القرآن

ومتی ترکوا الوزن فی شئی مع الامکان فانہ یخرجہ من ان یکون موزونافانہ لوباع قمقمۃ من حدیداوصفراونحاس بقمقمتین من جنسہاوتلک القمقمۃ لاتباع وزنافانہ یجوزیدابید لان الناس ترکوالوزن مع الامکان فیہا وترک الوزن فیماثبت وزنہ باصطلاحہم اعراض عن الاصطلاح عن الوزن فینسخ الاصطلاح علی الوزن والوزن فی ہذہ الاشیاء ثبت باصطلاحہم.

ولمافی التنویر مع الدر ج۵/ ۱۷۱ طبع سعید

(وعلتہ)ای علۃ تحریم الزیادۃ (القدر)المعہود بکیل اووزن (مع الجنس فان وجداحرم الفضل)ای الزیادۃ (والنسأ)بالمد التأخیر فلم یجزبیع قفیزبربقفیزمنہ متساویا واحدہما نسأ (وان عدما)بکسر الدال من باب علم (حلا)کہروی بمرویین لعدم العلۃ فبقی علی اصل الاباحۃ (وان وجداحدہما)ای القدر وحدہ اوالجنس (حل الفضل وحرم النسأ)ولومع التساوی حتی لوباع عبدابعبدالی اجل لم یجزلوجودالجنسیۃ .

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: عاقل شاہ

۲۰ صفر الخیر ۱۴۲۵ھ — فتویٰ نمبر: ۳۹۵۰

﴿چوری کا مال خریدنا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں (سہراب گوٹھ میں) بعض لوگ جو کہ زیادہ تر چرس پینے والے ہوتے ہیں موبائل بیچنے کیلئے لاتے ہیں اور آدھے سے بھی کم قیمت پر فروخت کرتے ہیں جس سے ظاہر ہیکہ یہ چوری ڈکیتی وغیرہ کا مال ہے۔ اب پوچھنا یہ ہیکہ اسطرح کی چیز خریدنا جائز یا نہیں؟ ایک ساتھی کا کہنا ہیکہ ہم تو پیسے دیکر خریدتے ہیں اگرچہ انہوں نے چوری کئے ہوں لہذا ہمارے لیے خریدنا جائز ہے۔ اس ساتھی کا یہ کہنا درست ہے یا نہیں؟ برائے کرم وضاحت فرما کر ممنون فرمائیں۔

﴿جواب﴾ چوری کے مال کا جب تک ضمان ادا نہ کیا جائے چور اسکا مالک نہیں بن پاتا اصل مالک بدستور اس مال کا مالک رہتا ہے، لہذا خریدار کو اگر معلوم ہیکہ یہ چوری کا مال ہے تو خریدنا ہرگز جائز نہیں بلکہ خریدنے سے وہ بھی مالک نہیں بنے گا۔ آپکے ساتھی کا یہ عذر پیش کرنا کہ ہم تو پیسے دیکر خریدلیتے ہیں کوئی معقول اور سمجھداری کی بات نہیں ہے آپکے دوست کے ذاتی مال کا کوئی غیر شخص سودا کر کے بیچدے تو کیا آپکا دوست اسکے عذر کو قبول کریگا کہ اس نے پیسہ دیکر حاصل کیا ہے؟

لمافی الرد ج۵/۹۸ طبع سعید

(قوله الحرمة تتعدى ....الخ) نقل الحموى عن سيدى عبدالوهاب الشعرانى انه قال فى كتابه المنن: وما نقل عن بعض الحنفية من ان الحرام لايتعدى ذمتين: سئالت عنه الشهاب ابن الشلبى فقال: هو محمول على مااذالم يعلم بذلك، امالورأى المكاس مثلا يأخذمن احد شيئا من المكس ثم يعطيه اخرثم يأخذمن ذلك الاخرلاخرفهوحرام

ولمافى العالمكيرية ج۳/۱۱۱ طبع رشيدية

ومن باع ملك غيره ثم اشتراه وسلم الى المشترى لم يجزويكون باطلا لافاسدا وانما يجوزاذاتقدم سبب ملكه قبل ذلك كذافى الفصول العمادية .

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: عاقل شاہ

۱۴ صفر الخیر ۱۴۲۵ھ — فتویٰ نمبر: ۳۹۲۳

﴿بیع الوفاء کی ایک صورت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی بہت زیادہ مقروض

تھا قرض خواہوں نے اسکو بہت زیادہ تنگ کر رکھا تھا، اسکے پاس کچھ تھا نہیں انکو دینے کیلئے، بالآخر وہ مجبور ہوا اس بات پر کہ اپنی جائیداد میں سے تھوڑا سا فروخت کر دے اور انکا منہ بند کر دے، چنانچہ اسنے اپنی جائیداد کا ایک حصہ دوسرے شخص پر فروخت کر دیا (چونکہ علاقے میں یہ رواج ہے کہ جو آدمی اپنی زمین جائیداد وغیرہ بیچتا ہے اسکو معیوب سمجھا جاتا ہے اسلئے) ساتھ یہ شرط بھی لگایا کہ جب میری مالی حالت اچھی ہوگی اور اتنی رقم میرے پاس آئیگی تو میں آپکو دیکر مذکورہ زمین کا حصہ آپ سے واپس لے لوں گا، کافی عرصہ گزرنے کے بعد اب بائع کی مالی حالت اچھی ہوگئی ہے وہ مشتری سے کہتا ہے کہ میں آپکو آپکی رقم ادا کرتا ہوں تم مجھے میری زمین واپس کر دو، لیکن مشتری اس کیلئے تیار نہیں وہ کہتا ہے اتنے سال میرے پیسے آپکے پاس رہے اب آپ وہی پیسے دیکر اپنی زمین واپس لے لوگے تو اسمیں میرا نقصان ہے یہ مجھے منظور نہیں۔ برائے کرم قرآن، حدیث اور فقہاء کرام کے اقوال کی روشنی میں اس مسئلہ کا حکم بیان فرمائیں۔

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں بائع کا مشتری سے یہ کہنا کہ "جب میری مالی حالت اچھی ہوگی میں آپکی رقم آپکو واپس کر کے اپنی زمین واپس لے لوں گا" اسکی دو صورتیں ہوسکتی ہیں:

(۱) یہ کہ بائع اور مشتری نے شروع عقد میں یہ شرط لگائی ہو کہ جب بائع رقم واپس کریگا تو اپنی مبیع واپس لینے کا اسکو اختیار ہوگا تو اس صورت میں یہ بیع فاسد ہے اور معاملہ رہن کے حکم میں ہے۔ لہذا بائع جب رقم ادا کردیگا تو مشتری پر لازم ہوگا کہ وہ زمین واپس کردے اور اس دوران اس زمین سے اگر فائدہ اٹھایا ہے مثلاً زمین سے منافع اٹھائے ہیں تو وہ بھی لوٹانا ضروری ہے۔

(۲) اور دوسری یہ کہ شروع عقد میں اس قسم کا تذکرہ نہیں کیا بعد میں دونوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ جب ثمن لوٹائے گا تو زمین واپس بائع کو دی جائیگی، تو اسکی حیثیت وعدہ کی ہے لیکن یہ عام وعدہ کیطرح نہیں ہے کہ پورا نہ کرنے کی صورت میں صرف گناہ ہوگا بلکہ یہ وعدہ قضاء بھی پورا کرنا لازم ہے، مشتری کا یہ عذر کہ آپنے اتنی مدت تک میری رقم استعمال کی ہے اسلئے میں زمین واپس نہیں کرسکتا قابل اعتبار نہیں ہے۔ بائع اگر یہ وعدہ قاضی کے ہاں حق ثابت کردے تو قاضی زبردستی زمین بائع کو لوٹائیگا۔ بیع وفاء کی یہ دوسری صورت بہتر ہے اس صورت میں مشتری نے زمین سے جو منافع حاصل کئے ہیں وہ لوٹانا ضروری نہیں ہے اور پہلی صورت

چونکہ حکماً رہن ہے اسلئے منافع لوٹانا واجب ہے۔

لمافی الدر:(ج ۵/۲۷۷طبع سعید)

ثم ان ذکرالفسخ فیه اوقبله اوزعماه غیرلازم کان بیعافاسداولوبعده علی وجه المیعادجازولزم الوفاء به لان المواعیدقدتکون لازمة لحاجة الناس وهوالصحیح .

ولمافی الهندیة :(ج۳/۲۰۸،۲۰۹طبع رشیدیة)

البیع الذی تعارف اهل زماننااحتیالاللربا، وسموه بیع الوفاء هوفی الحقیقة رهن وهذاالمبیع فی یدالمشتری کالرهن فی یدالمرتهن لایملکه ولایطلق له الانتفاع الاباذن مالکه وضامن لمااکل من ثمره واستهلک من شجره والدین ساقط بهلاکه فی یده اذاکان به وفاء بالدین ولاضمان علیه فی الزیادة اذاهلکت من غیرصنعه وللبائع استرداده اذاقضی دینه ولافرق عندنابینه وبین الرهن فی حکم من الاحکام کذافی الفصول العمادیة وعلیه فتوی سیدابی شجاع السمرقندی وفتوی القاضی علی السغدی ببخاری وکثیرمن الائمة علی هذاکذافی المحیط وصورته ان یقول البائع للمشتری :بعت منک هذاالعین بدین لک علی علی انی متی قضیت الدین فهولی، اویقول البائع :بعت هذابکذاعلی انی متی دفعت لک الثمن تدفع العین الی، والصحیح ان العقدالذی جری بینهماان کان بلفظ البیع لایکون رهناثم ینظران ذکراشرط الفسخ فی البیع فسد البیع وان لم یذکراذلک فی البیع وتلفظا بلفظ البیع بشرط الوفاء اوتلفظابالبیع الجائزوعندهماهذاالبیع عبارة عن بیع غیرلازم فکذلک وان ذکرالبیع من غیرشرط ثم ذکرالشرط علی وجه المواعدة جازالبیع ویلزم الوفاء بالوعد.

ولمافی المحیط البرهانی (ج۱۰/۳۶۹طبع ادارة القرآن

وفی فتاوی النسفی :ان البیع الذی تعارفوه اهل سمرقند وسموه بیع الوفاء تحرزاعن الرباء فی الحقیقة رهن والمبیع فی یدالمشتری کالرهن فی ید المرتهن لایملکه ولایحل له الانتفاع به الاباذن الراهن وهوضامن لمااکل من ثمرته واستهلکه من عینه والدین ساقط بهلاکه فی یده اذاکان به وفاء بالدین وللبائع استرداده اذاقضی الدین اذلافرق عندنابینه وبین الرهن فی حق حکم من الاحکام .وهکذافی الشامی (ج۵/۲۷٦طبع سعید)

ولمافی المقالات الفقهیة :(ص ۵٦ مکتبه دارالعلوم کراچی)

اذانظرناالی ماذکره اجلة الفقهاء من المذاهب الاربعة وجدناهم متفقین علی ان بیع الوفاء لوکان خالیاعن شرط الردفی صلب العقدیکون جائزا،امااذاشرط ردالمبیع فی صلب العقدیکون البیع فاسداعندالاحناف والمالکیة والشافعیة اماالحنابلة فیرون البیع صحیحاوالشرط فاسدافاذاکان البیع خالیاعن شرط ردالمبیع فالراجح فی المذاهب الاربعة انه جائز وذلک لکونه بیعاخالیاعن شرط وهل یجب الردعلی احدالمتعاقدین اذااتفقاعلی ردالمبیع عندردالثمن وکان ذلک الاتفاق قبل عقدالبیع اوبعده بصورة المواعدة فنری الراجح انه یجب علیهماالرداذاتواعداعلی ذلک

ویکون الوعد ملزما دیانة وقضاء. اما وجوب الوعد دیانة فظاهر لقوله تعالی ﴿واوفوا بالعهد ان العهد کان مسئولا﴾ وبالنصوص التی تدل علی ایفاء الوعد واما لزومه قضاء فالامر عند الامام مالک ظاهر کما تقدم وللفقهاء الحنفیة ایضا اختاروا فی هذه المسئلة لزوم الوعد قضاء لحاجة الناس فهو الراجح عند الامامین الجلیلین.

ولما فی المقالات الفقهیة (ص ۲۳۲ مکتبه دار العلوم کراچی)

ولکن المتأخرین من الحنفیة لم یبیحوا انتفاع المرتهن وان کان باذن الراهن لان العرف قد جری بالانتفاع بالرهن والمعروف کالمشروط ولذلک ذکر ابن عابدین نفسه فی رد المحتار فی کتاب الرهن انه لا یحل للمرتهن ولو بالاذن لانه ربا.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ تعالیٰ اعلم بالصوب: عاقل شاہ

۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ فتویٰ نمبر: ۳۶۶۱

﴿بیع فاسد، باطل اور موقوف کا بیان﴾

﴿بیع میں شرط فاسد کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دوکاندار گاہک کو مقررہ مدت تک ادھار موبائل دیتا ہے، جب گاہک سے متعین مدت تک قرضہ ادا نہیں ہو پاتا تو دوکاندار اس کو دوسرا مہنگا موبائل اس شرط پر ادھار بیچتا ہے کہ اس کو فروخت کر کے میرا پہلا ادھار ادا کرنا ہوگا اور اس موبائل کی کچھ رقم آپ کے ذمے باقی رہ جائے گی وہ بعد میں ادا کرنا۔

پوچھنا یہ ہے کہ یہ معاملہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: محمد ذاکر پشاور

﴿جواب﴾ بیع میں ایسی شرط لگانا جس سے بائع یا مشتری کو کوئی خاص فائدہ ہو شرعاً منع ہے، اس سے بیع فاسد ہو جاتی ہے، البتہ ایجاب وقبول سے پہلے یا بعد میں لگانے سے بیع فاسد نہیں ہوتی، لہذا مذکورہ صورت میں بھی ایجاب وقبول کے موقع پر ایسی شرط لگانے سے گریز کریں، پہلے یا بعد میں بیشک ایسی شرط لگائیں پھر وعدہ کے درجہ میں اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہوگا۔

لما فی الهدایة: (۶۱/۳، طبع رحمانیه)

کل شرط لا یقتضیه العقد وفیه منفعة لاحد المتعاقدین او للمعقود علیه ـــ یفسد العقد.

ولما فی الشامی: (۸۵/۵، طبع سعید) اما لو جری العرف به ـــ فلا فساد.

ولما فی درر الحکام: (۱۵۹/۱، طبع ماجدیه کوئٹه)

الشرط المتعارف ولو لم یکن من مقتضیات العقد جوز للعقد معه استحسانا وصار

معتبرا لان الشرط متى كان متعارفا فلايكون باعثا على النزاع.

ولما في الشامي:(۵/۸۴،طبع:سعيد)

ولو ذكر المبيع بلاشرط ثم ذكر الشرط على وجه العقد جاز البيع ولزم الوفاء بالوعد اذالمواعيد قدتكون لازمة فيجعل لازما لحاجة الناس.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: عبدالرحمٰن کوہاٹی

۲۹صفرالخیر۱۴۳۲ھ   فتویٰ نمبر: ۲۹۴۳

﴿نامعلوم مقدار واپس کرنے کی شرط لگانے سے عقد فاسد ہوجاتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر خریدار نے دوکاندار سے کوئی چیز لیتے وقت یہ شرط لگائی کہ جتنا مجھ سے زائد ہوجائے تو میں آپکو واپس کرونگا، جیسے چونا وغیرہ، تو کیا اس طرح کے شرط کے ساتھ یہ عقد جائز ہوگا؟   مستفتی: مولوی نور محمد عبدل خیل

﴿جواب﴾ مبیعہ کا کچھ حصہ (نامعلوم مقدار) واپس کرنے کو عقد میں شرط لگانے سے عقد فاسد ہوجاتا ہے، اس لئے کہ اس سے مبیعہ میں جہالت آجاتی ہے، لیکن اگر کسی علاقے میں ایسا رائج ہوگیا ہو، تو عرف بننے کی وجہ سے عقد فاسد نہ ہوگا۔

لمافي التنوير مع الدر:۵/۸۴طبع سعيد كراچی

(ولابيع بشرط) وفي الشامية تحته: من أنه لو باع مطلقاً عن هذه الآجال ثم أجل الثمن اليها صح فانه في حكم الشرط الفاسد كما أشرنا اليه عناك ثم ذكر في البحر أنه لو أخرجه مخرج الوعد لم يفسد وصورته كما في الولوالجية: قال اشترحتى ابنى الحوائط۔۔۔۔

قلت: وفي جامع الفصولين أيضاً لو ذكر البيع بلاشرط ثم ذكر الشرط على وجه العقد جاز البيع ولزم الوفاء بالوعداذالمواعيدقدتكون لازمة فيجعل لازما لحاجة الناس تباعا.

ولمافي تكملةفتح الملهم:۱/۶۲۹،۶۳۰طبع دارالعلوم كراچی

وخلاصة مذهب الحنفية في ذلك أنه ان كان شرطا يقتضيه العقد أويلائم العقد أوشرطاجرى به التعامل بين الناس فهو جائزولايفسد به البيع ومثال الشرط الذى جرى به التعامل ماإذااشترى نعلاعلى أن يحذوه البائع أو جرابا على أن يخرزه له خفاقال السرخسي رحمه الله في المبسوط:وإن كان شرطالايقتضيه العقدوفيه عرف ظاهر فذلك جائزأيضاكمالو اشترى نعلاوشراكا بشرط أن يحذوه البائع لأن الثابت بالعرف ثابت بدليل شرعي ولأن في النزع عن العادة الظاهرحرجا بينا وقال الكاساني في البدائع: والقياس أن لايجوزوهوقول زفر رحمه الله وجه القياس ان هذاشرط لايقتضيه العقد وفيه منفعة لاحد العاقدين وانه مفسد ۔۔۔۔ولنا أن الناس تعاملوا هذاالشرط في البيع كما تعاملوا

الاستصناع لسقط القیاس بتعامل الناس کما سقط فی الاستصناع.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۶ جمادی الثانی ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۲۷۵۱

﴿خریدار واپس بیچنے کی شرط لگائے تو بیع فاسد ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارا اسٹیٹ ایجنسی کا کاروبار ہے، ہم کبھی ایسا کرتے ہیں کہ ایک پلاٹ ۵۰ لاکھ کا کسی کو اس شرط پر فروخت کرتے ہیں کہ بعد میں یہی پلاٹ میں آپ سے ۵۵ لاکھ کا خرید لوں گا، پوچھنا یہ ہے کہ کیا شرعاً ہمارا یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: محمد شہزاد صاحب ڈیفنس

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں آپ کا یہ معاملہ شرعاً درست نہیں ہے، اس لئے کہ پلاٹ فروخت کرتے وقت بائع یعنی (بیچنے والے) کا یہ کہنا کہ میں اس پلاٹ کو دوبارہ آپ سے ۵۵ لاکھ روپے کا خرید لوں گا یہ شرط فاسد ہے، جس کی وجہ سے یہ معاملہ ناجائز ہو جاتا ہے، البتہ اگر اس شرط کو ذکر کیے بغیر دونوں باہمی معاملہ کرلیں، اور معاملہ کرنے کے بعد اسی وقت یا بعد میں بائع خریدار سے کہے کہ بعد میں یہی پلاٹ میں آپ سے خرید لوں گا تو ایسا کرنے کی گنجائش ہے اور بائع کو بعد میں اپنے وعدہ کی پاسداری کرنی چاہیے اگر وعدہ پورا نہ کیا تو وعدہ خلافی کی وجہ سے گنہگار ہوگا۔

لما فی التنویر مع الدر: (۸۴/۵، طبع سعید)

(و) لا (بیع بشرط)۔۔۔(لا یقتضیه العقد ولا یلائمه وفیه نفع لاحدهما أو)

وفی الشامیة: (قوله ولا بیع بشرط) شروع فی الفساد الواقع فی العقد بسبب الشرط لنهیه ﷺ عن بیع وشرط...... قلت: وفی جامع الفصولین أیضا: لو ذکر البیع بلا شرط ثم ذکر الشرط علی وجه العقد جاز البیع ولزم الوفاء بالوعد اذ المواعید قد تکون لازمة، فیجعل لازما لحاجة الناس تبایعا بلا ذکر شرط الوفاء ثم شرطاه یکون بیع الوفاء...... وبه أفتی فی الخیریة وقال: فقد صرح علماؤنا بانهما لو ذکرا البیع بلا شرط ثم ذکرا الشرط علی وجه العدة جاز البیع ولزم الوفاء بالوعد اه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالحکیم کشمیری عفا اللہ عنہ

۳ شعبان ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۷۵۰

﴿معتوہ کا معیار اور اس کے معاملات کا حکم﴾

﴿سوال﴾ ایک شخص جو کہ معتوہ ہے معاملات میں اکثر دھوکہ کھا جاتا ہے اور زیادہ قیمت والی اشیاء کم قیمت میں فروخت کر دیتا ہے جس سے اہل خانہ کا کافی نقصان ہوتا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ شریعت میں معتوہ کا معیار کیا ہے؟ کیا اس کے اہل خانہ کو اس کے معاملات فسخ کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

مستفتی: مولوی محمد شاہ صاحب عبدل خیل

﴿جواب﴾ فقہاء کرام کی اصطلاح میں معتوہ سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جسکی سمجھ میں کچھ کمی ہو اور کلام میں خلط ملط ہو رہا ہو اور اسکی تدبیر بھی فاسد ہو یعنی سوچ سمجھ کر معاملہ نہ کر سکتا ہو لیکن اسکی عقل میں اتنی کمی نہ ہو کہ وہ مجنون کی طرح سب وشتم کرنے لگے۔

لمافی الشامی: (۱/۱۴۳، طبع سعید)

العته: هو آفة توجب الاختلال بالعقل بحيث يصير مختلط الكلام فاسد التدبير الا انه لا يضرب ولا يشتم بحر.

ولما في العالمگيرية: (۵/۵۴ طبع رشيديه)

والمعتوه... هو من كان قليل الفهم مختلط الكلام فاسد التدبير الا انه لا يضرب ولا يشتم كمايفعل المجنون كذافي التبيين.

معتوہ کے وہ تمام معاملات جو نفع ونقصان کے مابین ہوں نافذ نہیں ہوتے بلکہ ولی کی اجازت پر موقوف ہوتے ہیں اگر ولی اس معاملے کو فسخ کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، مذکورہ صورت میں اگر اس شخص پر مذکورہ تعریف صادق آتی ہو تو اس کے ولی یعنی باپ یا دادا اگر موجود ہوں اور وہ چاہیں تو اس کے معاملات کو فسخ کر سکتے ہیں اس کے بیٹے اس کے مجاز نہیں، البتہ اگر مذکورہ اولیاء نہ ہوں تو اس کے اہل خانہ کو چاہیے کہ وہ عدالت کے ذریعے اس کے معاملات فسخ کروالیں۔

لمافی قوله تعالى: (سورة البقرة، آيت ۲۸۲)

﴿فان كان الذى عليه الحق سفيها او ضعيفا او لا يستطيع ان يمل هو فليملل وليه بالعدل﴾

ولما في المبسوط للسرخسي: (ج ۲۴ ص ۱۵۷، طبع دار المعرفة بيروت)

وقال شمس الدين السرخسي: هو تنصيص على اثبات الولاية على السفيه وانه مولى عليه ولا يكون ذالك الا بعد الحجر عليه. وقال الله تبارك وتعالى: ولا تؤتوا السفهاء اموالكم الى ان قال واكسوهم وهذا ايضا على اثبات الحجر عليه بطريق النظر له فان الولى الذى يباشر التصرف فى ماله على وجه النظر منه له. وفي التنوير مع الدر: (۵/۱۱۰، طبع سعيد)

ولمافی الکفایۃ:(۶/ ۶۷،طبع رشیدیہ)

(ومن باع من هؤلاء شيئا او اشترى وهو يعقل البيع ويقصده) المراد بهؤلاء الصبي والعبد والمجنون الذي يجن ويفيق وهو المعتوه الذي يصلح وكيلا عن غيره وهو يعقل البيع ويقصده وان كان لا يرجح المصلحة على المفسدة لا الذي ذهب عقله فان تصرفه لا يصح..... ولا بدان يعقلا البيع ليتحقق ركن البيع فينعقد موقوفا على الاجازة.

ولمافی البحر:(۸/ ۷۹-۷۸،طبع سعید)

(ولا يصح تصرف المجنون المغلوب بحال) يعني لا يجوز تصرفه بحال ولو اجازه الولي.....وان كان يجن تارة ويفيق اخرى فهو في حال افاقته كالعاقل والمعتوه كالصبي العاقل في تصرفاته وفي رفع التكليف عنه وهو الناقص العقل.وقيل هو مدهوش من غير جنون.....(ومن عقد منهم وهو يعقله يجيزه الولي او يفسخه) يعني من عقد البيع والشراء من هؤلاء المحجورين وهو يعقله اي وهو يعقل ان البيع سالب والشراء جالب ويعلم الغبن الفاحش من اليسير ويقصد به تحصيل الربح والزيادة فالولي بالخيار ان شاء اجازه وان شاء رده.وهكذا في العالمگيرية:(۵/ ۵۴،كتاب الحجر،طبع رشيديه) والعناية:(۹/ ۱۶۲،طبع رشيديه)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:ظہور احمد شمس

۹/ ۱/ ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر:۱۰۸۳

﴿چوری کا مال خریدنا یا بیچنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ایک شخص کے پاس چوری کا موبائل ہے اور میرے علم میں ہے کہ یہ موبائل چوری کا ہے،معلوم یہ کرنا ہے کہ میرے لئے اس موبائل کا خریدنا کیسا ہے؟ نیز اگر لاعلمی میں خرید لیا اور بعد میں معلوم ہوا تو ایسی صورت میں شرعاً کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ چوری کے مال کا مالک چور نہیں ہے،اسکو بیچنے کا اختیار نہیں ہے اور نہ آپ خریدنے سے مالک قرار پاتے ہیں،لہٰذا آپ کیلئے اسکا خریدنا ہرگز جائز نہیں ہے،لاعلمی میں خریدنے کی صورت میں بھی اصل مالک کو لوٹانا ضروری ہے،البتہ چور سے پیسہ وصول کرنے کا حق آپ کو حاصل ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۴/ ۱۱۰،طبع سعید)

(ولا غرم على السارق بعد ما قطعت يمينه..... وترد العين لو قائمة) وان باعها او وهبها لبقائها على ملك مالكها--- وفيه لو استهلكه المشتري منه او الموهوب له فللمالك تضمينه.

وفي الشامية:(قوله فللمالك تضمينه) اي تضمين المشتري او الموهوب له ثم يرجع

المشترى على السارق بالثمن لا بالقيمة تاتارخانية عن المحيط.

ولما فى بدائع الصنائع:(۷/ ۸۵،طبع سعید)

ولو باع السارق المسروق من انسان أوملكه منه بوجه من الوجوه فان كان قائما فلصاحبه ان ياخذه لانه عين ملكه وللماخوذمنه ان يرجع على السارق بالثمن الذى دفعه)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: عبدالرزاق عفا اللہ عنہ

۴ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ　　فتوی نمبر: ۱۵۵۲

﴿سودی بینک سے کاروبار کے لئے قرضہ لینا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ ایک شخص ایک فیکٹری کھولتا ہے اس پر چھ لاکھ ۶۰۰۰۰۰ روپے کی لاگت آئی ہے، دولاکھ ۲۰۰۰۰۰ اس کے پاس پہلے سے موجود ہیں اور چار لاکھ ۴۰۰۰۰۰ سودی بینک سے قرضہ لیتا ہے، اب ان تمام رقوم سے جو نفع ہوگا، اس کا کیا حکم ہے؟ نیز سودی بینک میں کرنٹ اکاؤنٹ کھولنا کیسا ہے؟　　مستفتی: محمد اسحاق ڈیفنس

﴿جواب﴾ سود لینا حرام ہے، اسی طرح سود پر قرض لے کر سود دینا حرام ہے، تاہم سودی قرضہ لے کر کاروبار میں لگانے سے اس پر ملکیت آجاتی ہے اور اب اس سرمایہ سے حاصل ہونے والا منافع سود کی طرح حرام اگر چہ نہیں لیکن نحوست اور بے برکتی سے خالی بھی نہیں۔

کنوینشنل بینکوں میں کرنٹ اکاؤنٹ کھولنے کے جواز کے فتاوی ہمارے اکابر ضرورت کے پیش نظر دیتے رہے ہیں، اس وقت سودی بینکوں کا متبادل غیر سودی بینک موجود نہ تھے، اب چونکہ یہ ضرورت غیر سودی بینکوں سے پوری ہو جاتی ہے، لہذا سودی بینکوں میں کرنٹ اکاؤنٹ کھولنے سے گریز کیا جائے تا کہ آپ کی رقم سودی معاملات میں استعمال نہ ہو، البتہ جہاں غیر سودی بینکوں کی سہولت میسر نہ ہو بوجہ ضرورت کرنٹ اکاؤنٹ کھولنے کی گنجائش ہے لیکن موجودہ دور میں اس قسم کے بینکوں کا غیر سودی ہونا بھی یقینی نہیں رہا، اس لئے کہ اکثر علماء نے مذکورہ بینکوں میں رائج معاملات کو سودی قرار دیا ہے اور مضبوط حوالوں سے استشہاد کیا ہے جن کا اب تک اطمینان بخش جواب نہیں آیا، اس لئے ایسے بینکوں کے بارے میں ہم توقف اختیار کرتے ہیں، لہذا دونوں قسم کے بینکوں میں بوجہ ضرورت کرنٹ اکاونٹ کھولنے کی گنجائش ہے۔

لما فى مشكوة المصابيح:(۲/ ۲۴۴،باب الربا،طبع سعید)

عن جابر رضى الله عنه قال لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا وموكله

وكاتبه وشاهديه وقال هم سواء(رواه مسلم)

ولما في الدر مع الدر:(۱۶۶/۵ طبع سعيد)

وفي الخلاصة القرض بالشرط حرام والشرط لغوبان يقرض على ان يكتب به الى بلد كذاليوفي دينه وفي الاشباه كل قرض جرنفعا حرام.

وفي الشامية:(قوله كل قرض جرنفعا حرام)اى اذاكان مشروطاكما علم مانقله عن البحر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: عبدالوہاب لغمانی عفااللہ عنہ

۳ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ　　　　فتوی نمبر: ۲۴۷۹

﴿قرض دیکر شرط لگانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں حضرات علماء کرام کہ زید عمرو کو اس شرط پر پیسے دیتا ہے کہ تم مارکیٹ سے جو چیز بھی خریدو پہلے مجھے دکھلانا اگر مجھے پسند آگئی تو میں خرید لونگا اگر پسند نہ آئی تو پورے پیسے واپس لے لونگا شریعت کی رو سے ایسا معاملہ کرنا کیسا ہے؟　　مستفتی: ملک محمد عمران

﴿جواب﴾ ایسا معاملہ کرنا از روئے شریعت درست نہیں، اس لئے کہ یہ رقم بطور قرض دی گئی ہے اور قرض دی گئی رقم پر یہ شرط لگانا کہ (تم جو بھی چیز خریدو پہلے مجھے دکھلانی ہوگی) یہ قرض سے فائدہ حاصل کرنا ہے جو کہ ایک گونہ نفع ہی ہے اور قرض پر کسی طرح کا نفع حاصل کرنا احادیث میں سود قرار دیا گیا ہے۔

لما في بدائع الصنائع:(۳۹۵/۷ طبع سعيد)

(وأما)الذى يرجع الى نفس القرض فهوان لايكون فيه جرمنفعة فان كان لم يجز نحو مااذاقرضه دراهم غلة على ان يردصحاحاأواقرضه وشرط شرطاله فيه منفعةلما روى عن رسول الله صلى الله عليه وسلم انه نهى عن قرض جرنفعا ولان الزيادة المشروطة تشبه الربا لانها فضل لايقابله عوض والتحرزعن حقيقةالرباوعن شبهةالرباواجب.

ولما في الشامي:(۱۶۶/۵ طبع سعيد)

(قوله كل قرض جرنفعا حرام)أى اذاكان مشروطاكما علم مانقله عن البحروعن الخلاصة وفي الذخيرة وان لم يكن النفع مشروطافي القرض فعلى قول الكرخي لا بأس به ويأتي تمامه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: انیس طالب کان اللہ لہ

۱۹ صفر ۱۴۳۱ھ　　　　فتوی نمبر: ۲۴۶۶

﴿آتش بازی کے سامان کی خرید و فروخت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ آتش بازی کے سامان کا کاروبار اور اس کا فروخت

کرنا کیسا ہے؟ نیز اس قسم کا کاروبار کرنے والوں کو اپنی دکان کرایہ پر دینے کا کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ آتش بازی کے سامان کا کاروبار اور اس کا فروخت کرنا ناجائز ہے، اس لئے کہ یہ سامان اس بے ہودہ کام کے علاوہ کسی جائز کام میں استعمال نہیں ہوتا اور آتش بازی محض اسراف اور فضول خرچی پر مشتمل کام ہے، قرآن کریم میں فضول خرچی سے ممانعت آئی ہے، چنانچہ سورۃ اسراء آیت ۲۷ میں اللہ تعالی کا ارشاد مبارک ہے:

ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین وکان الشیطن لربه کفورا......الأية.

ترجمہ: بے شک فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان رب کا نافرمان ہے، نیز آتش بازی کے سامان میں لوگ خصوصاً نوجوان طبقہ خاصا شغف رکھتا ہے اور نوجوان لڑکے اسکو خرید کر ساری رات پٹاخ چلاتے رہتے ہیں جس سے عام لوگ خصوصاً بزرگ اور کمزور لوگوں کو کافی تکلیف ہوتی ہے تو یہ ایذاء مسلم ہونے کی وجہ سے ناجائز اور حرام ہے، پس اسکا کاروبار اور خرید و فروخت اعانت علی المعصیۃ ہونے کی وجہ سے ناجائز ہوگا۔

اس کے علاوہ بھی ہمارے علم کے مطابق آتش بازی کے سامان کی تجارت اور اس کی خرید و فروخت قانوناً جرم ہے اگرچہ محکمہ پولیس اس بارے میں اپنا فریضہ کما حقہ انجام نہیں دے رہی، پس قانوناً جرم ہونے کی وجہ سے بھی اس کا کاروبار و خرید و فروخت درست نہیں۔

رہا مسئلہ اس قسم کے کاروبار کرنے والوں کو دوکان کرایہ پر دینا تو عام طور پر کوئی شخص مستقل آتش بازی کے سامان کیلئے دوکان نہیں کھولتا بلکہ جنرل اسٹور یا دیگر کسی دوکان میں مخصوص سیزن میں مذکورہ سامان فروخت کرتا ہے، ایسی صورت میں دوکان کرایہ پر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، البتہ اگر صرف آتش بازی کے سامان کا کاروبار اور خرید و فروخت ہو تو ایسی صورت میں "اعانت علی المعصیۃ" کی وجہ سے دوکان کرایہ پر دینا مناسب نہیں ہے۔

لمافی قوله تعالی (سورة المائدة، آیت ۲) ﴿وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان﴾
ولمافی الدر المختار: (۳۹۱/۶، طبع سعید)

قلت: وقدمنا انه معزيا للنهر ان ماقامت المعصية بعينه يكره بيعه تحريما والا فتنزيها.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالرزاق

۲ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۶۷۴

﴿ذبح کرنے سے پہلے جانور کی کھال بیچنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم قربانی کیلئے جانور خریدتے ہیں، ذبح کرنے سے پہلے خریدار اسکی کھال کی قیمت لگا کر بعض یا کل پیسے دیکر چلا جاتا ہے اور ذبح کے بعد آ کر کھال لے جاتا ہے کیا ایسا کرنا شرعا درست ہے؟ مستفتی عادل شیر سواتی

﴿جواب﴾ ذبح کرنے سے پہلے خریدار کا جانور کی کھال کی باقاعدہ بیع کرنا جائز نہیں ہے، البتہ وعدہ کے درجہ میں ہو تو اس کی گنجائش ہے، کھال اتارنے کے بعد دوبارہ نیا سودا کرنا ضروری ہے خواہ اسی رقم پر دونوں راضی ہوں یا اس کے علاوہ قیمت مقرر کریں۔

لما فی الهندية: (۱۲۸/۳ طبع رشیدیه)

لا یجوز بیع لبن فی ضرع ولا ولد فی بطن ولا یجوز بیع صوف علی ظهر الغنم فی الروایة المشهورة کذا فی محیط السرخسی۔۔ولو باع الجلد والکرش قبل الذبح لا یجوز فان ذبح بعد ذلک ونزع الجلد والکرش وسلم لا ینقلب العقد جائزا کذا فی الذخیرة.

ولما فی الشامی: (۶۳/۵ طبع سعید)

(قوله وجلد میتة) قید بها لانها لو کانت مذبوحة فباع لحمها او جلدها جاز لأنه یطهر بالزکاة الا الخنزیر خانیة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: حبیب الوہاب

۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۵۲۰

﴿معاملہ میں زندہ جانور بطور ادھار ہو تو جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ہمارے یہاں سردیوں کے موسم میں جب کوئی بڑا جانور مثلاً گائے وغیرہ مرنے لگتا ہے تو اسے ذبح کر کے سات یا آٹھ آدمی اس کو تقسیم کر لیتے ہیں اس شرط پر کہ وہ اس جانور کے مالک کو اسی موسم میں پیدا ہونے والا بھیڑ یا بکری کا بچہ دیں گے کیا یہ معاملہ کرنا درست ہے؟

واضح رہے کہ اس بدلے میں دیئے جانے والے بچے میں اکثر متعاقدین کا نزاع ہوتا ہے؟

﴿جواب﴾ گوشت کے بدلے میں زندہ جانور لینا دینا جائز ہے بشرطیکہ اسی وقت دونوں طرف سے ادائیگی ہو مذکورہ صورت میں بھیڑ یا بکری کا بچہ چونکہ بعد میں وصول ہوگا تو یہ گوشت کے بدلے زندہ جانور کا ادھار معاملہ ہے اس لئے ہرگز جائز نہیں ہے۔

لما فی الدر المختار مع رد المحتار:(۱۷۹/۵ طبع سعید کراچی)

کما جاز بیع لحم بحیوان ولو من جنسه لانه بیع الموزون بما لیس بموزون فیجوز کیفما کان بشرط التعیین اما نسیئة فلا(قوله اما نسیئة فلا)لانها ان کانت فی الحیوان او فی اللحم کان سلما،وهو فی کل منهما غیر صحیح نهر.

ولما فی البحر:(۱۳۲/۶ طبع سعید کراچی)

(قوله واللحم بالحیوان)ای صح بیع اللحم بالحیوان عند ابی حنیفة وابی یوسف ـــــ وانما لا یجوز بیع احدهما بالآخر نسیئة لان المتأخر منهما لا یمکن ضبطه لا لانهما جنس واحد الاتری انه لا یجوز ذلک اذا بیع بغیره من خلاف الجنس ایضاً.

ولما فی الفقه الحنفی فی ثوبه الجدید:(۲۲۱/۴ طبع دار القلم دمشق)

جاز بیع لحم بحیوان ولو من جنسه لانه بیع الموزون بما لیس بموزون فیجوز کیفما کان سواء کان اللحم من جنس ذلک الحیوان او لا مساویا لما فی الحیوان او لا اما بیعه نسیئة فلا تجوز،لانها ان کانت فی اللحم او فی الحیوان کان سلماً وهو فی کل منهما غیر صحیح.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن حفظہ اللہ تعالیٰ — واللہ اعلم بالصواب: محمد اویس غفرلہ ولوالدیہ

۱۴ جمادی الثانیہ ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر: ۳۸۰۹

﴿ثمن نقد یا ادھار متعین نہ ہو تو عقد فاسد ہے﴾

﴿سوال﴾ جناب مفتی صاحب! ہمارے علاقے میں یہ رواج ہے کہ لوگ ایک چیز نقد پیسوں پر خرید لیتے ہیں پھر تیسرے شخص کو ایک سال کیلئے ادھار دوگنا یا سہ گنا آگے فروخت کر دیتے ہیں تو کیا یہ خریدنا اور فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ فروخت اسطرح کرتے ہیں کہ اگر تم نقد دو گے تو اصل قیمت پر دونگا اور اگر ادھار کرو گے تو دوگنی یا سہ گنی قیمت لونگا۔ مستفتی: سیف الرحمٰن

﴿جواب﴾ سوال میں جو صورت ذکر کی گئی ہے اس میں چونکہ معاملہ کو دو صورتوں یعنی نقد یا ادھار کے درمیان دائر کیا ہے، کسی ایک صورت پر فیصلہ نہیں کیا، اس لئے ناجائز ہے، معاملہ کرتے وقت اسی مجلس میں نقد یا ادھار میں سے ایک صورت طے کر لی جائے اور اسکی کل قیمت اور کل مدت اسی وقت طے کر لی جائے اور پھر مقررہ وقت پر ادائیگی نہ ہو سکنے پر مزید کوئی جرمانہ عائد نہ کیا جائے تو یہ جائز ہے۔

لما فی بحوث:(۷/۱ طبع دار العلوم کراچی)

اما الائمة الاربعة وجمهور الفقهاء والمحدثین فقد أجازوا البیع المؤجل باکثر من سعر النقد،بشرط أن یبت العاقدان بانه بیع مؤجل بأجل معلوم وبثمن متفق علیه عند

العقد، فأما اذا قال البائع: أبيعك نقدا بكذا ونسيئة بكذا وافترقا على ذلك بدون أن يتفقا على تحديد واحد من السعرين، فإن مثل هذا البيع لا يجوز ولكن اذا عين العاقدان أحد الشقين في مجلس العقد، فالبيع جائز.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد وارث

۳۱ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۱۶۲۱

﴿عقدِ بیع میں دوسرے وقت کی قیمت متعین کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کے پاس ایسی گندم ہے جو بطور بیج کے استعمال ہوتی ہے وہ عمرو کو کٹائی کے موسم میں اس کی تین بوریاں اس شرط پر فروخت کرتا ہے کہ جب کاشت کا موسم آئے گا تو مارکیٹ میں جو قیمت ایسے گندم کی ہوگی وہ اس وقت ادا کروگے اور عمرو گندم پر قبضہ بھی کرلیتا ہے تو کیا شرعاً ایسا معاملہ کرنا درست ہے؟

﴿جواب﴾ شریعت میں ایسا معاملہ کرنا درست نہیں ہے کیونکہ اس میں زید اور عمرو کے درمیان کوئی قیمت طے نہیں ہوئی ہے اور جب قیمت مجہول ہو تو شرعاً وہ معاملہ فاسد ہوتا ہے، البتہ زید عمرو کو گندم ہی بطور ادھار دیدے اور جب واپس کرنا چاہیں تو بے شک اس وقت کی قیمت عمرو سے وصول کرے تو یہ قرض کا معاملہ ہے نہ صرف جائز بلکہ اس میں زید کو قرض دینے کا اجر و ثواب بھی ملے گا لیکن اس صورت میں گندم ہی عمرو کے ذمے واجب ہے، ہاں باہمی رضامندی سے اس وقت کی قیمت لینا دینا بھی جائز ہے.

لما في الشامي (۴/۵۵ طبع سعيد)

وأما الثالث وهو شرائط الصحة فخمسة وعشرون منها عامة ومنها خاصة فالعامة لكل بيع شروط الانعقاد المارة لأن ما لا ينعقد لا يصح وعدم التوقيت، ومعلومية المبيع، ومعلومية الثمن بما يرفع المنازعة فلا يصح بيع شاة من هذا القطيع وبيع الشيء بقيمته أو بحكم فلان.

ولما في الهندية (۳/۱۲۷ مكتبة رشيدية)

وفي الأصل اذا قال اخذت هذا منك بمثل ما يبيع الناس فهو فاسد.

ولما في الفقه الاسلامي وادلته (۵/۳۳۲۵ مكتبة رشيدية)

ولا يجوز البيع عند الفقهاء بما ينقطع عليه السعر في السوق او بما يبيع الناس او بما يقول فلان لجهالة الثمن.

ولما في الدر المختار (۵/۱۶۳ طبع سعيد)

فجاز شراء المستقرض القرض ولو قائما من المقرض.

(وفی الشامی تحت قوله فجاز شراء المستقرض القرض)تفریع علی قولهما، والمراد شراءه مافی ذمته لاعین القرض الذی فی یده وحینئذ فقوله ولو قائما فیه استخدام،لأنه عائد الی عین القرض الذی فی یده وبیان ذلک أنه تارة یشتری مافی ذمته للمقرض وتارة مافی یده أی عین مااستقرضه فان کان الأول ففی الذخیرة اشتری من المقرض الکر الذی له علیه بمائة دینار جاز لأنه دین علیه لابعقد صرف ولاسلم فان کان مستهلکا وقت الشراء فالجواز قول الکل لأنه ملکه بالاستهلاک وعلیه مثله فی ذمته بلاخلاف وان کان قائما فکذلک عندهما وعلی قول أبی یوسف ینبغی ان لایجوز لأنه لایملکه فلم یجب مثله فی ذمته فاذا اضاف الشراء الی الکر الذی فی ذمته فقد اضافه الی معدوم فلایجوز.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفااللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: صدیق انور

۱۲ اربیع الاول ۱۴۳۳ھ

فتویٰ نمبر ۳۱۷۷

﴿خاص رقبہ میں گندم کی فصل کی بیع صاف گندم کے بدلے میں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گندم کی فصل جو کہ ایک خاص رقبہ میں محیط ہو، مقصد اس سے چارہ حاصل کرنا ہو اور اس میں ابھی تک خوشہ بھی نہیں آیا ہے کا خرید نا صاف گندم کی متعین مقدار کے بدلے میں جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: ارشد سعید کوہاٹی

﴿جواب﴾ چونکہ مذکورہ صورت میں گندم کے فصل کی حیثیت گھاس کی ہے لہٰذا صاف گندم اور اسکی جنس ایک نہیں ہوئی اس لئے برابری بھی ضروری نہیں، معاملہ جائز ہے، البتہ فصل کو پکنے تک زمین پر چھوڑنے کی شرط نہیں لگانی چاہیے پھر مالک زمین اگر چھوڑنے پر راضی ہے تو کوئی مسئلہ نہیں ہے اور علاقہ میں اس معاملہ کا رواج اگر عام ہو چکا ہے تو باقاعدہ شرط لگانے سے بھی معاملہ فاسد نہیں ہوگا۔ تاہم اصل حکم کے اعتبار سے چونکہ یہ ناجائز شرط ہے اس لئے احتیاط اسی میں ہے کہ شرط باقاعدہ نہ لگائی جائے۔

لمافی شرح معانی الآثار(۲/۲۱۶،طبع:سعید)

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لاتبایعوا الذهب بالذهب ولاالورق بالورق الاوزنا بوزن ولاالتمر بالتمر ولاالحنطة بالحنطة ولاالشعیر بالشعیر ولاالملح بالملح الاسواء عینا بعین فمن زاد او ازداد فقد اربی ولکن بیعوا الذهب بالورق والحنطة بالشعیر والتمر بالملح یدا بید کیف شئتم.

ولمافی البزازیة علی هامش الهندیة(۴/۳۸۴،مکتبه:رشیدیة)

وشراء قصیل الحنطة بالحنطة کیلا لوجزافا یجوز لأن هذا بیع الحشیش بالحنطة فیصح کیفما کان.

ولمافی شرح المجلة(۱۲/۲،مکتبۃ رشیدیہ)

وعليه فاشتراط ترك الثمار البارزة حتى تنضج وان كان شرطا لايقتضيه العقد ولايلائمه وفيه نفع لأحد العاقدين لكن حيث جرى به العرف الشائع فى بلادنا واستفاض بين الخاص والعام..... فيكون معتبرا.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: صدیق انور

۱۵رجب المرجب ۱۴۳۲ھ فتوی نمبر:۳۳۵۱

﴿قبل الدباغۃ مردار جانور کی کھال فروخت کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ ایک آدمی کی بھینس مرگئی تو اس نے عیسائیوں کو بلا کر بھینس سے چمڑا اتروایا پھر اس کھال کو دو ہزار روپیہ میں مالک بھینس نے انہی عیسائیوں کے ہاتھ فروخت کر دیا، اب ان پیسوں کا کیا حکم ہے؟ مستفتی محمد شفیع ضلع قصور

﴿جواب﴾ اگر کھال دباغت کے بغیر فروخت کی گئی ہے اور ابھی تک یہی کھال اس عیسائی کے پاس موجود ہے تو اس معاملہ کو منسوخ کر کے کھال واپس لے لے اور رقم اس کے حوالے کر دے کیونکہ مردار کی کھال کی دباغت سے پہلے اسکی خرید و فروخت جائز نہیں ہے لیکن اگر کسی وجہ سے اس سودا کو منسوخ کرنا ممکن نہ رہا ہو۔

مثلاً عیسائی نے یہ کھال آگے فروخت کر دی ہو یا اس کا کچھ بنالیا ہو تو ایسی صورت میں اس رقم کا صدقہ کرنا واجب ہے اور اگر دباغت کے بعد کھال فروخت کی گئی ہے تو یہ پیسے حلال ہیں۔

لمافی مجمع الانہر:(۸۱/۳،طبع المنار کوئٹہ)

(لا)يجوز(بيع جلود الميتة قبل الدباغ)لانها غير منتفع بها وليست بمال لنجاستها فيبطل.

ولمافی الهندية:(۱۱۵/۳،طبع رشیدیہ)اهل الكفر اذا باعوا الميتة فيما بينهم لايجوز.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد وارث خان

۱۳رجب المرجب ۱۴۲۹ھ فتوی نمبر:۱۷۱۲

﴿کریڈٹ کارڈ کا استعمال جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ (۱) میرے پاس ایک کریڈیٹ کارڈ citi bank کا ہے جس سے میں نے دو تین چیزیں قسطوں پر لی تھیں، اسکے بارے میں علماء کرام کیا کہتے ہیں کیونکہ جب ہم کوئی

چیز قسطوں پر لیتے ہیں تو بینک والے اس کی اضافی رقم لگاتے ہیں اور اسکی قسطیں کرتے ہیں اسکے بارے میں بتائیں؟

(۲) دوسری بات جب ہم کریڈٹ کارڈ استعمال کرتے ہیں تو اس پر ہمیں پچاس ۵۰ روپے پر ایک پوائنٹ ملتا ہے تو میں پچھلے آٹھ سال سے کارڈ استعمال کر رہا ہوں تو میرے پاس ۱۱۰۰۰/ پوائنٹ جمع ہو گئے تھے، تو میں نے ایک ہاتھ کی گھڑی منگوالی، اسکے بارے میں بتائیں کہ میرے لئے اسکا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

(۳) اگر صحیح نہیں تو میں اس گھڑی کا کیا کروں اور اسکے علاوہ اس گھڑی کو میں نے پہن کر حج بھی کیا اگر یہ گھڑی صحیح نہیں تو میرے حج پر اسکا کیا اثر پڑا تحریر فرمائیں؟

(۴) میرے پاس ایک اور کریڈٹ کارڈ ہے جس پر میں نے اپنے آفس کے سامان کا انشورنس کیا ہوا ہے، وہ بھی بینک کے توسط سے ہے، اسکے بارے میں بتائیں کہ فی زمانہ حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے میں نے ۵۰۰۰۰۰/ لاکھ روپے کی انشورنس کروائی تھی، آپ بتائیں کہ گودام یا آفس کی انشورنس کروانا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: محمود احمد

﴿جواب﴾ (۱) بینک سے کریڈٹ کارڈ بنیادی طور پر سودی عقد کے ذریعے ہی حاصل ہوتا ہے، اس لئے اس کا حاصل کرنا، استعمال کرنا جائز نہیں ہے اور بعض لوگ جو کہتے ہیں کہ وقت پر بینک کو پیسہ ادا کرنے کی صورت میں سود نہیں دینا پڑتا، لہذا اس کا کوئی اہتمام اگر کرے گا تو اسکے لئے جائز ہے، یہ دراصل سودی معاملات میں تسامح (چشم پوشی) ہے، اس لئے کہ عملی طور پر سود لینا دینا جس طرح حرام ہے، اسی طرح اس کا معاملہ کرنا اور کسی درجہ میں سود دینے پر رضا مندی کا اظہار کرنا بلکہ تسلیم کرنا قطعاً حرام ہے۔ (۲-۳) گھڑی کسی غریب کو دیدیں حج آپ کا صحیح ہے۔ (۴) انشورنس ذات کی ہو یا آفس کی شرعاً اسکی کوئی گنجائش نہیں ہے، حالات کی نزاکت کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے تقدیری فیصلوں کا مقابلہ کوئی انشورنس سے نہیں کر سکتا، انشورنس جوا، سود پر مشتمل ہے، اس کے علاوہ توکل اور رضا بالقضا سے فرار کا نا کام راستہ اختیار کرنا ہے۔

لما فی قوله تعالیٰ: (سورة البقرة، آیت ۲۷۵) واحل الله البیع وحرم الربا ... الأية.

ولما فی الشامی: (۳۸۵/۶ طبع سعید)

لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق اذا تعذر الرد علی صاحبه.

ولما فی قولہ تعالیٰ:(سورۃ المائدہ،آیت ۹۰)

﴿انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون﴾

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:محمد طیب حسن زئی

۱۶ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر:۲۰۲۵

﴿کریڈٹ کارڈ کا شرعی حکم﴾

﴿سوال﴾ میں کاروباری شخص ہوں بیکری چلاتا ہوں میرا چھوٹا بھائی بھی میرے ساتھ ہے وہ کہتا ہے کہ میں کریڈٹ کارڈ سے خریداری کیا کروں مگر میرا دل نہیں مانتا کیونکہ یہ سارا سودی لین دین ہے وہ کہتا ہے میں اپنا کریڈٹ کارڈ استعمال کیا کروں گا آپ مجھے پیسے بعد میں دے دیا کریں، میری راہنمائی فرمائیں یہ طریقہ درست ہے جبکہ میرا دل نہیں مانتا ہے اور ہم دکان پر کریڈٹ کارڈ مشین بھی لگوانا چاہتے ہیں جس میں ایک پرسنٹ ہمارا بھی کٹے گا۔

﴿جواب﴾ بینک سے کریڈٹ کارڈ وصول کرتے وقت معاہدہ پر دستخط لئے جاتے ہیں اس میں باقاعدہ سود دینے کا معاہدہ ہوتا ہے،اس لئے کارڈ کا وصول کرنا ناجائز اور حرام ہے۔

لما فی قولہ تعالیٰ:(سورۃ البقرہ،آیت ۲۷۵) احل اللہ البیع وحرم الربوا الآیۃ

ولما فی المظہری:(۲۹۹/۱،طبع رشیدیہ)

الربوا فی اللغۃ الزیادۃ: قال اللہ تعالیٰ ویربی الصدقات والمعنی ان اللہ تعالیٰ حرم الزیادۃ فی القرض علی القدر المدفوع والزیادۃ فی البیع لاحد المتعلقین

ولما فی المشکوۃ:(۲۲۲/۲،طبع سعید)

عن جابرؓ قال لعن رسول اللہ ﷺ اکل الربوا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال ھم سواء

ولما فی الھدایۃ:(۸۵/۳،طبع رحمانیہ)

وما سواہ مما فیہ الربوا یعتبر فیہ التعیین ولا یعتبر فیہ التقابض

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:بلال احمد وابا...

۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر:

﴿کنوینشنل بنکوں سے قسطوں پر گاڑی نکلوانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ کنوینشنل بینکوں سے قسطوں پر گاڑی نکلوانا اس طور پر کہ میں کوئی قسط ضائع نہیں ہونے دونگا ورنہ بینک مجھ سے مزید

منافع لیگا جو سود ہوتا ہے، کیا یہ صحیح ہے؟

نیز کیا کنونشنل بینکوں کے کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم جمع کرانا صحیح ہے یا نہیں؟ جبکہ بنک ہماری رقوم سے سود کماتے رہتے ہیں اور اگر بجلی کے بل کی ادائیگی کی تاریخ گذر جائے تو سرچارج لگا کر جمع کرنے سے ہم گنہگار تو نہیں ہونگے؟

﴿جواب﴾ کنونشنل بینکوں سے مذکورہ معاملے کے طور پر گاڑی نکلوانا جائز نہیں کیونکہ معاملہ کی دستاویزات میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قسط کو مؤخر کرنے کی صورت میں زائد رقم دینا ہوگی تو یہ سودی معاملہ ہے اس طرح معاملہ کرنا ہی غلط ہے، لہٰذا اس معاملے کے تحت آپ گاڑی نہ نکلوائیں، نیز کنونشنل بینکوں کے کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم جمع کرانا جائز ہے اور مناسب یہ ہے کہ آپ مقررہ وقت پر بجلی کا بل جمع کرادیں تاکہ سرچارج سے بچ جائیں، البتہ سرچارج کے ساتھ بل جمع کرانے سے آپ گنہگار نہیں ہونگے۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد ضیاء الدین

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۷۸۵

﴿جنرل پراویڈنٹ فنڈ کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ سرکاری ملازم کی تنخواہ میں سے حکومت ہر ماہ (جی-پی) فنڈ کے نام پر کچھ رقم کاٹتی ہے جس پر ہر سال اضافہ لگتا ہے، جسے گورنمنٹ پرافٹ کا نام دیتی ہے، میں نے مفتی شفیع صاحب کا اس کے متعلق رسالہ پڑھا تھا کہ یہ اضافہ سود نہیں ہے بلکہ ملازم کو ملازمت کے آخر میں ساری رقم بمع پرافٹ کے دی جاتی ہے یہ سود نہیں ہے بلکہ جائز ہے، یہ فتویٰ آپ کی نظروں سے لازمی گذرا ہوگا۔

اس میں وضاحت طلب بات مزید یہ ہے کہ اب ہمارے سرکاری محکمے میں یہ گنجائش دی گئی ہے کہ کوئی شخص اپنی اس کٹوتی پر پرافٹ نہ لینا چاہے تو فارم پر لکھ کر بھیج دے، اسکی رقم تو کاٹی جائے گی لیکن سال کے بعد منافع نہیں ملے گا اور ملازمت کے آخر میں ساری رقم اتنی ہی اسکو دیدی جائے گی، اب اس صورت میں کوئی آدمی فارم پر نہ کرے تو اسکی رقم پر اسی طرح سال بعد پرافٹ لگتا ہے اور ملازمت کے آخر میں اسکو ساری رقم اضافے کے ساتھ مل جائے گی، ہماری رہنمائی

فرمائیں اگر یہ لینا سود ہے تو اب تک ۱۵ سالوں میں جو رقم ہماری کٹ چکی ہے اسکا کیا کیا جائے؟

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں سرکاری ادارے نے جب آپ کو اختیار دیدیا ہے تو احتیاط اسی میں ہے کہ فارم پر کر کے دیدیا جائے اور نفع نہ لیا جائے تاہم فارم پر نہ کرنے کی صورت میں اضافی رقم لینے کی بھی گنجائش ہے، اس لئے کہ سودی معاملہ تو محکمہ والوں نے بینک سے کیا ہے، ملازم کا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے، رقم کی نسبت اگرچہ ملازم کی طرف ہوتی ہے لیکن اسکے قبضے میں آنے سے پہلے شرعاً وہ اس رقم کا مالک قرار نہیں پارہا، اس لئے ملازم کے حق میں اس اضافی رقم کا حکم سود کا نہیں ہے۔

لیکن یہ حکم اس صورت میں ہے اگر ملازم اپنے ہی محکمے سے وہ پوری رقم وصول کرے اور اگر ملازم کو یہ رقم براہ راست بینک سے وصول کرنا پڑتی ہے تو اس صورت میں اضافی رقم وصول کرنے کی گنجائش نہیں ہے اگر غلطی سے وصول کر لی ہو تو اسکا صدقہ کرنا واجب ہے۔

لمافی البحر الرائق:(۲۰۰/۷ طبع سعید)

(قوله بل بالتعجيل أوبشرطه أوبالاستيفاء أوبالتمكن)يعني لايملك الأجرة الابواحد من هذه الاربعة والمرادأنه لايستحقها المؤجرالابذلك كمااشار اليه القدوري في مختصره لأنهالوكانت دينالايقال أنه ملكه المؤجرقبل قبضه......لكن ليس له بيعهاقبل قبضها.

ولمافی الهداية:(۸۲/۳ طبع رحمانيه)

لأن الربواهوالفضل المستحق لأحدالمتعاقدين في المعاوضة الخالي عن عوض شرط فيه.

(پراویڈنٹ فنڈ پر زکوۃ اور سود کا مسئلہ ص ۱۹ از مفتی محمد شفیعؒ)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: شاہد محمود عفا اللہ عنہ

۵ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۵۲۲

﴿Life Insurance (بیمہ زندگی) کرانا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام کہ ملازمت اختیار کرنے کے بعد کمپنی نے اپنے قانون کے مطابق بیس (20) سال کے لئے میرا Life Insurance (بیمہ زندگی) کرائی تھی اور جب یہ عرصہ گذرا تو میں نے مزید کچھ عرصہ کیلئے یہ معاملہ جاری رکھا، بیس سال (20) گذرنے کے بعد اب تک میں نے پچھتر ہزار (75,000) روپے جمع کیے ہیں، اب

کمپنی مجھے تین لاکھ (300000) روپے دے رہی ہے تو کیا میرے لئے یہ تین لاکھ (300000) روپے لینا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: مقتدی ابوبکر صدیق مسجد ڈیفنس فیز 2

﴿جواب﴾ انشورنس سود، جوے اور غرر پر مشتمل معاملہ ہے، شرعاً حرام ہے، شروع میں کمپنی والوں نے اگر چہ آپ کی اجازت کے بغیر انشورنس کرایا تھا لیکن بعد میں آپ نے اس حرام معاملہ کو اپنے اختیار سے جاری رکھا، اس لئے اس پر توبہ واستغفار کریں اور آئندہ ایسے حرام کاموں سے دور رہنے کا عزم کریں اور اب تک آپ کی رقم انشورنس کمپنی میں جتنی جمع ہوئی ہے، صرف وہی اصل رقم لینا جائز ہے اضافی رقم سود ہے جس کا لینا حرام ہے اگر غلطی سے لی ہو تو ثواب کی نیت کے بغیر صدقہ کرنا واجب ہے۔

لمافی قوله تعالی:(سورة البقرة آیت ۲۷۸)

یا ایها الذین اٰمنوا اتقوا الله وذروا مابقی من الربا ان کنتم مومنین، فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من الله ورسوله......الآیة.

ولمافی قوله تعالی:(سورة المائدة آیت ۹۰)

یا ایها الذین اٰمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوه لعلکم تفلحون......الآیة.

ولمافی الصحیح لمسلم:(۲/۲، کتاب البیوع، طبع قدیمی کراچی)

عن أبی هریرة قال:نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن بیع الحصاة وعن بیع الغرر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: صادق محمد سواتی غفرلہ ولوالدیہ

۲۹ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر: ۳۰۹۱

﴿ڈی ایس پی فنڈ کا شرعی حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں پی-اے-ایف میں ملازم ہوں، محکمہ کی طرف سے ہمیں اختتام ملازمت پر ڈی-ایس-پی فنڈ ملتا ہے جس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر مہینہ ہماری تنخواہ سے پچیس روپے جبراً کاٹ لئے جاتے ہیں، اس پر ہم کو بارہ فیصد منافع ملتا ہے، اس طرح آنے والے مہینوں کی کٹوتیاں پچھلے مہینوں کی تمام کٹوتیوں سے ملا کر مجموعہ پر بارہ فیصد ملتا ہے۔

اگر کوئی ملازم اپنی رضا سے پچیس روپے پر زیادہ رقم اپنی تنخواہ سے کٹوانا چاہے تو اتنی ہی رقم پر

اس کو بارہ فیصد منافع ملتا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں ملنے والا بارہ فیصد منافع سود میں شمار ہے یا نہیں؟

مستفتی: عمر روشن شاہ مروت

﴿جواب﴾ ملازم کو تنخواہ کی رقم موصول ہونے کے بعد اسکی ملکیت میں داخل ہوتی ہے، ملازم کے قبضہ میں آنے سے پہلے محکمہ والے جو بھی تصرف اس میں کریں وہ انکی ذاتی رقم میں تصرف شمار ہوتا ہے، لہذا جبراً کٹوتی کی صورت میں محکمہ والے اگر سود پر یہ رقم دیتے ہیں تو سودی معاملہ کا گناہ بھی انہی کو ہوتا ہے ملازم کا اس معاملہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، لہذا اس کٹوتی کی صورت میں ملازم کو اصل رقم کے ساتھ سودی رقم بھی اگر ملتی ہے تو اس کے لئے یہ سود نہیں ہے اس لئے کہ محکمہ والوں نے اپنی رقم سے سودی معاملہ کر کے سود لیکر ملازم کو اصل رقم کے ساتھ شامل کر کے دے دیا ہے، ملازم کے کسی قول یا فعل کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

البتہ کوشش یہ ہو کہ ملازم براہ راست خود سودی ادارے سے وصول نہ کرے بلکہ محکمہ سے ہی وصول کرے لیکن جبری کٹوتی کے علاوہ مزید رقم اپنی مرضی سے کوئی ملازم کٹوائے اور اس پر سود لینے کا مطالبہ کرے گا تو یہ سودی صورت ہوگی جس سے بچنا ضروری ہے۔

لما فی تنویر الابصار:(۱۶۸/۵ طبع سعید)

(فضل خال عن عوض بمعیار شرعی مشروط لاحد المتعاقدین فی المعاوضة)

ولما فی البحر الرائق:(۱۲۲/۶ طبع سعید)

وهو ان یکون الفضل الخالی مشروطا فی العقد لاحد المتعاقدین

ولما فی فتح القدیر:(۷/۷ طبع رشیدیه)

لان الربا هو الفضل المستحق لاحد المتعاقدین فی المعاوضة الخالی عن عوض شرط فیه

ولما فی بدائع الصنائع:(۱۹۳/۵ طبع سعید)

ومنها ان لا یکون البدلان ملکا لاحد المتبایعین فان کان لا یجری الربا

ولما فی کتاب الاختیار لتعلیل المختار:(۲۰/۱ طبع قدیمی)

وروی الحارث فی مسنده قال رسول الله: کل قرض جر منفعة فهو ربا

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: حزب شاہ ولی مروت

۲۶ محرم الحرام ۱۴۳۰ھ | فتوی نمبر: ۱۹۶۹

﴿غیر اختیاری طور پر کرائی گئی انشورنس کی رقم کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے والد صاحب

مرحوم فوج میں ملازم تھے، کمپنی نے انکی رضامندی کے بغیر اپنے قانون کے مطابق انکالائف انشورنس (بیمہ زندگی) کرائی تھی، اب والد صاحب کے انتقال کے بعد کمپنی انکے لائف انشورنس کی رقم ہمیں دے رہی ہے تو آیا ہمارے لئے یہ رقم لینا جائز ہے یا نہیں؟

واضح رہے کہ انشورنس کی رقم والد صاحب کی (Besec selewry) یعنی اصل تنخواہ سے نہیں بلکہ (medical allowance) میڈیکل الاؤنس وغیرہ سے کاٹی جاتی تھی، نیز جس کمپنی میں والد صاحب کام کرتے تھے وہ خود وصول کر کے ادا کرتی۔

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں اس انشورنس کی رقم کے جائز یا ناجائز ہونے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر واقعۃً انشورنس کی رقم ادارہ اپنے خزانے میں شامل کر کے مرحوم ملازم کے پسماندگان کو دیگا تو اس کو لینا جائز ہے، اس لئے کہ انشورنس والا معاملہ ادارہ نے کیا ہے، ملازم کا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے رقم کی نسبت اگرچہ ملازم کی طرف ہوتی ہے لیکن اس کے قبضے میں آنے سے پہلے شرعاً وہ اس رقم کا مالک قرار نہیں پا رہا، اس لئے ملازم کے حق میں اس اضافی رقم کا حکم سود کا نہیں ہے لیکن! اگر انشورنس کی یہ رقم براہ راست انشورنس کمپنی سے وصول کرنی پڑتی ہے تو اس صورت میں اتنی رقم وصول کرنا جائز ہے، جتنی رقم ادارہ نے پریمیم کے طور پر انشورنس کمپنی کو ادا کی تھی اس سے زائد لینا جائز نہیں ہے اگر غلطی سے لے لی ہے تو اس زائد رقم کو صدقہ کرنا واجب ہے، واضح رہے کہ انشورنس کی یہ رقم ادارہ مرحوم ملازم کے پسماندگان میں جس کو متعین کر کے دیگا وہ اس کا مالک ہوگا یہ رقم مرحوم کے ترکہ میں شامل نہیں ہوگی۔

لما فی البحر: (۳۰۰/۷ طبع سعید)

(قوله بل بالتعجیل أو بشرطه أو بالاستیفاء أو بالتمکن) یعنی لا یملک الأجرة الا بواحد من هذه الاربعة والمراد انه لا یستحقها المؤجر الا بذالک کما اشار الیه القدوری فی مختصره لانها لو کانت دینا لا یقال انه ملکه المؤجر قبل قبضه.اه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: خلیل اللہ

۱۳ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۵۶۳

﴿جبری بیمہ کرانے کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ ٹریول ایجنسی کسی شخص کی رضامندی کے بغیر اپنے قانون کے تحت انشورنس

کرالیتی ہے، پوچھنا یہ ہے کہ اس شخص کے لئے مذکورہ انشورنس کی رقم لینا جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ انشورنس کی رقم ادارہ اگر اپنے خزانے میں شامل کر کے دے رہا ہے تو اس کا لینا جائز ہے، البتہ اگر انشورنس کی رقم براہ راست انشورنس کمپنی سے وصول کرنی پڑتی ہے تو اس صورت میں اتنی رقم وصول کرنا جائز ہے، جتنی رقم ادارہ نے انشورنس کمپنی کو فراہم کی تھی، اس سے زائد رقم لینا جائز نہیں اگر غلطی سے لے لی ہے تو اس زائد رقم کو صدقہ کرنا واجب ہے۔

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: ظہور احمد شمس

۵ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۱۵۱۱

﴿دین مؤجل کا کچھ حصہ اجل کے عوض معاف کرنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ زید نے عمرو سے ڈیڑھ لاکھ روپے کی ایک گاڑی خریدی اور اس میں سے پچاس ہزار روپے فی الفور ادا کر دئے اور باقی ایک لاکھ روپے قسطوں کے ذریعہ ادا کریگا اور اس کیلئے چھ ماہ کی مدت مقرر کی گئی لیکن مدت مقررہ سے پہلے عمرو کو پیسوں کی ضرورت پڑی تو اس نے زید سے کہا کہ تم ابھی مجھے اسی ہزار روپے ادا کر دو باقی بیس ہزار روپے میں تمھیں معاف کرتا ہوں اس معاملہ کا شرعاً کیا حکم ہے؟　　　　مستفتی: ادارہ، پشاور

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں قرض خواہ مدیون سے وقت مقررہ کے بدلے کچھ رقم ساقط کر رہا ہے اور یہ دراصل وقت مقررہ کا معاوضہ ہے جس کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے، اس لئے یہ معاملہ جائز نہیں ہے۔

لمافی التنویر مع الدر: (۵/۶۴۰ طبع سعید)

(أو عن ألف مؤجل علىٰ نصفه حالا)......(أو عن الف سود علىٰ نصفه بيضا) والاصل أن الاحسان ان وجد من الدائن فاسقاط وان منهما فمعاوضة.

وفي الشامية: قوله (حالا) لانه اعتياض عن الاجل وهو حرام... قوله: (فمعاوضة) اى ويجرى فيه حكمها فان تحقق الربا أو شبهته فسدت والاصحت قال ط: بان صالح على شيئ هو أدون من حقه قدرا أو وصفا أو وقتا وان منهما: اى من الدائن والمدين بان دخل في الصلح مالا يستحقه من الدائن من وصف كالبيض بدل السود أو ماهو في معنى الوصف كتعجيل المؤجل او عن جنس بخلاف جنسه اه.

ولمافي الهداية: (۳/۲۵۶ طبع رحمانيه)

ولو كانت له الف مؤجلة فصالحه علىٰ خمسمائة حالة لم يجز لان المعجل خير من

المؤجل وهو غير مستحق بالعقد فيكون بازاء ماحطه عنه وذالك اعتياض عن الاجل وهو حرام.اه كذا في العناية:(۷/۱۶۹)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد حسن غفرلہ

۲ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر:۱۵۳۶

﴿قسطوں پر خریدی ہوئی چیز کو قسطوں کی مکمل ادائیگی سے پہلے فروخت کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص قسطوں پر کوئی چیز خریدے مثلاً موٹر سائیکل یا کار وغیرہ پھر قسطوں کی مکمل ادائیگی سے پہلے پہلے اسے دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کردے، پوچھنا یہ ہے کہ قسطوں کی مکمل ادائیگی سے پہلے اس چیز کو فروخت کرنا درست ہے یا نہیں؟ مستفتی: عبدالحنان حیدرآباد

﴿جواب﴾ قسطوں پر کوئی چیز خریدنے سے خریدار اس کا مالک ہوجاتا ہے اور ہر شخص کو اپنی مملوکہ چیز میں ہر طرح کے جائز تصرف کا حق حاصل ہے، لہٰذا خریدار چاہے تو تمام قسطوں کی ادائیگی سے پہلے بھی دوسرے کو فروخت کرسکتا ہے، البتہ باقی ماندہ قسطوں کی ادائیگی کی ذمہ داری اسی اول خریدار پر ہے۔

لما في الشامي:(۴/۵۰۶،طبع ایچ ایم سعید)

(قوله وهما ركنه)ظاهره ان الضمير للايجاب والقبول.

ولما في الشامي:(۴/۵۰۵طبع سعيد) واما الثاني وهو شرائط النفاذ فاثنان:الملك والولاية.

ولما في الهداية:(۳/۲۰،طبع رحمانيه)

واذا حصل الايجاب والقبول لزم البيع ولا خيار لواحد منهما الامن عيب اوعدم روية.

ولما في الهداية:(۳/۷۸،طبع رحمانيه)

من اشترى شيئاً ممايتقل ويحول لم يجزله بيعه حتى يقبضه لانه نهى عن بيع مالم يقبض ولان فيه غرر انفساخ العقد على اعتبار الهلاك.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عدنان خدا بخش

۲۶ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ فتویٰ نمبر:۲۵۵۷

﴿گوبر کی خرید وفروخت جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زمیندار لوگ فصل کیلئے

بطور کھاد جانوروں کا فضلہ استعمال کرتے ہیں جس سے فصل اچھی ہوتی ہے، چنانچہ زمیندار اس کو باقاعدہ خریدتے ہیں، کیا فضلہ حیوانی کی خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: محمد اقبال مانکی

﴿جواب﴾ فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ جانوروں کے فضلہ یعنی گوبر کی خرید وفروخت جائز ہے کیونکہ یہ ایسی چیز ہے جس سے نفع حاصل کیا جاسکتا ہے۔

لما فی البحر الرائق: (۱۹۹/۸ ،طبع سعید)

کره بیع العذرة لا السرقین لان المسلمین یتمولون السرقین وانتفعوا به فی سائر البلاد والامصار من غیر نکیر فانهم یلقونه فی الاراضی لاستکثار الریع.

ولما فی التنویر مع الدر: (۳۸۵/۶ ،طبع سعید)

(کره بیع العذرة) رجیع الآدمی (خالصة لا) یکره بل یصح بیع (السرقین) ای الزبل.

ولما فی الشامی: (۵۸/۵ ،طبع سعید) یجوز بیع السرقین والبعر والانتفاع به والوقود به.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۵ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ فتویٰ نمبر: ۲۵۷۳

﴿قیمت کے تعین کے بغیر بیع درست نہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے اپنے ایک دوست کو موٹر سائیکل بیچی اور اس کو کہا دو ماہ بعد اسکی جو قیمت ہوگی وہ ادا کردینا، کیا اس طرح کا معاملہ کرنا درست ہے یا نہیں؟ مستفتی: سمیع اللہ کوٹ

﴿جواب﴾ بیع کے صحیح ہونے کیلئے ضروری ہیکہ مبیع کی قیمت معلوم ہو، مذکورہ صورت میں مبیع کی قیمت معلوم نہیں ہے بلکہ مجہول ہے اسلئے مذکورہ بیع درست نہیں ہے، البتہ معاملہ کے وقت اگر قیمت کو متعین کرلیا جائے اور ادائیگی کو باہمی رضامندی سے معین مدت تک مؤخر کرلیا جائے تو پھر یہ معاملہ درست ہوگا۔

لما فی التنویر مع الدر: (۵۲۹/۴ ،طبع ایچ ایم سعید) (وشرط لصحته معرفة قدر) مبیع وثمن

ولما فی الشامی: (۵۳۶/۴ مطلب یعتبر الثمن فی مکان العقد وزمنه ،طبع سعید)

وکما یعتبر مکان العقد یعتبر زمنه ایضاً کما یفهم مما قدمناه فی مسئلة الکساد والرخص فلا یعتبر زمن الایفاء: لان القیمة فیه مجهولة وقت العقد وفی البحر عن شرح المجمع لو باعه الی اجل معین وشرط ان یعطیه المشتری ای نقد یروج یومئذ کان البیع فاسداً.

ولما فی الهندیة: (۳/۳ ،طبع رشیدیه)

واما شرائط الصحة..... ومنها ان یکون المبیع معلوماً والثمن معلوماً علماً یمنع من المنازعة

فبیع المجهول جهالة تفضی الیها غیر صحیح کبیع شاة من هذا القطیع وبیع شئ بقیمته.

ولما فی الهدایة:(۲۱/۳،طبع رحمانیه) ویجوز بیع بثمن حال ومؤجل اذا کان الاجل معلوما.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: عدنان خدا بخش

۷ جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ　　　فتویٰ نمبر: ۲۶۸۹

﴿گاہک کے مطالبے پر منگوائی ہوئی چیز پر نفع لینا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ان مسائل کے بارے میں کہ (۱) میرا جنرل اسٹور ہے جسمیں نقد اور ادھار ہر قسم کی خرید و فروخت ہوتی ہے، ہوتا اس طرح ہے کہ جن لوگوں کو ہم ادھار پر کوئی چیز فروخت کرتے ہیں ان سے جو نفع ہم لیتے ہیں، اس کی شرح اس نفع سے ذرا بڑھی ہوتی ہے جو نفع ہم نقد خریدنے والوں سے لیتے ہیں، ایسا کرنا شرع میں جائز ہے یا نہیں؟

(۲) بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ گاہک کی مطلوبہ چیز ہمارے پاس بروقت موجود نہیں ہوتی اس لئے ہم ان سے کہدیتے ہیں کہ بعد میں آجانا ہم منگوا کر دیدینگے منگوانے کے بعد ہم اپنا نفع لیکر وہ چیز اس گاہک کو دیدیتے ہیں، پوچھنا یہ ہے کہ گاہک کے مطالبے پر جو چیز ہم نے منگوائی ہے اس پر ہمارا نفع لیکر بیچنا جائز ہے یا اسی قیمت پر گاہک کو دیں جس پر ہمیں ملی ہے؟

﴿جواب﴾ (۱) شرعاً ادھار معاملہ جائز ہے اور ادھار کی وجہ سے نفع کی شرح زیادہ مقرر کر لینا بھی جائز ہے بشرطیکہ معاملہ کے شروع میں اس چیز کی ایک خاص قیمت طے ہوجائے اور ادائیگی کی تاریخ بھی واضح ہوجائے اور ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے مقرر قیمت سے اضافے کا مطالبہ بھی ہرگز نہ ہو۔

لما فی الهندية:(۷۸/۳،طبع رشیدیه) الا یری انه یزاد فی الثمن لاجل الاجل.

ولما فی فقه السنة:(۱۲۵/۳،طبع دارالکتب)

واذا کان الثمن مؤجلا وزاد البائع فیه من اجل التاجیل جاز لان للاجل حصة من الثمن والی هذا ذهب الاحناف والشافعیة وجمهور الفقهاء.

ولما فی مرقاة المفاتیح:(۷۸/٦،طبع رشیدیه)

عن ابی هریرة قال نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن بیعتین فی بیعة...... فسروا البیعتین فی بیعة علی وجهین احدهما ان یقول: بعتک هذا الثوب بعشرة نقداً او بعشرین نسیئة الی شهر فهو فاسد عند اکثر اهل العلم لانه لا یدری ایهما جعل الثمن.

ولما فی الهندية:(۱۳٦/۳،طبع رشیدیه)

رجل باع علی انه بالنقد بکذا وبالنسیئة بکذا او الی شهر بکذا والی شهرین بکذا لم یجز.

(۲) دوکاندار سے گاہک کوئی ایسی چیز منگوائے جو دکان سے متعلق ہو تو یہ عموماً توکیل کی صورت نہیں ہوتی، چنانچہ گاہک کو لینے نہ لینے کا اختیار رہتا ہے، اس لئے دوکاندار کے لئے منافع لینا بھی جائز ہے، تاہم بہتر یہ ہے کہ مطلوبہ چیز مہیا کرنے کے بعد دوکاندار گاہک پر واضح کردے کہ یہ چیز میں آپ کو اتنے میں فروخت کرتا ہوں پسند ہو تو لے لینا تاکہ گاہک مروت کی وجہ سے اپنے کو لینے کا پابند نہ سمجھے جبکہ توکیل کی صورت میں گاہک بلاوجہ لینے سے انکار نہیں کرسکتا اور ایسی صورت میں دوکاندار کے لئے منافع لینا بھی جائز نہیں ہے۔

ولما فی الشامی: (۵/۵۰۹ طبع سعید)

ولو قال اشتر هذه الجارية بالف درهم كان مشورة والشراء للمامور الا اذا قال البائع على ان اعطيك لاجل شرائك درهما لان اشتراط الاجر له يدل على الانابة والفادانه ليس كل امر توكيلا بل لابد مما يفيد كون فعل المامور بطريق النيابه عن الآمر فليحفظ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: نعیم اقبال عفا اللہ عنہ

۱۷ صفر ۱۴۳۱ھ فتویٰ نمبر: ۲۳۳۵

﴿زمین میں پوشیدہ چیزوں کی خرید وفروخت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہمارے گاؤں میں بعض حضرات گاجر، مونگ پھلی وغیرہ کی خرید وفروخت اس طرح کرتے ہیں کہ جب ان کی کاشت کا وقت قریب آتا ہے تو زمین میں ہی فروخت کرتے ہیں حالانکہ نہ تو مبیع کی حقیقی مقدار کا علم ہوتا ہے اور نہ ہی مبیع نظر آرہی ہوتی ہے، آیا ایسی خرید وفروخت درست ہے یا نہیں؟ مستفتی: امان اللہ کرک

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں خرید وفروخت کا یہ معاملہ شرعاً جائز ہے بشرطیکہ معاملہ کرتے وقت اس بات کا یقین ہو کہ گاجر، مونگ پھلی وغیرہ کا واقعی وجود ہے اگرچہ یہ چیزیں نظر نہ آرہی ہوں، البتہ مشتری کو خیار رؤیت حاصل ہوگا یعنی گاجر، مونگ پھلی وغیرہ کا کچھ حصہ زمین سے نکالنے کے بعد مشتری کو اختیار ہے پسند آنے کی صورت میں بیع کو برقرار رکھے اور ناپسندیدگی کی صورت میں بیع فسخ کردے۔

لما فی الشامی: (۴/۵۶۲ طبع سعید)

وما فی المبسوط من ان الاشارة اليه أو الى مكانه شرط الجواز ... وفی العناية قال القدوری: من اشترى شيئا لم يره فالبيع جائز ... وكذلك العين الغائب المشار الى

مکانه ولیس فی ذلک المکان بذلک الاسم غیر ماسمی والمکان معلوم باسمه والعین معلومة وقال صاحب الاسرار:لان کلامنا فی عین هی بحالة لوکانت الرؤیة حاصلة لکان البیع جائزاً وفی الدر المختار:(۵/۵۲،طبع سعید)

ولما فی الهندیة:(۳/۱۴ طبع رشیدیه)

ولواشتری شیئاً مغیباً فی الارض کالبصل والثوم والجزر وماشبهه لم یکن مرؤیة بعضه مختاراو هو علی خیاره مالم یره جمیعه وهذاعندابی حنیفةؒ وعندهمااذاقلع شیئا منه یستدل به علی الباقی ورضی به سقط خیاره کذافی السراج الوهاج وهذااذاکان المغیب معلوماوجوده فی الارض فان باعه قبل النبات اوبعدمانبت فی الارض الا انه لایدری اهونابت فی الارض اولیس بنابت لایجوزبیعه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: نعیم اقبال عفا اللہ عنہ

۲۳ صفر الخیر ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۴۷۶

﴿زمین میں پوشیدہ پیاز وغیرہ کی بیع درست ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم پیاز اور سبزیاں وغیرہ کی کاشت کرتے ہیں بعض اوقات پیاز زمین سے نکالنے سے پہلے ہم اس کی بیع کرتے ہیں ،جس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ خریدار ظاہری اوپر سے پیاز کی فصل دیکھ کر یا زیادہ زیادہ مختلف حصوں سے کچھ پیاز نکال کر دیکھتا ہے اور پھر کسی قیمت پر ہمارے مابین عقد ہو جاتا ہے۔کیا از روئے شرع ہمارا یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں؟ برائے مہربانی وضاحت فرمائیں۔ مستفتی: غلام رسول

﴿جواب﴾ خریدار کھیت کے مختلف حصوں سے کچھ پیاز نکال کر اگر دیکھ لے اور باقی کھیت میں دیکھے بغیر سودا اس کو منظور ہو تو شرعاً یہ سودا جائز اور معتبر ہے۔خدانخواستہ بعد میں اس کے اندازے سے فصل کم نکلے تو اسے انکار کرنے کی گنجائش نہیں ہوگی۔

لما فی الشامی:(۴/۵۲۹ طبع سعید)

وشرط لصحته معرفة قدر مبیع وثمن .وفی الشامیة: لوکان قدر المبیع مجهولا ای جهالة فاحشة فانه لایصح .....والمشتری لایعلم مافیها لایصح لفحش الجهالة اما لو باعه جمیع مافی هذا البیت ،أو الصندوق او الجوالق فانه یصح لان الجهالة یسیرة قال فی التنبیه :الا اذا کان لایحتاج معه الی التسلیم والتسلم ،فانه یصح بدون معرفة قدر المبیع ،کمن اقر أن فی یده متاع فلان غصبا أو ودیعة ثم اشتراه جاز وان لم یعرف مقداره اه ومعرفة الحدود تغنی عن معرفة المقدار.

لما فی قاضی خان : (۲/۳۷،طبع قدیمی)

وان اشتری شیأ مغیباًفی الارض کالجزر والبصل والثوم والشلجم والفجل ذکر الشیخ

الامام علی بن محمد البزدوی قال: اذا قلع البائع بعضها او قلع المشتری باذن البائع فرآه ورضی به عن ابی حنیفة فیه روایتان فی روایة: بطل خیاره فیمارآه وله الخیار فیما لم یره وعنه فی روایة: مالم یر الکل بعد القلع لا یبطل خیاره ــــ وعن ابی یوسف انه قال ان کان المغیب فی الارض مما یکال او یوزن بعد القلع: کالثوم والبصل والجزر فقلع المشتری شیأ باذن البائع او قلع البائع ــــ اذا رأی المقلوع ورضی به لزم البیع فی الکل ویکون رؤیة البعض کرؤیة الکل اذا وجد الباقی ــــ والفتوی فی هذه المسائل علی قول ابی یوسف.

ولمافی الهندية: (۲/۶۲ طبع رشیدیه)

ولواشتری شیئا مغیبا فی الارض کالبصل والثوم والجزروماشبهه لم یکن برؤیة بعضه مختارا وهو علی خیاره مالم یره جمیعه وهذاعندابی حنیفة وعندهما اذاقلع شیئا منه یستدل به علی الباقی ورضی به سقط خیاره کذافی السراج الوهاج وهذااذاکان المغیب معلوما وجوده فی الارض فان باعه قبل النبات اوبعدمانبت فی الارض الا انه لایدری اهونابت فی الارض اولیس بنابت لا یجوز بیعه.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری غفرلہ ولوالدیہ

۲۰ رجب المرجب ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر: ۴۲۳۳

﴿دکان دار کی غیر موجودگی میں زائد رقم کو اپنے پاس رکھنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ میری کپڑے کی دکان ہے اور میرے سامنے میرے دوست کی بھی پینٹ شرٹ کی دکان ہے، جب میرا دوست نماز کے لئے جاتا ہے، وہ میرے حوالے دکان کر کے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ شرٹ ۲۰۰ روپے میں فروخت کرنا اور فلاں پینٹ ۵۰۰ سو روپے میں فروخت کرنا۔

اب میں اسطرح کرتا ہوں کہ وہ شرٹ وغیرہ ۳۰۰ سو روپے کی فروخت کر کے ۲۰۰ سو روپے اسکو دیتا ہوں اور ۱۰۰ سو روپے خود رکھتا ہوں، کیا میرا اسطرح کرنا درست ہے؟ اور یہ رقم میرے لئے جائز ہے؟ جواب دے کر عنداللہ ماجور ہوں۔ مستفتی: محمد تابش، ٹوسٹ گارڈ

﴿جواب﴾ مسئولہ صورت میں آپ کی حیثیت اپنے دوست کی جانب سے دلال اور وکیل کی ہے، آپ تمام کام اسکی خیر خواہی میں انجام دے رہے ہیں، اس وجہ سے جس قیمت پر سامان فروخت کیا ہے اسکی تمام قیمت دوست کو دینا لازم ہے، اس کا استعمال آپ کیلئے جائز نہیں ہے۔

لمافی شرح المجلة: (۲/ ۶۷۷ طبع رشیدیه)

لو اعطی احدماله للدلال وقال بعه بکذادراهم فان باعه الدلال بأزیدمن ذلک

فالفاضل ایضا لصاحب المال ولیس للدلال سوی الاجرۃ.

ولما فی بدائع الصنائع:(۶/ ۲۷،طبع سعید کمپنی)

فالوکیل بالبیع فالتوکیل بالبیع لایخلو اماان یکون مطلقاواماان یکون مقیدافان کان مقیدابراعی فیہ القیدبالاجماع حتی انہ اذاخالف قیدہ لاینفذعلی الموکل ولکن یتوقف علی اجازتہ الاان یکون خلافہ الی خیرلماان الوکیل یتصرف بولایۃ مستفادۃ من قبل الموکل فیلی من التصرف قدرماولاہ وان کان الخلاف الی خیر فانمانفذلانہ ان کان خلافاصورۃ فھووفاق معنی لانہ آمربہ دلالۃ فکان متصرفا بتولیۃ الموکل فنفذ بیان ھذہ الجملۃ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر اکرام

۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۶۹۱

﴿مجہول چیز کی کفالت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص دکاندار سے سوداخریدتا ہے لیکن دکانداراس کوعدم اعتماد کی وجہ سے نہیں دیتا،دوسرا آدمی دکاندار سے کہتا ہے کہ تم اسکوسودادیدیا کرو جتنی رقم خرچ ہوگی،اسکامیں ذمہ دار ہوں تو یہ مجہول چیز کی کفالت درست ہے یانہیں؟

﴿جواب﴾ کسی شخص کی طرف سے مال کی ذمہ داری لینا کفالت ہے جسمیں بنیادی طور پر ہمدردی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے،ایسے امور میں معمولی جہالت قابل برداشت ہے،صورت مسئولہ میں بھی ایسے شخص کا مجہول چیز میں ذمہ داری اٹھانا جائز ہے۔

لمافی البحرالرائق:(۶/ ۲۱۸،طبع ایچ ایم سعید)

(قولہ ومابایعت فلانافعلی)من امثلۃ الکفالۃ بالمجہول وفی المبسوط ولوقال اذا بعتہ شیئافھوعلی فباعہ متاعابالف درھم ثم باعہ متاعابعدذلک بالف درھم لزم الکفیل الاول دون الثانی لان حرف اذالایقتضی التکرار بخلاف کلماومامثل اذامتی.

ولمافی الھندیۃ:(۳/ ۲۵۴،طبع رشیدیہ)

ولوقال من بایعک من ھؤلاء واشارالی قوم معدودین فاناکفیل عنک بثمنہ جازلان المکفول لہ معلوم کذافی خزانۃ المفتیین.

ولمافی الھندیۃ:(۳/ ۲۵۱،طبع رشیدیہ)

ولوقال لرجل مابایعت فلانافھوعلی جازلانہ اضاف الکفالۃ الی سبب الوجوب وھوالمبایعۃ.

ولمافی الھندیۃ:(۳/ ۲۵۱،طبع رشیدیہ)

الکفالۃ بالمال جائزۃ معلوماکان اومجہولا بامرالمکفول عنہ اوبغیر امرہ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: احمد علی عفی عنہ

۱۵ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۵۹۶

﴿قسطوں پر معاملہ کرنا درست ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ (۱) قسطوں پر سامان لینا جائز ہے یا نہیں؟ (۲) یہ بیع کی کون سی قسم ہے؟ (۳) قسطوں میں تاخیر کی وجہ سے جرمانہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

مستفتی: عبدالعزیز سنہری مسجد کورنگی

﴿جواب﴾ (۱) قسطوں پر خرید و فروخت کرنا جائز ہے بشرطیکہ سودا کرتے وقت قیمت متعین ہو اور قسطوں کی ادائیگی کی تاریخ بھی معلوم ہو۔ (۲) بیع بالتقسیط سے موسوم ہے۔ (فقہی مقالات: ۱/۸۲، طبع میمن اسلامک پبلیشرز، شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ) (۳) قسط میں تاخیر کی وجہ سے جرمانہ لینا جائز نہیں ہے بلکہ یہ حکماً سود ہے۔

لما فی جامع الترمذی: (۱/۱۴۷، طبع فاروقی ملتان)

عن ابی هریرة قال: نهی رسول الله ﷺ عن بیعتین فی بیعة ــــ وقد فسر بعض اهل العلم قالوا بیعتین فی بیعة ان یقول ابیعک هذا الثوب بنقد بعشرة وبنسیئة بعشرین ولا یفارقه علی احد البیعین فاذا فارقه علی احدهما فلا باس اذا کانت العقدة علی واحد منهما.

ولما فی البحر الرائق: (۶/۱۱۴-۱۱۵، طبع سعید کمپنی)

لان للاجل شبها بالمبیع الا تری انه یزاد فی الثمن لاجل الاجل ان الاجل فی نفسه لیس بمال فلا یقابله شئی حقیقة اذا لم یشرط زیادة الثمن بمقابله قصدا ویزاد فی الثمن لاجله اذا ذکر الاجل بمقابلة زیادة الثمن قصدا فاعتبر مالا فی المرابحة احترازا عن شبهة الخیانة ولم یعتبر مالا فی حق الرجوع عملا بالحقیقة.

ولما فی الهدایة: (۳/۷۸، باب المرابحة طبع رحمانیه)

الا یری انه یزاد فی الثمن لاجل الاجل والشبهة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر اکرام

۴ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ　　　فتویٰ نمبر: ۲۶۹۵

﴿سیل مین کا جھوٹ بول کر سامان فروخت کرنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ میری ایک دکان ہے، اس میں ۵-۶ سیلز مین کام کرتے ہیں، بعض سیلز مین کی تنخواہ مقرر ہے لیکن دو سیلز مین کمیشن پر ہیں اگر دو ہزار کی سیل کریں تو ۲۰۰ سو روپے انکو ملتے ہیں تو یہ سیلز مین اپنا کمیشن زیادہ کرنے کے لئے خریدار سے کچھ زیادہ جھوٹ بولتے ہیں تاکہ چیز زیادہ منافع میں فروخت ہو اور انکو نفع زیادہ

ہو، اب معلوم یہ کرنا ہے کہ انکے جھوٹ سے ہماری جو کمائی ہوئی ہے وہ جائز ہے اور جھوٹ بول کر فروخت کرنا کیسا ہے؟ مستفتی: مقصود علی ناظم آباد کراچی

﴿جواب﴾ جھوٹ بول کر خرید و فروخت کرنا جائز نہیں کیونکہ جھوٹ فی نفسہ حرام ہے اور اس صورت میں دھوکا بھی ہے، سیل مین کی حیثیت آپکی جانب سے دلال اور وکیل کی ہے دھوکہ کے ذریعہ زیادہ منافع حاصل ہوئے ہوں تو اصل مالک کو لوٹانا ضروری ہے اور یہ ممکن نہ ہو تو اسکی طرف سے صدقہ کرنا ضروری ہے۔

لمافی مشکوۃ المصابیح:(ص ۲۴۳ طبع سعید کمپنی)

التجار یحشرون یوم القیمۃ فجارا الامن اتقیٰ وبر وصدق۔

ولمافی بدائع الصنائع:(۳۳/۶، طبع سعید کمپنی)

ان الوکیل متصرف بطریق النیابۃ عن الموکل وتصرف النائب تصرف المنوب عنہ الاتری ان حکم تصرفہ یقع للموکل فکذاحقوقہ لان الحقوق تابعۃ للحکم والحکم هو المتبوع فاذاکان الاصل لہ فکذاالتابع۔

ولمافی صحیح البخاری:(۳۱۷/۱، طبع قدیمی)

قال رسول اللہ ﷺ ثلثۃ لاینظر اللہ الیہم یوم القیمۃ ولایزکیہم ولہم عذاب الیم — ورجل اقم سلعتہ بعدالعصر فقال واللہ الذی لاالہ غیرہ لقداعطیت بہاکذاوکذافصدقہ رجل۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ	واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر اکرام
۱۱ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ	فتویٰ نمبر: ۲۵۹۰

﴿مروجہ پگڑی کے معاملہ کی شرعی حیثیت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کہ بارے میں کہ میں نے ایک دوکان پگڑی پر لی ہے پندرہ لاکھ روپے میں، ہر ماہ سات سو روپے اس شخص کو ادا کرتا ہوں جس سے دوکان لی ہے، چونکہ دوکان پگڑی پر ہے، لہذا آگے کسی اور کو وہ دوکان ہم اس شخص کی اجازت کے بغیر نہیں بیچ سکتے مزید یہ کہ اسکی اجازت سے بیچ بھی دیں تو ہمیں اس شخص کو ۲۰ فیصد اسمیں سے ادا کرنا ہوگا سوال یہ ہے کہ اس بیع کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور پندرہ لاکھ روپے جو اس شخص کو دیئے ہوئے ہیں ان پر زکوۃ ہے یا نہیں؟ مستفتی: محمد فیصل دہلی کالونی

﴿جواب﴾ مروجہ پگڑی کا معاملہ شرعا جائز نہیں ہے اور پگڑی کے نام پر کرایہ دار سے لی

جانے والی رقم شریعت کے کسی قاعدہ پر منطبق نہیں ہوتی، لہذا یہ رشوت اور حرام ہے جس سے بچنا ضروری ہے، البتہ مروجہ پگڑی کے متبادل کے طور پر درج ذیل صورتیں ہوسکتی ہیں:

(۱) مالک دکان کے لیے جائز ہے کہ وہ کرایہ دار سے خاص مقدار میں یکمشت رقم لے لے جسے متعینہ مدت کا پیشگی کرایہ قرار دیا جائے، یہ یکمشت رقم سالانہ یا ماہانہ کرایہ کے علاوہ ہوگی، اس یکمشت رقم پر اجارے کے سارے احکام جاری ہونگے اگر کرایہ داری کا معاملہ کسی وجہ سے طے شدہ مدت سے پہلے ختم ہوجائے تو مالک کے ذمہ واجب ہوگا کہ اجارہ کی باقی ماندہ مدت کے مقابل یک مشت رقم کا جتنا حصہ آرہا ہے اسے واپس کردے۔

(۲) اگر کرایہ داری کا معاملہ متعینہ مدت کے لئے ہوا ہے تو کرایہ دار کو اس مدت تک کرایہ داری باقی رکھنے کا حق ہے، لہذا اگر کوئی دوسرا شخص یہ چاہے کہ پہلا کرایہ دار اپنے حق سے دستبردار ہوجائے اور یہ دوسرا شخص اسکی جگہ کرایہ دار ہوجائے تو پہلے کرایہ دار کے لئے یہ جائز ہے کہ دوسرے شخص سے عوض کا مطالبہ کرے، اور پہلے کرایہ دار کا یہ عمل بالعوض حق کرایہ داری سے دستبرداری کا عمل ہوگا لیکن اسکے لئے یہ شرط ہے کہ اصل کرایہ داری کا معاملہ معینہ مدت کے لئے کیا گیا ہو مثلا دس سال کے لئے اور دس سال پورے ہونے سے قبل پہلا کرایہ دار دستبردار ہورہا ہو، جہاں تک مذکورہ رقم پر زکوۃ کا مسئلہ ہے تو یہ ضمار کے حکم میں ہے کیونکہ اس میں غالب اس رقم کا نہ ملنا ہی ہے، لہذا اس پر زکوۃ واجب نہیں اور اگر یہ رقم مل گئی تو اس وقت سے اسپر زکوۃ کے احکام لاگو ہونگے۔

قال شیخ الاسلام مفتی محمدتقی العثمانی حفظه الله:

تحقق مماذكرنا ان بدل الخلو المتعارف الذی یاخذه المؤجر من مستاجره لایجوز ولا ينطبق هذا المبلغ الماخوذ على قاعدة من القواعد الشرعية، وليس ذلك الا رشوة حراما نعم يمكن تعديل النظام الرائج للخلو الى مايلي: (١) يجو... جران ياخذ من المستاجر مقدارا مقطوعا من المال، الخ. في الملتقى: ولا في مال ضمار بالكسر مخفي وشرعا مال زائل اليد غير مرجو الوصول غالبا وانما لاتجب الزكوة عندهم لان كلا من الملك والنماء فيه مفقود (فتوى نمبر: ١٢٢٠ (٢٦) از تبويب دار الافتاء دار العلوم كراچی)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: نعمان اقبال عفا اللہ عنہ

۲۱ ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ — فتوی نمبر: ۲۶۳۸

﴿ایک وارث کا دوسرے وارث کو اپنے حصہ کی زمین کم قیمت پر فروخت کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید اور بکر دو بھائی ہیں اور دونوں کو وراثت میں زمین ملی، اب زید اپنے بھائی بکر کو کچھ رقم پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہارا جو حصہ زمین میں ہے اسکی عوض مجھ سے اتنی رقم لے لو اور زمین کو چھوڑ دو، دونوں اس پر راضی ہو گئے حالانکہ زید نے جو رقم دی ہے وہ بکر کے زمین کے حصہ کے بنسبت کم ہے، آیا شرعا یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: عمران خان بنارس

﴿جواب﴾ بکر اگر سمجھدار ہے یعنی فائدہ ونقصان کو جانتا ہے اور خوشی ورضامندی سے کم پیسوں کے بدلے بھائی کو قیمتی زمین دے رہا ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

لمافی التنویر مع الدر: (۶۴۲/۵، طبع ایچ ایم سعید)

(اخرجت الورثة احدهم عن) التركة وهي (عرض او) هي (عقار بمال) اعطاه له (او) اخرجوه (عن) تركة هي (ذهب بفضة) دفعوها له (او) على العكس او عن نقدين بهما (صح) في الكل صرفا للجنس بخلاف جنسه (قل) ما اعطوه (او كثر)

ولمافي الهداية: (۲۶۰/۲، طبع رحمانيه)

واذا كانت التركة بين ورثة فاخرجوا احدهم منها بمال اعطوه اياه والتركة عقار او عروض جاز قليلا كان ما اعطوه او كثيرا.

ولمافي الهندية: (۲۶۸/۴ طبع رشيديه كوئٹه)

اذا كانت التركة بين ورثة فاخرجوا احدهم منها بمال اعطوه اياه والتركة عقار او عروض صح قليلا كان ما اعطوه او كثيرا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۱۴ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ — فتوی نمبر: ۲۵۲۸

﴿خریدے ہوئے درختوں کو کہاں سے کاٹا جائے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہمارے گاؤں میں زمین میں لگے ہوئے درختوں کی خرید وفروخت ہوتی ہے، پوچھنا یہ ہے کہ خریدنے کے بعد ان کو سطح زمین سے کاٹا جائے یا جڑوں سے اکھیڑ لیا جائے، کیا شریعت نے اس کی کوئی حد مقرر کی ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ درختوں کی خرید وفروخت میں بائع ومشتری کا معاملہ کاٹنے سے متعلق اگر واضح

نہ ہو تو اس علاقہ کے عرف کے مطابق کاٹنا ہوگا، البتہ سودا کرتے وقت کاٹنے کی جگہ متعین ہوئی ہو تو اسی جگہ سے کاٹنا ضروری ہوگا اگرچہ عرف اس کے خلاف ہو۔

لمافی الشامی:(۴/۵۵۴،طبع سعید)

اشتری شجرۃ للقطع یؤمر بقلعھا بعروقھا ولیس له حفر الارض الی انتھاء العروق بل یقلعھا علی العادۃ الا ان شرط البائع القطع علی وجه الارض،اویکون فی القطع من الاصل مضرۃ للبائع ککونھا بقرب حائط اوبئر فیقطعھا علی وجه الارض وکذافی البحر الرائق:(۵/۲۱۴،طبع سعید)والھندیۃ:(۳/۳۵،طبع رشیدیه)

ولمافی الشامی:(۵/۲۳۸،طبع سعید)

لوباع شجرۃ ان بین موضع قطعھامن وجه الارض فعلی ذلک وان بین باصلھافعلی قرارھامن الارض وان لم یبین له ان یقطع من اصلھا الا ان تقوم دلالۃ اھ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:نعیم اقبال عفااللہ عنہ

۶ ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ　　　　فتویٰ نمبر:۲۶۱۴

﴿خرید وفروخت میں نفع کا معیار﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری سبزی کی دکان ہے جس میں ہر قسم کی سبزیاں بیچی جاتی ہیں، کچھ سبزیاں بہت جلد خراب ہو جاتی ہیں اور ان کی مانگ بھی نہ ہونے کے برابر ہے، بسا اوقات ہمیں پھینکنی پڑتی ہیں اور دگنا نقصان اٹھاتے ہیں لیکن دکان داری ہے رکھنا پڑتا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ ہم ایسی سبزیوں کو مثلاً اگر ۱۰ روپے کلو میں ہمیں ملے تو ہم ۵۰ یا ۶۰ روپے کلو کے حساب سے فروخت کر سکتے ہیں یا کہ نہیں آیا اتنا نفع میرے لئے جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ پوری مارکیٹ میں یہی ریٹ چل رہا ہو۔　　　مستفتی:خان محمد ڈیفنس فیز ۲

﴿جواب﴾ شریعت مطہرہ نے کسی بھی چیز پر زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کو حرام یا ناجائز کے درجے میں منع نہیں فرمایا، ہر شخص کو اپنی مملوکہ اشیاء خواہ جتنے بھی نفع پر بیچنا چاہے اجازت ہے بشرطیکہ ظلم اور دھوکا نہ ہو لیکن مروت، ہمدردی اور انسانوں کی خیر خواہی کا تقاضہ یہ ہے کہ نفع کی مقدار کم، مناسب اور مارکیٹ کے مطابق رکھا جائے جیسا کہ احادیث میں بھی اجمال فی الطلب کا ذکر آیا ہے اور لوگوں کی ہمدردی، خیر خواہی کی غرض سے کم نفع پر بیچنا بلاشبہ باعث برکت وثواب ہوگا، لہٰذا صورت مسئولہ میں آپکا ۱۰ روپے کلو والی سبزی کو ۵۰ یا ۶۰ روپے میں

فروخت کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ مذکورہ عذر کی وجہ سے اتنے پیسوں میں بیچنا مروت کے خلاف بھی نہیں ہے۔

لمافی کنز العمال:(۲/۲۱،طبع رحمانیہ)سیدالسلعة احق ان یسام.

ولمافی الهندية:(۳/۱۶۱،طبع رشیدیہ)

اشترىٰ متاعاًورقم بأكثر من ثمنه فباعه مرابحة على الرقم جازولا يقول قام على بكذا.

ولمافی احیاء علوم الدین:(۲/۱۱۰،دارالکتب العلمیة)

ومهمالم يكن تلبيس لم يكن اخذالزيادة ظلماً.

ولمافی فقه السنه:(۳/۱۲۳،طبع دارالکتب العلمیة)

وروى ابن ماجه والحاكم عن ابن عمران رسول الله صلى الله عليه وسلم قال:الجالب مرزوق والمحتكرملعون والجالب هوالذى يجلب السلع ويبيعهابربح يسير.

ولمافی الجامع العلوم والحكم:لابن رجبؒ الحديث السابع:(۱/۲۲۲،طبع بیروت)

واماالنصيحةللمسلمين فان يحب لهم مايحب لنفسه ويكره لهم مايكره..... ويفرح لفرحهم وان ضره ذلك فى دنياه كرخص اسعارهم.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ ‏ واللہ اعلم بالصواب:نعیم اقبال عفااللہ عنہ

۱۰صفر۱۴۳۱ھ ‏ فتویٰ نمبر:۲۴۶۶

﴿غیر ملکی کرنسی کو روک کر رکھنا پھر زیادہ منافع سے بیچنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی جاپانی کرنسی خریدتا ہے اور اپنے پاس محفوظ رکھتا ہے جب انکی قیمت مارکیٹ میں بڑھ جاتی ہے تب اس کرنسی کو زیادہ منافع کیساتھ بیچ دیتا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ کرنسی کی اسطرح خرید وفروخت جائز ہے کہ نہیں؟ اور یہ سود میں تو شمار نہیں ہوگا؟ ‏ مستفتی:احسن ربعہ صاحب

﴿جواب﴾ دومختلف ملکوں کی کرنسی کو کمی وزیادتی کیساتھ بیچنا جائز ہے کیونکہ مختلف ممالک کی کرنسیوں کی جنس مختلف ہے، اس لئے جب کرنسیوں کی جنس الگ الگ ہو تو کمی وزیادتی کیساتھ بیچنا جائز ہے۔ جیسے سعودی ایک ریال کو (۲۲) بائیس روپے پاکستانی کے بدلے بیچنا جائز ہے، اس لئے کچھ مدت تک مہنگا بیچنے کی غرض سے رکھنا بھی جائز ہے۔

لمافی بحوث فی قضایافقهية معاصرة:(۱/۱۶۹،طبع دارالعلوم کراچی)

فتبين أن عملات الدول المختلفة أجناس مختلفة،ولذلك تختلف أسماءها وموازينها

ووحداتها المتشعبة منها ولما كانت عملات الدول اجناسا مختلفة جاز بيعها بالتفاضل بالأجماع —واما عند أبى حنيفة واصحابه فلأن تحريم بيع الفلس بالفلسين مبنى عندهم على كون الفلوس أمثالا متساوية قطعا فيبقى عند التفاضل فضل خال عن العوض ولكن عملات البلاد المختلفة لما كانت أجناسا مختلفة لم تكن أمثالا متساوية فلا يتصور الفضل الخالى عن العوض فيجوزاذن أن يباع الريال السعودى مثلا بعدد أكثر من الروبيات الباكستانية.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: علی خان

۷ جمادی الاولی ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۶۸۳

﴿انسان کے بال کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان شرع دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقہ میں بعض لوگ عورتوں کے وہ بال جو کنگھی کرتے وقت کنگھی میں رہ جاتے ہیں خریدتے ہیں۔اور بسا اوقات مہنگے بھی خریدتے ہیں پوچھنا یہ ہے کہ بنی آدم کے بال کی خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں۔ مستفتی: مولوی فضل رحمانی

﴿جواب﴾ انسان اشرف المخلوقات ہے جس طرح وہ محترم ہے اسکے بدن کے اجزاء بھی محترم ہیں۔ بال بھی انسان کے بدن کا جزء وحصہ ہے۔ شریعت نے بیچنے کو سختی سے منع فرمایا ہے نہ صرف بیچنا بلکہ دوسرے کے استعمال میں لانے کو بھی منع کیا ہے۔ اسلئے کہ بیچنا اور استعمال میں لانا احترام کے منافی ہے۔

لما فى التنوير مع الدر والرد:۵/۵۸، طبع سعيد

(كما بطل بيع صبى لا يعقل ومجنون....... وشعر الانسان) لكرامة الآدمى ولو كان كافرا ذكره المصنف وغيره فى بحث الغنزير (قوله وشعر الانسان) ولايجوز الانتفاع به لحديث" لعن الله الواصلة والمستوصلة"

(ولما فى شرح الطحطاوى:۳/۶۱، طبع رشيديه)

(قوله ذكره المصنف)حيث قال والآدمى مكرم شرعا وان كان كافرا فايراد العقد عليه وابتذاله به والحاقه بالجمادات اذلال له انتهى اى وهو غير جائز وبعضه فى حكمه وصرح فى فتح القدير ببطلانه.

(ولما فى الهداية:۳/۵۴، طبع رحمانيه)

ولا يجوز بيع شعور الانسان ولا الانتفاع به لأن الآدمى مكرم لا مبتذل فلا يجوز أن

يكون شيئي من أجزائه مهانا ومبتذلا وقد قال ﷺ "لعن الله الواصلة والمستوصلة" الحديث،

ولما في فتح القدير:(۲۹۱/٦، طبع رشيديه كوئٹه)

(ولا يجوز بيع شعر الانسان) مع قولنا بطهارته (والانتفاع به لأن الآدمي مكرم غير مبتذل فلا يجوز أن يكون شيئي من أجزائه مهانا ومبتذلا) وفي بيعه اهانة وكذا في امتهانه بالانتفاع، وقد قال ﷺ فيما ثبت عنه في الصحيحين (لعن الله الواصلة والمستوصلة والواشمة والمستوصلة)

ولما في العناية بهامش فتح القدير:(۲۹۱/٦، ۲۹۲)

(ولايجوز بيع شعور الانسان الخ) بيع شعور الآدميين والانتفاع بها لايجوز وعن محمد أنه يجوز الانتفاع بها استدلالا بما روى" أن النبي حين حلق رأسه قسم شعره بين أصحابه فكانوا يتبركون به" ولو كان نجسا لما فعله ، اذ النجس لا يتبرك به ، وجه الظاهر أن الآدمي مكرم غير مبتذل وما هو كذالك لا يجوز أن يكون شيئي من أجزائه مبتذلا مهانا وفي البيع والانتفاع ذلك، ويؤيد ذلك قوله ﷺ "لعن الله الواصلة والمستوصلة"

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عمران الحق

۱۰ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر: ۳۷-۴۰

﴿فروخت کردہ چیز واپس زیادہ قیمت دیکر لینالینا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے کہ میں ایک شخص سے گاڑی دولاکھ میں لے رہاہوں اور اسکو نقد دے رہاہوں پھر وہی مجھ سے اڑھائی لاکھ میں واپس گاڑی ادھار لے رہاہے تو یہ جائز ہے یانہیں؟ یادرہے قبضہ بھی گاڑی پر کرلیتاہوں اور اسکو واپس خریدنے کاپابند بھی نہیں کرتا اسکی مرضی ہے واپس لے یانہ لے۔

﴿جواب﴾ آپ واقعی اس شخص کوادھار اڑھائی لاکھ روپے میں دوبارہ خریدنے کاپابند اگر نہیں بناتے وہ اپنی مرضی سے زیادہ پیسوں سے وہی گاڑی واپس خریدنا چاھتاہے تو شرعا اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

(لمافي الجوهرة النيرة جزء الاول ،ص۲۷۰ ،میر محمد كتب خانه)

(قوله ومن اشترى شيئا ممايتقل ويحول لم يجز له بيعه حتى يقبضه) مناسبة هذه المسئلة بالمرابحة والتولية ان المرابحة انماتصح بعد القبض ولاتصح قبله وقيد بقوله لم يجز بيعه ولم يجز ان يتصرف فيه يقع المسئلة على الاتفاق فان عند محمد يجوز الهبة والصدقة والرهن قبل القبض فيما ينقل ويحول وكان عدم جواز البيع على

الاتفاق كذا في النهاية ...الخ

(كما في الهندية، ج ۳/ ۸، رحمانيه)

ومن اشترى شيئا مما ينقل ويحول لم يجز له بيعه حتى يقبضه لانه نهى عن بيع مالم يقبض ولان فيه غرر انفساخ العقد على اعتبار الهلاك.

(شرح مختصر الطحاوي، ج ۳/ ۱۱۰، ۱۱۱ كتاب البيوع)

قال ابوجعفر: ولا يجوز بيع مالم يقبض من الاشياء المبيعة الا العقار ـــ انما تعتبر التخلية في جواز البيع، وتقام مقام النقل فيما يتأتى فيه القبض الحقيقي.

قال الخجندي: اذا اشترى منقولا لا يجوز بيعه قبل القبض لا من بائعه ولا من غيره ـــ وقال محمد: لا يجوز بيع العقار قبل القبض اعتبارا كالمنقول

(كما في البحر ج ۶/ ۱۲۲، ۱۲۵ باب المرابحة طبع دار المعرفة)

لان للأجل شبها بالمبيع الاترى انه يزاد في الثمن لأجله اذا ذكر الأجل بمقابلته زيادة الثمن قصدا فاعتبر مالاً في المرابحة احترازا شبهة الخيانة ولم يعتبر والا في حق الرجوع عملا بالحقيقة.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ

واللہ اعلم بالصواب: صفی اللہ عفرلہ والوالدیہ

فتویٰ نمبر: ۳۱۴۰